اسلامی طرزِ فکر

مسائل حیات، قرآن و سُنّت کی روشنی میں

ادارت

عادل صلاحی

ترتیب و ترجمہ

عبدالسلام سلامی

apkar pk



معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

اسلامی طرزِ فکر

مسائل حیات، قرآن و سنت کی روشنی میں

ادارت

عادل صلاحی

ترتیب و ترجمہ

عبدالسلام سلامی

اسلامی طرزِ فکر

مسائل حیات، قرآن و سنت کی روشنی میں

تیسرا ایڈیشن : دسمبر ۲۰۰۰ء

کتاب حاصل کرنے کے لیے درج ذیل پتے پر رابطہ کیجیے :

اپکار پی کے (apkar pk)

محمد عارف

404 قمر ہاؤس

ایم۔اے جناح روڈ، کراچی -74000

فون: 231 2495

فیکس : 231 0908

تشکر:

○ اس کتاب میں شائع ہونے والے سوالات و جوابات سب سے پہلے روز نامہ ''عرب۔ نیوز'' جدہ میں اور ان کا اُردو ترجمہ ماہنامہ ''رابطہ'' میں شائع ہوا۔ کتابی صورت میں اشاعت ان دونوں اداروں کے شکریے کے ساتھ کی جارہی ہے۔

○ محترم ثروت جمال اصمعی، محترم انوار احمد مینائی اور محترم عتید ریاض نے کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں تعاون فرمایا، جس کے لیے ان حضرات کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔

فہرست عنوانات

اپکار پی کے (apkar pk)

''اپکار پی کے'' الائیڈ پروموٹرز کراچی کا مخفف ہے، جس میں پی کے کے حروف پاکستان کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

میرے ایک دوست محترم عقید ریاض ''عرب نیوز'' جدہ کے مذہبی صفحے میں شائع ہونے والے زندگی کے مسائل کے بارے میں سوالات اور ان کے جوابات ایک عرصے سے اپنے حلقہ احباب اور ان لوگوں میں بلامعاوضہ تقسیم کر رہے ہیں، جو انہیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ ''آور ڈائیلاگ'' کے عنوان سے شائع ہونے والا ''عرب نیوز'' کا یہ کالم نہ صرف نہایت مقبول ہے بلکہ مفید، معلوماتی اور فکر انگیز بھی ہے۔ میں یہ صفحات جمع کرتا رہا ہوں۔ ۱۹۸۹ء میں ایک دوست کے تعاون سے ان کالموں پر مبنی ۱۲۵ صفحات کی کتاب ''آور ڈائیلاگ'' کے نام سے انگریزی میں شائع کی۔ لوگوں نے اسے پسند کیا۔ اس سلسلے کے تحت اب تک مختلف سائز اور اشکال میں، انگریزی میں اس کتاب کے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جبکہ نظر ثانی شدہ چھٹا ایڈیشن (6th Edition Rev) ستمبر ۱۹۹۸ء میں تین جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

''عرب نیوز'' کے ''آور ڈائیلاگ'' کے کالم کو ماہنامہ ''رابطہ'' (بنکاک/کراچی) اُردو میں ترجمہ کر کے ''دین کا راستہ'' کے عنوان سے شائع کرتا رہا ہے۔ اپریل ۱۹۹۴ء تک عرب نیوز سے سوالات کے انتخاب اور ترجمے کا کام عبدالسلام سلامی کرتے رہے۔ اب انہوں نے ہی ان سوالات و جوابات کو موضوعات کے اعتبار سے تقسیم کر کے، اس کتاب کے لیے مرتب کیا ہے۔

میں جناب عقید ریاض، جناب انوار احمد مینائی اور جناب محمد عیاض غزنوی کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں تعاون فرمایا۔

محمد عارف

عرضِ مرتب

سعودی عرب کے مؤقر انگریزی روزنامے ''عرب نیوز'' کے میگزین سیکشن میں دینیات کا صفحہ ''اسلام ان پراسپیکٹو'' (Islam in Perspective) کے عنوان سے شائع ہوتا ہے۔ اس صفحے پر سوال و جواب کا مستقل کالم ''آور ڈائیلاگ'' (Our Dialogue) ہے جس میں اسلام اور زندگی کے حوالے سے قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ دینیات کا یہ صفحہ عادل صلاحی صاحب مرتب کرتے ہیں۔

ماہنامہ ''رابطہ'' (بینکاک/کراچی) ''عرب نیوز'' کے مذہبی صفحے میں شائع ہونے والے سوالات و جوابات کا اردو ترجمہ ''دین کا راستہ'' کے عنوان سے شائع کرتا رہا ہے۔ دسمبر ۱۹۸۴ء سے اپریل ۱۹۹۴ء تک ان سوالات کے انتخابات اور ترجمے کا خوشگوار فرض ادا کرنے کی سعادت راقم الحروف کو حاصل رہی۔ ان سوالات اور ان کے جوابات کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ انہیں کتابی صورت میں شائع ہونا چاہیے۔ الحمد للہ کہ اس کتاب کی اشاعت کی صورت میں یہ خواہش حقیقت بن رہی ہے۔

کتاب کے تقاضوں اور قارئین کی سہولت کے پیش نظر کتاب کو تین عنوانات، عقائد، عبادات اور معاملات میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر عنوان کے ذیلی عنوانات (مثلاً عبادات میں نماز، روزہ، زکوۃ، حج) کے تحت سوالات مرتب کیے گئے ہیں۔

ہر ممکن احتیاط کے باوجود انسانی کام میں نقائص اور اغلاط کا احتمال رہتا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ ان کی نشاندہی فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں انہیں دور کیا جا سکے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس سعی کو قبول فرمائے اور ان تمام حضرات کو اجر عطا فرمائے جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں باہمی تعاون کیا ہے۔

کراچی۔ اپریل ۱۹۹۶ء

عبدالسلام سلامی

عرب نیوز کے مذہبی صفحے کے سوالات و جوابات کی کتابی صورت میں اشاعت، ایک قاری کا سوال اور جناب عادل صلاحی کا جواب

سوال: ایک گزشتہ اشاعت میں آپ نے اشارہ کیا تھا کہ سوال و جواب کے اس کالم کو آپ نے کتابی صورت میں مرتب کیا ہے اور جو قارئین خریدنا چاہیں، وہ یہ کتاب حاصل کر سکیں گے۔ کیا یہ کتاب فروخت کے لیے دستیاب ہے؟

جواب: مجھے نہیں یاد کہ میں نے یہ لکھا تھا کہ سوال و جوابات کو مرتب کرنے کا کام میں نے ذاتی طور پر کیا ہے۔ میں نے غالباً یہ لکھا تھا کہ میں ایسا کرنے کی خواہش ضرور رکھتا ہوں۔ امید ہے کہ مستقبل میں کبھی یہ کام کرنے کا موقع مل سکے گا۔ تاہم فوری طور پر میں اس کام کو نہیں کر سکتا۔

بعض حضرات نے اس صفحے پر شائع ہونے والے سوالات اور ان کے جوابات کو مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ ان میں سے ایک یا دو نے اس کی اشاعت کی اجازت حاصل کرنے کے لیے مجھے خطوط لکھے تھے۔ میں نے نہ تو اشاعت کی اجازت دی اور نہ ہی انہیں منع کیا۔ جواب نہ دینے کی دو وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ میں کسی ایسے کام کو منع نہیں کر سکتا جس سے اسلام کے بارے میں ان لوگوں کے علم میں اضافہ ہو جو یہ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ میں کسی ایسے مواد کی اشاعت کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں جس پر مجھے کوئی کنٹرول نہ ہو۔

یہ بات واضح ہے کہ اس نوعیت کی کتاب مرتب کرنے اور اسے شائع کرنے کے لیے مرتب مواد کی نہایت توجہ کے ساتھ مفصل ادارت (Extensive editing) کی ضرورت ہے۔ یعنی سوالات کو موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دیا جائے اور ایک موضوع پر ملتے جلتے سوالات کو از سرنو جامع انداز سے لکھا جائے۔ اسی صورت میں یہ ممکن ہوگا کہ بعض سوالات کے جواب میں متعلقہ موضوع پر سیر حاصل بحث کی جا سکے اور وہ جواب صرف ایک قاری کے مخصوص اور محدود سوال کے جواب کے بجائے اس مسئلہ پر زیادہ وسعت اور گہرائی کے ساتھ قارئین کو معلومات مہیا کر سکے۔ اس کے لیے خاصا وقت درکار ہے اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مستقبل میں مجھے یہ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دریں اثناء کسی باقاعدہ معاہدے کے بغیر کسی ایسے کام کی اجازت بھی نہیں دی جا سکتی جس کے نتیجے میں مالی منافع حاصل ہو۔ جن حضرات نے سوالات و جوابات مرتب کر کے شائع کیے ہیں وہ اس سے کوئی منافع حاصل نہیں کرنا چاہتے بلکہ ان کا مقصد یہ مفید معلومات ان لوگوں تک پہنچانا ہے جو اسے حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ یہ حضرات ایک نیک کام کر رہے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر عطا فرمائیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس اجر کا کچھ حصہ مجھے بھی عنایت فرمائیں گے۔

(عرب نیوز، ۱۷ فروری ۱۹۹۵ء)

دینی مسائل کے جوابات کے بارے میں استدلال کا طریقہ

ایک قاری کے سوال کے جواب میں، (جو تصویر کشی کے بارے میں تھا) عادل صلاحی صاحب نے ان بنیادی اصولوں کی وضاحت کی ہے، جن کو سامنے رکھ کر وہ ان سوالات کے جوابات دیتے ہیں، جو ان سے پوچھے جاتے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں اس تحریر کو دینے کا مقصد یہ ہے کہ عادل صلاحی صاحب کا طریقہ کار، ان کا نقطۂ نظر پڑھنے والوں کے پیش نظر رہے۔ (مرتب)

مسلمانوں کے ایک عظیم حکمران ابو جعفر المنصور نے، جو عباسی عہد کے آغاز میں بیس سال سے زیادہ عرصہ تک حکمران رہے، ایک مرتبہ امام مالکؒ سے درخواست کی کہ عام لوگوں کو اپنی روز مرہ زندگی میں جن مسائل کا سامنا کرنا ہوتا ہے، ان کے حل کے بارے میں اسلامی احکامات پر مبنی ایک کتاب مرتب فرمادیں۔ المنصور کا خیال تھا کہ اس طرح کی ایک معیاری کتاب مرتب کرا کے پوری اسلامی مملکت میں اسے پھیلایا جائے اور اس کتاب میں عام مسائل کا حل موجود ہو۔ امام مالکؒ نے جو ایک فقہی مسلک کے بانی ہیں، ابو جعفر المنصور کو مشورہ دیا کہ ایسا کوئی کام نہ کیا جائے۔ آپؒ نے دلیل دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ (رضی اللہ عنہم) مملکت کے مختلف حصوں میں تشریف لے گئے تھے اور وہاں مستقل رہائش اختیار کرلی تھی۔ ہر صحابیؓ نے دین کی تعلیمات، براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھیں اور وہ جہاں جہاں آباد ہوئے، ان میں سے ہر ایک کے پاس علم کا ذخیرہ تھا۔ اگر اس وقت کسی ایک مکتب فکر کو بنیاد بنا کر احکامات نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ افتراق اور انتشار پیدا کرنے کا سبب ہوگی۔

یہ الفاظ امام مالکؒ کی عظیم فہم و فراست کا مظہر ہیں۔ جو بات اس وقت درست تھی، وہ آج بھی صحیح ہے۔ بلکہ آج کی دنیا کے تناظر میں اس بات کی درستگی کا اطلاق زیادہ ہوگیا ہے۔ مسلمان علماء اور مفکرین نے جو محنت اور جستجو کی ہے، ان کے ثمرات ان کی کتابوں کی شکل میں ہمارے پاس

موجود ہیں۔ بعض مسائل کے بارے میں مختلف علماء کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر ایک نے قرآنی تعلیم اور سنت (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں مسئلے کا تجزیہ کیا ہے اور اپنی فہم و دانش کے مطابق اس کا حل پیش کیا ہے۔ لیکن لوگ اس بات کے لیے مضطرب رہتے ہیں کہ انہیں ان کے ہر سوال کا ایک حتمی جواب دیا جائے۔ لیکن دین یا زندگی کے معاملات میں سختی اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔ اسلامی فکر کا ایک نمایاں پہلو ہمیشہ یہ رہا ہے کہ دوسروں کے خیالات کا احترام کیا جائے اور مختلف رائے رکھنے والے علماء کی عزت کی جائے۔ اس روشنی میں یہ بات عملی طور پر ناممکن ہے کہ ہر مسئلہ کے بارے میں ایک ''حتمی'' حکم تلاش کیا جائے۔

اگر اسلام یہ چاہتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی نشاندہی فرمائی ہوتی۔ لیکن اسلام میں موجودہ دور کے سرکاری دفاتر کا کلریکل نظام نہیں پایا جاتا۔ یہاں ہر ایک کی رائے کو وقعت دی جاتی ہے، لیکن درست اسے تسلیم کیا جاتا ہے جس کی تائید میں قرآن اور سنت کی زیادہ مضبوط شہادتیں موجود ہوں۔

قارئین کے سوالات کے جواب دیتے ہوئے واضح کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسا جواب دیا جائے جس کی تائید میں مضبوط ترین شہادت موجود ہو۔ ہم شدت پسندی اور متنازعہ پہلوؤں سے دور رہتے ہیں اور خود کو کسی ایک ہی فقہی امام کے نقطۂ نظر اور رائے تک محدود نہیں رکھتے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ مسئلے کا ایسا حل پیش کیا جائے جو عصر حاضر میں قابل عمل اور قابل قبول ہو۔ اس معاملے میں جواب کو نہایت صاف اور قابل فہم بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، خواہ وہ سوال پوچھنے والے کے لیے ناخوشگوار ہی کیوں نہ ہو۔ موضوعی تشریح کے لیے قرآن کی تعلیم یا مصدقہ حدیث کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کی جاتی۔

اگر کسی سوال کا جواب موجودہ (یا پہلے بیان کردہ) نقطۂ نظر سے مختلف ہوتا ہے تو یہ اسی کوشش کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ امید کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا اجر دیں گے۔ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ بات واضح طور پر فرمائی ہے کہ جو شخص کسی مسئلے کے بارے میں ایک واضح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے اپنی بہترین کوشش کرتا ہے اور صحیح حل تلاش کر لیتا ہے تو اسے دوگنا ثواب ملے گا۔ لیکن جو شخص غلط نتیجہ پر پہنچتا ہے اسے پہلے شخص کے مقابلے میں آدھا ثواب ملے گا۔ یہ وہ رواداری ہے جو اسلام کی خصوصیت ہے اور جو ہماری کوششوں کو تقویت بخشتی ہے۔

اب اگر کوئی قاری ان صفحات میں مسئلے کے حل کے بارے میں کوئی ایسا حکم پڑھتا ہے جو اس کے ان نظریات سے مختلف ہے جس پر وہ پہلے سے عمل کرتا آرہا ہے، تو ممکن ہے کہ اسے یہ انداز فکر زیادہ بہتر لگے کیونکہ اس کے ثبوت میں قرآن وحدیث سے شہادتیں ہوں گی، اگر اسے قبول کرنے میں کوئی جھجک محسوس ہو، تو اسے چاہیے کہ مسئلے کا یا تو خود بغور جائزہ لے اور اگر خود خاطر

خواہ علم اور اہلیت نہ رکھتا ہو تو کسی عالم سے مدد لے اور پھر فیصلہ کرے کس کی بنیاد مضبوط ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر کی یا اس کے اپنے نقطۂ نظر کی ---- اس تجزیہ کے بعد جس نقطۂ نظر کے حق میں زیادہ ٹھوس شہادتیں ہوں، اسے اختیار کرنا چاہیے۔

میرے خیال میں اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ اسلام میں کسی فرد واحد یا ادارے کو ''حکم آخر'' نہیں بنایا گیا۔ ''حکم آخر'' صرف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو قرآن مجید کی شکل میں موجود ہے یا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ حدیث کی شکل میں جو کچھ فرمائیں، وہ حتمی بات ہوگی۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ رواداری جو اسلام کی خصوصیت ہے اور جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے، لوگوں کے لیے مسئلہ کیوں بن گئی ہے۔ اگر کسی مسئلے کے بارے میں ہم غلط رائے رکھتے ہیں تب بھی ہمیں اس کا ثواب ملے گا۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی اس بے پایاں عنایت اور رحمت پر خوش اور شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہم غلطی پر ہوتے ہیں، تب بھی وہ ہمیں اجر دیتا ہے۔

فوٹوگرافی کے مسئلے کو لیجیے جس کی بنیاد پر آپ نے یہ سوال اٹھایا ہے۔ میرے نقطۂ نظر کے مطابق فوٹوگرافی کی بالکل اجازت ہے سوائے اس کے کہ اسے کسی ناجائز یا ممنوع کام کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ ہو۔ اپنے موقف کے حق میں میری دلیل یہ ہے کہ فوٹوگرافی، جو ہمارے آج کے دور میں مروج ہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں اس شکل میں موجود نہیں تھی۔ فوٹوگرافی کے لیے جو عربی لفظ استعمال کیا جاتا ہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کسی اور چیز کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جب قرآن مجید میں اس لفظ کے معنی دیکھے جائیں تو علم ہوتا ہے کہ یہ لفظ ''شکل دینے، سجانے، ماڈلنگ یا کوئی قطعی شکل دینے'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ معنی فوٹوگرافی کے اس معنی سے بالکل مختلف ہیں جو آج کے دور میں رائج ہے۔ یعنی کیمرے میں عدسوں کا استعمال اور فلم پر عکس کی منتقلی اور بعد میں کاغذ پر اس کی طباعت۔ مطبوعہ تصویر دراصل عدسہ کے ذریعہ منتقل ہونے والا عکس ہے، اور اس کی اجازت ہے خواہ وہ گھر پر رکھی جائے یا کہیں اور۔

یہ ہمارا طرز استدلال ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن وسنت کی روشنی میں کسی اور نتیجہ پر پہنچتا ہے تو براہ کرم ضرور مطلع کیجیے۔ ان تمام قارئین کو بھی، جو اس نقطۂ نظر کو قبول کرنے میں تامل کرتے ہیں، چاہیے کہ وہ دوسرے علماء سے رائے لیں۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ ماضی میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا وہ درست ہے تو وہ اپنے موقف پر قائم رہنے میں بالکل درست ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ان کی کوششوں کا اجر عطا کرے۔ اس اختلاف رائے کو مسئلہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ کسی ایک موقف کے حتمی ہونے پر اصرار کرنا اسلامی طرز فکر کے خلاف ہے۔

دینی مسائل پر ''عرب نیوز'' جدہ میں شائع ہونے والے
سوالات کے جوابات ایک سے زیادہ علماء سے حاصل کیے
جاتے ہیں۔ جناب عادل صلاحی ان کی ادارت کے
ذمہ دار ہیں۔

اسلامی شریعت کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ کسی خاص
صورت حال کے لیے جو قانون وضع کیا گیا ہو وہ قانون
اسی وقت لاگو ہوگا، جب وہ خاص صورت حال اور اسباب
موجود ہوں۔

عقائد

○ ایمان اور عقیدہ

○ قرآن مجید اور احادیث نبویؐ

عقائد

ایمان اور عقیدے میں فرق

سوال: یقین یا عقیدے اور ایمان ــــــ میں کیا فرق ہے۔ ان ... کے بارے میں ذہن بعض اوقات الجھن میں مبتلا ہوتا ہے۔ قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے ... کے مطابق ایمان ــــــ سادہ یقین ــــــ سے بالکل مختلف ہے۔ اگر ایک ... سے یہ کہے کہ وہ دو عمارتوں کے درمیان تنی ہوئی رسی پر چل سکتا ہے تو میں اس کی بات کا یقین کرلوں گا لیکن اگر وہ مجھ سے یہ مطالبہ کرے کہ میں اس کی پیٹھ پر سوار ہوں اور وہ معلق رسی پر چلے تو میں اس کی پیشکش قبول نہیں کروں گا، باوجود اس کے کہ میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ وہ رسی پر چل سکتا ہے۔ اگر میں اس کی پیشکش قبول کرلوں تو اس کا مطلب ہوگا کہ میں اس شخص کی بات پر ایمان رکھتا ہوں۔ ازراہ مہربانی قرآن کی روشنی میں ان دونوں کا فرق واضح کیجیے۔

جواب: اس سوال میں جو ... ہے، وہ ایمان اور یقین کا فرق خود ہی واضح کردیتی ہے۔ لوگوں کی بڑی اکثریت یہ کہ ... پر یقین رکھتے ہیں، ان کا یہ یقین انفعالی ہوگا۔ ان کے کسی عمل یا ان کی زندگی کے کسی ... ن کا اثر نظر نہیں آئے گا۔ وہ اللہ کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں اور اسے خالق کائنات مانتے ہیں۔ ان کے اس یقین میں اس اضافی قوت کی کمی ہے جو انہیں معلق تنی ہوئی رسی پر چلنے سے روکتی ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی تعریف یوں کی ہے کہ ''ایمان وہ ہے جو انسان کے دل میں راسخ ہو جائے اور اس کے عمل سے اس کی تصدیق ہو۔'' لہٰذا ایمان رکھنے والا

شخص وہ ہوا جو اللہ پر غیر متزلزل یقین رکھے۔ یہ یقین اس نے اللہ کی قدرت کے مشاہدے کے بعد ذہنی عمل سے گزر کر حاصل کیا ہو اور اس یقین کا پرتو اس کی عملی زندگی پر نظر آتا ہو۔ اس عملی اظہار کے بغیر اس کا یقین غیر انفعالی ہوگا اور وہ شخص ایمان کے اس درجے تک نہیں پہنچے گا جس کا اللہ مطالبہ کرتا ہے۔

سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع یا چار فقہی مکاتب میں سے ایک کی پیروی

سوال: ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے لیکن کیا مسلمانوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ چار فقہی مکاتب فکر میں سے کسی ایک کی پیروی کریں۔ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو ازراہ کرم اس مسئلہ پر روشنی ڈالیے کہ یہ کیونکر صحیح ہے کیونکہ یہ مکاتب فکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاصے عرصے بعد قائم ہوئے ہیں۔

جواب: اس سوال کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ چار مکاتب فکر میں سے کسی ایک کا اتباع کرنا قطعی ضروری نہیں ہے اور نہ ہی سب لوگ ایسا کرتے ہیں۔

اگر ایک شخص اسلام کا خاصا علم رکھتا ہے اور اسے یہ پتہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات کے متن اور احادیث سے شریعت کے احکام کا کس طرح استخراج کیا جاتا ہے تو وہ ہر درپیش مسئلے کا علیحدہ سے جائزہ لے سکتا ہے کہ اس خاص مسئلے کے بارے میں کس مکتب فکر کا موقف زیادہ مدلل اور زیادہ وزنی ہے، خواہ وہ موقف کسی بھی مکتب فکر کا ہو۔ لیکن اگر ایک شخص اسلام کی ناکافی معلومات رکھتا ہے تو ایسے شخص کو کسی خاص درپیش مسئلے کے بارے میں اس عالم کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرنا چاہیے جس کے سامنے اس نے اپنا مسئلہ پیش کیا ہے۔

مثال کے طور پر ''عرب نیوز'' کے قارئین کو لے لیجیے جو مختلف مسائل کے بارے میں سوالات بھیجتے ہیں اور جو جوابات انہیں دیے جاتے ہیں وہ انہیں یہ لحاظ کیے بغیر قبول کر لیتے ہیں کہ اس مسئلہ کے حل کے لیے کس مکتب فکر کے طریقے کو اختیار کیا گیا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ بعض قارئین اپنا سوال بھیجتے وقت یہ وضاحت کر دیتے ہیں کہ ان کا تعلق کسی خاص مکتب فکر سے ہے اور یہ درخواست کرتے ہیں کہ ان کے سوال کا جواب اسی خاص مکتب فکر کے مطابق دیا جائے۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے ایسے قارئین کے لیے گنجائش نکالی جاتی ہے۔ لیکن بعض اوقات میں انہیں ایسے علماء کی رائے پیش کرتا ہوں جو ان کے مخصوص

حالات میں، ان کے لیے آسان اور موزوں ترین ہوسکتی ہے۔ بعض اوقات کسی سنگین مسئلے پر میں انہیں ایسا مشورہ دیتا ہوں جو چاروں مکاتیب فکر سے اختلاف رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک نشست میں تین مرتبہ طلاق کا اعلان کرنے کے معاملے میں، میرا رجحان امام ابن تیمیہؒ کی رائے کی طرف ہے، جو چار معروف مکاتیب فکر کے بانیوں میں سے تو نہیں ہیں لیکن ان کا درجہ ان حضرات سے کم بھی نہیں ہے۔ ایک ہی نشست میں تین مرتبہ طلاق دینے کے اعلان کو امام ابن تیمیہؒ ایک طلاق تصور کرتے ہیں، جس کے بعد بغیر نکاح کے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ اس رائے پر عمل کرنے سے بہت سے ناخوشگوار حالات اور مسائل کو جس طرح دور رکھا جاسکتا ہے، آپ کو ان کا اندازہ ہوگا۔ اس رائے کے حق میں ایک مضبوط حدیث ہے اور علماء اس رائے سے زیادہ سے زیادہ اتفاق کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض مسلمان ملکوں کے عائلی قوانین میں اسے شامل کرلیا گیا ہے۔

اگر ایک عالم کسی خاص مکتب فکر کا عمیق مطالعہ کرتا ہے اور اس کے طریقے سے مطمئن ہوکر اسے اختیار کرتا ہے تو ایسا شخص اپنے فیصلے میں حق بجانب ہے۔

ہمیں جو بات یاد رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ مکاتیب فکر، انسانی زندگی کے مسائل کے حل کے لیے احکامات کا استخراج کرنے کے طریقے ہیں۔ ان تمام کی بنیاد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی زندگی اور اسلام کے ابتدائی دور کے علماء کی رائے ہے۔

نیک کاموں کے اجر کے لیے ایمان ضروری ہے

سوال: نیک کاموں کی اہمیت ہر کوئی تسلیم کرتا ہے۔ آپ نے بھی اپنے جوابات میں ان کی اہمیت واضح کی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ نیک کاموں کی بنیاد ایمان پر ہونی چاہیے ورنہ ان کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔

اس دنیا میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے۔ لوگوں کی بہت بڑی اکثریت اپنے والدین کا مذہب اختیار کرتی ہے۔ اس حقیقت کی جانب قرآن مجید میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دنیا کے تمام مذاہب نیکی کی تعلیم دیتے ہیں۔ کیا آخرت میں غیر مسلموں کی نجات کے لیے یہ تعلیمات کافی نہیں ہیں۔

جواب: تمام آسمانی مذاہب کا مشترکہ عقیدہ یہ ہے کہ کوئی بھی نیک کام اللہ کے نزدیک اسی وقت

قابل ثواب ہوگا جب اس کی بنیاد ایمان پر ہو۔ یہی نظریہ اسلام میں بھی ہے۔ اگر ہم اس نظریے کا احتیاط کے ساتھ جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس نظریے کے نتیجہ میں دو اہم خصوصیات یقینی ہو جاتی ہیں۔ اول یہ کہ کوئی بھی نیک کام ذاتی غرض سے بالا ہو کر پورے خلوص اور اس نیت کے ساتھ کیا جائے کہ اس کا ثواب اللہ تعالیٰ دیں گے۔ اس صورت میں منافقت اور ذاتی وقار کی گنجائش کا امکان نہیں رہتا۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ صرف اسی صورت میں نیک کام کرنا چاہیں جب انہیں اس کا بہتر بدلہ ملنے کی توقع ہو۔ خواہ یہ بدلہ مادی ہو یا اخلاقی۔ اور اگر انہیں یہ اندیشہ ہو کہ ان کی ''نیکی'' کا معاشرے میں کوئی نوٹس نہیں لے گا تو وہ اس نیک کام کو انجام دینے سے پہلے دو مرتبہ غور کریں گے۔ ایسی صورتحال میں ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ایمان وہ قوت ہے جو نیکی اور نیک کاموں کو انجام دینے کی صحیح محرک ہے۔

ایمان کی بنیاد کے ساتھ نیکی کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان ہر لمحہ نیک کام کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ اگر کسی شخص کو دو میں سے کسی ایک نیک کام کا انتخاب کرنا ہو تو وہ ایسا کام منتخب کرے گا جس کے بارے میں اسے توقع ہوگی کہ اس کا اجر زیادہ ملے گا۔ ممکن ہے کہ ان دو میں سے ایک کام ایسا ہو جس کو انجام دینے سے اسے فوری یا ذاتی فوائد بھی حاصل ہوتے ہوں ___ لیکن وہ اس کام کو پسند کرے گا جس کا اجر آخرت میں ملنے کی توقع ہوگی۔ ایک مزید فائدہ یہ ہے کہ ایمان، انسان کے عمل کو راسخ بنا دیتا ہے اور کرنے والا وہ کام یقین کے ساتھ کرتا ہے۔ جب ایک سے زیادہ افراد نیک کاموں میں مشغول ہوں تو وہ نہ صرف ایک دوسرے سے بہتر طور پر نیک کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ نیکی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون بھی کرتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں آدمی کی شخصیت میں نیکی کی جانب رغبت کا ایک خاص رجحان پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی شخصیت کی پہچان بنتا ہے۔ اس کی فکر ایک خاص سمت میں پرواز کرتی ہے جس کی وجہ سے ایک بہتر انسان کی تشکیل ہوتی ہے کیونکہ ایسا شخص ہر وقت اس فکر میں رہتا ہے کہ اس کی اور اس کے معاشرے کی فلاح کس میں ہے ___ اور پھر وہ ___ ایسے کام انجام دیتا ہے جو معاشرے کے لیے بہبود کا اور ترقی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

ایمان اور عمل کے درمیان ایک اور تعلق بھی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار پوچھا گیا کہ ایمان کی تعریف کیا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ یہ وہ عقیدہ ہے جو انسان کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے اور اس کے ہر کام کو یقین کی قوت فراہم کرتا ہے ___ اس تعریف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لیے صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ وہ فلاں خاص مذہب پر یقین رکھتا ہے یا کسی خاص عقیدے کا پیرو ہے۔ جب تک وہ اپنے عمل سے

اپنے قول کی تصدیق نہیں کرے گا اس قول کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ چنانچہ ایمان یہ نہیں ہے کہ دانشورانہ طور پر کسی خاص عقیدے کو قبول کرلیا جائے، اس کے لیے لازمی ہے کہ عملی نمونے سے اس عقیدے کا ثبوت مہیا کیا جائے۔ جب ایمان اور عمل (قول اور فعل) کے درمیان ہم آہنگی کا یہ رشتہ استوار ہوجاتا ہے تو اعمال حسنہ ایک اضافی قدر اختیار کرلیتے ہیں۔

آپ کی یہ بات درست ہے کہ انسانوں کی اکثریت وہی مذہب اختیار کرتی ہے جو ان کے والدین کا ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ہم سے اس (اندھی تقلید) سے زیادہ کچھ اور چاہتے ہیں۔ حشر کے دن ہم میں سے کسی کے لیے بھی اللہ کے سامنے صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہوگا کہ چونکہ ہمارے والدین نے ہماری تربیت اسلام پر کی، اس لیے ہم مسلمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسلام کو بطور مذہب اپنے شعوری فیصلے کے ساتھ اختیار کریں ــــــ یا نہ کریں۔ ہم میں سے ہر شخص کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب اس کے مخصوص ذاتی حالات میں ایک واضح انتخاب اس کے سامنے ہوتا ہے اور اسے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایمان لائے یا نہ لائے۔ ایک مرتبہ یہی تذکرہ ایک دوست کے سامنے ہورہا تھا جن کی تربیت ایسے والدین نے کی جو مذہب کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ میرے دوست نے کہا کہ انہیں تو اس سے بھی زیادہ کا تجربہ ہوا ہے۔ میرے سامنے صرف صحیح اور غلط میں سے کسی ایک کا انتخاب نہیں رکھا گیا بلکہ وہ نعمتیں اور فوائد بھی دکھا دیے گئے جو صحیح فیصلہ کرنے کی صورت میں مجھے حاصل ہوسکتے تھے۔ اس حیات آفریں لمحے میں جب انہوں نے پورے شعور کے ساتھ صحیح انتخاب کیا تو یہ بات ان کے سامنے واضح تھی کہ اگر انہوں نے اس لمحہ ایمان سے منہ موڑا تو حتمی طور پر ایک غلط فیصلہ ہوگا۔ میرے دوست نے کہا کہ میں زندگی بھر اللہ کے اس احسان کا شکر ادا نہیں کرسکتا جو اس نے صحیح فیصلہ کرنے کی قوت دے کر مجھ پر فرمایا ہے۔

جب ہم اس بات کو یاد رکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک کا حساب انفرادی طور پر لیں گے، تو ہمیں لازماً یہ احساس رہے گا کہ اللہ تعالیٰ کی عادل و منصف ذات ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کی (بندے کی) ذاتی پسند کے پیش نظر انصاف کرے گی۔ (یعنی دنیا میں انسان نے اپنے لیے جو عقیدہ پسند کیا اس کی بناء پر آخرت میں اس سے سوال جواب ہوں گے) اگر ایک شخص نے اسلام کو اس لیے اختیار کیا کہ اس کی تربیت کرنے والے مسلمان تھے ــــــ اور باشعور ہونے پر اس نے اس انتخاب کی توثیق نہیں کی ــــــ تو اسلام کے نزدیک ایسا شخص مذہب کو شعوری طور پر، اپنی پسند سے منتخب کرنے میں ناکام کہلائے گا۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اس معاملے میں اللہ کی عطا کردہ ان دو عظیم نعمتوں کو استعمال کرے جو اس نے ہر بندے کو

بخشی ہیں۔ یہ دو عظیم نعمتیں استدلال اور چیزوں اور معاملات کو پرکھنے کی صلاحیتیں ہیں۔ جب ہم ان صلاحیتوں کو استعمال کر کے کوئی فیصلہ کریں گے تو عام انسانوں سے خود کو بلند کر کے اس سطح پر پہنچ جائیں گے جہاں اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اب ہم اللہ تعالیٰ پر جو ایمان رکھیں گے وہ ایک دانشورانہ انتخاب کی بنیاد پر ہوگا۔

غیر مسلموں یا کافروں کے نیک کام کوئی حیثیت رکھتے ہیں یا نہیں؟

یہ سوال ایسا ہے جس کا ہم سے بہت زیادہ تعلق نہیں ہے۔ انسان کی حیثیت سے ہم دوسروں کے اعمال وافعال کو پرکھنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں ہمیں جو ہدایت دی ہے وہی ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک وہی اعمال قبول ہیں جو ایمان کے ساتھ کیے گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ روز محشر میں کیا کریں گے، یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے معاملات کو بہتر جانتے ہیں۔ تاہم ہمیں یہ یقین ہے کہ اس روز ہر ایک کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

''اور (تمہارے اعمال کی) کتاب (کھول کر) رکھی جائے گی تو تم گنہگاروں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں (لکھا) ہوگا اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے ہائے شامت! یہ کیسی کتاب ہے کہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے اور جو عمل کیے ہوں گے سب کو حاضر پائیں گے اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔''
(القرآن: پارہ: ۱۸ آیت ۴۹)

نذر اور نیت میں فرق

سوال: ہمارے ملک میں لوگ اللہ سے وعدہ کرتے ہیں کہ اگر ان کی فلاں خواہش پوری ہوگئی تو وہ کوئی نیک کام انجام دیں گے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ کیا اسلام میں اس طرح کے اعمال کی اجازت ہے۔ اگر اجازت ہے تو یہ فرمایئے کہ اس طرح کے وعدے کے بغیر اللہ سے کسی خواہش کی تکمیل کی دعا کرنے میں اور اس طرح کا وعدہ کرنے میں کیا فرق ہے؟

جواب: آپ نے جس نوعیت کے وعدے کا اپنے سوال میں حوالہ دیا ہے، اسلامی اصطلاح میں اسے ''نذر'' (منت) کہتے ہیں۔ ''نذر'' میں اور ''نیت'' میں فرق ہے۔ ''نیت'' کا مطلب ہے ارادہ کرنا جبکہ ''نذر'' کا مطلب ہے وعدہ کرنا۔ اس میں اللہ سے آپ وعدہ کرتے ہیں کہ اگر فلاں کام ہوگیا تو

ہیں اتنے دن روزے رکھوں گا یا غریبوں کو اتنی رقم خیرات کروں گا یا اتنے نوافل ادا کروں گا۔ ''نیت'' میں آپ اپنے طور پر یہ ارادہ کر لیتے ہیں کہ فلاں کام کروں گا، خواہ یہ ارادہ آپ کی کسی خواہش کی تکمیل سے منسلک ہو یا کوئی دوسری صورت ہو ___ اس کے استعمالات وسیع ہیں اور نیت کا اطلاق ہر بات اور ہر فعل پر ہوتا ہے۔ حدیث مبارکہ میں فرمایا گیا ہے ''عمل کا دارومدار نیت پر ہے'' اس کا مطلب ہے کہ ہم جو بھی کام کرتے ہیں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہماری نیت سے کیا جائے گا۔ اگر ایک شخص مسجد میں جا کر نماز باجماعت پابندی کے ساتھ اس نیت سے ادا کرتا ہے کہ اس کے پڑوسیوں پر اس کے بارے میں ایک خاص اثر ہو، اس کے مقابلے میں ایک دوسرا شخص نماز کم پابندی کے ساتھ ادا کرتا ہے لیکن اس نیت کے ساتھ پڑھتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی اطاعت کر رہا ہے تو ان دونوں افراد کے اعمال کے اجر میں، نیت کی بنیاد پر فرق ہوگا۔ ''نذر'' اور ''نیت'' میں ایک اور فرق بھی ہے۔ وعدہ (نذر) کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اسے پورا کرنا ہے۔ ''نذر'' اللہ سے بندے کا وعدہ ہوتا ہے اور اسے ہر صورت میں پورا کرنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص اللہ سے وعدہ کر کے اسے پورا نہیں کرے گا تو اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ آپ نے رضاکارانہ طور پر اللہ سے وعدہ کیا ہے اور اس وعدے کو مذاق نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لیے وعدے کی تکمیل بندے پر فرض ہو جاتی ہے۔

نیت کا معاملہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے طور پر ایک کام کا ارادہ کیا ہے۔ اگر آپ وہ کام نہیں کرتے تو آپ سے اس کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوگی۔ اگر آپ نے کسی نیکی کا ارادہ کیا ہے تو آپ کو اس کا ثواب ملے گا۔ اگر آپ وہ نیک کام نہیں کرتے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کے ثواب سے محروم رہے لیکن آپ نے کوئی گناہ نہیں کیا۔

لوگ ''نذر'' اس لیے مانتے ہیں کہ ان کے خیال میں، اس طرح ان کی خواہش کی تکمیل کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، یہ بات درست نہیں ہے۔ نذر کے طور پر روزہ رکھنے، نماز پڑھنے یا کوئی اور عبادت کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی خواہش کی تکمیل کے امکانات نزدیک آ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ہماری عبادات کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر ہم زیادہ عبادات کریں تو وہ ہماری خواہشیں پوری کرے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہم اللہ سے دعا کریں کہ وہ ہماری خواہشوں کو پورا کر دے بشرطیکہ یہ خواہشات کسی گناہ سے متعلق نہ ہوں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور وہ ہماری ہر خواہش کو پوری کرنے پر قادر ہے۔ اس کی جود و سخا بے حساب ہے، اگر ہم اس سے خلوص نیت اور عاجزی کے ساتھ التجا کریں تو وہ ہماری دعاؤں کا جواب دیتا ہے۔ جب ہماری دعائیں (خواہشیں) پوری ہو جائیں تو ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے جس کا

بہترین طریقہ نفلی عبادات ہیں۔ سجدہ شکر بجالانا، اللہ کی راہ میں خیرات کرنا، روزے رکھنا، یہ سب شکرانے کے طریقے ہیں۔

فرض، سنت اور واجب کی تعریف

سوال: ازراہ کرم یہ وضاحت فرمایے کہ مندرجہ ذیل امور انجام دینے یا ان کو نہ کرنے پر ایک مسلمان کو کتنا ثواب، یا کتنی سزا ملے گی۔ ان اصطلاحوں کے معنی پر بھی روشنی ڈالیے:

فرض، سنت، واجب، حرام، رکن، سنت موکدہ، سنت غیر موکدہ، نفل، مستحب، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی اور فاسد۔

جواب: ہر وہ کام ''گناہ'' ہے جس کے ارتکاب کی اللہ تعالیٰ نے ممانعت کی ہے۔ ''گناہ'' کا مرتکب سزا کا مستوجب ہوگا، الا یہ کہ وہ اپنے گناہ پر نادم ہو اور اس نے اللہ تعالیٰ سے صدق دل سے معافی مانگی ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا ہو، اس کے برخلاف، ایسے اعمال، جو فرض کر دیے گئے ہیں ان کی ادائیگی پر ثواب ملتا ہے۔ فرائض کے علاوہ بعض دوسرے اعمال ادا کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ بحیثیت انسان، ہم قطعی یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ کس خاص فعل کی انجام دہی پر کسی شخص کو کتنا ثواب ملے گا یا کسی ممنوعہ حرکت پر کیا سزا دی جائے گی۔ ہم تو بس یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں عمل ممنوع ہے، فلاں عمل کی ترغیب دی گئی ہے اور فلاں فلاں کام یا افعال، فرائض ہیں۔ آپ نے اپنے سوال میں جو مختلف اصطلاحات استعمال کی ہیں ان کی تعریف نیچے درج ہے:

فرض: فرض وہ اعمال یا عبادات ہیں جن کی ادائیگی اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر لازمی قرار دی ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ فرائض کی ادائیگی پر ثواب یا اجر ملتا ہے ان کو ادا نہ کرنے پر سزا دی جائے گی۔

واجب: واجب بھی فرض کی ایک شکل ہے لیکن ''فرض'' کے مقابلے میں اس کا درجہ قدرے کم ہے۔ مثلاً عشاء کی نماز کے بعد وتر کی ادائیگی بعض مسالک کے نزدیک واجب ہے۔ واجب کو ترک کرنا قابل ملامت ہے، تاہم اس کی عدم ادائیگی پر خاص طور پر کوئی سزا نہیں ہے۔

رکن: کسی فرض عبادت کا کوئی ایک حصہ رکن کہلاتا ہے اور اگر رکن ادا نہ کیا جائے تو پوری عبادت ساقط ہو جاتی ہے۔ مثلاً ۹ ذی الحجہ کو میدان عرفات کا قیام، حج کی عبادت کا ایک رکن ہے۔ اگر ایک

شخص حج کے باقی تمام اعمال ادا کرتا ہے لیکن نو ذی الحجہ کو غروب آفتاب سے قبل میدان عرفات نہیں پہنچ پاتا..... تو اس نے حج کا یہ رکن ادا نہیں کیا اور اس کی وجہ سے اس کا حج نہیں ہوگا۔

حرام: ہر وہ چیز یا فعل، جس کی اللہ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت کی ہے، حرام کہلاتی ہے۔ حرام کام کا مرتکب سزا کا مستوجب ہوگا جبکہ حرام امور سے اجتناب کرنے والا جزا کا حقدار ہوگا۔ گویا حرام "فرض" کا متضاد ہے۔

سنت: اللہ کے رسول محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کام خود انجام دیے ہیں اور جن کاموں کے کرنے کی ترغیب دی ہے، وہ سنت کہلاتے ہیں۔ فرض نماز کے علاوہ جو نمازیں ادا کی جاتی ہیں وہ سنت ہیں۔ بعض سنتیں ایسی ہیں جن کی ادائیگی پر زور دیا گیا ہے، انہیں "سنت موکدہ" کہتے ہیں۔ فرض نمازوں کے علاوہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض نمازیں باقاعدگی سے ادا کیں۔ ان نمازوں کو سنت موکدہ کہتے ہیں جبکہ بعض نمازیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے باقاعدگی سے ادا نہیں کیں ایسی نمازوں کو سنت غیر موکدہ کہا جاتا ہے۔

نفل: وہ عبادات جو رضا کارانہ طور پر ادا کی جائیں، نفل کہلاتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عبادات کی ترغیب دی ہے اور وقتاً فوقتاً آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہیں ادا بھی کیا ہے۔

مستحب: جن عبادات یا امور کی انجام دہی کی حوصلہ افزائی کی گئی ہو، انہیں مستحب کہا جاتا ہے۔ مثلاً نماز میں سنت اور نفل نمازیں مستحب ہیں۔ ان کی ادائیگی پر ثواب یا جزا ملے گی لیکن ادا نہ کیا جائے تو اس کے لیے کوئی سزا نہیں ہے۔

مکروہ: ہر وہ کام مکروہ ہے جو قابل ملامت قرار دیا گیا ہو، یا جس کی ادائیگی سے بالعموم کراہت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ مکروہات سے بچنے والوں کو ثواب یا جزا ملے گی۔ مکروہات ادا کرنے والے کے لیے کوئی سزا تو نہیں ہے لیکن ایسا شخص قابل ملامت ہوتا ہے۔

مکروہ تحریمی و مکروہ تنزیہی: مکروہات کے دو درجے ہیں۔ مکروہ تحریمی کا مطلب انتہا درجہ کا مکروہ ہے اور سخت قابل اعتراض ہے جبکہ مکروہ تنزیہی کا مطلب یہ ہے کہ ایک اچھے مسلمان کو اس سے بچنا چاہیے۔

فاسد: اگر کوئی چیز اسلام کے عائد کردہ اصولوں کو پورا نہ کرتی ہو تو وہ فاسد کہلائے گی (یعنی اس کی

کوئی حیثیت نہیں ہوگی) اگر یہ چیز لین دین کے کسی معاملے سے متعلق ہے تو وہ پورا معاملہ غیر مؤثر ہو جائے گا۔ کاروباری معاملات میں اسے ایک مثال سے یوں سمجھایا جا سکتا ہے کہ اگر لین دین کے کسی معاہدے کی طے شدہ شرائط میں سے ایک شرط اسلامی نقطۂ نگاہ سے فاسد ہے تو اس معاہدے پر عمل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر فاسد شرط کو تسلیم کر لیا گیا ہے تو اس کا مرتکب سزا کا مستوجب ہوگا۔ بعض معاملات میں پورا معاہدہ غیر مؤثر ہو جائے گا۔

دنیا میں سزا ملنے کے بعد آخرت میں سزا دی جائے گی

سوال: فرض کیجیے کہ ایک شخص نے ایک جرم کیا ہے جو اسلام میں بھی قابل سزا ہے، اس شخص کو اس معاشرے کی مروجہ عدالت میں پیش کیا گیا جو اسلامی شریعت اور قوانین پر عمل نہیں کرتی۔ عدالت نے مقدمہ کی سماعت کے بعد ملزم کو مجرم قرار دیا اور اپنے ضابطۂ قانون کے مطابق اسے سزا سنادی۔ سوال یہ ہے کہ ایسے شخص کی آخرت میں کیا حیثیت ہوگی۔ کیا اس دنیا میں ایک غیر مسلم عدالت نے اسے جو سزا سنائی وہ اس کے جرم کا کفارہ ہوگی یا اسے دنیا کے جرم کی آخرت میں دوبارہ سزا دی جائے گی؟ علاوہ ازیں اس معاشرے کے ان حکام کا کیا معاملہ ہوگا جنہوں نے اس شخص کو سزا دی ہے۔ کیا انہیں معاشرے کو تحفظ فراہم کرنے پر اجر ملے گا یا اسلامی شریعت پر عمل نہ کرنے کی سزا دی جائے گی؟

جواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جو تعلیم دی ہے اس کے مطابق جب کوئی شخص اپنے جرم کی سزا اسلامی قوانین کے مطابق پوری کر لیتا ہے، تو وہ معاشرہ کے خلاف اپنے جرم کا کفارہ ادا کر دیتا ہے، اور اس کے لیے صرف یہی سزا ہوگی۔ اگر کسی شخص نے دوسرے شخص کی کوئی چیز چوری کی ہے تو چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور اگر کوئی شراب پیئے گا تو اسے مقررہ اسلامی سزا دی جائے گی اور یہ سزائیں بھگتنے کے بعد آخرت میں ان لوگوں سے ان جرائم کے بارے میں دوبارہ سوال نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر ایک مسلمان شخص کسی یورپی ملک میں شراب پیتا ہے اور نشے کی حالت میں کار چلاتے ہوئے گرفتار ہو جاتا ہے تو اسے اس جرم کی جو زیادہ سے زیادہ سزا دی جائے گی وہ جرمانہ اور کم یا زیادہ مدت کے لیے گاڑی چلانے سے معطلی ہوگی۔ یہ سزا شراب نوشی کے اس جرم کی سزا سے قطعی مختلف ہے جو اسلامی قانون میں مقرر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شخص کو شراب پینے کی سزا نہیں دی گئی بلکہ اس بات کی سزا دی گئی کہ اس نے ایسی حالت میں گاڑی چلائی جس حالت میں گاڑی چلانے کی ممانعت ہے۔ اسی طرح چور کو قید کی سزا دی جائے گی، جو چوری کے جرم میں

اسلامی سزا (قطع ید) کے مقابلے میں بہت کم درجہ کی ہے۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام نے صرف چند جرائم کی سزائیں مقرر کی ہیں۔ ان جرائم میں چوری، زنا، قذف، قتل اور مسلح بغاوت وغیرہ شامل ہیں۔ بیشتر جرائم میں اسلامی قانون قاضی (مسلمان جج) کو یہ اختیار دیتا ہے کہ اس وقت کے حالات و واقعات کے پیش نظر جرم کی سنگینی کا اندازہ لگائے اور اس کے مطابق سزائیں تجویز کرے۔ ایک مسلمان معاشرے میں ایک مسلمان جج، اسلامی قانون کے مطابق کسی شخص کو سزا دیتا ہے اور مجرم پر اس سزا کا اطلاق ہو جاتا ہے تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس شخص نے اپنے جرم کا خمیازہ بھگت لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بھی یہی ہے کہ اگر مجرم کو خدائی قانون کے مطابق سزا دے دی جائے، تو وہ اپنا کفارہ ادا کر لیتا ہے۔ اگر اس دنیا کی زندگی میں کسی شخص کو اس کے جرم کی سزا نہیں ملی تو آخرت میں اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہیں تو اسے سزا دے سکتے ہیں اور چاہیں تو معاف کر سکتے ہیں۔ یہ بات ہر دو معاملوں کے لیے درست ہوگی۔ یعنی ایسے جرائم کے لیے بھی جن کی دنیا میں کوئی سزا نہیں دی گئی اور ایسے جرائم کے لیے بھی جن کی اس دنیا میں سزا تو دی گئی لیکن وہ اسلامی سزا کے مقابلے میں کم تھی۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ان گناہوں اور جرائم کو معاف کرتے ہیں جن سے اللہ کے حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اگر ہمارا کوئی جرم معاشرے کے کسی فرد یا پورے معاشرے کے خلاف ہوگا تو اس صورت میں جاں بخشی اس وقت ہوگی جب متعلقہ فرد یا افراد ہمیں معاف کر دیں، یا کسی اور صورت مطمئن ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ اس شخص سے، جس کا حق مارا گیا ہے، کہیں گے کہ وہ مجرم کو معاف کر دے، لیکن یہ اختیار اس شخص کا ہے کہ وہ معاف کرے یا نہ کرے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ چاہیں گے کہ خطا کار کو معاف کر دیا جائے تو وہ (اللہ تعالیٰ) اس بندے کی (جس کے خلاف جرم کیا گیا یا جس کا حق مارا گیا) کسی طریقے سے اور نہایت فراخدلی سے تلافی فرما دیں گے تاکہ وہ خطا کار شخص کو معاف کرنے پر رضا مند ہو جائے۔

مسلمان کو کافر کہنا

سوال: ایک شخص خود کو مسلمان ظاہر کرتا ہے اور وہ تمام فرائض و اعمال ادا کرتا ہے، جو مسلمان پر واجب ہیں، اگر ایسے شخص کو کافر کہا جائے تو یہ کہاں تک درست یا غلط ہوگا؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حکم دیا ہے ''اس شخص کو کافر نہ کہو جو تم پر سلامتی بھیجے'' (۹۴:۴) یہ ہدایت نہایت واضح ہے۔ اگر کوئی شخص واضح طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے یا جیسا کہ اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ کوئی شخص تمہیں ''السلام علیکم'' کہے تو ہمیں اسے مسلمان ہی سمجھنا چاہیے الا یہ کہ ہمیں اس کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص ''السلام علیکم'' کہنے کے علاوہ زبان سے اللہ کے وحدہ لاشریک ہونے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اللہ کا رسول تسلیم کرنے کا اعلان کرتا ہے، اسے کسی بھی طرح غیر مسلم قرار نہیں دیا جاسکتا، بجز اس کے کہ ہمارے پاس اس کے غیر مسلم ہونے کا واضح ثبوت موجود ہو۔

درحقیقت کسی مسلمان کو غیر مسلم یا کافر کہنا، اسلام میں گناہ کبیرہ ہے۔ اس بات کی سنگینی کا اندازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک سے کیا جاسکتا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا جو شخص کسی دوسرے کو کافر کہے وہ خود کافر ہوجاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کو کافر کہنے والا بذات خود حلقۂ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اسلام کے عقیدے کی بنیادی شرائط سے انکار کرنے والا مسلمان نہیں رہتا، مثلاً اگر کوئی شخص خود کو مسلمان کہتے ہوئے قیامت کے دن، یا فرشتوں کے وجود کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں رہ سکتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مسلمانوں کا عقیدہ

سوال: ازراہ کرم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت فرمائیں۔ خاص طور پر ان کی پیدائش اور وفات کے بارے میں۔ انہیں پھانسی دی گئی یا صلیب پر چڑھایا گیا یا وہ زندہ ہیں اور دوبارہ دنیا میں آئیں گے؟

جواب: عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم کے بطن سے پیدا ہوئے جو ان کی کنواری ماں تھیں اور جوزف سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے تھے یا یہ کہ وہ بذات خود خدا تھے، جو اپنی مرضی کے مطابق انسانی شکل میں حضرت مریم کے یہاں پیدا ہوئے۔ تیس سال کی عمر میں انہوں نے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانا شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد انہیں گرفتار کرلیا گیا اور صلیب پر چڑھادیا گیا۔ دفن کردیا گیا اور تین دن بعد زندہ کر کے انہیں اوپر اٹھالیا گیا۔ عیسائی جب عبادت کے دوران ''خداباپ'' کہتے ہیں تو وہ انہیں کو پکارتے ہیں وہ انہیں ''یسوع مسیح ہمارے خدا'' کے لقب سے بھی یاد کرتے ہیں ''باپ، بیٹا اور روح القدس''

عیسائیوں کا بنیادی عقیدہ ہے جسے عقیدہ تثلیث کہتے ہیں۔ اس میں بیٹے سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ یہ تینوں مل کر ہی خدا بنتے ہیں۔

عیسائیوں کے اس عقیدے کے برخلاف، مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت، اللہ کی قدرت کاملہ سے، حضرت مریم کے یہاں ہوئی۔ حضرت مریم کی نہ تو یوسف نامی کسی شخص سے شادی ہوئی تھی، نہ ہی کسی اور مرد سے۔ ان کے غیر شادی شدہ ہونے کی اہمیت یہ ہے کہ وہ کنواری تھیں۔ جب ان کے یہاں ولادت ہوئی تو لوگوں نے اس پر حیرت اور تعجب کا اظہار کیا۔ اس موقع پر نومولود نے لوگوں کو ان کی زبان میں نہایت واضح طور پر بتایا کہ ان کی ماں کنواری ہے۔ حضرت مریم کی معصومیت کی شہادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پہلا معجزہ کہا جاسکتا ہے۔ کسی مسلمان کو حضرت مریم کے کنواری ہونے میں اس لیے کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ جس اللہ نے آدم کو مٹی سے بغیر ماں اور باپ کے پیدا کیا وہ ایک انسان کو بغیر باپ کے بھی پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ ہمارے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے۔ انہوں نے اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچایا جو بائبل یا نیا عہد نامہ میں شامل ہے۔ ''نیا عہد نامہ'' اللہ کا وہ پیغام ہے جو وحی کی صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ''بائبل'' اب اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں ہے (موجودہ نسخہ ''بائبل کی ترمیم و تنسیخ شدہ شکل ہے جو مسلمانوں کے نزدیک اصل کے مطابق نہیں ہے) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقتول یا مصلوب ہونے کے بارے میں عیسائیوں کا جو عقیدہ ہے، قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ اسلامی نظریے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا تھا۔ سورہ ''مریم'' میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور سورۃ ''النسا'' میں ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے یہ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ قیامت سے پہلے دنیا میں واپس بھیجے جائیں گے اور تبلیغ کریں گے۔ مسلمان کی حیثیت سے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ نے جتنے بھی رسول اور نبی مبعوث کیے، سب نے بنیادی طور پر ایک ہی پیغام ـــــ یعنی اسلام کی تعلیم دی اور اللہ کی وحدانیت و اطاعت کا سبق سکھایا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اور قرآن مکمل اور آخری پیغام ہے۔ ہمارے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے نہیں تھے اس لیے کہ اللہ نے نہ کسی کو جنا ہے اور نہ ہی اس کو کسی نے جنا۔ اللہ ـــــ انسانی احتیاجات و خصوصیات سے ماورا ہے۔ اسے نہ بیوی کی ضرورت ہے نہ بیٹے کی۔ وہ خالق کائنات ہے۔ سب سے عظیم ترین ہستی ہے۔ ہر وہ چیز جو دنیا میں پیدا ہوئی ہے، اسے بالآخر ختم

ہونا ہے جب کہ رب العالمین دائمی، لافانی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ عیسائیت کے وہ تمام تصورات ونظریات جو موجودہ دور میں نظر آتے ہیں، اسلامی نظریے کے خلاف ہیں۔

تسبیح باری تعالیٰ

سوال: براہ کرم کوئی مختصر تسبیح تجویز کیجیے جسے ہر وقت دہرایا جاسکے۔

جواب: تسبیح کے معنی اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور اس کی کبریائی کا اقرار ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی کبریائی کی تسبیح کے جو طریقے بتائے ہیں ان میں سے کسی بھی طریقے کے مطابق یہ ذکر کیا جاسکتا ہے خواہ وہ کسی خاص وقت کے لیے ہو یا ہر وقت کے لیے۔

''سبحان اللہ'' ایک ایسا وظیفہ ہے جو ہر وقت پڑھا جاسکتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے درج ذیل تسبیح تجویز کی ہے جسے ہر وقت دہرایا جاسکتا ہے اور اسے جتنا زیادہ ممکن ہو، پڑھا جاسکتا ہے۔ وظیفہ یہ ہے: سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا

سوال: کیا دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھانا درست نہیں ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ ہماری تمام دعائیں سنتا ہے، خواہ وہ ہاتھ اٹھا کر مانگی جائیں یا بغیر ہاتھ اٹھائے۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے جو احادیث بیان کی ہیں ان کے مطابق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا کے وقت ہاتھ بلند فرماتے تھے۔

جنت میں حوروں کی موجودگی کس لیے؟

سوال: قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کہ جنت میں عورتیں (حوریں) ہوں گی۔ کیا میں سوال کرسکتی ہوں کہ یہ عورتیں وہاں کیوں ہوں گی۔

ہمارے ملک میں بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ ایک سچے مسلمان کو آخرت کی زندگی میں ــــ جنت میں ستر عورتیں ملیں گی۔ کیا یہ بات درست ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر یہ فرمایئے کہ مسلمان عورتوں کے لیے وہاں کیا ہے۔

ایک شادی شدہ خاتون ہونے کی حیثیت سے میں تو یہ بات تصور میں بھی پسند نہیں

کر سکتی کہ میرے شوہر ستر عورتوں میں گھرے ہوئے ہوں۔ انہیں تو صرف میرا ہونا چاہیے۔ کیا یہ ممکن ہے۔

اس قسم کے خیالات رکھنا کیا گناہ میں شمار ہوگا۔

میں عربی زبان نہیں جانتی لیکن نیکی کے ثواب اور اس کے اجر کے حوالے سے جب بھی کوئی بات بیان کی جاتی ہے تو وہ مردوں کے حوالے سے ہوتی ہے۔ عورتوں کے لیے نیکی کا اجر کیا ہے۔

بخاری شریف کے ایک ترجمے میں، میں نے پڑھا کہ عبادت کے معاملے میں عورت مرد کے مقام تک نہیں پہنچ سکتی۔ کیا یہ بات درست ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرد کو عورت کے مقابلے میں برتر حیثیت حاصل ہے۔

ازراہ کرم ان سوالات کے جوابات عنایت فرمائیں۔

جوابات: جب ہم اس زندگی کے بعد ___ آنے والی ابدی زندگی کی بات کرتے ہیں تو یہ حقیقت پیش رکھنا چاہیے کہ ہم خواہ کچھ بھی کر لیں، آنے والی زندگی کا صحیح تصور نہیں کر سکتے اور نہ ہی یہ بات ہمارے اختیار میں ہے کہ اس زندگی کا بالکل درست اندازہ لگا سکیں۔ قیامت کیسے آئے گی؟ اس سوال کا جواب بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔ روز حشر پر ہمارا کامل یقین تو ہے کہ یہ یقین ایمان کا جزو ہے، لیکن اس کے طریقۂ کار کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں ہے۔ بحیثیت مسلمان ہم نے اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو دین آخر اور دین کامل کے طور پر تسلیم کیا ہے کہ انسانوں کے لیے اللہ کا عطا کردہ مکمل دین یہی ہے۔ روز قیامت پر یقین رکھنا، اس دین پر ایمان لانے کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے ہم اس بات کو بلاکسی حیل و حجت کے تسلیم کرتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں داخل کی جانے والی خواتین کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ اپنی بہترین حالت میں ہوں گی۔ زندگی اور شباب سے بھرپور جیسی کہ وہ دنیا میں اپنی نوعمری کے دور میں نظر آتی ہوں گی۔ دنیا میں ساٹھ، ستر یا اس سے زیادہ عمر پانے والی خاتون کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دوبارہ نوعمر و نوخیز بن سکے۔ اس سوال کا جواب بھی ہمیں نہیں معلوم۔ لیکن اس بات پر ہمارا یقین ہے کیونکہ ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں وہ جیسا چاہیں کر سکتے ہیں۔

ہمیں وہ حدیث بھی ذہن میں رکھنی چاہیے جس میں بتایا گیا ہے کہ مومن جنت میں کس

طرح رہیں گے۔ اس حدیث مبارکہ کے مطابق جنت میں ایسی چیزیں ہیں جسے کسی آنکھ نے پہلے نہیں دیکھا اور انسانی ذہن جن کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو خوش بخت جنت میں داخل ہوں گے انہیں وہاں ایسی سہولتیں اور آرام میسر ہوگا جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں جنت کا کچھ حال بیان کیا گیا ہے کہ وہاں کیا کیا ہوگا، لیکن یہ تذکرہ دنیا کی زندگی اور اس میں موجود آسائشوں کے حوالے سے ہے۔ کسی مسلمان کو قرآن و حدیث میں بیان کردہ تصریحات کے بارے میں شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ خواہ یہ بیان قیامت اور اس کے بعد کی زندگی کے بارے میں ہو یا کسی اور مسئلے کے بارے میں۔

اگر اللہ تعالیٰ نے جنت میں موجود آسائشوں کا حقیقی تذکرہ فرمایا ہوتا تو ہمارے لیے اس کا سمجھنا بہت مشکل ہوتا، ـــــ کیونکہ ہمیں نہ ان چیزوں کا تجربہ ہے اور نہ مشاہدہ۔ بس ہمیں یہی سمجھنا چاہیے کہ جنت میں جو مسرت اور آسائشیں ہوں گی وہ اس دنیاوی زندگی کی خوشیوں اور عیش و آرام سے کہیں زیادہ اور منفرد ہوں گی۔

یہ بات درست ہے کہ قرآن مجید میں جنت کا جو بیان ہے اس کے مطابق وہاں نوجوان خوبصورت عورتیں (حوریں) موجود ہوں گی لیکن اس سے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ حوریں کسی بھی طور مومنوں کی بیویوں کا بدل ہوں گی۔ آپ کی یہ خواہش کہ بعد کی زندگی میں بھی آپ کو اپنے شوہر کا قرب میسر ہو، قابل فہم ہے اور اگر آپ دونوں ان لوگوں میں شامل رہے جن پر اللہ کا فضل و کرم ہوگا اور جو جنت میں داخل کیے جائیں گے ـــــ تو یقیناً آپ کی یہ خواہش پوری ہوگی۔ ایک مسلمان مرد یا عورت کے لیے یہ بات بالکل جائز ہے کہ وہ اس بات کی خواہش اور دعا کرے کہ جنت میں اسے اس دنیا کے شریک حیات کی رفاقت میسر ہو۔

یہ بات میں نے پہلی مرتبہ سنی ہے کہ جنت میں ایک مرد کو ستر عورتیں ملیں گی۔ عربی میں سات یا ستر کا عدد بعض اوقات کثرت ظاہر کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

یہاں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ جنت میں داخل ہونے والے اہل ایمان اور جنت کی خواتین (حوروں) کے درمیان تعلق واضح کردوں۔ اس دنیا میں شادی کا بنیادی مقصد انسان کی فطری خواہشات کی تکمیل اور نسل انسانی کا فروغ ہے۔ جنسی خواہش کی تکمیل کو اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کی بقاء کے لیے نشاط انگیز بنایا ہے۔ نسل انسانی کی بقاء اس دنیا کے تسلسل و ترقی کی بنیاد ہے، لیکن آخرت کے بعد کی زندگی میں یہ معاملہ نہیں ہے۔ جنت میں رہنے والے نہ بچوں کو جنم دیں گے اور نہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ قرآن مجید میں کسی ایک جگہ بھی اس کا ذکر نہیں ملتا۔

اس لیے آپ کو یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ جنت میں آپ کو اپنے شوہر کے لیے دوسری عورتوں سے مسابقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

قرآن مجید میں جہاں جہاں نیکی کے اجروثواب کا ذکر ہے، وہاں تذکیر کے صیغے کا استعمال عربی زبان کی ضرورت کی وجہ سے ہے۔ زبان کے مزاج کی وجہ سے یہ صورتحال دوسری زبانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ تاہم قرآن مجید میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ کسی خاص عمل کے بدلے میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یکساں اجر دیں گے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اجر اور ثواب کے ذکر میں جہاں مردوں کا بیان ہے، وہی اجر اس جیسا عمل کرنے والی خواتین کو بھی حاصل ہوگا۔ ایک حدیث مبارکہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ عورتیں مردوں کی بہنیں ہیں، اس حدیث کے مطابق عورت اور مرد دونوں برابر ہیں، سوائے جسموں میں طبعی فرق اور زندگی میں اپنے اپنے مخصوص کردار کے۔

آپ کے سوال کے آخری حصے میں، میں تھوڑی سی تصحیح کرنا چاہتا ہوں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کی کتاب ''صحیح بخاری'' خود نہیں لکھی۔ صحیح بخاری اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کا مجموعہ ہے، جنہیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس تحقیق کے بعد مرتب کیا ہے کہ یہ واقعی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں۔ ممکن ہے کہ سوال میں آپ نے جس بات کا تذکرہ کیا ہے وہ اس تشریح کے بارے میں ہو جو کسی حدیث کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کسی عالم نے کی ہو۔ تشریح یا تفسیر کسی انسان کا کام ہے جس میں غلطی کا امکان ہوسکتا ہے۔ میری رائے میں یہ بات درست نہیں ہے کہ عبادات میں عورت، مرد کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بعض خواتین کسی بھی معاملے میں مرد سے آگے بڑھ سکتی ہیں خواہ وہ معاملہ اللہ کی رضا کے حصول کا ہی کیوں نہ ہو۔

روح کا مقام کیا ہے

سوال: عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جسم میں روح کا مقام انسان کا دل ہے جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو اس کی روح دل سے نکل جاتی ہے۔ موجودہ دور میں سائنس کی ترقی کی وجہ سے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ایک انسان کا دل آپریشن کے ذریعے دوسرے انسان کے لگادیا جائے۔ اس صورت میں نئے دل میں روح کہاں سے آئے گی؟

جواب: یہ ایک عام تصور تو ہوسکتا ہے کہ روح انسان کے جسم میں رہتی ہے لیکن اس بارے میں

یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ یقین کے ساتھ اگر کوئی بات کہی جاسکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔ اگر کسی انسان کے دماغ میں گولی لگ جائے تو اس کی فوری موت واقع ہوجاتی ہے جبکہ یہ ممکن ہے کہ اس کا دل کچھ دیر بعد تک دھڑکتا رہا ہو۔ اس صورت میں کیا سمجھا جائے گا؟ روح کے بارے میں انسان ہمیشہ سے متجسس اور حیران رہا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مشرکین مکہ نے اپنا ایک وفد مدینہ بھیجا جس نے وہاں یہودی عالموں (ربیوں) سے ملاقات کی اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کے بارے میں ان کی رائے جاننا چاہی۔ ربیوں نے مشرکین مکہ سے کہا کہ اگر وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تین سوالات کے اطمینان بخش جواب دے دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ سچے نبی ہیں۔ ان تین سوالوں میں سے ایک سوال روح کی تعریف کے بارے میں تھا۔ مکہ واپس آ کر جب مشرکین نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ سے دعا کی کہ وہ ان سوالوں کے جوابات سے آگاہ فرمائے۔

روح کے بارے میں سوال کا جواب قرآن کریم کی سورہ اسراء آیت ۸۵ میں دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔
آپ کہہ دیجیے کہ روح اللہ کا حکم ہے، جو کچھ تم جانتے ہو وہ بہت تھوڑا ہے۔“

اس فرمان الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں یہ جاننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ روح کیا ہے، کہاں ہوتی ہے اور کس طرح کام کرتی ہے۔ قرآن میں واضح طور پر بتادیا گیا ہے کہ روح کے بارے میں تمام علم اللہ نے اپنے لیے رکھا ہے ہمیں اس کے بارے میں جاننے سے نہ صرف منع کیا گیا ہے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ کوئی انسان روح کے بارے میں نہیں بتا سکتا۔

متعدد علماء وفضلاء نے روح کے موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔ مسلمان کی حیثیت سے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جب ایک چیز کا علم صرف اللہ کو ہے تو کوئی بھی شخص اس بارے میں صحیح بات کہنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ صرف قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔

جادو اور ٹونا (وِچ کرافٹ) وغیرہ

سوال: کیا ایک مسلمان جادو ٹونے (وِچ کرافٹ) وغیرہ پر یقین رکھتا ہے۔ بعض جگہوں پر جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے اس پر سایہ ہوگیا ہے۔ مریض کو کسی ایسے شخص کے پاس لے جایا جاتا ہے جو عملیات کا ماہر ہونے کا دعوٰی کرتا ہے۔ عام جھاڑ پھونک کے ذریعہ اور کبھی

تعویذ گنڈوں کے ذریعے علاج کی کوشش کرتا ہے۔ ان تمام چیزوں کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟

جواب: قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس نے انسانوں اور جنوں کو پیدا کیا ہے۔ ہر ایک کی اپنی علیحدہ دنیا ہے۔ اللہ نے دونوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے ایمان اور عقیدے کا انتخاب کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ دونوں ہی کے لیے یہ بات بھی لازمی قرار دی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ قرآن کی آیات سے پتا چلتا ہے کہ انسانوں کے ساتھ جنوں پر بھی ان تمام عقائد کی پابندی ضروری ہے، جن پر ایک مسلمان یقین رکھتا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جنوں کی اکثریت اللہ پر ایمان نہیں رکھتی بالکل اسی طرح جس طرح دنیا میں انسانوں کی اکثریت کافروں پر مشتمل ہے۔ نہ جنوں کو انسان پر اختیار ہے اور نہ انسانوں کو یہ قوت دی گئی ہے کہ وہ عام حالات میں جنوں پر قابو پا سکیں۔

جادو ایک علم ہے اور انسان اسے سیکھ سکتا ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک جادوگر یا جادوئی عملیات کرنے والا، شعبدوں کے ذریعے اپنے ناظرین کو یہ باور کرا سکتا ہے کہ وہ غیر معمولی صلاحیتیں اور قوتیں رکھتا ہے اور جنوں کو قابو کر کے انہیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا ہے۔ ان جادوگروں کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ کسی شخص کو یا کسی مقام کو بد دعا دیدیں تو وہ انسان یا مقام خرابی اور نقصان کا شکار رہتا ہے اور کبھی پنپنے نہیں پاتا۔ اسلام جادو کے بارے میں ان تمام نظریات کو رد کرتا ہے۔ جادو کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعے کسی شخص کو محیر العقول قوتیں حاصل ہو جائیں اور وہ دوسرے انسانوں کی زندگی تباہ کرنے پر قادر ہو جائے۔ لہٰذا ایک مسلمان کو کسی بھی حالت میں جادو میں دلچسپی لینے یا جادوگروں سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں ہدایت فرمائی ہے۔ حدیث کا ترجمہ یہ ہے ''جادو سیکھنا منع ہے اور اس پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو رد کیا جا رہا ہے۔'' ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ کیا ہے کہ ''جو شخص کسی ساحر، یا جادوگر سے مدد لیتا ہے وہ اپنے عمل سے اللہ کے اس پیغام و ہدایت کی نفی کرتا ہے، جو وحی کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔'' اس سلسلہ میں اس سے زیادہ واضح ہدایت اور کیا ہو سکتی ہے! جادو پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے خود کو اسلام کی برادری سے خارج کر لیا۔ اسلام کے نقطہ نظر سے صرف جادوگر اور ساحر ہی دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہیں

بلکہ جو شخص ان پر یقین کرتے ہوئے ان کے عملیات خود کرے، یا ساحروں اور جادوگروں سے مدد طلب کرے، وہ بھی اپنا ایمان کھوٹا کرتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی ہے کہ اگر تمہارا کوئی عزیز بیمار ہو جائے تو اس کا طبی علاج کراؤ کہ اللہ نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے۔ ایک اور حدیث میں ارشاد کیا گیا ہے کہ بیماری میں طبی علاج کراؤ اللہ نے ہر مرض کا علاج رکھا ہے جو بعض کو نہیں معلوم۔ ان دونوں احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بدروحوں، اور جنات وغیرہ سے بیماری لاحق نہیں ہوتی۔

بیماری کی حالت میں ایک اور چیز جس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اللہ کا کلام ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ ''ہم نے قرآن اتارا جس میں یقینی علاج موجود ہے اور ایمان والوں کے لیے رحمت ہے۔'' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد اور قرآن کو بھی امراض کا علاج قرار دیا ہے۔ لیکن قرآن سے علاج کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی چند آیات کو لکھ کر گلے میں لٹکا لیا جائے اور کسی معجزہ کی توقع کی جائے۔ قرآن کی تلاوت اس کی ہدایات کو سمجھنا اور ان پر عمل کرنا امراض کا علاج ہے۔ قرآن کی تلاوت، ایک مسلمان کو زبردست روحانی قوت مہیا کرتی ہے کیونکہ اللہ کی کتاب اس کے ایمان کی بنیاد ہے۔ یہ ایمانی قوت امراض میں مدافعت کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اور مرض پر قابو پانے اور شفایاب ہونے میں مدد دیتی ہے۔

پامسٹری اور علم نجوم کی حیثیت

سوال: کیا مسلمانوں کو پامسٹری (ہاتھ کی لکیروں سے قسمت کا حال جاننے کا علم) پر یقین کرنا چاہیے۔ کیا علم نجوم کی اسلام میں اجازت دی گئی ہے؟

جواب: مستقبل کا حال صرف اللہ کو معلوم ہے۔ آئندہ ماہ یا آئندہ گھنٹہ میں کیا ہونے والا ہے۔ اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا۔ انسانی فطرت کا تجسس اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ آنے والے وقت اور واقعات کے بارے میں جان سکے۔ زمانہ قدیم سے انسانی معاشروں میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو مختلف طریقوں سے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ بعض افراد ستاروں کی چال کی مدد سے انسانی زندگی کے نامعلوم گوشوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک انسان کی پیدائش کے وقت ہونے والی ستاروں کی حرکات اس انسان کی زندگی پر اثر ڈالتی ہیں۔ کچھ لوگ ہتھیلی کی لکیروں کو پڑھ کر آنے والے واقعات کے بارے میں بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو چائے یا کافی کی پیالی سے ''پڑھ کر'' مستقبل بینی کا

یقین دلاتے ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جو ایک خاص قسم کی ریت پر لکیریں کھینچ کر انسانی مستقبل کے بارے میں بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق یہ تمام باتیں محض شعبدہ بازی ہیں۔ جس چیز کو اللہ نے مخفی رکھا ہے اسے کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ آنے والے واقعات کے بارے میں بالکل صحیح پیشگوئی کرسکتا ہے وہ کاذب ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی تمام باتوں کے بارے میں اپنا فیصلہ دیا ہے۔ حدیث مبارک ہے کہ ''نجومی جھوٹے ہوتے ہیں خواہ وہ سچ ہی کیوں نہ بتائیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک نجومی کی مستقبل کے بارے میں پیش گوئی سچ بھی ثابت ہو جائے تب بھی وہ جھوٹ ہی بولتا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کبھی یہ نہیں بتا سکتا کہ آنے والے لمحے میں کیا ہونے والا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اس کی کسی وقت کی بتائی ہوئی بات صحیح ہو جائے۔

مسلمان اللہ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سچ ہے اور جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے علم نجوم، دست شناسی اور مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرنے کے دوسرے طریقوں کو جھوٹ قرار دے دیا ہے تو مسلمان کی حیثیت سے انہیں جائز اور سچ نہیں سمجھا جاسکتا۔ ان علوم پر یقین کرنا اسلام کے بنیادی عقیدے اور تعلیمات کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کو ستاروں کی چال کا احوال نہیں پڑھنا چاہیے۔ بدقسمتی سے بیشتر اخبارات اور رسائل میں اس قسم کے کالم شائع ہوتے ہیں۔

یہ بات اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی کہ جن اخبارات و رسائل میں قسمت کے حال پر مبنی کالم شائع ہوتے ہیں خود ان جرائد کے مدیران ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے بلکہ جو لوگ ان کالموں کو تحریر کرتے ہیں خود ان کا بھی اس پر یقین نہیں ہوتا کیونکہ انہیں اس حقیقت کا علم ہے کہ یہ محض شعبدہ بازی ہے۔

کعبہ مشرفہ مرکز زمین؟

سوال : کیا یہ بات درست ہے کہ کعبہ مکرمہ زمین کے عین مرکز میں واقع ہے؟ اگر یہ درست ہے تو اسے کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ بات بھی درست ہے کہ عین خانہ کعبہ کے اوپر آسمان میں ایک اور کعبہ موجود ہے اور فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں؟

جواب: میں نہیں سمجھتا کہ دین میں اس بات کی کوئی اہمیت ہے کہ کعبہ مکرمہ زمین کے مرکز میں واقع ہے یا نہیں۔ دارالافتاء سعودی عرب کے رسالے ''اسلامک ریسرچ'' میں حسین کمال الدین کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ خانہ کعبہ ایک ایسے دائرے کا مرکز ہے جس کا محیط کرہ زمین پر واقع تمام براعظموں کو چھوتا ہوا گزرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے مختلف خطے خانہ کعبہ کے اطراف ایک خاص تناسب سے واقع ہیں اور بیت اللہ ــــ کرہ ارض کے صرف خشکی کے علاقوں کا مرکز ہے۔ یہ مضمون عربی میں تھا مجھے علم نہیں اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے یا نہیں۔

بعض شارحین نے قرآن کی ۵۲ ویں سورۃ کی چوتھی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جنت میں بھی ایک کعبہ ہے اور ملائکہ اللہ کی عبادت کرتے ہوئے اس کے گرد طواف کرتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں کہ ان کا یہ قیاس درست ہے یا نہیں۔ تاہم یہ بات ممکن ہے کہ فرشتوں کے طواف کے لیے ایک کعبہ بنایا گیا ہو۔ اسلام میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو اس امکان کی اجازت نہ دیتی ہو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ زمین پر موجود خانہ کعبہ کے متوازی ایک اور کعبہ کے وجود پر یقین رکھنے کا، ایمان کی بنیادی شرائط سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر مسلمان ہونے کے لیے اس بات پر یقین کرنا ضروری نہیں ہے۔

قرآن مجید اور حدیث نبویؐ

قرآن مجید آخری کتاب کیوں؟

سوال: قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اور اس کے ذریعہ دین مکمل کر دیا گیا ہے۔ میرے ایک غیر مسلم دوست نے سوال کیا ہے کہ یہ کتاب پہلی آسمانی کتاب کے طور پر کیوں نازل نہیں کی گئی۔ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ براہ کرم آپ وضاحت فرمایے۔

جواب: قرآن مجید سے پہلے کی آسمانی کتابوں پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ ان کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر صحیفے نازل ہوئے۔ یہ وہ کتابیں اور صحیفے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے مختلف پیغمبروں پر نازل کیے گئے اور قرآن مجید میں ان کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ بھی مختلف انبیاء کرام علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ کے احکامات نازل ہوئے لیکن قرآن مجید میں ان کا ذکر ''کتاب'' یا ''صحیفہ'' کے طور پر نہیں ہے۔

جب ہم اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں کا ذکر کرتے ہیں تو ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور ان کے نتیجے میں کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ تمام آسمانی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ذکر ہے۔ یہ کتابیں ان انبیاء کرام پر نازل کی گئیں جن میں سے ہر ایک کو کسی خاص امت کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے لیے بھیجا گیا تھا جبکہ دیگر انبیاء کرام، کسی ایک قوم کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان الٰہی تعلیمات میں مختلف ذریعوں سے خرابیاں داخل ہوگئیں۔

ایک اہم بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ پچھلی تمام آسمانی کتابوں میں سے کوئی بھی قرآن مجید کی طرح جامع نہیں ہے اور نہ ہی کسی اور کتاب میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے اس قدر وضاحت کے ساتھ قوانین مرتب کیے گئے ہیں۔ قرآن مجید میں ہر اس شخص کے لیے ہدایت موجود ہے جو اللہ کی بندگی، اس کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کر کے، اس کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو شخص ان میں سے کسی بھی آسمانی کتاب پر ایمان لایا اور ان کی اصل شکل میں ان ہدایات پر کسی بعد میں آنے والی کتاب سے پہلے تک عمل کیا تو وہ شخص جنت میں جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف توریت پر ایمان لانے والوں نے اگر اس کے مؤثر ہونے کے دوران میں توریت کی ہدایات پر عمل کیا تو انہیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ وہ آخرت میں فلاح پائیں گے۔ جب انجیل نازل ہوئی تو بنی اسرائیل کے لیے لازم تھا کہ وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی ہدایات پر عمل کریں۔ بنی نوع انسان کے لیے قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے۔ قرآن حکیم گزشتہ تمام آسمانی کتابوں کی تنسیخ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ضمانت دی ہے کہ یہ آخر وقت تک تحریف یا ردوبدل سے محفوظ رہے گا۔

نزول قرآن کے بعد پوری دنیا کے انسانوں کے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ وہ اپنی زندگی اس ضابطۂ حیات کے مطابق بسر کریں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم قرآن مجید سے پہلے نازل کی گئی کتابوں پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ ان کتابوں میں جہاں کہیں اختلاف پیدا ہوتا ہے وہاں ہم قرآن مجید پر عمل کرتے ہیں۔ قرآن مجید کسی خاص قوم یا امت کے لیے نازل نہیں کیا گیا بلکہ یہ تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اگر یہ دوسری آسمانی کتابوں سے پہلے نازل کیا جاتا تو پھر ان کتابوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر دور کی اقوام کے لیے پیغمبر بھیجے، انہیں اپنی رہنمائی سے سرفراز کیا۔ ہدایات و رہنمائی کا یہ سلسلہ قرآن مجید کی شکل میں مکمل کر دیا گیا اور یہ بالکل فطری ہے کہ اس جامع الکلام کو سب سے آخر میں نازل کیا گیا۔

مطلب سمجھے بغیر قرآن کی تلاوت

سوال: عربی زبان نہ جاننے کی وجہ سے قرآن کی تلاوت کے وقت میں صرف پانچ سے دس فیصد مطلب سمجھ پاتا ہوں۔ میں دو تین مہینے میں قرآن مجید مکمل پڑھ لیتا ہوں۔ تقریباً ہر روز دو گھنٹے گاڑی چلاتا ہوں اور گاڑی چلاتے وقت کیسٹ سے قرآن مجید کی تلاوت سنتا ہوں۔ آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میرے لیے عربی میں قرآن مجید کی تلاوت کرنا درست ہے یا میں، اپنی زبان میں اس کا ترجمہ پڑھوں؟

جواب: آپ نے اپنے سوال کے ساتھ دو متبادل پیش کیے جو درحقیقت ایک دوسرے کا متبادل نہیں ہیں۔ آپ کے لیے بہتر یہ ہے کہ آپ دونوں باتوں پر عمل کریں۔ عربی میں قرآن مجید کی تلاوت عبادت ہے۔ جب آپ عربی متن پڑھ رہے ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ وہ عبارت دہرا رہے ہوتے ہیں جو اللہ تبارک تعالیٰ نے خود بیان فرمائی ہے۔ یہی صورت اس وقت ہوتی ہے جب کوئی دوسرا قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہو اور آپ اسے توجہ سے سنیں۔ یہ تلاوت خواہ سامنے کی جا رہی ہو یا ریکارڈ شدہ ہو۔ جب آپ یکسوئی اور توجہ کے ساتھ یہ ذہن میں رکھتے ہوئے قرآن کی تلاوت سنتے ہیں یا خود تلاوت کرتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے تو یہ ایک عبادت ہے اور اس کا اجر ملے گا۔ لہٰذا ابتداء سے آخر تک آپ کا قرآن مجید کی تلاوت کرنا درست ہے۔

قرآن کی تلاوت کے ساتھ ساتھ ہر مسلمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس کے معنی سمجھے۔ اس مقصد کے لیے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا جاسکتا ہے۔ قرآن کی کسی مصدقہ تفسیر سے اسے بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ جب آپ اس طرح قرآن کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تو اس فعل کا اجر بھی ملے گا اور دوسری جانب آپ کو فہم قرآن بھی حاصل ہوگا۔ تاہم ترجمہ پڑھنا، اس طرح کی عبادت نہیں ہے جیسے عربی میں قرآن کی تلاوت کرنا۔ نماز کے دوران قرآن مجید کا عربی متن پڑھا جاتا ہے کیونکہ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہماری یہ عبادت مکمل ہوسکتی ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ کو قرآن مجید کی عربی میں تلاوت بھی جاری رکھنا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ اور تفسیر بھی پڑھنا چاہیے۔

قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق

سوال: قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کو کس طرح ضائع کیا جائے؟

جواب: کاغذ کے جن بوسیدہ اوراق پر قرآن مجید کی آیات لکھی ہوئی ہوں انہیں جس طرح بھی ضائع کیا جائے اس میں بے حرمتی کا کوئی پہلو نہیں ہونا چاہیے۔ اگر آپ ایسے اوراق کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں گے، جس کے کچرے کو بعد میں کسی کوڑے دان پر پھینک دیا جائے گا، جہاں ہر طرح کی غلاظت اور گندگی ڈالی جاتی ہے، تو یہ مقدس کلام کے بوسیدہ اوراق کو ضائع کرنے کا بدتر طریقہ ہوگا کیونکہ اس طرح بے ارادہ ہی سہی، قرآن مجید کی بے حرمتی ہوگی۔ شاید قرآن کے بوسیدہ اوراق کو تلف کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ انہیں جلادیا جائے۔ آج کل کے جدید مکانات اور اپارٹمنٹس میں شاید اس طریقے پر عمل کرنا ممکن نہیں ہو، کیونکہ اس سے گھر میں آگ لگنے کا اندیشہ

ہو سکتا ہے۔ جہاں یہ اندیشہ ہو وہاں یہ طریقہ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ایسی صورت میں ان بوسیدہ اوراق کو زمین میں دفن کرنا مناسب ہوگا۔ لیکن اس میں احتیاط برتی جائے کہ گڑھا خاصا گہرا کھودا جائے تاکہ ان اوراق کے دوبارہ باہر نکلنے کا امکان نہ رہے۔ اگر زمین میں دفن کرنے سے پہلے قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کو ___ تھیلے میں رکھ دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

بعض ممالک میں استعمال شدہ اور بوسیدہ کاغذوں کو علیحدہ سے جمع کر کے انہیں بازیافت کے طریقے (ری سائیکلنگ) سے دوبارہ قابل استعمال بنالیا جاتا ہے۔ یہ یقیناً اس قسم کے کاغذوں کو تلف کرنے کا بہتر طریقہ ہے۔

قرآن حکیم کی تلاوت کا دس گنا ثواب

سوال: ایک حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے کہ جو مسلمان قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے اسے ہر حرف پڑھنے پر دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا ثواب کی یہ نوید ایسے مسلمان کے لیے ہے جو قرآن مجید کے معنی جانتا ہے اور وہ جو کچھ پڑھ رہا ہوتا ہے، اس کے مفہوم سے واقف ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس شخص کے لیے کیا حکم ہے جو عربی زبان سے واقف تو نہیں ہے لیکن وہ قرآن مجید کو عربی میں پڑھتا ہے؟

جواب: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم بندے کے ہر نیک عمل کا ثواب کم سے کم دس گنا دیتے ہیں۔ قرآن حکیم کی تلاوت ایک نیک کام ہے اور اس کا ثواب بھی اسی دنیا میں ملتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کے ایک حرف کی تلاوت کرنے پر، دس حروف کے پڑھنے کا ثواب مل سکتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم اور جود وسخا سے اس سے زیادہ کی توقع کی جاسکتی ہے۔

تمام مسلمانوں کو اس بات کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ قرآن حکیم کو اس کے مفہوم ومعنی کے ساتھ پڑھیں تاہم جو شخص عربی زبان سے واقف نہیں ہے، اسے قرآن کی تلاوت کے ثواب سے محروم نہیں کیا گیا۔ عربی سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے اسے قرآن مجید کو پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسے پڑھتا ہے چنانچہ اسے بھی برابر کا ثواب دیا جائے گا۔

قرآن مجید کا ترجمہ غیر مسلم کو دیا جاسکتا ہے؟

سوال: مسلمان قرآن شریف کی تلاوت سے قبل وضو کرتے ہیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کیا یہ درست ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ کسی غیر مسلم کو پڑھنے کے لیے دیا جائے؟

جواب: قرآن مجید کا ترجمہ کسی غیر مسلم کو پڑھنے کے لیے دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جب وہ اس ترجمے کو یا اس کے کسی حصے کو پڑھے تو اس آفاقی پیغام کی سچائی اس کے دل میں گھر کر جائے اور وہ اس پر ایمان رکھنے والوں میں شامل ہو جائے۔ قرآن مجید کو ہاتھ لگانے سے پہلے وضو کرنا افضل ہے۔

وضو کے بغیر قرآن مجید کو ہاتھ لگانا

سوال: میرے ایک دوست کا اصرار ہے کہ بغیر وضو کیے قرآن شریف کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے ازراہ کرم بتایے کہ کیا یہ درست ہے؟

جواب: جیسا کہ اوپر کے سوال کے جواب میں عرض کیا ہے، یہ بات افضل ہے کہ قرآن مجید کو ہاتھ لگانے سے پہلے وضو کر لیا جائے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کی تلاوت کرنا عبادت ہے۔ اس لیے قرآن مجید کو تھامنے یا اس کی تلاوت سے قبل وضو کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ کے کلام کے ساتھ عزت و احترام کا مظاہرہ کر رہے ہیں، تاہم یہ بات کہ تلاوت قرآن یا قرآن کو ہاتھ لگانے

سے پہلے وضو کرنا فرض ہے، ایک مختلف مسئلہ ہے۔

بعض حضرات اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اسے صرف وہ لوگ ہاتھ لگا سکتے ہیں جنہیں پاک کیا گیا۔''

یہ حضرات اس آیت سے یہ دلیل اخذ کرتے ہیں کہ تلاوت قرآن سے پہلے وضو، فرض ہے۔ اگر ہم اس آیت کے مفہوم و معنی پر غور کریں تو یہ بات ظاہر ہوگی کہ قرآن کو ہاتھ لگانے کے لیے ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے۔ ''جنہیں پاک کیا گیا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے خود پاکیزگی حاصل نہیں کی بلکہ انہیں پاک کر دیا گیا۔ عربی عبارت میں یہ فرق زیادہ سہولت سے سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن کے بیشتر مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ اس آیت میں فرشتوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، جنہیں قرآن مجید کو چھونے کی اجازت دی گئی ہے۔ ان علماء کے نزدیک اس آیت میں کلام الٰہی پر مبنی کتاب کو چھونے یا ہاتھ لگانے کا ذکر نہیں ہے۔

اس کے برخلاف بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ قرآن شریف کو ہاتھ میں لینے کے لیے وضو ضروری ہے تاہم وہ وضو کو فرض نہیں سمجھتے۔ یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت سے قبل وضو کرنا افضل ہے۔

سجدہ تلاوت اور ترجمہ قرآن

سوال : قرآن مجید کی بعض آیات کے لیے یہ ہدایت ہے کہ جب انہیں پڑھا جائے تو سجدہ تلاوت ادا کیا جائے، خواہ وہ آیات نماز کے علاوہ تلاوت کی جارہی ہوں۔سوال یہ ہے کہ کیا ان آیات کا ترجمہ پڑھتے وقت بھی سجدہ کرنا لازمی ہوگا؟

جواب: قرآن مجید میں ۱۴ یا ۱۵ آیات ایسی ہیں جن پر سجدہ تلاوت لازم ہے۔ یہ سجدہ انسان کا اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عاجزی کا اظہار ہے۔ یہ آیات خواہ نماز کے دوران تلاوت کی جائیں یا نماز کے علاوہ، ان کو پڑھنے کے بعد، سجدہ ادا کرنا ضروری ہے۔اس موقع پر صرف ایک سجدہ ادا کرنا ہوتا ہے اور سجدہ سے اٹھ کر ہم اپنی عبادت معمول کے مطابق جاری رکھ سکتے ہیں۔ اگر نماز کے علاوہ تلاوت کے دوران سجدہ کی آیت آجائے تو ''اللہ اکبر'' کہہ کر سجدہ میں جانا چاہیے اور سجدہ سے اٹھ کر سلام پھیرنا چاہیے اور اس کے بعد تلاوت جاری رکھنی چاہیے یا ختم کر دینا چاہیے ــــــ جیسا بھی موقع ہو۔

اگر قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے وضو نہیں کیا گیا تھا اور تلاوت کے دوران سجدہ کی آیت آگئی ہے تو سجدہ ادا نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ سجدہ تلاوت نماز کا حصہ ہے اور نماز کے لیے وضو لازمی ہے۔ قرآن مجید کا ترجمہ پڑھتے وقت سجدہ تلاوت ادا کرنا ضروری نہیں ہے۔

کیا ایک غیر مسلم عربی کی تعلیم دے سکتا ہے؟

سوال : میرے وطن میں، علاقے کے ایک سرکاری اسکول میں بچوں کو عربی پڑھانے کے لیے ایک غیر مسلم خاتون ٹیچر کو مقرر کیا گیا ہے۔ یہ خاتون ٹیچر عربی میں گریجویشن کی سند رکھتی ہیں۔ اسکول میں جو مسلمان طلباء پڑھتے ہیں ان کے والدین اپنے بچوں کو غیر مسلم خاتون سے عربی پڑھوانے پر رضامند نہیں ہیں کیونکہ ان کی رائے میں عربی ــــــ قرآن مجید کی زبان ہے اور کسی غیر مسلم کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ مسلمان بچوں کو عربی کا درس دے۔ براہ کرم اس مسئلے پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیے۔

جواب: اس قسم کے واقعات جب بھی میرے علم میں آتے ہیں، میری اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ آج کل کے مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے زیادہ سے زیادہ واقف ہونا چاہیے۔ آپ نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس کے مطابق مسلمان والدین اپنے بچوں کو ایک غیر مسلم استاد سے عربی پڑھوانے پر

تیار نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان والدین نے یہ نظریہ کہاں سے اپنایا کہ کوئی غیر مسلم عربی نہیں پڑھا سکتا۔ یہ تصور نہایت غلط ہے اور کسی بھی منطقی بنیاد پر اس کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔ یہ والدین غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ عربی چونکہ قرآن مجید کی زبان ہے اس لیے یہ متبرک اور مقدس زبان ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اس بارے میں کسی چیز کے مقدس یا متبرک ہونے کا ذکر نہیں کرتا۔

ان والدین کا یہ خیال بھی ہوگا کہ عربی کا استاد بچوں کو قرآن مجید کی آیات بھی سکھائے گا اور ان کی رائے میں غیر مسلم استاد کو یہ اجازت نہیں کہ وہ قرآن مجید پڑھے۔ اس قسم کی سوچ رکھنے والے حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ غیر مسلموں سے خطاب کیا ہے تاکہ وہ اللہ کا کلام سنیں اس پر غور کریں، ممکن ہے کہ وہ اس پیغام کی حقانیت پر ایمان لے آئیں۔

اگر ہم غیر مسلموں پر قرآن مجید پڑھنے اور سننے پر پابندی لگا دیں تو یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں موافق نظریہ رکھیں گے۔ ان والدین کے اس رویے کے بارے میں کوئی شہادت بھی نہیں ملتی بلکہ حقیقتاً اس قسم کے خیالات کے خلاف شہادت پائی جاتی ہے۔ جنگ بدر کے بعد مسلمانوں کے پاس ۷۰ جنگی قیدی تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ دیا کہ ان قیدیوں کے رشتے دار معاوضہ ادا کر کے اپنے قیدی کو آزاد کرا سکتے ہیں۔ لیکن جو قیدی لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے ان کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ شرط رکھی کہ اگر وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں گے تو انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ یہ قیدی ــــ جو کفار قریش میں سے تھے ــــ مسلمان بچوں کو عربی ہی کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے اور ان بتوں کو اللہ کا شریک قرار دیتے تھے۔ بہ الفاظ دیگر یہ مشرک تھے لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عربی کی تعلیم و تدریس سے نہیں روکا بلکہ مسلمان بچوں کو ان کے ذریعہ تعلیم دلوائی۔ قیدیوں میں سے جس جس نے دس مسلمان بچوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھا دیا اسے آزاد کر دیا گیا۔

آپ اپنے علاقے میں مسلمان والدین کو یہ واقعہ بتا سکتے ہیں تاکہ وہ اپنے بچوں کو عربی کی تعلیم سے محض اس لیے محروم نہ رکھیں کہ پڑھانے والا استاد غیر مسلم ہے۔

علم حدیث کی بنیاد اور کمزور حدیث کا تعین

سوال: کیا کوئی حدیث ایسی بھی ہے جو احادیث کے دو مجموعوں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں شامل ہو اور اسے ''کمزور'' کہا گیا ہو۔

جواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے جب کوئی حدیث بیان کی جاتی ہے تو علماء دو باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس حدیث کا جائزہ لیتے ہیں، پہلی بات راویوں کا سلسلہ ہے اور دوسری حدیث کا متن یا عبارت ہے۔

حدیث جمع کرنے والے علماء مثلاً امام احمد بن حنبلؒ، امام بخاریؒ یا امام مسلمؒ نے جس وقت احادیث جمع کر کے مرتب کیں، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو خاصا عرصہ ہو چکا تھا اور یہ ضروری تھا کہ ہر حدیث چار یا چار سے زائد راویوں کے سلسلہ سے روایت ہو۔ روایت کے اس سلسلہ کو ''سند'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ احادیث کے کسی بھی مجموعے میں آپ ہر حدیث مبارکہ کی عبارت سے پہلے یہ دیکھیں گے کہ امام بخاریؒ یا امام مسلمؒ یا کسی اور عالم نے یہ بیان کیا ہے کہ ان سے یہ حدیث کس نے روایت کی اور اس راوی نے یہ حدیث کس سے سنی اور اس راوی سے یہ حدیث کس نے بیان کی۔ روایت کا یہ سلسلہ شخص در شخص کسی صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے گا اور ان صحابی نے بیان کیا ہوگا کہ ''میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ............'' اس کے آگے حدیث کا مضمون ہوگا۔

علماء نے کسی بھی حدیث کے قابل قبول ہونے کے لیے پانچ شرائط عائد کی ہیں۔ ان میں سے تین حدیث کی ''سند'' یا سلسلۂ روایت کے بارے میں ہیں اور دو حدیث کے متن یا عبارت کے بارے میں۔ یہ پانچ شرائط درج ذیل ہیں:

۱۔ حدیث کا راوی ذہین شخص ہو اور صحیح البیان ہو اور اس نے حدیث اسی طرح نقل کی ہو جس طرح اس نے سنی ہے۔

۲۔ راوی بلند اخلاق کا حامل ہو، متقی اور پرہیزگار ہو اور دین کا خاصا علم رکھتا ہو جس کی بنیاد پر وہ کسی بھی غلط بیانی کو رد کرنے کا اہل ہو۔

۳۔ درج بالا دونوں خصوصیات ایک حدیث کو بیان کرنے والے سلسلۂ روایت کے ہر راوی میں پائی جاتی ہوں۔ اگر راویوں کے سلسلے کا کوئی ایک راوی بھی ان دونوں یا دو میں سے کسی ایک شرط پر پورا نہ اترتا ہو تو اس حدیث کی حیثیت مصدقہ نہیں ہوگی۔

حدیث کو جانچنے کی پانچ شرائط میں سے دو شرائط حدیث کے متن یا عبارت کے بارے میں ہیں:

۱۔ حدیث کی عبارت مختلف نہ ہو۔

۲۔ متن میں کوئی ایسی خامی نہ ہو جو اس کی واقعیت کو متاثر کرے۔

حدیث کا متن مختلف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک معتبر راوی نے جو حدیث بیان کی

ہو، اس کے متن میں اور ایک زیادہ معتبر راوی کی بیان کردہ اسی حدیث کے متن میں فرق پایا جاتا ہو۔ اس صورت میں دونوں راویوں کے اعتبار، ذہانت اور درستگی میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا اور دونوں حدیثیں قابل قبول ہوں گی، لیکن جب ہم یہ دیکھیں گے کہ ایک راوی نے حدیث کی جو عبارت بیان کی ہے وہ ایک دوسرے، اور زیادہ قابل اعتبار راوی کی بیان کردہ عبارت کی تردید کرتی ہے، تب یہ معاملہ مختلف محسوس ہوگا۔

دوسری جانب کسی خاص حدیث میں بعض ایسی خامیاں ہوتی ہیں جو اس کی حیثیت کو کم کر دیتی ہیں۔ اس قسم کی حدیث کی واضح مثال یہ ہے کہ حدیث کا متن قرآن مجید کے کسی بیان کی تردید کرتا ہو۔

یہ پانچ شرائط، ایک ایسا نظام مرتب کرتی ہیں جس کی بنیاد پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کسی حدیث کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دنیا میں کوئی اور شخص ایسا نہیں ہے جس کی بیان کردہ باتوں کی روایت کی درستگی اور صداقت جانچنے کے لیے ایسا کوئی نظام وضع کیا گیا ہو۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلمان علماء نے نہ صرف یہ نظام وضع کیا بلکہ اس کے مطابق عمل بھی کیا۔

علم حدیث کے سرکردہ علماء جیسے امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، ترمذیؒ، النسائیؒ اور دوسرے حضرات کسی حدیث کی مصدقہ حیثیت جانچنے کے لیے حدیث کی روایت یا سند یا راویوں کے سلسلے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ہر راوی کا بغور جائزہ لیتے ہیں۔ یہ علماء ہر راوی کو اپنے وضع کردہ پیمانے پر پرکھنے کے بعد اس کی حیثیت کا تعین کرتے ہیں۔ اگر انہیں کسی راوی کے بارے میں یہ علم ہو جائے کہ اس نے کسی وقت جھوٹ بولا تھا، تو اس راوی سے بیان کردہ حدیث کو اس وقت تک قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا جب تک کسی اور معتبر راوی نے اس حدیث کے بیان میں شرکت نہ کی ہو، یا راویوں کے کسی اور سلسلے سے وہی حدیث بیان نہ کی گئی ہو۔ اگر ان علماء کو یہ معلوم ہو کہ کسی عالم کی روایت بہت زیادہ درست نہیں رہی ہے تو اس راوی کے لیے بلحاظ عمر ایک حد مقرر کر لی جاتی ہے اور صرف اس عمر تک پہنچنے سے پہلے کی بیان کردہ احادیث معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ اس عمر کے بعد ان سے جو حدیثیں روایت ہوں، وہ مسترد کر دی جاتی ہیں۔

یہ نظام نہایت جامع ہے اور اس میں راویوں کے سلسلہ کے معتبر ہونے کا نہایت تفصیل سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب علماء کسی خاص حدیث کے متن کے بارے میں یہ تعین کر لیتے ہیں کہ یہ متن ایسے راویوں سے مروی ہے جو معتبر بھی ہیں اور ان کی بیان کی درستگی بھی کسی شک سے بالاتر ہے، تو اس حدیث کو مصدقہ حدیث قرار دے دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں علم

حدیث کے ہر بڑے عالم جیسے امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، الترمذی، ابن ماجہ اور دیگر علماء نے حدیث کے راویوں کے بارے میں ان شرائط پر عمل کیا، جو ہر ایک نے متعین کی تھیں۔ بعض علماء دوسرے علماء کے مقابلے میں اس معاملے میں زیادہ سخت تھے۔ چنانچہ کوئی حدیث جو کسی عالم مثلاً الترمذی نے ''صحیح'' قرار دی، اسے امام بخاری نے ''حسن'' قرار دیا۔ یہ دو اصطلاحیں یعنی ''صحیح'' اور ''حسن'' حدیث کی مصدقہ حیثیت کے درجے کو متعین کرتی ہیں۔ ''صحیح'' کے معنی ہیں ''نہایت مصدقہ۔'' امام بخاری نے حدیث کے راویوں کے معتبر ہونے کے بارے میں جو معیار قائم کیا تھا وہ نہایت کڑا تھا۔ لہٰذا جب وہ کسی حدیث کو ''مصدقہ'' قرار دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حدیث بلا شک و شبہ، راویوں کے ایسے سلسلے سے مروی ہے جن میں سے ہر ایک راوی نہایت معتبر ہے۔ ان پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حدیث کے دونوں مجموعوں، یعنی ''صحیح بخاری'' اور ''صحیح مسلم'' میں کوئی کمزور حدیث شامل نہیں ہے۔

یہ علماء کا کام ہے کہ وہ کسی حدیث کے متن کو دیکھ کر یہ فیصلہ کریں کہ اس کا متن ناقص یا عجب ہے۔ یہاں یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ یہ کام صرف ایسے افراد کرسکتے ہیں جو قرآن کا گہرا علم رکھتے ہوں اور ساتھ ہی دیگر اسلامی علوم سے بخوبی واقف ہوں، کیونکہ صرف ایسے علماء ہی کسی حدیث کے متن کی جانچ کرسکتے ہیں یا اس کی عبارت کا موازنہ اس موضوع پر کسی دوسری حدیث سے کرسکتے ہیں۔ علم حدیث اور علم فقہ کے علماء اس معاملے میں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور یہ دونوں علوم مل کر تحقیق کے شعبہ میں ایک ایسا معیار قائم کرتے ہیں جس کا ثانی پوری دنیا میں نہیں ہے۔

یہ ممکن ہے کہ کوئی حدیث اپنے راویوں کے سلسلہ کی حد تک مصدقہ ہو لیکن اس کا متن یا تو ناقص ہو یا اس موضوع پر دیگر احادیث سے بالکل مختلف ہو۔ بعض احادیث جو بخاری یا مسلم میں بھی شامل ہیں، اس نوعیت کی ہوسکتی ہیں۔ ایسے معاملے میں روایت کی حد تک یہ مصدقہ سمجھی جائیں گی لیکن متن کے پیش نظر فقہ کا کوئی عالم ایسی حدیث کو علیحدہ کرسکتا ہے۔ میں ایک مثال کے ذریعہ واضح کرتا ہوں کہ ایسا کیوں کر ہوتا ہے:

یہ حدیث مصدقہ طور پر بیان کی گئی ہے کہ جنگ بدر کے نتیجہ میں جب مسلمانوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قریش کی جارح فوج کے جو لوگ جنگ میں مارے گئے ہیں انہیں ایک ہی بڑی قبر میں دفن کیا جائے۔

جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم کی تعمیل کی جاچکی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کفار کی قبر کے نزدیک کھڑے ہوکر انہیں نام کے ساتھ مخاطب کیا اور سوال کیا کہ ــــ کیا

وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ اللہ کا وعدہ سچا ثابت ہوا۔ اس موقع پر موجود صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان لوگوں سے کس طرح گفتگو کر سکتے ہیں جو ہلاک ہو چکے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کا جو جواب دیا وہ ایک سے زائد صحابہ سے روایت ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ ___ تم میری بات ان سے بہتر نہیں سن سکتے البتہ وہ مجھے جواب نہیں دے سکتے۔

جب یہ واقعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا گیا تو حضرت عائشہ نے اسے قطعی مسترد کر دیا۔ حضرت عائشہ کی دلیل یہ تھی کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے تم مردوں کو نہیں سنا سکتے۔

حضرت عائشہ نے یہ دیکھا کہ ان کے سامنے جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے وہ قرآن مجید کے بیان کے خلاف ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے مسترد کر دیا۔ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر قریش کے ہلاک شدہ لوگوں کے حوالے سے اپنے صحابہ سے خطاب کیا تھا۔

اس واقعہ سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک حدیث، جو راویوں کے ایک مصدقہ سلسلے سے مروی ہو، حضرت عائشہ یا کسی اور عالم کے نزدیک مسترد ہو سکتی ہے کیونکہ اس کی عبارت میں نقص ہے کہ قرآن مجید کے واضح بیان کے خلاف ہے۔ مذکورہ بالا واقعہ کے حوالے سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ امام بخاریؒ نے یہ حدیث بیان کی ہے اور ساتھ ہی حضرت عائشہ کا اعتراض بھی درج کر دیا ہے تاکہ پڑھنے والا محتاط ہو جائے۔

مجھے امید ہے کہ میرے اس جواب سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ جن احادیث کو ''صحیحہ'' کہا جاتا ہے وہ کس قدر معتبر ہیں اور اس معاملے ___ یعنی علم حدیث میں مسلمان علماء کس قدر احتیاط سے کام لیتے رہے ہیں۔

صحاح ستہ

چھ کتب احادیث ایسی ہیں جنہیں مسلمانوں کی اکثریت سب سے زیادہ قابل اعتماد سمجھتی ہے اور انہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔

۱۔ ''صحیح بخاری'' ۲۔ ''صحیح مسلم'' ۳۔ ''سنن ابن ماجہ'' ۴۔ ''سنن ابی داؤد'' ۵۔ ''سنن ترمذی'' ۶۔ ''سنن نسائی''۔

● امام مالکؒ جب کوئی حدیث بیان فرماتے تو اس خوف سے کپکپانے لگتے کہ کہیں غلط نہ ہو

اور قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرمندہ ہونا پڑے۔ انہوں نے جب موطا لکھی تو اس میں چار ہزار حدیثیں تھیں۔ پھر زیادہ تحقیق کرنے لگے تو یہ تعداد کم ہوگئی یہاں تک کہ ہزار کے قریب حدیثیں رہ گئیں۔

- امام بخاریؒ نے احادیث کو مرتب کیا تو چھ لاکھ میں سے ۷۲۹۰ حدیثیں منتخب کیں گویا ۱۵۰ میں صرف ایک قابل قبول قرار پائی جن احادیث کی تکرار ہوئی ہے اگر انہیں خارج کر دیں تو بخاری شریف میں صرف ۲۷۶۱ حدیثیں ہیں۔
- امام مسلمؒ نے تین لاکھ میں سے صرف ۴۳۴۸ کو قبول فرمایا اور امام بخاریؒ کی طرح ۱۵۰ میں سے صرف ایک کو قبول کیا۔
- ابوداؤدؒ نے پانچ لاکھ میں سے ۴۸۰۰ اور امام نسائیؒ نے دو لاکھ میں سے ۴۳۲۱ کو قابل قبول سمجھا۔

قرآن مجید کی تفہیم کا طریقہ

سوال: میں نے ریڈیو پر ایک عالم کی تقریر سنی جس میں انہوں نے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح بیان کی:

> ''اور ہاں جو برے کام کرے اور اس کے گناہ اس کو گھیر لیں تو ایسے
> لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں وہ ہمیشہ اس میں (جلتے) رہیں گے۔''
> (سورۃ البقرہ آیت ۸۱)

عالم دین نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی برائی کو تواتر کے ساتھ کرتا رہے تو اس کے نیک اعمال بھی ضائع ہوجاتے ہیں اور ایسے شخص کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ کافروں کی طرح ہمیشہ آگ میں جلتا رہے گا۔ مولانا صاحب کا کہنا تھا کہ اس شخص کا نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسے نیک اعمال اور عبادات بھی اللہ کے نزدیک قبول نہیں ہوں گے۔ اگر وہ کسی گناہ کو باقاعدگی کے ساتھ مسلسل کرتا رہے تو اس کے لیے نجات کا صرف ایک راستہ ہے کہ وہ اس گناہ سے باز آئے اور اللہ سے معافی مانگے۔ براہ کرم اس تشریح پر آپ روشنی ڈالیے۔

جواب: آپ نے قرآن مجید کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے وہ درست ہے لیکن میں اس کے معنی مختلف انداز میں بیان کرتا ہوں:

''یقیناً جس نے گناہ کیا اور اپنے گناہ میں گھر گیا____ ، وہ ایسے لوگ ہیں جو آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔''

یہودی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ اللہ اور اس کے کلام پر ایمان نہ لانے کے باوجود وہ دوزخ کا عذاب صرف تھوڑے دن جھیلیں گے۔ قرآن مجید کی اس آیت میں یہودیوں کے اس دعویٰ کا جواب دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس آیت میں جو بات بیان کی گئی ہے اس کا اطلاق صرف ان یہودیوں پر ہی نہیں ہوتا جنہوں نے وہ دعویٰ کیا تھا، بلکہ ہر ایک پر ہوتا ہے۔ اپنی اہمیت کے لحاظ سے یہ آیت سب کے لیے یکساں ہے۔ لیکن اس کے صحیح معنی و مفہوم سمجھنے کے لیے ہمیں اس آیت کا مطالعہ اس کے سیاق و سباق کے ساتھ کرنا ہوگا۔ یہودی، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہر قسم کے جھوٹے دعوے کرتے تھے اور ان دعووں کی وجہ سے خود کو ایمان کے دائرے سے خارج کرتے تھے۔ انہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی کوشش کی اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کی، حالانکہ انہیں علم تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کی مذہبی کتاب توریت کے مطابق یہودیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور کفار کے خلاف آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حمایت کریں لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں حیی ابن اخطب کی مثال دی جا سکتی ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک معروف یہودی عالم تھا۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہ یہودی اپنے بھائی کے ساتھ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملنے گیا تاکہ یہ اندازہ لگا سکے کہ جس آخری رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آنے کی بشارت دی گئی ہے یہ وہی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں یا نہیں۔ ان دونوں نے پورا ایک دن اپنی اس مہم میں گزارا اور پھر گھر واپس آئے۔ حیی نے اپنے بھائی سے کہا کہ یہ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کی بشارت توریت میں دی گئی ہے۔ اس کے بھائی نے پوچھا کہ اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔ حیی نے جواب دیا ''میں اپنی پوری زندگی ان کے خلاف لڑوں گا۔''

یہ ایسے یہودی تھے جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ اللہ کے محبوب فرزند ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں ان کے گناہوں کی سزا نہیں دے گا۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت میں ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے گناہوں میں گھر چکے ہیں وہ یقیناً ہمیشہ کے لیے دوزخ کی آگ میں جلتے رہیں گے۔

قرآن مجید کی اس آیت میں مخصوص نوعیت کے گناہوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ایسے گناہ جو

اپنی نوعیت کے لحاظ سے سنگین ہوں، کثیر مقدار میں ہوں اور گناہ کرنے والے کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہوں۔ سوال یہ ہے کہ مسلم علماء اس آیت کی تشریح کرتے وقت کس قسم کے گناہوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تشریح میں جن گناہوں کا ذکر کیا ہے ان میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے کا گناہ شامل ہے۔ شرک ___ یعنی اللہ کے ساتھ کسی کو شامل کرنا، بدترین نوعیت کا گناہ ہے جو کسی انسان سے سرزد ہوسکتا ہے۔ بیشتر علماء اور قرآن مجید کے شارح اس بات پر متفق ہیں کہ سورہ بقرہ کی اس آیت میں ''برے اعمال'' کا مطلب بدترین گناہ ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ اور کوئی گناہ اپنے مرتکب کو اسی وقت گھیر سکتا ہے جب وہ مستقل اور بغیر کسی احساس ندامت کے کیا جاتا رہے اور گناہ کرنے والے کو اسی حالت میں موت آجائے۔ صرف اس نوعیت کے معاملے میں کسی گناہ کا اتنا سنگین نتیجہ ظاہر ہوسکتا ہے۔

عالم دین کو اپنی گفتگو میں یہ تمام صورتحال واضح کرنا چاہیے تھی تاکہ سننے والے اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہتے کہ کوئی بھی گناہ انہیں جہنم کی آگ میں دھکیل سکتا ہے۔ فرض کریں کہ یہی حقیقت ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی عفو درگزر اور معاف کرنے کی اس صفت کا کیا جواز رہ جاتا ہے جس کا قرآن مجید میں بار بار ذکر کیا گیا ہے اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو بھی چاہے وہ اللہ کی ان صفات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو انسان کے تمام گناہ معاف کرسکتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ''میری رحمت ہر شے پر محیط ہے۔''

صرف ایک گناہ ایسا ہے جسے اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے اور وہ ہے ''شرک''۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے کا مطلب اللہ کی وحدانیت سے قطعی انکار کرنا اور اس پر ایمان نہ رکھنا ہے۔ اس گناہ کے سوا بندے کے تمام گناہ معاف کیے جاسکتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:

> ''اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا (اور گناہ) جس کو وہ چاہے بخش دے گا۔ (سورۃ النساء۔ آیت ۱۱۶)

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے کبیرہ گناہ بھی معاف کردیں گے، اگر بندہ توبہ کرے اور اللہ سے رجوع کرے اور آئندہ اس برائی سے بچا رہے۔

میرے نزدیک ان لوگوں کا رویہ پسندیدہ نہیں ہے جو گناہوں کے معاملے میں سزا پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمیں گناہوں سے بچنا چاہیے اور برے اعمال سے دور رہنا چاہیے۔ ہم جو بھی برائی کرتے ہیں وہ ہمارے خلاف درج ہوجاتی ہے اور سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کردے، ہمیں اس برائی اور گناہ کی سزا ملے گی۔

آخرت کے دن ہمارے گناہ اور ہماری نیکیاں میزان میں رکھی جائیں گی۔ اگر نیک اعمال زیادہ ہوئے تو گناہوں سے چھٹکارا مل جائے گا اور خدانخواستہ معاملہ اس کے برعکس ہوا تو ہمیں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا ہوگی، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے کام لیتے ہوئے ہماری مغفرت فرمادیں۔ جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ گناہوں کے لیے اللہ کی طرف سے سزا اور نیکیوں کے عوض اس کی خوشنودی اور انعام کی وعید اور نوید میں توازن پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خوشیوں اور انعامات کو حاصل کرنے کا جذبہ اور سزا کا خوف انسان کی فطرت کے بنیادی عناصر ہیں۔ اس لیے کسی ایک جزو کو دوسرے پر فوقیت دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان دونوں میں عدم توازن کی وجہ سے لوگوں میں ان کا اثر ختم ہو جائے گا اور بجائے مثبت نتائج کے، اس کے منفی اثرات ظاہر ہوں گے۔

جب لوگ کثرت سے یہ بات سنیں گے کہ اگر انہوں نے فلاں کام کیا تو اس کی سزا ملے گی اور فلاں کام کرنے سے وہ عذاب میں ڈال دیے جائیں گے تو ان میں یہ احساس پیدا ہونے لگے گا کہ ماضی میں ہم جو کچھ کرتے آئے ہیں اس کی بنا پر ہمیں سزا تو ملنی ہی ہے خواہ ہم اب آئندہ اچھے کام ہی کیوں نہ کریں، تو ان میں اچھائیوں کی رغبت پیدا نہیں ہوگی اور وہ شیطان کے بہکاوے میں مایوسی کا شکار ہو جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے گناہ کے راستے پر چل نکلیں گے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''نیک اعمال، برائیوں کو مٹا دیتے ہیں۔''

قرآن حکیم میں کسی بھی جگہ ایسی کوئی آیت نہیں ہے جس میں اس کے برعکس یہ کہا گیا ہو کہ برائیاں، اچھائیاں کو بے اثر کردیتی ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اچھائیاں برائیوں کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر انسان کا ایمان صحیح ہے تو اس کے تمام نیک اعمال کا ثواب اسے ملے گا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ ہماری ہر نیکی کا اجر دس گنا دیتے ہیں اور یہ اجر سات سو گنا یا اس سے بھی زیادہ دیا جاسکتا ہے جبکہ گناہ کے بدلے سزا اتنی ہی ملتی ہے جو اس گناہ کے لیے مقرر ہے۔ مختصراً یہ کہ صرف مشرک کو اس کے نیک اعمال کا اجر نہیں ملے گا۔ اس کے سوا کفر کے علاوہ کوئی بھی چیز انسان کی نیکیوں کو بے اثر نہیں بنا سکتی۔

عبادات

- نماز
- روزہ
- زکواۃ اور زکواۃ الفطر
- حج وعمرہ

نماز

نماز کے لیے نیت ضروری ہے؟

سوال: میرے دوست کا کہنا ہے کہ وضو کرتے وقت نماز کی نیت کر لینا کافی ہے۔ نماز سے پہلے واضح طور پر نیت کے الفاظ دہرانا ضروری نہیں ہے۔ میرے لیے اس بات کو قبول کرنا مشکل ہے۔ براہ کرم وضاحت فرمایئے۔

جواب: ایک معروف حدیث ہے جس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص نماز کے تمام ارکان اور افعال ادا کرے، وہ تمام آیات اور کلمات ادا کرے جو نماز میں پڑھے جاتے ہیں، لیکن اس نے واضح طور پر نماز ادا کرنے کی نیت نہ کی ہو تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اس نے صرف نماز کی حرکات ادا کی ہوں گی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص وضو کی واضح نیت کرے تب ہی اس کا وضو مکمل ہوگا۔ وضو کی نیت کا مطلب نماز کی نیت کرنا نہیں ہے، کیونکہ وضو کرنے کے بعد ممکن ہے کہ نماز ادا نہ کی جائے۔ اسی طرح ایک مرتبہ کیے گئے وضو کی بنیاد پر دو یا دو سے زائد وقت کی نمازیں ادا کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہوا ہو جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس بات کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو خود واضح ہو جائے گا کہ وضو کرتے وقت ایک یا ایک سے زائد نمازوں کی نیت کرنا ممکن نہیں ہے۔ مجھے اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ہر نماز کی ادائیگی سے پہلے واضح طور پر اس کی نیت کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص نماز سے قبل نیت نہیں کرے گا تو اس کی نماز ادا نہیں ہوگی۔

نماز کی تاخیر سے ادائیگی

سوال: کیا تاخیر سے نماز ادا کرنا درست ہے۔ ایک دوست بالعموم نماز کے اصل وقت سے دو تین گھنٹے بعد نماز ادا کرتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے۔

جواب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار پوچھا گیا کہ وہ کون سے بہترین کام ہیں جو انسان کو کرنے چاہئیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ نماز کو اس کے اولین وقت میں ادا کرنا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالی نے قرآن مجید میں نماز کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ یہ ''تمام مسلمانوں کے لیے وقت کی پابندی سے مشروط عبادت ہے۔'' قرآن مجید اور حدیث مبارکہ سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ نماز کی بروقت ادائیگی نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ جو لوگ نماز کو نظر انداز کرتے ہیں یا اس کی ادائیگی میں سستی اور کاہلی برتتے ہیں انہیں قرآن مجید میں تنبیہ کی گئی ہے:

''ان کے لیے بڑی خرابی ہے جو نماز تو پڑھتے ہیں لیکن اس میں غفلت کرتے ہیں۔''

اگر نماز کی وقت پر ادائیگی کو مؤخر کرنے کا کوئی جواز نہ ہو اور کوئی شخص نماز کی ادائیگی میں اس کے آخر وقت تک تاخیر کرے تو وہ ایسے بڑے گناہ کا مرتکب ہوگا، جس کی تلافی ممکن نہیں، سوائے اس کے کہ وہ اللہ تعالی سے معافی مانگے اور اللہ تعالی اسے معاف کردیں۔

بعض صورتوں میں دو نمازوں کو ملا کر پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے جیسے ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء۔ لیکن یہ اجازت سفر کے دوران یا علالت یا نماز کی ادائیگی کے لیے دستیاب سہولتوں کی مکمل عدم موجودگی سے مشروط ہے۔

ان وجوہات کی موجودگی کی بنا پر جو نماز مؤخر کی جائے گی اس کا سبب غفلت اور کاہلی نہیں ہے بلکہ شعوری طور پر دو نمازوں کو بہ اجازت ملا کر پڑھنا ہے۔ نماز کی ادائیگی کو جانتے بوجھتے مؤخر کرنے کا مطلب ایمان کی کمزوری ہے۔

امامت کون کرے؟

سوال: ہمارے دفتر میں ہر نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے۔ جب لوگ نماز کے لیے جمع ہوتے ہیں، اس وقت جو شخص امامت کے لیے آگے آتا ہے، اس کے بارے میں سب کو اچھی طرح علم ہے کہ جب وہ ملک سے باہر دورے پر جاتا ہے تو شراب پیتا ہے اور نامحرم عورتوں کے ساتھ شب بسری

کرتا ہے۔ کیا اس شخص کو امامت کی اجازت دینا یا اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟

جواب: اس سوال کے مختلف پہلو ہیں، جنہیں سامنے رکھتے ہوئے ان کے حل کے بارے میں غور کرنا ہوگا۔

جو صاحب امامت کرتے ہیں اگر انہیں اس کام کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور انہیں آسانی سے تبدیل نہیں کیا جاسکتا تو اس صورت میں آپ کو اپنی نماز کے بارے میں یہ فکر نہیں کرنی چاہیے کہ وہ ادا ہوجاتی ہے یا نہیں اور نہ ہی ان کے پیچھے نماز کی ادائیگی موقوف کرنی چاہیے۔ انفرادی طور پر فرض نماز ادا کرنے سے بہتر ہے کہ نماز باجماعت ادا کی جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی باقاعدہ امام مقرر نہ ہو اور جب لوگ نماز کے لیے جمع ہوتے ہوں تو اس وقت امام کا انتخاب کرلیا جاتا ہو۔ چونکہ آپ سب ایک ہی ادارے میں کام کرتے ہیں، اس لیے یہ بات زیادہ اہم ہے کہ باہم کوئی اختلاف پیدا نہ ہو۔ زیادہ بہتر ہے کہ امامت کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے جو سب نمازیوں کے لیے قابل قبول ہو۔ موجودصورتحال میں جو شخص امامت کے لیے آگے آتا ہے، اگر وہ مذکورہ بری عادتوں میں مبتلا ہے، تو اسے تبدیل کرنے کے لیے معاملہ فہمی کے ساتھ کارروائی کی جائے۔ بہتر ہوگا کہ آپ کے یہاں جو شخص زیادہ باعزت و باوقار ہو وہ ان صاحب سے اس موضوع پر علیحدگی میں بات کرے اور دوسروں کے جذبات ان تک پہنچادے۔

آپ نے ایک اہم اور سنجیدہ مسئلے کی نشاندہی کی ہے۔ آپ کے دفتر کا معاملہ صرف ایک مثال نہیں ہے ایسے بہت سے واقعات میرے علم میں لائے گئے ہیں۔ لوگوں کا یہ متضاد رویہ پریشان کن ہے۔ وہ لوگ جونفس پر قابو نہیں رکھ سکتے اور دنیاوی ترغیبات کے آگے ہتھیار ڈال کر شراب اور زنا کی لعنت کا شکار ہوجاتے ہیں، وہ اپنے ضمیر کی ملامت اور گناہ کے احساس کو کم کرنے کے لیے نماز کے وقت امامت کے لیے خود کو پیش کرتے ہیں۔ ایسے افراد کو اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنا چاہیے، ان پر قابو پانے کی کوشش کرنا چاہیے اور پچھلے گناہوں پر اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرنا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے ''اس شخص پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ مقتدی اسے پسند نہیں کرتے، نماز کی امامت کے لیے آگے آتا ہے۔''

امامت نہایت ذمہ داری کا فرض ہے جس کے ساتھ کسی قسم کی مراعات وابستہ نہیں ہیں۔ جو شخص ہماری نمازوں کی امامت کرتا ہے وہ اس لیے ہماری عزت وتکریم کا حقدار ٹھہرتا ہے کہ وہ ہم میں سب سے زیادہ قرآن و حدیث اور فقہ کے بارے میں علم رکھتا ہے۔ اس مسئلے کو نظرانداز نہیں

کرنا چاہیے۔ ایسی کمزوریاں جن کی آپ نے نشاندہی کی ہے، کسی شخص میں ہوں تو اسے نماز کی امامت کے لیے قدم آگے بڑھانے سے پہلے کم از کم ایک سے زیادہ بار سوچنا چاہیے۔

تاہم، میں دوبارہ یہ بات واضح کردوں گا کہ اس شخص کے پیچھے آپ کی نمازیں درست ہیں اور گھر جا کر اس نماز کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

نماز کی ادائیگی کے ممنوعہ اوقات

سوال: کیا فجر اور عصر کی نماز کے بعد نفل نمازوں کی ادائیگی کی اجازت ہے؟ اگر نہیں، تو براہ کرم وضاحت فرمایے۔

جواب: فجر اور عصر کی فرض نماز ادا کرنے کے بعد نفل نمازیں اس وقت تک نہیں پڑھی جاسکتیں جب تک (فجر کے بعد) سورج پوری طرح طلوع نہ ہوجائے یا عصر کے بعد پوری طرح غروب نہ ہوجائے۔ اس معاملے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، سوائے ممانعت کی درجہ بندی کے لحاظ سے۔ یعنی بعض فقہاء ان اوقات میں نماز کی ادائیگی کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں جبکہ حنبلی مکتب فکر میں اسے قطعی ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ جب ہمیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے واضح ہدایات ملی ہوں تو ہمیں ان ہدایات پر بغیر کسی سوال کے عمل کرنا چاہیے۔ اس معاملے میں ایک مستند حدیث موجود ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ بہت سے معززین موجود تھے، جن میں میری دانست میں سب سے بااختیار حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ حضرت عمرؓ نے میری موجودگی میں فرمایا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کے بعد نفل نماز کی ممانعت کی ہے، اس وقت تک جب تک سورج مکمل طور پر طلوع نہ ہوجائے اور عصر کے بعد نفل نماز کی ادائیگی کی ممانعت ہے یہاں تک کہ سورج مکمل طور پر غروب نہ ہوجائے۔ (یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے روایت ہے)۔

صحابی رسولؐ ابوسعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فجر کے بعد کوئی بھی نماز اس وقت تک ادا نہیں کی جاسکتی جب تک سورج پوری طرح آسمان پر طلوع نہ ہوجائے اور عصر کے بعد کوئی نماز اس وقت تک ادا نہیں کی جاسکتی جب تک سورج مکمل طور پر غروب نہ ہوجائے۔ (یہ حدیث بھی بخاری اور مسلم سے روایت ہے۔)

ان کے علاوہ اور بھی احادیث ہیں جن میں طلوع آفتاب، غروب آفتاب اور دوپہر کے اس وقت، جب سورج آسمان میں بلند ترین مقام (نصف النہار) پر ہو، نماز کی ادائیگی کی ممانعت کی گئی ہے۔

اس مسئلے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے علماء یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اگر کوئی فرض نماز بھول کی وجہ سے رہ گئی ہو، تو وہ ان ممنوعہ اوقات میں ادا کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث کا حوالہ دیا جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر بھول یا نیند کی وجہ سے کسی کی نماز رہ گئی ہو تو وہ اس وقت ادا کرلے جب اسے یاد آئے۔ علاوہ ازیں شافعی مکتب فکر میں ان ممنوعہ اوقات میں تحیۃ المسجد کی ادائیگی کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان اوقات میں نماز جنازہ اور طواف کی ادائیگی کے دوران سنت نمازیں ادا کی جاسکتی ہیں۔

پانچ سال کی قضا نمازیں

سوال: میرا ایک دوست فلپائن کے ایسے علاقے میں رہتا ہے جہاں مسلمان نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس نے گزشتہ پانچ سال کے عرصے میں نمازیں ادا نہیں کیں۔ ازراہ کرم بتایئے کہ اسے اپنی قضا نمازیں کس طرح ادا کرنی ہوں گی؟

جواب: آپ کے دوست کو چاہیے کہ اپنی اس غفلت پر اللہ کے سامنے عاجزی اور پورے خلوص کے ساتھ ندامت کا اظہار کرتے ہوئے معافی طلب کرے اور فوری طور پر نماز کی باقاعدہ ادائیگی شروع کردے۔ ترکِ نماز ایک بڑا گناہ ہے اور کسی بھی مسلمان کو اپنی نمازوں اور دیگر فرض عبادات کے معاملے میں اس قدر غافل نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نماز تمہارے ایمان کی بنیاد ہے۔ مسلمان خواہ کہیں بھی ہو اور کسی بھی حالت میں ہو، اگر وہ اللہ کو مانتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام پر یقین رکھتا ہے تو اس بات کا لحاظ کیے بغیر کہ وہ کس ملک میں ہے، کن لوگوں کے درمیان ہے، اسے اپنی عبادات کی باقاعدہ ادائیگی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ نماز کو چھوڑنے کا کوئی جواز نہیں۔ صرف اللہ کی رحمت سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ترک نماز کے اس گناہ کو معاف کردے۔ مغفرت کی یہ امید اسی وقت کی جاسکتی ہے جب وہ خلوص قلب سے ندامت کا اظہار کرے اور آئندہ کے لیے پابندی کے ساتھ نماز کی ادائیگی کا اہتمام کرے۔ اس کے علاوہ انہیں نفل نمازوں کی ادائیگی بھی کرتے رہنا چاہیے۔

میں نے اوپر کی سطور میں جو بات بیان کی ہے وہ ایک نقطۂ نظر ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک قضا نمازوں کی ادائیگی ممکن ہے۔ ان فقہاء کے نقطۂ نظر کے مطابق آپ کے دوست کو چاہیے کہ وہ ہر نماز کے ساتھ ایک قضا نماز ادا کرے اور یہ عمل پانچ سال تک جاری رکھے۔ اس طرح اس کی گزشتہ پانچ سال کی قضا نمازیں ادا ہو جائیں گی۔ مثال کے طور پر اگر وہ فجر کی نماز ادا کر رہا ہے تو اسے دو

رکعت فرض قضا نماز بھی ادا کرنا چاہیے۔ اسی طرح دن کی دیگر چار نمازوں کے ساتھ چار فرض نمازیں پڑھنی چاہئیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے ماضی کے اس فعل پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے اللہ سے معافی مانگنی چاہیے۔

آپ اپنے دوست کو جو بھی طریقہ تجویز کریں اس کے ساتھ یہ نشاندہی ضرور کریں کہ اس سارے عمل میں خلوص کے ساتھ اپنی غفلت پر معافی اور مستقبل میں پابندی کے ساتھ نماز کی ادائیگی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

جمعہ میں وضو ٹوٹ جائے تو...؟

سوال: جمعہ کی نماز ادا کرتے وقت اگر آخری رکعت میں وضو ٹوٹ جائے، اور دوبارہ وضو کے دوران جمعہ کی نماز ختم ہوجائے تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اس صورت میں ظہر کی نماز ادا کرنی چاہیے، جمعہ کی نماز قضا ہوجائے گی۔ لیکن چونکہ اس شخص نے جمعہ کی نماز میں شمولیت کی کوشش کی ہے، لہٰذا یہ توقع رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کوتاہی کے لیے معاف فرمائیں گے، بشرطیکہ متعلقہ شخص کی جانب سے کوئی غفلت سرزد نہ ہوئی ہو۔ بعض لوگ وضو کے بارے میں ضرورت سے زیادہ محتاط رہتے ہیں اور انہیں شبہ گزرتا ہے کہ ان کا وضو ٹوٹ گیا۔ جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔ شک وشبہ کا یہ رویہ اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ اگر کسی شخص نے اپنا وضو قاعدے کے مطابق کیا ہے اور نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد آیا ہے تو جب تک اسے یہ یقین نہ ہوجائے کہ وضو ٹوٹ گیا، اسے اپنے وضو کے بارے میں شبہ نہیں کرنا چاہیے۔

فضائی سفر کے دوران نمازوں کی ادائیگی

سوال: کیا کوئی مسافر فضائی سفر کے دوران مقررہ وقت پر فرض نمازیں ادا کرسکتا ہے؟ اگر نہیں تو کیا اسے اپنی نماز کی ادائیگی اس وقت تک ملتوی رکھنی چاہیے جب تک کہ وہ اپنی منزل پر نہ پہنچ جائے، گو کہ اس طرح نماز قضا ہوجائے گی...؟

جواب: مالکی مکتب فکر کے مطابق نماز کی صحیح ادائیگی کے لیے شرط یہ ہے کہ نماز ادا کرنے والا یا تو زمین پر کھڑا ہو یا پھر وہ کسی ایسی چیز پر کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر نماز ادا کررہا ہو جو زمین پر رکھی ہو یا اس چیز کا تعلق زمین سے براہ راست قائم ہو۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق ہوائی جہاز میں نماز کی ادائیگی صحیح

نہیں ہوگی، جب کہ دوسرے مکاتب فکر اس بارے میں مالکی مسلک سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نماز پڑھنے والے کا اگر زمین کے ساتھ کوئی رابطہ نہ ہو تو بھی نماز ادا ہو جائے گی۔ اس لیے ان مکاتب فکر کے مطابق ہوائی جہاز میں سفر کے دوران ادا کی جانے والی نمازیں ٹھیک ہوں گی۔

آپ اگر ہوائی جہاز میں سفر کے دوران ٹھیک طور پر نماز کی ادائیگی کے لیے کھڑے ہوسکیں، رکوع اور سجدے میں جاسکیں تو پھر آپ کو نماز ادا کرنی چاہیے۔ لیکن آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہوائی جہاز میں نماز کی ادائیگی کے لیے مطلوبہ جگہ کا ملنا بہت دشوار ہوگا تاوقتیکہ آپ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں جہاں نسبتاً کشادہ جگہ ہوتی ہے۔ لیکن وہاں بھی اتنی جگہ ملنا دشوار ہوگی کہ آپ نماز ادا کرسکیں۔ ایسی صورت میں آپ یہ کر سکتے ہیں کہ اپنی نشست پر ہی، یعنی بیٹھی ہوئی حالت میں نماز ادا کریں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آپ جب فضائی سفر کر رہے ہوں تو آپ کو وہ ہی رعایتیں حاصل ہوں گی جو دوسرے ہر سفر کے لیے اللہ نے اپنے بندوں کو دی ہوئی ہیں۔ یہ رعایتیں دو طرح کی ہیں۔

۱۔ نمازوں کو مختصر کرنا: ہر فرض نماز جو چار رکعت پر مشتمل ہو اسے مختصر کرکے دو رکعت کر دیا جاتا ہے لیکن فجر اور مغرب کی نماز مختصر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح فجر سے پہلے کی دو رکعت سنتوں اور عشاء کے بعد وتر کے علاوہ باقی تمام نمازوں کی سنتوں کو دوران سفر چھوڑ دینے کی اجازت ہے۔ اگر دوران سفر نماز کی ادائیگی میں زیادہ مشکل پیش آ رہی ہو تو اس صورت میں فجر سے پہلے کی سنتیں اور عشاء کے بعد وتر بھی چھوڑ دینے کی اجازت ہے۔

۲۔ فرض نمازوں کو ملا کر پڑھنا: دوران سفر آپ دو فرض نمازوں کو ملا کر پڑھ سکتے ہیں تاکہ آپ کو پانچ مرتبہ کی بجائے صرف تین مرتبہ نماز ادا کرنے کی سہولت حاصل ہوسکے۔ فجر کی نماز تو مقررہ وقت پر ہی ادا کرنی ہوگی ظہر اور عصر کی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو دو رکعت ظہر کی پڑھنی ہوں گی اور اس کے فوراً بعد دو رکعت عصر کی پڑھنی ہوں گی۔ ظہر اور عصر کی ملا کر یہ نماز آپ ظہر کا وقت شروع ہونے سے لے کر عصر کا وقت ختم ہونے تک کے دوران کسی بھی وقت ادا کر سکتے ہیں۔ یہی طریقۂ کار مغرب اور عشاء کی نماز ملا کر پڑھنے میں اختیار کیا جائے گا۔ یہ نمازیں غروب آفتاب سے سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے تک کے درمیانی وقت میں کسی وقت بھی ادا کی جاسکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سہولت و رعایت دوران سفر نماز کی ادائیگی میں زیادہ سے زیادہ آسانی پہنچانے کی غرض سے دی ہے۔

اگر کوئی شخص شام کے اوقات میں ہوائی سفر پر روانہ ہوتا ہے تو وہ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے ظہر اور عصر کی نمازیں ملا کر پڑھ سکتا ہے اور بیشتر صورتوں میں وہ اپنی منزل پر پہنچ کر مغرب اور

عشاء کی نمازیں ملا کر ادا کرسکتا ہے۔

نمازوں کو ملا کر اور مختصر کر کے پڑھنے کی رعایت صرف اس دن کے لیے نہیں ہے جس روز سفر کیا جارہا ہو بلکہ یہ رعایت اس پوری مدت کے لیے ہے جب تک آپ سفر میں ہوں بشرطیکہ کسی ایک جگہ پر مسلسل قیام اٹھارہ روز سے زائد نہ ہو۔ ان اٹھارہ دنوں میں وہ دو دن شامل نہیں کیے جائیں گے جس روز مسافر کسی جگہ پہنچا اور جس روز وہ وہاں سے روانہ ہوا۔ اگر اس سفر کے دوران اسے کئی مختلف جگہوں پر جانا ہے اور ہر جگہ اسے تھوڑے تھوڑے دن قیام کرنا ہے تو مندرجہ بالا رعایت اسے پورے سفر کے دوران حاصل رہے گی خواہ یہ سفر مقررہ اٹھارہ دنوں سے زیادہ طویل ہو۔ وہ جب اس جگہ پر واپس پہنچ جائے جہاں اس کا مستقل قیام ہے تو یہ رعایت فوری طور پر ختم ہوجائے گی۔

نماز کے بعد مصافحہ

سوال: دیکھا گیا ہے کہ بعض حضرات نماز باجماعت کے اختتام پر اپنے برابر والے سے مصافحہ کرتے ہیں۔ مجھے کسی نے بتایا کہ اس بات کی ہدایت نہیں کی گئی ہے۔ ازراہ کرم اس معاملے پر روشنی ڈالیے۔

جواب: علماء اس معاملے میں نہایت سخت نظریہ رکھتے ہیں کہ عبادات میں کسی بات کا اضافہ کیا جائے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے میں بتدریج ارتقاء کی وجہ سے جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، عبادات ان سے متاثر نہیں ہوتیں۔ کوئی شخص بھی یہ تجویز نہیں کرسکتا کہ ــــ مثلاً انسان نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں جو پیش رفت کی ہے اس کی بناء پر نماز کسی دوسرے طریقے سے ادا کی جائے یا نمازوں کے اوقات میں تبدیلی کردی جائے یا نمازوں کی ادائیگی میں چند تبدیلیاں متعارف کرائی جائیں۔ عبادات صرف اسی طریقے سے ادا کی جاسکتی ہیں، جن طریقوں کی تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دی ہے۔ اللہ کے رسولؐ انسان کامل ہیں اور انہوں نے اللہ کی عبادت کے بہترین طریقے ہمیں بتائے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ہمیں یہ کہیں نظر نہیں آتا کہ انہوں نے نماز کی ادائیگی کے بعد مصافحہ کرنے کی حوصلہ افزائی کی ہو۔ اگر یہ طریقہ صحابہ کرامؓ میں رائج ہوتا تو اس کی روایت ہم تک ضرور پہنچتی، کیونکہ نماز دن میں پانچ مرتبہ ادا کی جاتی ہے۔ چنانچہ نماز کے بعد مصافحہ کرنا، نہ تو نماز کا حصہ ہے اور نہ ہی یہ نماز کے بعد کی تہنیت ہے۔

یہاں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اگر کوئی شخص ہمیں تہنیت پیش کرے تو ہمیں اس کا جواب ضرور دینا چاہیے۔ مصافحہ کرنا تسلیم وتہنیت کا ایک طریقہ ہے اور اگر ہمارے برابر نماز پڑھنے والا شخص نماز کے بعد مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے تو ہمیں اس کا جواب دینا چاہیے۔ علاوہ ازیں اگر آپ اپنی مقامی مسجد میں نماز ادا کرتے ہیں تو نماز کے بعد آپ جتنے بھی لوگوں سے ہاتھ ملانا اور انہیں تہنیت پیش کرنا چاہیں، کرسکتے ہیں۔ اس میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔ علماء جس بات پر معترض ہوتے ہیں، وہ یہ ہے کہ نماز ادا کرنے کے بعد مصافحہ کرنے کو کہیں نماز کا حصہ نہ بنالیا جائے۔ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ نماز کے فوراً بعد اپنے آس پاس کے ہر شخص سے مصافحہ کرنا شروع کردیتے ہیں۔ اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی عجلت کے ساتھ اس کام کو کرنا اچھا نظر آتا ہے کہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ تاہم جب نماز مکمل طور پر ادا کی جاچکے اور اللہ کی حمد وثناء کے ساتھ اس سے عافیت اور امان طلب کرلی جائے تب ایک دوسرے سے ملنے، ہاتھ ملانے اور خیریت دریافت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

باجماعت نماز میں تاخیر سے شریک ہونا

سوال: اگر کوئی شخص باجماعت نماز میں تاخیر سے شریک ہو تو اسے اپنی نماز کس طرح مکمل کرنا چاہیے۔ امام کے ساتھ وہ جس رکعت میں شریک ہوا ہے وہ اس کی پہلی رکعت سمجھی جائے گی یا آخری۔

جواب: اس خاص مسئلے کے بارے میں علماء کی رائے مختلف ہے۔ بعض علماء کے خیال میں تاخیر سے شریک ہونے والا، امام کے ساتھ جس رکعت میں شریک ہوگا وہ اس کی پہلی رکعت سمجھی جائے گی اور بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ اس کی آخری رکعت ہوگی۔ ہم جس رائے کو بھی قبول کریں، وہ اپنی جگہ درست ہے، البتہ اس بارے میں کچھ اختلاف ہے کہ تاخیر سے آنے والے کو اپنی نماز کس طرح مکمل کرنا چاہیے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ امام کے ساتھ ادا کی گئی رکعت کو اپنی پہلی رکعت سمجھتا ہے یا آخری۔ فرض کریں کہ تاخیر سے آنے والے نے چار رکعت فرض نماز میں امام کے ساتھ صرف ایک رکعت ادا کی ہے، اور وہ اس رکعت کو پہلی رکعت سمجھتا ہے تو اسے امام کے سلام پھیرنے کے بعد دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہوجانا چاہیے۔ دوسری رکعت مکمل ہونے پر وہ تشہد کے لیے بیٹھے گا اور تشہد پڑھ کر تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہوجائے گا اور تیسری کے بعد چوتھی رکعت ادا کرکے دوبارہ تشہد کے لیے بیٹھے گا اور نماز مکمل کرلے گا۔

اگر امام کے ساتھ ادا کی گئی ایک رکعت کو اس نے اپنی آخری رکعت سمجھا ہے تو اس صورت

میں امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ اپنی پہلی رکعت ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوجائے گا اور پہلی کے بعد دوسری رکعت ادا کرکے تشہد کے لیے بیٹھے گا۔ تشہد کے بعد وہ اپنی تیسری رکعت ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوگا اور سجدے کے بعد آخری تشہد کے لیے بیٹھا رہے گا اور نماز مکمل کرلے گا۔ آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ ان دونوں طریقوں میں معمولی فرق ہے، اصل بات یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں نماز ادا ہوجاتی ہے۔ میں ذاتی طور پر پہلے طریقے کے حق میں ہوں جس میں امام کے ساتھ ادا کی گئی رکعت کو تاخیر سے آنے والا اپنی پہلی رکعت سمجھتا ہے اور پھر نماز مکمل کرتا ہے۔

گاؤں کی مسجد میں نماز جمعہ کی ادائیگی

سوال: ہمارا گاؤں شہر سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس صورت میں گاؤں کی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرنا صحیح نہیں ہے۔ گاؤں میں تقریباً ۵۰۰ افراد بستے ہیں اور گاؤں کی مسجد میں پانچ وقت کی نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے۔ براہ کرم اس مسئلے کی وضاحت فرمایئے؟

جواب: اگر نماز جمعہ میں گاؤں کے لوگ خاصی تعداد میں موجود ہوتے ہیں اور نماز کی امامت کے لیے ایک قابل شخص موجود ہے تو اس صورت میں گاؤں کے لوگ یہ چاہیں گے کہ ان کی مسجد میں جمعہ کی نماز ہوتا کہ گاؤں کا اسلامی تشخص واضح ہو۔ ایسی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنا بالکل درست ہے اور گاؤں کے کسی باشندے کو جمعہ کی نماز کے لیے شہر جانے کی ضرورت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اسے وہاں کوئی اور کام بھی ہو۔

بعض علماء نے نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے نمازیوں کی تعداد ۴۰ مقرر کی ہے، جبکہ بعض علماء کے نزدیک ۱۲ نمازی موجود ہوں تو جمعہ کی نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ آپ نے گاؤں کی جو آبادی بتائی ہے اس کے مطابق نمازیوں کی تعداد ان دونوں اعداد سے زیادہ ہونی چاہیے، ایسی صورت میں گاؤں کی مسجد میں نماز جمعہ کا اہتمام کرنے کی کوششوں پر مزید توجہ دینی چاہیے۔

نماز کے دوران ٹخنوں کو ڈھانپنا

سوال: بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جو لوگ نماز کے دوران اپنے ٹخنے ڈھانپ کر رکھتے ہیں، قیامت کے دن ان کے پاؤں آگ میں جلائے جائیں گے۔ براہ کرم اس بارے میں اپنی رائے دیجیے۔ علاوہ ازیں میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سیدھے کھڑے ہوتے وقت یا تیسری رکعت کے آغاز میں ہاتھوں کو اٹھانا ضروری ہے؟

جواب: نماز کے دوران جو لوگ ٹخنوں کو ڈھانپ کر رکھتے ہیں قیامت کے دن ایسے لوگوں کے پاؤں آگ میں جلانے کے بارے میں جو بات کہی جاتی ہے وہ غلط ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے خلاف ضرور فرمایا ہے جو اپنے لبادے ٹخنوں تک نیچے رکھ کر خود نمائی کا مظاہرہ کرتے تھے، لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تنبیہ اس وقت کے سماج میں رائج رسوم و روایات کے حوالے سے تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عام لوگ اپنے لبادے گھٹنوں اور ٹخنوں کے درمیان تک نیچے رکھتے تھے۔ جو شخص اپنے لباس کو ٹخنوں تک رکھتا تھا اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی بڑائی اور حاکمیت ظاہر کرنا چاہتا ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے اس خود پسند اور شیخی بگھارنے والے رویے کے خلاف یہ حدیث ارشاد فرمائی۔ یہ بات محض لباس کو ٹخنوں تک لٹکانے کے بارے میں نہیں تھی۔ موجودہ دور میں پائجامہ، شلوار، تہبند یا پتلون ایک عام لباس ہے جو ٹخنوں تک ہوتا ہے۔ یہ لباس امیر، غریب، ہر سطح کے لوگ استعمال کرتے ہیں اور اس کے استعمال میں تفاخر یا خود پسندی کا عنصر نہیں ہوتا، لہٰذا آج کے دور میں نماز کے دوران یا عام زندگی میں ٹخنوں تک لباس پہننا درست ہے۔

بعض مکاتب فکر خصوصاً شافعی فقہ کے نزدیک نماز کے دوران رکوع میں جاتے ہوئے یا رکوع سے اٹھتے ہوئے تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہوتے وقت اللہ اکبر کہتے وقت دونوں ہاتھوں کو چہرے تک اٹھانا بہتر سمجھا جاتا ہے۔ دیگر مکاتب فکر میں اسے ضروری نہیں سمجھا جاتا، آپ جس طریقے پر بھی عمل کریں، وہ درست ہوگا۔

کیا میں مسافر ہوں؟

سوال: میں ایک بھاری گاڑی کا ڈرائیور ہوں۔ اپنے فرض کی ادائیگی کے سلسلے میں مجھے پورے ملک میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ مختلف حضرات نماز کی ادائیگی کے سلسلے میں مختلف مشورے دیتے رہتے ہیں۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ مجھے اپنی نمازیں عام طریقے سے ادا کرنی چاہئیں کیونکہ میرے پاس پانی کی خاصی مقدار ہوتی ہے اور نماز کی ادائیگی کے لیے میں جہاں چاہوں گاڑی ٹھہرا سکتا ہوں۔ بعض دوسرے حضرات کا کہنا ہے کہ چونکہ میں ہمیشہ حالت سفر میں رہتا ہوں اس لیے مجھے اپنی نمازیں مختصر کر دینی چاہئیں اور صرف اس وقت پوری نماز ادا کرنی چاہیے جب میں اپنی رہائش کے مقام پر ہوں۔ براہ کرم بتایئے کہ صحیح صورت حال کیا ہے۔

جواب: آپ یقیناً ایک مسافر ہیں۔ کافی مقدار میں پانی ساتھ ہونے اور کسی جگہ گاڑی ٹھہرانے کی

سہولت سے اس حقیقت پر کوئی فرق نہیں پڑے ۔ جب آپ سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جارہے ہوتے ہیں تو گویا ایک مسافت طے کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر آپ جدہ میں مقیم ہیں تو جب بھی آپ جدہ سے روانہ ہوں گے تو نماز کا وہ طریقہ آپ پر لاگو ہوگا جو حالت سفر کے لیے بتایا گیا ہے۔ آپ ظہر، عصر اور عشاء کی فرض نمازیں دو دو رکعت مختصر کر کے پڑھ سکتے ہیں۔ ظہر اور عصر کی نماز ملا کر بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں بھی ایک ساتھ ادا کی جاسکتی ہیں۔ جب آپ اپنے رہائشی مقام پر واپس آئیں گے تو آپ کو عام طریقے سے نماز ادا کرنی ہوگی۔ اگر مسافرت کے دوران کسی مقام پر ۱۸ دن سے زائد قیام کرنا پڑے (اس مدت میں آمد اور روانگی کے دن شامل نہ ہوں) اور اگر کسی جگہ قیام کے وقت آپ کی نیت طویل عرصے رہنے کی ہو تو آپ کو عام طریقے سے نماز ادا کرنی ہوگی۔

نماز باجماعت سے رخصت

سوال: کیا ایک شخص کو اس بات کی اجازت ہے کہ اگر وہ کسی متعدی مرض میں مبتلا ہوجائے تو نماز باجماعت ادا نہیں کرے، کیونکہ اس طرح اس کا مرض دوسرے نمازیوں کو لاحق ہونے کا اندیشہ ہوگا۔ یہاں میں یہ وضاحت کرنا چاہوں گا کہ ضروری نہیں کہ یہ مرض خطرناک نوعیت کا ہو یا ایسا ہو جس کی وجہ سے ایک آدمی اپنی روزمرہ زندگی کے معمولات ادا کرنے کے قابل نہ رہے۔

جواب: نماز باجماعت کی ادائیگی سے رخصت کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں اور کسی متعدی مرض میں مبتلا ہونا، یقیناً ان میں سے ایک ہے۔ درحقیقت کسی بھی بیماری کی صورت میں ایک مسلمان، نماز باجماعت سے رخصت لے سکتا ہے۔ کسی بھی متعدی بیماری کی صورت میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ باجماعت نماز کی ادائیگی سے دوسرے نمازیوں کو وہی مرض لاحق ہوجائے گا۔ اس لیے ایسی صورت میں مسجد میں جاکر نماز ادا کرنے کے بجائے اس وقت تک گھر پر نماز ادا کی جاسکتی ہے جب تک مکمل صحت یابی نہ ہوجائے۔ بعض امراض ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان اپنے روزمرہ کے معمولات انجام دیتا رہتا ہے، لیکن متعدی مرض کی صورت میں مسجد میں جاکر نماز باجماعت پڑھنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

باجماعت نماز سے رخصت کے دیگر اسباب درج ذیل ہیں:

— نماز باجماعت کے وقت اچانک فوری اجابت محسوس ہو۔

— کوئی شخص بھوکا ہو اور کھانا تیار ہو۔

— کسی بات کا خوف یا اندیشہ ہو، مثلاً یہ کہ نماز کے لیے جانے سے اس کی غیر موجودگی میں اس کی کوئی چیز چوری ہو جائے گی یا کوئی شخص اس کی ملکیت پر قبضہ کر لے گا یا اگر اس شخص نے اپنی کوئی چیز دوسرے شخص کے پاس رکھوائی ہے تو وہ اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر چیز لے کر چلا جائے گا۔

— بارش، تیز ہوا یا راستہ میں کیچڑ کی صورت میں۔

— کسی بیمار شخص کی تیمارداری کی وجہ سے۔

— جب کوئی شخص مسجد میں ہو اور اسے نیند آ رہی ہو اور جماعت کی ادائیگی میں خاصا وقت ہو، اس صورت میں وہ شخص تنہا نماز ادا کر کے گھر جا سکتا ہے۔

نماز میں با آواز بلند تلاوت کرنا

سوال: پانچ وقت کی نمازوں میں سے صرف تین وقت کی نمازوں میں قرآن کریم کی تلاوت با آواز بلند کیوں کی جاتی ہے۔نفل نمازوں میں با آواز بلند تلاوت کیوں نہیں کرتے؟

جواب: قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔قرآن کی متعدد آیات میں یہ حکم دہرایا گیا ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی نماز پڑھنے کے طریقے کا ذکر نہیں ہے۔نماز کے طریقے کی تعلیم ہمیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ حدیث نبویؐ ہے: ''نماز پڑھو اس طرح جیسے میں پڑھتا ہوں۔'' لہٰذا نماز کی ادائیگی کا وہ طریقہ فرض ہوا جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے۔معتبر اور مستند حوالوں کے ذریعہ نماز کی ادائیگی کا جو طریقہ ہم تک پہنچا ہے، وہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دو فرض رکعتوں میں اور مغرب وعشاء کے فرضوں کی پہلی دو رکعتوں میں قرآن کی با آواز بلند تلاوت فرماتے تھے۔فرض نمازوں کے ساتھ ادا کی جانے والی سنت یا نفل نمازوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نہیں کرتے تھے۔تاہم یہ بات درست نہیں ہے کہ نفل نمازوں میں قرآن شریف کی آواز کے ساتھ تلاوت نہیں کی جا سکتی۔ رات کو ادا کی جانے والی نفل نمازوں میں قرآن با آواز بلند پڑھنے کی اجازت ہے۔رات کے وقت نفل نماز اگر باجماعت ادا کی جا رہی ہے تو امام با آواز بلند تلاوت کر سکتا ہے۔رمضان المبارک میں تراویح کی نماز میں قرآن با آواز بلند پڑھا جاتا ہے۔اپنی تمام عبادات میں ہمیں سنت نبویؐ کی پیروی کرنی چاہیے۔

باجماعت نماز میں سورہ فاتحہ کی تلاوت

سوال: جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے وقت مقتدیوں کو سورہ فاتحہ پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ ہمارے یہاں نماز کے دوران صرف امام صاحب تلاوت کرتے ہیں اور تمام مقتدی خاموش رہتے ہیں۔ سعودی عرب میں میں نے باجماعت نماز کے دوران بعض حضرات کو زیر لب تلاوت کرتے دیکھا ہے۔

سوال: بعض امام حضرات نماز کے دوران سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد وقفہ دیتے ہیں، اس کے بعد کوئی دوسری سورہ یا آیات تلاوت کرتے ہیں۔ اس وقفہ کے دوران مقتدی حضرات سورہ فاتحہ پڑھتے ہیں۔ کیا یہ طریقہ فرض ہے یا جب امام تلاوت کرے تو توجہ کے ساتھ سننا کافی ہے؟

جواب: قرآن مجید میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ نماز میں قرآن کی تلاوت کی جائے۔ اس بات کی وضاحت بعض احادیث کے ذریعہ ہوتی ہے کہ نماز میں کیا پڑھا جائے۔ احادیث کی تمام کتابوں کے مرتبین، بطور راوی، حضرت عبادہؓ بن صامت کی بیان کی ہوئی احادیث کی صحت پر متفق ہیں اور حضرت عقبہؓ بن صامت سے یہ حدیث روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تک کوئی شخص سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ادا نہیں ہوگی۔'' اس حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ نماز میں جب تک سورہ فاتحہ نہ پڑھی جائے نماز ادا نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں ایک مرتبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو غلط طریقے سے نماز ادا کرتے دیکھا تو اسے نماز کا صحیح طریقہ سکھایا۔ جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے سورہ فاتحہ پڑھائی تو اس کے بعد ہدایت کی کہ اپنی تمام نمازوں میں یہ پڑھا کرو۔ امام مالکؒ اور امام ترمذیؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ام القرآن (سورہ فاتحہ) کی تلاوت کے بغیر ایک رکعت نماز ادا کی، اس کی نماز ادا نہیں ہوئی، بجز اس کے کہ وہ امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو۔

بعض علماء خصوصاً حنفی مسلک سے تعلق رکھنے والوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے نماز ادا کر رہا ہو اسے سورہ فاتحہ یا کوئی اور قرآنی سورہ یا آیت پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے اس موقف کی بنیاد ایک حدیث ہے جو حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ امام جب موجود ہو تو اس کی اتباع کرو، جب وہ تکبیر کہے تو تکبیر کہو اور جب وہ تلاوت کرے تو خاموشی سے سنو۔ یہ علماء اپنے موقف کے حق میں ایک اور قرآنی آیت پیش کرتے ہیں جس میں

فرمایا گیا ہے کہ ’’جب قرآن پڑھا جائے تو خاموشی اور توجہ کے ساتھ سنو تاکہ تم پر اللہ کی رحمت نازل ہو۔‘‘ اس سلسلہ میں یہ حضرات ایک اور حدیث پیش کرتے ہیں جس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے’’ جو شخص امام کے پیچھے نماز ادا کرتا ہے اس کے لیے امام کی تلاوت کافی ہے۔‘‘ تاہم یہ حدیث ضعیف احادیث میں شمار کی جاتی ہے۔

دونوں جانب کے نقطۂ نظر کو دیکھنے کے بعد علم حدیث کے ماہرین نے نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کی تلاوت کے حق میں فیصلہ دیا ہے خواہ امام اس کی تلاوت با آواز بلند کرے جیسے کہ فجر، مغرب اور عشاء میں کی جاتی ہے یا وہ بغیر آواز کے تلاوت کرے جیسا کہ ظہر اور عصر کی نمازوں میں تلاوت کی جاتی ہے۔ ان محدثین کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت یا دیگر احادیث کو خاموشی اور ادب کے ساتھ سننے کی ہدایت عام مواقع کے لیے ہے۔ نماز میں تلاوت کی ہدایت حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت کردہ حدیث سے واضح ہے جس میں قطعی طور پر بتایا گیا ہے کہ سورہ فاتحہ کی تلاوت اور احادیث کو خاموشی سے سننے کی عام ہدایت اس پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتی ہے کہ اس میں خاص طور پر نماز کے دوران تلاوت کا ذکر ہے۔

آپ کے سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے جب ان دونوں نقطہ ہائے نظر کا موازنہ کیا جائے تو لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کی تلاوت نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ دونوں احادیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے اور علماء کی اکثریت کی رائے بھی یہی ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کی تلاوت ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ لہٰذا نماز کے دوران اس کا پڑھنا ہی بہتر طریقہ ہے تاہم یہ اس طرح پڑھی جائے کہ مقتدی کی تلاوت امام کے لیے مسئلہ نہ بنے، یعنی بے آواز پڑھا جائے۔ سورہ فاتحہ کے علاوہ امام جو کچھ تلاوت کرے اسے خاموشی سے سنا جائے۔ اس کا پڑھنا یا دہرانا ضروری نہیں ہے۔

جو امام نماز کے دوران سورہ فاتحہ کے بعد وقفہ کرتے ہیں، اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس وقفہ میں مقتدی سورہ فاتحہ کی تلاوت کرلیں تاہم یہ وقفہ دینا لازمی نہیں ہے، افضل ضرور ہے۔ اگر امام وقفہ نہ دے تو مقتدی یا تو امام کے ساتھ ساتھ سورہ فاتحہ کی تلاوت کرسکتا ہے یا جب امام سانس لینے کے لیے رکے تو ان وقفوں میں سورہ فاتحہ کی آیات پڑھ سکتا ہے یا جب امام دوسری سورہ کی تلاوت کر رہا ہو تب سورہ فاتحہ پڑھ سکتا ہے۔ یہ تمام طریقے درست ہیں۔

امام دوبارہ اسی نماز کی امامت کرسکتا ہے؟

سوال: ہم نے اپنے دفتر میں باجماعت نماز کی ادائیگی کا اہتمام کیا ہے۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ

کوئی ایک ساتھی نماز کی ادائیگی کے لیے اس وقت پہنچتا ہے جب جماعت ختم ہوچکی ہوتی ہے۔ایسی صورت میں وہ چند لمحے انتظار کرتا ہے کہ کوئی اور ساتھی آجائے تاکہ وہ باجماعت نماز ادا کرسکے۔ ایک موقع پر جب کوئی اور ساتھی نہیں آیا تو پہلی جماعت کی امامت کرنے والے نے پیش کش کی کہ وہ ان کے ساتھ شامل ہوجاتے ہیں اور دوبارہ امامت کے فرائض انجام دیتے ہیں تاکہ تاخیر سے آنے والے ساتھی نماز باجماعت ادا کرسکیں۔ تاخیر سے آنے والے ساتھی کا کہنا تھا کہ چونکہ امام صاحب پہلے ہی ایک جماعت کی امامت کرچکے ہیں اس لیے وہ دوسری جماعت کی امامت نہیں کرسکتے۔اس مسئلے پر دونوں میں خاصا اختلاف رائے ہوا۔آپ کی رائے درکار ہے۔

جواب: آپ کے ساتھی کو اس مسئلہ پر بحث نہیں کرنی چاہیے تھی، امامت کوئی بھی شخص کرے نماز کی درستگی پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔تاخیر سے آنے والے غالباً اس بات پر فکر مند تھے کہ چونکہ امام صاحب فرض نماز کی امامت کرچکے ہیں اس لیے میرے ساتھ نماز ادا کرنے میں وہ سنت یا نفل نماز ادا کریں گے۔ ان کے ذہن میں یہ سوال ہوگا کہ سنت یا نفل نماز کو فرض نماز پر کیسے فوقیت دی جاسکتی ہے۔ لیکن یہاں فوقیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات صحیح ہے کہ بعض علماء اس بات کو درست نہیں سمجھتے کہ فرض ادا کرنے والے مقتدیوں کی امامت ایسا شخص کرے جو سنت یا نفل ادا کررہا ہو،لیکن علماء کی اکثریت اس رائے سے متفق نہیں ہے۔ ان کے خیال میں اس طرح نماز باجماعت ادا کی جاسکتی ہے اور وہ بالکل درست ہوگی۔ اس بارے میں ایک مشہور حدیث موجود ہے جس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ معروف صحابی رسولؐ حضرت معاذؓ بن جبل کا یہ معمول تھا کہ وہ عشاء کی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں ادا کرتے اور اس کے بعد اپنے قبیلے میں جاکر وہاں لوگوں کی عشاء کی نماز کی امامت کرتے۔ دیکھا جائے تو حضرت معاذؓ کا طرزِ عمل وہی تھا جو آپ کے بیان کردہ واقعہ میں آپ کے ان ساتھی کا ہے جو نماز کی امامت کراتے ہیں۔ امام کے انتخاب کا پہلا معیار یہ ہے کہ وہ مقتدیوں میں سے سب سے بہتر ہو اور قرآن مجید کی تلاوت کرسکتا ہو۔کسی شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ معاذؓ نے عشاء کی نماز میں قرآن مجید کی سب سے طویل سورہ ''البقرۃ'' تلاوت کی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو بلایا اور انہیں ہدایت کی کہ امامت کرتے وقت قرآن مجید کی درمیانی طوالت یا مناسب طوالت کی سورہ تلاوت کیا کریں۔ یہاں جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ سے اس بات پر کوئی سوال نہیں کیا کہ جب وہ آپؐ کی امامت میں عشاء کی نماز ادا کرلیتے ہیں تو پھر اپنے قبیلے میں جاکر

عشاء کی نماز کی امامت کیوں کراتے ہیں۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک خاص وقت کی نماز ادا کر چکا ہو تو اسے اجازت ہے کہ وہ اسی وقت کی فرض نماز کی دوسرے لوگوں کی امامت کرے۔ امام کے لیے وہ سنت یا نفل نماز ہوگی لیکن اس سے فرض نماز ادا کرنے والوں کی نماز متاثر نہیں ہوتی۔

مسجد کے علاوہ نماز باجماعت کی ادائیگی کی جگہ

سوال: ہماری فیکٹری اور رہائشی کوارٹرز کے علاقے میں باجماعت نماز کی ادائیگی کے لیے علیحدہ جگہ نہیں ہے۔ کام کے دوران ہم فیکٹری کے ایک مخصوص علاقے میں جماعت ادا کرتے ہیں اور رہائشی کوارٹرز میں ایک بڑے کمرے کے ایک حصہ میں جماعت کر لیتے ہیں۔ یہ کمرہ باورچی خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ان دونوں جگہوں کو کمپنی کی انتظامیہ مختلف مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔ کیا ان جگہوں پر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا درست ہے۔

جواب: اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کی جاتی ہے جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ میرے لیے پوری دنیا عبادت کی جگہ ہے اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ حدیث میں ''مسجد'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمان کسی بھی جگہ نماز ادا کر سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ جگہ پاک اور صاف ہو، لہٰذا آپ جہاں بھی ہیں، وہیں نماز ادا کر سکتے ہیں۔ باجماعت نماز ادا کرنا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے، لہٰذا جب بھی دو یا دو سے زائد مسلمان فرض نماز ادا کرنا چاہیں تو انہیں جماعت کی صورت اختیار کر لینی چاہیے۔ نماز باجماعت کہیں بھی ادا کی جا سکتی ہے، سوائے چند مخصوص مقامات کے جن سے سب واقف ہیں یعنی غسل خانہ، اصطبل، وغیرہ۔ یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ نماز باجماعت لازماً مسجد میں ادا کی جائے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جس جگہ اکثر نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہو، جیسا کہ دفاتر اور کارخانوں میں ہوتا ہے تو اس جگہ کو مسجد قرار دے دیا جائے اور دوسرے مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ درحقیقت ''مسجد'' ایسی جگہ ہے جہاں مسلمان اپنے اجتماعی معاملات انجام دے سکتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ''مسجد'' معاملات حکومت انجام دینے کی جگہ تھی جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کے مشورے سے مسلمانوں کو درپیش مسائل کے حل تلاش کیا کرتے تھے اور فیصلے سنایا کرتے تھے۔ مسجد نبویؐ میں ایک اسکول بھی تھا جہاں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو تعلیم دیتے تھے۔ دوسرے ملکوں اور قبیلوں کے طالب علم (صحابہؓ) یہاں تک کہ غیر مسلموں

کے وفود سے ملاقات بھی مسجد میں کی جاتی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین مسجد میں مختلف قسم کی تربیت حاصل کرتے تھے جن میں اسلحے کے استعمال کی تربیت بھی شامل تھی۔

درج بالا باتوں کی روشنی میں یہ بالکل درست ہے کہ نماز کی ادائیگی کے اوقات کے علاوہ کمپنی ان جگہوں کو دوسرے جائز کاموں کے لیے استعمال کرے۔ ہاں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ان جگہوں پر ناپاک اشیاء نہ لائی جائیں۔

فجر کی نماز کا وقت

سوال: فجر کی اذان کے بعد نماز کی ادائیگی کس وقت تک کی جاسکتی ہے؟

جواب: فجر کی نماز کا وقت طلوع سحر کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ وقت جب دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں فرق کیا جاسکے۔ بالعموم یہ طلوع آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹے پہلے کا وقت ہے۔ جب فجر کی اذان کہہ دی جائے تو اس کے بعد فجر کی نماز ادا کی جاسکتی ہے اور طلوع آفتاب تک ادا کی جاسکتی ہے۔

تاہم اگر ایک شخص فجر کے وقت بیدار ہونے کے انتظامات کے باوجود سوتا رہ جائے تو اسے نیند سے بیدار ہونے کے فوراً بعد وضو کرکے فجر کی نماز ادا کرلینی چاہیے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ سوتے رہ جانے سے اس کی فجر کی نماز رہ گئی، لیکن اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ اسے اضافی وقت دیا گیا ہے جو صرف اس مدت تک ہے جب وہ بیدار ہو اور وقت ضائع کیے بغیر نماز کے لیے تیار ہو جائے۔ یہاں یہ تاکید ضروری ہے کہ اس صورت میں متعلقہ شخص کو نماز ادا کرنے تک کسی دوسرے کام میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نماز کے وقت سوتا رہ جائے یا بھول جائے اسے چاہیے کہ ہوش وحواس میں آنے پر فوراً نماز ادا کرے۔ اس کے لیے نماز کا وقت وہی ہوگا۔

نمازوں کے صحیح اوقات اور قضا نماز

سوال: ازراہ کرم پانچ وقت کی نمازوں کے دورانیہ کی وضاحت فرمایے۔ یہ بھی بتایے کہ کسی نماز کے چھوٹ جانے پر اس کی قضا کس صورت میں واجب ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص غروب آفتاب سے بیس منٹ پہلے عصر کی نماز ادا کرتا ہے تو کیا اس کی یہ نماز بروقت ادا ہو جائے گی؟

جواب: ہر نماز کے دورانیہ کی وضاحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے کی گئی جنہوں نے دو متواتر دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں امامت کی۔ پہلے دن ہر نماز، اس نماز کے وقت کے آغاز پر شروع کی گئی اور دوسرے دن نمازوں کو ان کے آخر وقت تک مؤخر کیا۔ یعنی پہلے دن فجر کی نماز نمود صبح کے ساتھ پڑھی گئی۔ ظہر کی نماز دوپہر کو اس وقت ادا کی گئی جب سورج، آسمان پر اپنی بلندی کی انتہا پر تھا، عصر کی نماز اس وقت شروع کی گئی جب دھوپ میں اشیاء کا سایہ ان کی اصل لمبائی کے برابر تھا، مغرب کی نماز غروب آفتاب کے فوراً بعد ادا کی گئی اور نماز عشاء، غروب آفتاب کے ڈیڑھ گھنٹے بعد۔

دوسرے دن فجر کی نماز طلوع آفتاب سے ذرا قبل ادا کی گئی۔ ظہر کی نماز عصر کا وقت شروع ہونے سے چند منٹ قبل، عصر کی نماز غروب آفتاب سے چند منٹ قبل، مغرب کی نماز، پچھلے دن کی مغرب کی نماز کے وقت سے کچھ دیر بعد پڑھی گئی اور عشاء کی نماز، رات کے خاتمے سے قبل ادا کی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو بتایا کہ ان دونوں دنوں میں ادا کی گئی نمازوں کے اوقات، ہر نماز کے وقت کا وہ دورانیہ ہے، جس میں نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ صرف دو صورتوں میں مقررہ وقت گزر جانے کے بعد، اس نماز کی قضا ادا کی جا سکتی ہے۔ پہلی صورت یہ کہ آدمی سوتا رہ جائے یا بے ہوشی کی حالت میں ہو، اور دوسری صورت یہ کہ وہ بھول جائے۔ اگر ایک شخص سوتا رہ گیا، یا بے ہوشی کی حالت میں تھا یا اسے نماز کی ادائیگی یاد نہیں رہی اور اس کا وقت گزر گیا، تو اسے چاہیے کہ بیدار ہونے، یا ہوش میں آنے، یا یاد آنے پر فوراً نماز ادا کرے۔ اس صورت میں اس کی نماز قضا نہیں سمجھی جائے گی، بلکہ وہ مقررہ وقت میں ادا تصور کی جائے گی۔ اگر ایک شخص نماز فجر کے وقت اٹھنے کا اہتمام کرنے کے باوجود سوتا رہ گیا اور طلوع آفتاب کے بعد بیدار ہوا تو اسے چاہیے کہ فوراً وضو کر کے نماز ادا کرے۔ اس کے علاوہ کوئی اور صورت ایسی نہیں ہے جس میں کسی نماز کا مقررہ وقت گزر جانے کے بعد نماز ادا کی جائے سوائے دو فرض نمازوں کی ایک ساتھ ادائیگی کے، جو سفر کے دوران ادا کی جاتی ہے۔

میں نے جو کچھ بیان کیا ہے، وہ اس رائے سے مختلف محسوس ہوتا ہے جو "قضا" کے بارے میں ہے۔ قضا اس وقت پڑھی جاتی ہے جب کسی وقت کی نماز غفلت یا سستی کی وجہ سے چھوٹ جائے۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر یہ گناہ سرزد ہو جائے تو متعلقہ شخص کو قضا نمازوں کی ادائیگی کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرنا چاہیے۔

نماز کے بارے میں بہتر اور افضل رائے یہی ہے کہ جب کوئی نماز اپنے مقررہ وقت میں ادا نہ کی جا سکے تو اسے وقت گزرنے کے بعد فوراً ادا کر لیا جائے۔ یہ رائے قرآن حکیم کے مطابق ہے

جس میں کہا گیا 'نمازوں کی ادائیگی ایمان والوں پر فرض ہے، وقت کی پابندی کے ساتھ۔''
اس سے یہ بات واضح ہے کہ نماز ایک ایسی فرض عبادت ہے جو پابندی وقت کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر اس کی ادائیگی میں وقت کی پابندی کے عنصر کو شامل نہیں رکھا جائے گا تو فرض ادا نہیں ہوگا۔

● جس شخص کی نماز لاپرواہی کی وجہ سے چھوٹ جائے اسے سب سے پہلے یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔ اس کے بعد اسے اللہ تعالیٰ سے توبہ اور استغفار کرنا چاہیے اور عہد کرنا چاہیے کہ یہ گناہ آئندہ سرزد نہیں ہوگا۔ علاوہ ازیں اسے کثرت سے نفل نمازیں پڑھنی چاہئیں اور یہ توقع رکھنی چاہیے کہ ان نفل نمازوں کی ادائیگی سے ملنے والا ثواب اس کے نماز چھوڑنے کے گناہ کی تلافی کر سکے گا۔

یہ بات میرے علم میں ہے کہ بعض حضرات کسی وقت کی نماز چھوٹ جانے پر، مقررہ وقت کے بعد اس کی قضا پڑھنے کے بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ لیکن جو بات میں نے بیان کی ہے وہ قرآن کے حکم کی روشنی میں زیادہ وزن رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ ایک منطقی بات ہے کہ جب کسی فرض کو مقررہ وقت کے اندر ادا کرنے کا حکم دیا جا رہا ہو، یعنی وقت کی پابندی اس کا لازمی جزو ہو، اور اس لازمی شرط کی پابندی نہ کی جائے تو وہ فرض ایک اہم عنصر کے بغیر رہ گیا اور یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ گزرے ہوئے وقت کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اس تمام گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی بھی وقت کی نماز کو اس کے مقررہ وقت کے اندر، پہلی فرصت میں ادا کرنا لازمی ہے۔ کسی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہترین عمل کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ ؐ نے جواب دیا ''نماز کو پابندی وقت کے ساتھ ادا کرو۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ نمازوں کو ان کے وقت کے شروع ہونے کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ کسی نماز کو مقررہ وقت کے اندر ادا کرنے کا یہ مفہوم ہے کہ اس وقت کی نماز اور اگلی نماز کا وقت شروع ہونے میں اتنا وقت ہو کہ اس میں ایک رکعت نماز ادا ہو سکے۔ کسی غیر معمولی صورتحال کے سوا، نماز کی تاخیر کا کوئی بھی جواز ناقابل قبول ہے۔

نماز پڑھنے میں بھٹکتے خیالات کی آمد

سوال: میں جب بھی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں اور نماز شروع کرتا ہوں تو میرے دماغ میں بہت سے خیالات بھٹکنے لگتے ہیں۔ ازراہ کرم بتایئے کہ ان پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔ کیا فرشتے نماز ادا کرنے والے کا ذہن پڑھنے پر قادر ہیں؟

۲۔ میں نماز فرش کے بجائے اپنے بستر پر ادا کرتا ہوں کیونکہ اس طرح مجھے سہولت محسوس ہوتی ہے۔ اس عمل میں کوئی خرابی تو نہیں ہے۔

جواب: آپ کو چاہیے کہ نماز ادا کرتے وقت آپ اپنی توجہ ان آیات پر مرکوز رکھیں جو آپ پڑھ رہے ہوں۔ نماز پڑھتے وقت قرآن کی ان آیات کے معنی پر توجہ دینی چاہیے جن کی تلاوت کی جارہی ہے۔ اگر آپ ثناء پڑھ رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور اس کی عظمت کا اعلان کرنے والے الفاظ کے معنی پر آپ کی توجہ ہو اور جو کچھ آپ زبان سے ادا کر رہے ہوں، اس کا مفہوم ذہن میں واضح ہو۔ اس طرح غیر ضروری خیالات آپ کے دماغ سے دور رہیں گے۔

فرشتے ہر اس بات کو درج کرتے ہیں جو ہم زبان سے کہتے یا سوچتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں سے بخوبی واقف ہیں اور اللہ تعالیٰ کو فرشتوں کی رپورٹ کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ بہتر ہوگا کہ آپ نماز فرش پر ادا کریں کیونکہ فرش کی سطح سخت ہوتی ہے۔ بستر پر نماز ادا کرنا، میرے خیال میں آرام دہ نہیں ہوتا، خصوصاً اس وقت جب بستر نرم ہو۔

فجر کی نماز کے بعد سنتوں کی ادائیگی

سوال: فجر کی نماز کے بعد میں نے طواف کعبہ کیا اور پھر مقام ابراہیمؑ پر دو رکعت نماز ادا کی۔ بعض دوستوں نے مجھ سے کہا کہ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد طلوع آفتاب تک کوئی نماز ادا کرنا ممنوع ہے۔ اس لیے آپ کو مقام ابراہیمؑ پر دو رکعت کی ادائیگی طلوع آفتاب کے بعد کرنا چاہیے تھی۔ ازراہ کرم آپ رہنمائی فرمایے۔

جواب: آپ کے احباب اس حدیث کی جانب اشارہ کر رہے تھے جس میں فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک نماز ادا کرنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے تاہم یہ مکروہ ہے، اس کی قطعی طور پر ممانعت نہیں ہے۔ امام شافعیؒ کے مطابق یہ مکروہ اس صورت میں نظر انداز کیا جا سکتا ہے جب نفل نماز ادا کرنے کا کوئی خاص موقع ہو مثلاً تحیۃ المسجد ___ یعنی مسجد میں داخل ہونے پر دو رکعت نفل ادا کرنا۔ اس قسم کا ایک موقع طواف کا ہے۔ شافعیؒ مسلک کے علماء کا کہنا ہے کہ فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک نماز ادا نہ کرنے کی ہدایت ایک عمومی اصول ہے جس کا اطلاق کسی غیر عمومی صورتحال میں نہیں ہوتا کیونکہ نئی صورتحال میں معاملے کی نوعیت یکسر تبدیل ہو جاتی ہے، لیکن دوسرے مسالک کے علماء

اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتے اور ان کے مطابق ان اوقات میں (فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک) نماز ادا کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

آپ کے معاملے میں صورتحال کچھ یوں ہے کہ شافعی مسلک کی رو سے آپ کا یہ عمل درست تھا جبکہ دیگر مسالک کے مطابق یہ عمل درست نہیں تھا۔

یکے بعد دیگرے دو نمازیں باجماعت

سوال: بستی کی ایک مسجد میں حنفی اور شافعی مسالک کے حضرات فرض نماز علیحدہ علیحدہ ادا کرتے ہیں۔ یعنی پہلے ایک مسلک کا امام نماز پڑھاتا ہے اور جب یہ فرض نماز ختم ہو جاتی ہے تو دوسرے مسلک کا امام نماز پڑھاتا ہے۔ ازراہ کرم بتایے کہ کیا یہ طریقہ جائز ہے؟

جواب: ایک مسجد میں یکے بعد دیگرے دو علیحدہ اماموں کی امامت میں دو فرض نمازوں کی ادائیگی جہالت کی ایک شکل ہے جسے فوراً بند ہونا چاہیے۔ جب فرض نماز باجماعت ادا کی جارہی ہو اور کوئی شخص اس جماعت میں شامل نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے امام کے ایمان کے بارے میں شک وشبہ ہے۔ اگر یہ شکوک وشبہات اس بنیاد پر ہیں کہ امام کا تعلق کسی دوسرے مسلک سے ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ متعلقہ شخص اسلام کے مختلف مسالک کے بارے میں لاعلمی کا شکار ہے۔ اگر دو فرض نمازیں بیک وقت ادا کی جائیں تو دونوں ناقابل قبول ہوں گی۔ اگر ایک فرض نماز کے بعد دوسری فرض نماز ادا کی گئی ہے تو بعد میں ادا کی جانے والی نماز ناقابل قبول ہوگی۔

تاریخ کے صفحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ جب بغداد گئے تو وہاں ان کی ملاقات حنفی مسلک کے ایک بڑے عالم امام ابو یوسفؒ اور دیگر علماء سے ہوئی۔ امام ابو یوسفؒ، حضرت امام ابو حنیفہؒ کی وفات کے بعد ان کے جانشین تھے۔ امام شافعیؒ نے ان حضرات سے مختلف اہم موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا۔ جب نماز کا وقت ہوا تو امام شافعیؒ نے بغیر کوئی سوال کیے ان حضرات کے ساتھ نماز ادا کی۔

آپ کی بستی کی مسجد کے دونوں مسالک کے امام حضرات کو اپنے اپنے مسلک کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کرنی چاہیے اور یہ معلوم کرنا چاہیے کہ دونوں مسالک کن امور میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جب وہ یہ علم حاصل کرلیں گے تو انہیں احساس ہوگا کہ ان کا یہ رویہ درست نہیں تھا۔

جمعہ کی نماز میں تاخیر سے شریک ہونا

سوال: جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لیے میں مسجد میں تاخیر سے پہنچا۔ جماعت شروع ہو چکی تھی۔ میں شامل نماز ہو گیا۔ جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ نماز کا بیشتر حصہ ادا کیا جا چکا ہے۔ ایسی صورت میں جب میں اپنی نماز مکمل کرنے کے لیے کھڑا ہوں تو مجھے کتنی رکعات ادا کرنا چاہئیں؟

جواب: اگر آپ نماز باجماعت میں اس وقت شامل ہوں جب وہ آپ کے شامل ہونے سے پہلے شروع ہو چکی ہو تو اگر امام کے رکوع میں جانے اور واپس کھڑا ہونے سے پہلے آپ شامل ہو گئے ہیں تو آپ کی ایک رکعت ادا ہو جائے گی۔ اگر آپ رکوع کے بعد شامل ہوئے تو آپ کی وہ رکعت ادا شدہ نہیں سمجھی جائے گی۔ بہتر یہی ہے کہ نماز باجماعت میں فوراً شامل ہو لیا جائے اس بات کا لحاظ کیے بغیر کہ جو ارکان ادا کیے جا رہے ہیں وہ آپ کی رکعت میں شمار ہوں گے یا نہیں۔

نماز جمعہ میں امام کے ساتھ نماز ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ نے ایک مکمل رکعت امام کے ساتھ ادا کی ہو۔ بالفاظ دیگر آپ کو لازماً دوسری رکعت کے رکوع میں یا رکوع سے پہلے نماز میں شامل ہو جانا چاہیے۔ اگر دونوں رکعات آپ سے چھوٹ جائیں تو پھر آپ نماز باجماعت کے اختتام پر چار رکعت فرض بطور ظہر ادا کریں گے جو جمعہ کے دو فرض چھٹنے کی صورت میں آپ پر فرض ہیں۔

نماز میں توجہ کا ارتکاز

سوال: میں پابندی سے نماز ادا کرتا ہوں لیکن یہ بہت کم ہوتا ہے کہ میری توجہ عبادت کی طرف مرکوز رہے۔ اس عدم توجہ کی وجہ سے بعض اوقات مجھے نماز کے ارکان کی ادائیگی کے بارے میں شبہ ہو جاتا ہے۔ ازراہ کرم بتایئے کہ ایسی صورتحال میں کیا میری نمازیں مؤثر رہتی ہیں؟

جواب: جب بھی نماز شروع کی جائے تو اپنی پوری توجہ اس کام کی جانب مرکوز رکھنی چاہیے جو اس وقت ادا کیا جا رہا ہے۔ جب قرآن مجید کی آیات کی تلاوت کی جا رہی ہو یا کوئی حرکت کی جا رہی ہو، تو انسان کو اپنی توجہ اسی جانب رکھنی چاہیے۔

قرآنی آیات کی تلاوت کرتے وقت اگر ان کے معنی پر غور کیا جائے تو اس سے توجہ نماز کی جانب مرکوز رکھنے میں مدد ملے گی۔ اگر آپ نے قرآن مجید کی بعض سورتیں بغیر معنی کے یاد کی ہوئی ہیں تو آپ کے لیے بہتر ہوگا کہ ان کے معنی بھی یاد کریں۔ اس طرح جب آپ وہ آیات نماز میں پڑھیں

گے تو ان کے معنی آپ کے ذہن میں ہوں گے اور آپ کی توجہ کسی اور جانب مبذول نہیں ہوگی۔

تاہم اگر کسی شخص کی توجہ نماز کے دوران عبادت کی طرف مرکوز نہیں رہتی اور اس وجہ سے اسے نماز کے ارکان کی ادائیگی کے بارے میں شبہ ہوتا ہے تو اس مسئلے کا ایک آسان حل موجود ہے۔

فرض کیجیے کہ آپ کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے دو رکعات ادا کی ہیں یا تین رکعات ادا کر چکے ہیں... تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دو رکعات کی ادائیگی کا تو آپ کو یقین ہے، البتہ تیسری رکعت کی ادائیگی مشکوک ہے۔ اس صورت میں آپ دو رکعت کی یقینی ادائیگی کی بنیاد پر اپنی نماز جاری رکھیں۔ نماز ختم کرنے سے پہلے تشہد ادا کرنے کے بعد آپ دو مرتبہ سجدہ کرلیں۔ یہ سجدہ آپ کی بھول کی تلافی کے لیے ہوگا۔ سجدہ سہو کے بعد آپ حسب معمول نماز ادا کریں اور مکمل کرلیں۔ اگر آپ سجدہ سہو ادا کرنا بھول جائیں، تب بھی آپ کی نماز ہو جائے گی۔

نماز باجماعت کی گھر پر ادائیگی

سوال: اگر ایک شخص کا گھر قریب ترین مسجد سے خاصے فاصلے پر ہو تو کیا وہ شخص اپنے گھر پر بیوی کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرسکتا ہے۔

جواب: ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ نماز باجماعت مسجد میں ادا کرے۔ اگر پانچ وقت کی ممکن نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ کے لیے کوشش کی جائے۔ تاہم اگر ایک شخص کی نماز باجماعت ادا ہونے سے رہ جائے یا اس کا گھر مسجد سے خاصے فاصلے پر ہو تو وہ اپنے گھر پر بیوی اور خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرسکتا ہے۔ اگر گھر پر صرف بیوی ہے تو بیوی کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی جاسکتی ہے۔ اس صورت میں وہ خود ہی اقامت کہے گا یا اگر خاندان کا کوئی اور فرد موجود ہے تو وہ اقامت کہہ سکتا ہے۔ عورت، مردوں کی نماز کی امامت نہیں کرسکتی، البتہ ایک عورت، عورتوں کی نماز کی امامت کرواسکتی ہے۔

نماز میں طویل سورہ کی تلاوت

سوال: بعض حضرات نفل نماز جلد پڑھ لیتے ہیں کیونکہ وہ نماز کی رکعات کے دوران قرآن مجید کی کسی چھوٹی سورہ کی تلاوت کرتے ہیں یا صرف چند آیتیں پڑھتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ نفل نمازیں ادا کرسکیں۔

دوسری طرف بعض حضرات اپنی نفل نمازوں میں قرآن مجید کی طویل سورہ کی تلاوت کرتے

ہیں لیکن نفل نمازوں کی تعداد کم ہوتی ہے، ان میں سے کون سا طریقہ درست ہے؟

جواب: نماز میں قیام کے دوران قرآن مجید کی تلاوت کی دونوں حالتوں کے بارے میں علماء کی دو مختلف آراء ہیں۔ قیام کی حالت میں کوئی بھی شخص خود کو اللہ کی بندگی میں تصور کرتے ہوئے اپنے آقا کی بڑائی اور کبریائی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اللہ کی حمد وثناء کرتا ہے اور اس کے مالک ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ علاوہ ازیں جب آپ نماز کی ادائیگی کے دوران قیام کی حالت میں ہوتے ہیں تو اس وقت آپ قرآن مجید کی آیات پڑھتے ہیں، یعنی آپ اللہ کا کلام، دہرا رہے ہوتے ہیں۔ قیام کو مختصر کرنے یا طویل کرنے کی دو مختلف صورتوں کے بارے میں یہ اندازہ لگانا نہایت دشوار ہے کہ ثواب کسے زیادہ ملے گا۔ آپ جو بھی طریقہ منتخب کریں وہ درست ہوگا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ قیام کو طویل کرنا اور قرآن مجید کی طویل سورہ کی تلاوت کرنا بہتر ہے۔

غالباً اس مسئلے کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہیے۔ جب آپ نماز ادا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کے اخلاص، توجہ اور اس وقت کے پیش نظر ثواب دیں گے جو آپ اس عبادت کی ادائیگی میں صرف کرتے ہیں۔ ان دو صورتوں میں سے انتخاب کی گنجائش نہایت محدود ہے کہ ایک شخص آدھے گھنٹے میں دو رکعت نفل نماز ادا کرے اور دوسرا شخص اسی وقت میں دس رکعات کو ادا کرے۔ البتہ بعض حالات میں کوئی اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً بعض حضرات رمضان المبارک میں تراویح کی ۸ رکعات اگر ۳۰ منٹ میں ادا کرتے ہیں اور اس کے برخلاف دوسرے حضرات اتنی ہی رکعات ۲۰ منٹ میں ادا کریں تو یہ صاف اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ۲۰ منٹ میں ۸ رکعات تراویح ادا کرنے والوں نے نماز پر کم توجہ دی ہوگی۔ اس قدر عجلت کے ساتھ نماز ادا کرنا احسن طریقہ نہیں ہے۔

نمازِ عشاء کی ادائیگی

سوال: میری عادت ہے کہ عشاء کی نماز نصف شب بستر پر جانے سے قبل ادا کرتا ہوں۔ اس وقت نماز کی ادائیگی کو میں نے زیادہ باثواب محسوس کیا ہے۔ کیا یہ طریقہ غلط ہے؟

جواب: آپ جو کرتے ہیں اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یقیناً یہ بہتر ہے کہ فرض نماز مسجدوں میں باجماعت ادا کی جائے تاہم اگر آپ عشاء کی نماز باجماعت ادا نہیں کرتے اور سونے سے قبل دن کا اختتام نماز عشاء پر کرتے ہیں تو یہ زیادہ باثواب ہے جیسا کہ آپ نے کہا ہے۔ بعض مکاتب فکر کے

مطابق عشاء کی نماز نصف شب کے بعد مؤخر نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے آپ کو اس بارے میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

نماز میں دستک کا جواب دینا

سوال: اگر ایک شخص گھر میں تنہا نماز ادا کر رہا ہو اور نماز کے دوران دروازے پر دستک دی جائے اور نماز ادا کرنے والا اسے اہم سمجھے تو کیا وہ دروازہ کھول سکتا ہے؟

جواب: ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تنہا تھے اور نماز ادا کر رہے تھے کہ میں نے دروازے پر دستک دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دروازے پر آئے، دروازہ کھولا اور واپس جا کر اپنی نماز جاری رکھی۔ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک نماز کی حالت میں چل کر دروازے تک آنا اور دروازے کو کھولنا ایسا عمل ہوا جس سے نماز کی درستگی پر اثر نہیں پڑا۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نماز کی حالت میں ضرورت کے وقت اس طرح چلنے کی اجازت ہے کہ رخ قبلہ سے نہیں پھرنا چاہیے، نماز میں چلتے وقت چہرہ قبلہ رو رکھنا لازمی ہے۔

اگر نماز کی ادائیگی کے دوران ٹیلیفون آجائے تو اس کا جواب بھی اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ گفتگو نہ کی جائے۔ نماز ادا کرنے والے کو ریسیور اٹھا کر اپنے منہ تک لا کر نماز میں پڑھی جانے والی آیات یا دیگر کلمات (ثنا، تکبیر، تسبیح وغیرہ) کی تلاوت جاری رکھنا چاہیے، اس سے ٹیلی فون کرنے والا اندازہ لگا سکتا ہے کہ دوسرے سرے پر جو شخص ہے وہ نماز کی حالت میں ہے، اس طرح وہ انتظار کرے گا تاکہ مذکورہ شخص اپنی نماز ختم کر کے بات کر سکے۔

نماز کی جگہ پر تصویر

سوال: ہماری کمپنی میں مسلمان ملازمین نماز باجماعت کی ادائیگی کے لیے جو کمرہ استعمال کرتے ہیں وہ دن کے دیگر اوقات میں مختلف کاموں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کمرہ کی ایک دیوار پر پرائمری اسکول کے بچوں کی تصویر ہے۔ کیا اس کمرے کو نماز کے لیے استعمال کرنا درست ہے؟

جواب: جی ہاں! اس کمرے کو نماز کے لیے استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ تصویریں اتارنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ تصویر غیر شائستہ نہ ہو۔ اکثر لوگ فوٹو گرافی کو اس

حدیث کی روشنی میں دیکھنے کی غلطی کرتے ہیں جس میں ''شبیہ سازی'' کی مذمت کی گئی ہے، اس غلط فہمی کی وجہ شاید یہ ہے کہ جدید عربی میں ''شبیہ سازی'' کا لفظ فوٹو گرافی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ اسلام میں کسی چیز کی ''ممانعت'' کا معاملہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے، کیونکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کسی چیز کو جائز یا ناجائز قرار دے سکتے ہیں، اس لیے ہم اس حدیث کا اطلاق فوٹو گرافی پر اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ یہ بات یقینی طور پر ثابت نہ ہو جائے کہ احادیث میں ایسا مفہوم موجود ہے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ جس وقت قرآن نازل ہوا یا متعلقہ احادیث مبارک ارشاد فرمائی گئیں، اس وقت اس خاص لفظ کے عام معنی اور مفہوم دیکھنے ہوں گے۔ اس زمانے میں فوٹو گرافی کا وجود نہیں تھا اور قرآن مجید اور احادیث میں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ ایسی شبیہوں کے بنانے کے لیے استعمال ہوتا تھا جو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزوں سے ملتی جلتی ہوں۔ بالکل واضح طور پر دیکھا جائے تو وہ لفظ ''بت سازی'' کے لیے اور دیگر مخلوقات کے مجسموں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہ چیز یقینی طور پر اسلام میں منع ہے۔ عام فوٹو گرافی ایک مختلف چیز ہے اور اس کی اجازت ہے۔

ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر نماز کی ادائیگی

سوال: مکہ مکرمہ میں مسجد الحرام میں ادا کی جانے والی نماز ریڈیو اور ٹیلیویژن پر نشر کی جاتی ہے۔ کیا امام کعبہ کی اقتداء میں جدہ، طائف، مکہ یا ریاض میں، ریڈیو اور ٹیلیویژن پر نشر ہونے والی نماز کے ساتھ نماز ادا کی جا سکتی ہے؟

سوال: میں نے ایک شخص کو دیکھا جو گاڑی میں سفر کرتے ہوئے اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے امام کعبہ کی اقتداء میں نماز ادا کر رہا تھا، نماز گاڑی کے ریڈیو پر نشر ہو رہی تھی۔ کیا اس طرح نماز ادا کرنا جائز ہے۔ خیال رہے کہ مذکورہ شخص تمام وقت اپنی نشست پر بیٹھا رہا، دوسرے یہ کہ وقت کا بھی فرق تھا کیونکہ اس وقت گاڑی مکہ مکرمہ سے بہت فاصلے پر تھی۔

جواب: ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والی نماز کے ساتھ ادا کی جانے والی فرض نماز قبول نہیں ہوتی۔ فرض نماز کی ادائیگی کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ پہلی یہ کہ امام اور مقتدی کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ نہیں ہونا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ فاصلہ جس کا اندازہ لگایا گیا ہے وہ تین سو میٹر کے لگ بھگ ہے۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ امام اور مقتدی کے درمیان کوئی ایسی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے جو مقتدی کے امام تک پہنچنے میں مانع ہو (اگر مقتدی امام تک پہنچنا چاہے) چنانچہ اگر دریا کے

ایک کنارے پر نماز باجماعت ادا کی جارہی ہو تو دریا کے دوسرے کنارے کے لوگ اس جماعت میں شریک نہیں ہو سکتے، خواہ دریا کا پاٹ کتنا ہی کم چوڑا کیوں نہ ہو۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں وہ مقصد ذہن میں رکھنا چاہیے جو مسجد میں نماز باجماعت کی ادائیگی میں مضمر ہے۔ اس بات سے سب ہی واقف ہیں کہ باجماعت نماز ادا کرنے کا ثواب، تنہا نماز پڑھنے کے مقابلے میں ۲۵ گنا زیادہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باجماعت نماز کی ادائیگی کو اس قدر اہمیت دی کہ ایک نابینا شخص کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس شخص سے پوچھا کہ "کیا تم اذان کی آواز سن سکتے ہو۔" اور جب مذکورہ شخص نے اس کا جواب اثبات میں دیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "پھر تم کیسے مسجد سے دور رہ سکتے ہو۔" اس حدیث سے نماز باجماعت کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی معاشرے کے درمیان سماجی تعلقات کو مستحکم بناتی ہے۔ لوگ جب دن میں پانچ مرتبہ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی غیر حاضر ہو تو اس کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ اس طرح ایک مسجد کے نمازیوں میں برادری کا سا احساس پیدا ہوتا ہے اور ایک ایسی محبت اور بھائی چارگی جنم لیتی ہے جس کی بنیاد عقیدہ ہے۔ یہ مقصد گھروں پر بیٹھ کر یا گھروں میں ریڈیو ٹی وی پر نشر ہونے والی نماز کے ساتھ نماز ادا کر کے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ نماز باجماعت کی ادائیگی کے لیے لوگوں کا حقیقی طور پر موجود ہونا ضروری ہے۔ یہ لوگ نماز کے بعد آپس میں بات چیت کر سکیں، ایک دوسرے کی خیریت دریافت کر سکیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو کر آپس کے مسائل حل کر سکیں۔

چلتی ہوئی گاڑی میں سفر کرنے کے بارے میں علماء کی وہی رائے ہے، جو اونٹ یا گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر نماز ادا کرنے کے بارے میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اونٹ اور گھوڑے ہی سواری کے لیے استعمال ہوتے تھے اور آنحضرتؐ کی سنت سے یہ ثابت ہے کہ آپؐ نے نفل نمازیں، اونٹ پر سفر کے دوران ادا کیں لیکن ایسی کوئی روایت نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرض نماز سواری پر ادا کی۔ سفر کے دوران جب بھی نماز کا وقت ہوا، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سواری سے اتر کر فرض نماز ادا کی۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہوئی کہ سفر کے دوران چلتی ہوئی سواری پر نفل نمازیں ادا کی جا سکتی ہیں لیکن فرض ادا نہیں کیے جا سکتے۔

یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ سفر کے دوران ظہر اور عصر کی نمازیں ملا کر پڑھی جا سکتی ہیں اور دونوں نمازوں کے فرض دو، دو رکعت تک مختصر کیے جا سکتے ہیں، اسی طرح مغرب اور عشاء کی

نمازیں بھی ملا کر پڑھی جاسکتی ہیں۔ یہ رعایت ہمیں سفر کے دوران یہ سہولت مہیا کرتی ہے کہ جب قیام کریں تب نماز ادا کرلیں۔ سفر کے جدید ذرائع، ریل اور طیارے میں نماز کی ادائیگی اس سے مستثنیٰ ہے۔ فضائی سفر میں جب آٹھ یا دس گھنٹہ کا مسلسل سفر درپیش ہو اور طیارے کی روانگی اور آمد کے اوقات موزوں نہ ہوں تو اس صورت میں طیارے کے اندر اپنی نشست پر بیٹھ کر یا ترجیحاً کسی کشادہ جگہ میں تمام ارکان (قیام، رکوع، سجدہ، قعدہ) کی ادائیگی کے ساتھ نماز ادا کی جاسکتی ہے۔

تشہد کے دوران شہادت کی انگلی کی حرکت

سوال: نماز کی دوسری اور چوتھی رکعت میں تشہد کے دوران مختلف حضرات شہادت کی انگلی کو مختلف طریقے سے حرکت دیتے ہیں۔ کون سا طریقہ صحیح ہے؟

جواب: تشہد کے دوران سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی کی حرکت میں فرق کسی اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ مختلف علماء نے مختلف طریقوں کی نشاندہی کی ہے جس طرح بھی انگلی کو حرکت دی جائے یا بالکل حرکت نہ دی جائے، نماز ادا ہوجاتی ہے۔

بار بار سفر اور قصر نماز کی رعایت

سوال: میری مستقل رہائش الخبر میں ہے لیکن حال ہی میں عارضی طور پر مجھے جبیل میں تعینات کردیا گیا ہے۔ ہر تیسرے دن مجھے الخبر واپس جانا ہوتا ہے اور اختتام ہفتہ تک وہیں ٹھہرنا ہوتا ہے۔ ان حالات میں کیا مجھے جبیل میں اپنی نمازیں قصر کرنا چاہئیں؟

جواب: بار بار سفر کرنے سے آپ کا یہ حق متاثر نہیں ہوتا کہ آپ سفر میں اپنی نماز قصر کریں۔ آپ کی رہائش الخبر میں ہے اس لیے جب آپ الخبر میں ہوں تو نمازیں پوری ادا کریں لیکن جب آپ جبیل کا سفر کریں، خواہ یہ سفر چند گھنٹوں کا ہو یا دنوں کا، آپ اپنی نمازیں قصر کرکے پڑھیں گے۔ متعدد بار جبیل جانے سے سفر میں نماز قصر کرکے پڑھنے کی رعایت متاثر نہیں ہوتی۔

مدینے میں نماز باجماعت کی ادائیگی

سوال: جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے وقت صفوں کے درمیان، یا ایک صف میں زیادہ جگہ خالی چھوڑ دینا جائز ہے؟ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ مسجد نبویؐ میں جمعہ کی نماز باجماعت ادا کرتے وقت، بعض حضرات دھوپ سے بچنے کے لیے مسجد کے آس پاس کی دکانوں میں گروپ کی شکل میں نماز ادا

کرتے ہیں جن میں نمازیوں کی تعداد تین سے دس تک ہوتی ہے۔ ان حضرات کا مرکزی جماعت کی صفوں سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا۔ ایک اور بات جو دیکھنے میں آئی وہ یہ ہے کہ افریقہ سے تعلق رکھنے والی خواتین جمعہ کی نماز مسجد سے کافی فاصلے پر ادا کرتی ہیں لیکن ان کی نماز بھی باجماعت ہوتی ہے اور وہ امام مسجد نبویؐ کی امامت ہی میں نماز پڑھتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا نماز باجماعت کی یہ صورتیں جائز ہیں؟

جواب: باجماعت نماز کی ادائیگی کی عام اور زیادہ قابل ترجیح صورت یہ ہے کہ صفیں ایک دوسرے سے قریب ہوں اور خود صفوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہو۔ ایک صف میں کھڑے ہوئے نمازیوں کا شانہ ملا ہوا ہونا چاہیے۔ درمیان میں فاصلہ بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ عام حالت میں جبکہ باجماعت نماز ادا کرنے والے تمام افراد مسجد کی حدود کے اندر سمو سکتے ہوں یہ باجماعت نماز کی آئیڈیل صورت ہے۔

جب باجماعت نماز کا اجتماع بہت بڑا ہو اور مسجد (یہاں مسجد کا مطلب کوئی بھی مسجد ہے خصوصیت کے ساتھ مسجد نبویؐ مراد نہیں ہے) کی گنجائش سے زیادہ ہو تو نمازی مسجد سے باہر بھی صف بندی کر سکتے ہیں۔ اگر مسجد کے فوراً باہر کوئی سڑک ہے تو سڑک چھوڑ کر اس کے بعد کے علاقے میں بھی صف بندی کی جاسکتی ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک اگر درمیان میں کوئی ندی یا دریا یا ایسی رکاوٹ آجائے جس کو عبور کرنا دشوار ہو تو ندی، دریا یا اس دشوار رکاوٹ کے دوسری جانب کے افراد رکاوٹ کے اس جانب امام کی امامت میں نماز ادا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسجد نبویؐ کے اطراف جو حضرات اپنی دکانوں میں نماز ادا کرتے ہیں ان کا یہ عمل جائز ہے۔ یہ نماز کی ادائیگی کا مثالی طریقہ تو نہیں لیکن ناجائز بھی نہیں ہے۔ ان دکانوں اور مسجد کے درمیان کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے۔ دوسری جانب ان حضرات کا یہ عذر کہ وہ دھوپ کی شدت اور لو کے خطرے سے بچنے کے لیے ایسا کرتے ہیں، ایک جائز عذر ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ پسند نہیں فرماتے کہ اس کے بندے عبادت کی ادائیگی میں بیماری کا خطرہ مول لیں۔ موسم گرما میں دوپہر کے وقت مدینہ میں شدت کی دھوپ ہوتی ہے، لو کے خطرے سے بچنے کی کوشش بالکل درست ہے۔ جیسا کہ آپ نے خود اتفاق کیا ہے کہ باجماعت نماز کے دوران خواتین نمازیوں کی صفیں، مردوں کی جماعت کے عقب میں ہوتی ہیں۔ اگر اس صورت میں فاصلہ پیدا ہوتا ہے اور وہ فاصلہ زیادہ ہے تو اس میں کسی نقصان کا احتمال نہیں ہے۔ میرے خیال میں افریقی خواتین اس بات کو یقینی بنانے کے لیے فاصلہ زیادہ رکھتی ہیں کہ ان کے بعد مردوں کی کوئی صف موجود نہیں ہے۔ ان کا یہ طریقہ بالکل درست ہے۔ /

نماز میں قیام اور قعدہ کا صحیح طریقہ

سوال: فرض نماز میں کس طرح کھڑا ہونا چاہیے؟ لوگ نماز کے دوران قعدہ کی حالت میں بھی مختلف طریقوں سے بیٹھتے ہیں۔ صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب: نماز کے دوران لوگ جتنے طریقوں سے بیٹھتے ہیں ان سب کی اجازت ہے۔ تاہم تین رکعت یا چار رکعت کی ادائیگی کے بعد جب آخری بار تشہد کے لیے بیٹھا جاتا ہے تو اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ بایاں پاؤں دائیں پاؤں کے نیچے ہو اور بایاں کولھا فرش پر ہو۔

فرض نماز کی باجماعت ادائیگی میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ صف سیدھی ہونی چاہیے۔ نماز باجماعت میں ہر صف امام کے بالکل پیچھے اور صف کے درمیان کھڑے ہوئے شخص سے شروع ہوتی ہے۔ صف سیدھی رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ شانے سے شانہ ملا کر کھڑا ہوا جائے۔

وقت پر نماز ادا نہ کر سکنے کا جواز

سوال: میں جس کمپنی میں کام کرتا ہوں وہاں میرے اوقات کار نصف شب سے لے کر اگلے دن بارہ بجے تک ہیں۔ کمپنی کی گاڑی کے ذریعہ گھر سے کمپنی پہنچنے میں چالیس منٹ صرف ہوتے ہیں۔ ان اوقات کار کی وجہ سے میرے لیے دن میں سونا ضروری ہوتا ہے جس کے باعث میں نمازوں کو ان کے وقت پر ادا نہیں کر سکتا۔ میرے بعض دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ظہر کے وقت ادا کر لیا کروں اور ہر نماز کی صرف دو رکعتیں پڑھوں۔ اگر میں اس طرح کروں تو میرا مسئلہ حل ہو جائے گا کیونکہ میں روزانہ عام طور پر ڈھائی بجے دن سے رات ساڑھے نو بجے تک سوتا ہوں۔ لیکن کیا ایسا کرنا جائز ہوگا۔

جواب: اسلام ایک مکمل مذہب ہے اور وہ ایسے طریقے اپنانے کی اجازت دیتا ہے جن پر عمل کر کے لوگ معمول کی مصروفیات میں کوئی بڑی تبدیلی لائے بغیر اپنے فرائض ادا کر سکیں۔

سب سے پہلے نماز کی رکعتوں میں تخفیف کے مسئلے کو لیتے ہیں۔ آپ کے دوستوں نے آپ کو قصر نماز ادا کرنے کا مشورہ اس لیے دیا ہے کہ آپ روزانہ ۴۰ منٹ کا سفر کر کے کمپنی جاتے ہیں۔ اس بات پر بحث کرنے سے قبل کہ آپ کا یہ سفر کیا اس سفر کی تعریف میں آتا ہے جس کے دوران نماز قصر کرنے کی اجازت اسلام نے دی ہے، پہلے یہ دیکھئے کہ آپ جن چار نمازوں کی رکعتوں میں تخفیف کرنا چاہتے ہیں وہ جن اوقات میں آتی ہیں ان اوقات میں آپ گھر پر موجود ہوتے ہیں یا نہیں؟

فرض کریں آپ اپنے کام پر جانے کے لیے سفر کرتے ہیں اور مختلف نمازیں اس دوران میں آتی ہیں، ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آپ کا یہ سفر، نماز قصر کی اجازت دینے کے لیے کافی ہے یا نہیں۔ کار کے ذریعہ چالیس منٹ کا سفر کوئی بڑا سفر نہیں ہوتا۔ ریاض کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچنے میں اس سے زیادہ وقت صرف ہوسکتا ہے لیکن جو شخص ایسا سفر کر رہا ہے وہ اپنے شہر میں ہے اور کسی طرح نماز میں تخفیف نہیں کرسکتا۔ دوسری جانب ایک شخص سفر کے ارادے سے ریاض سے باہر کہیں جاتا ہے اور کار کے ذریعہ چالیس منٹ میں منزل پر پہنچ جاتا ہے تو وہ شخص بجا طور پر نماز قصر کی رعایت کا مستحق ہے۔

آپ کے دوستوں نے آپ کو تمام نمازوں میں دو رکعتیں ادا کرنے کا مشورہ دیا ہے حالانکہ نماز قصر میں صرف ظہر، عصر اور عشاء میں دو رکعتیں ادا کی جاتی ہیں جبکہ فجر کی نماز پوری پڑھی جاتی ہے اور مغرب کی تینوں فرض رکعتیں ادا کی جاتی ہیں۔

آیئے اب اس عملی مشکل کا جائزہ لیتے ہیں جو آپ کو درپیش ہے کہ آپ دن میں سونے کی وجہ سے عصر اور مغرب کی نمازیں ادا نہیں کر پاتے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ نیند، کسی نماز کو بروقت ادا نہ کرنے کا جواز نہیں ہے۔ آج کل ہم میں سے بہت سے لوگ صبح نماز فجر ادا کرنے کے لیے نیند توڑ کر اٹھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ بعض لوگ جلدی سو جاتے ہیں اور صبح جلدی بیدار ہوتے ہیں اور نماز فجر ادا کرنے کے بعد اپنے معمول کے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ یہ سب سے بہتر طریقہ ہے اس طرح ہمیں دن کا اولین حصہ میسر آجاتا ہے جب ہر ایک تازہ دم ہوتا ہے۔ کچھ لوگ صبح جلدی اٹھتے ہیں اور نماز فجر ادا کرنے کے بعد ایک یا دو گھنٹے کے لیے سو جاتے ہیں۔ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو روزانہ نماز فجر کے لیے اٹھنے کی بڑی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے اور کچھ لوگ صبح نماز کے لیے اٹھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے۔

اگر کوئی شخص یہ عزم کر کے سوئے کہ اسے نماز کی ادائیگی کے لیے بروقت بیدار ہونا ہے اور اس نے اس سلسلے میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا ہے تو اس نے اپنی ذمہ داری ادا کردی۔ اگر وہ مقررہ وقت پر بیدار نہ ہوسکا، تو جس وقت وہ جاگے اسے نماز ادا کرلینی چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ نیند میں کوئی کوتاہی نہیں، کوتاہی بیداری میں ہے لہٰذا جب تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز بھول جائے یا سو جائے تو جب اسے یاد آئے اسے پڑھ لے۔ (ترمذی، نسائی)

آپ اگر عصر اور مغرب کے اوقات میں نماز ادا کرنے کے لیے بیدار ہوسکتے ہوں تو آپ کو ایسا کرنا چاہیے لیکن اگر آپ کو ذاتی تجربے سے احساس ہو کہ آپ ایسا نہیں کرسکتے کیونکہ آپ بڑی

گہری نیند سوتے ہیں یا آپ کی نیند ایک بار اچاٹ ہو جائے تو دوبارہ آسانی سے نیند نہیں آتی تو آپ کو کوئی اور طریقہ اختیار کرنا ہو گا۔

آپ یوں کر سکتے ہیں کہ اگر عصر کا وقت آپ کے سونے کے وقت سے کچھ ہی دیر بعد شروع ہوتا ہو جیسا کہ موسم سرما میں ہوتا ہے تو آپ نماز عصر کا وقت ہونے تک کوشش کر کے جاگتے رہیں اور نماز عصر ادا کر کے سوئیں۔ اس طرح آپ کو صرف نماز مغرب کے لیے ایک بار جاگنا ہو گا۔ اسی طرح موسم گرما میں آپ یوں کر سکتے ہیں کہ نماز عشاء کا وقت شروع ہونے سے نصف گھنٹہ پہلے بیدار ہو جائیں اور نماز مغرب ادا کر لیں۔ اس صورت میں بھی آپ کو صرف ایک بار نماز عصر کی ادائیگی کے لیے بیدار ہونا پڑے گا۔

اگر یہ طریقہ آپ کو بہت مشکل محسوس ہو اور اس پر عمل سے آپ کے معمول کے کام بری طرح متاثر ہوں تو آپ دو نمازوں کو ملا کر ادا کر سکتے ہیں، جسے جمع بین الصلاتین کہا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں جب کوئی مجبوری ہو، ظہر اور عصر کی نمازوں کو اور مغرب اور عشاء کی نمازوں کو ملا کر پڑھا جاتا ہے۔ ہر نماز کی فرض رکعتیں پوری یعنی چار ادا کی جائیں گی۔ آپ دوپہر میں سونے سے قبل نماز ظہر اور عصر ملا کر ادا کریں گے، لیکن آپ کی نیت یہ ہونی چاہیے کہ آپ عصر کی نماز پڑھنے کے لیے بیدار ہوں گے، اسی طرح آپ مغرب کی نماز کے لیے بھی جاگنے کی نیت رکھیں لیکن اگر آپ مغرب کے وقت بیدار نہ ہو سکیں تو آپ مغرب کی نماز عشاء کی نماز کے ساتھ ملا کر ادا کر لیں۔

دو نمازوں کو ایک ساتھ ملا کر ادا کرنے کی جو صورت اوپر بیان کی گئی ہے یہ مخصوص حالات کے لیے ہے اور اس کا اطلاق ہر ایک پر نہیں ہوتا۔ یہ رعایت صرف اس شخص کے لیے ہے جو حقیقی دشواریوں سے دوچار ہو۔ ایسا شخص جو آسانی سے بیدار ہو کر نماز پڑھ سکتا ہو اور پھر جا کر دوبارہ سو سکتا ہو اسے اس رعایت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس رعایت سے استفادہ کو عادت بنا لینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی یعنی جن دنوں آپ اپنی کمپنی سے چھٹیوں پر ہوں یا آپ کی ہفتہ وار تعطیل ہو، آپ کو تمام نمازوں کو ان کے مقررہ اوقات میں ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

امام کا بسم اللہ نہ پڑھنا

سوال: بہت سے امام صاحبان جب نماز کی امامت کرتے ہیں تو وہ تلاوت قرآن پاک سے قبل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں پڑھتے حالانکہ ہمیں ہر کام سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنی چاہیے۔ کیا وجہ ہے کہ نماز کے آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں پڑھی جاتی؟

جواب: جو امام صاحبان نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنے سے قبل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز سے نہیں پڑھتے، دراصل وہ اسے ہلکی آواز سے پڑھ لیتے ہیں۔ اس بارے میں فقہاء کرام کی رائے مختلف ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو قرآن کریم کی ہر سورۃ کی آیت کے طور پر مانا جائے یا نہیں۔ دونوں جانب اپنی اپنی رائے کے حق میں معقول شواہد ہیں۔ اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ہم اختلاف کرنے والوں کی رائے کا احترام کریں۔ جہاں تک نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کا تعلق ہے تو چونکہ اسے پڑھا جاتا ہے خواہ بلند آواز سے ہو یا خاموشی سے ہو، اس لیے اختلاف بہت معمولی سا رہ جاتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی کوئی شخص نماز باجماعت ادا کر رہا ہو تو یہ بات اس کے لیے مسئلہ نہیں بنی چاہیے کہ امام صاحب نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز سے پڑھی یا آہستہ سے پڑھی۔ شافعی مسلک کے مطابق (جہری نمازوں میں) امام کا بلند آواز کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور سورہ فاتحہ پڑھنا بہتر ہے لیکن اگر آپ کسی ایسے امام کے پیچھے نماز ادا کریں، جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو آہستگی سے پڑھتے ہوں تب بھی آپ کی نماز بالکل درست ہے، چاہے آپ شافعی مسلک سے تعلق رکھتے ہوں۔

نماز میں سجدہ کرنے کا طریقہ

سوال: نماز میں سجدہ کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب: نماز میں سجدہ کرتے وقت، ہتھیلیاں زمین پر رکھنے سے پہلے آپ کے گھٹنے زمین پر لگنے چاہئیں۔ اس کے بعد ہتھیلیاں اور پھر پیشانی زمین پر رکھنا چاہیے۔ گھٹنوں سے پہلے ہتھیلیوں کو زمین پر رکھنے کے طریقے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے سوائے اس کے کہ آدمی کسی جسمانی تکالیف یا معذوری کی وجہ سے اس طریقے پر عمل کرنے سے قاصر ہو۔ سجدے سے اٹھتے وقت اور کھڑے ہوتے وقت آپ کے گھٹنے سب سے آخر میں فرش سے الگ ہونے چاہئیں۔ سوائے اس کے کہ آپ کو کھڑے ہوتے وقت زمین پر ہاتھ رکھ کر سہارا لینا ضروری ہو۔

دعائے قنوت کب پڑھی جائے؟

سوال: نماز میں دعائے قنوت کس وقت پڑھی جائے؟

جواب: مختلف مکاتب فقہ میں دعائے قنوت کے طریقے اور اوقات مختلف ہیں۔ آپ جس فقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے مطابق پڑھ سکتے ہیں۔ یہ معمولی سا فرق درحقیقت غیر اہم ہے۔

اگر نماز کے دوران امام کا وضو ٹوٹ جائے؟

سوال ۱: اگر نماز باجماعت کے دوران امام کا وضو ٹوٹ جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟

سوال ۲: ایسا عام طور پر ہوتا ہے کہ کوئی شخص نماز باجماعت ہوجانے کے بعد مسجد پہنچتا ہے جہاں وہ کسی کو انفرادی طور پر نماز ادا کرتے دیکھتا ہے، وہ شخص نماز ادا کرنے والے کو امام کا درجہ دیتے ہوئے اس کے ساتھ نماز میں شامل ہوجاتا ہے لیکن بعد میں آنے والے کو علم نہیں ہے کہ جو شخص پہلے سے نماز ادا کررہا ہے وہ فرض ہے یا نفل۔

جواب ۱: اگر کوئی امام نماز باجماعت کی امامت کے دوران محسوس کرے کہ اس کا وضو ٹوٹ گیا ہے یا اسے یاد آئے کہ اس نے نماز سے پہلے وضو نہیں کیا تھا یا وہ کسی اور وجہ سے محسوس کرے کہ خود اس کی نماز فاسد ہوگئی ہے تو اسے مقتدیوں میں سے کسی کو اشارہ دینا چاہیے کہ وہ آگے آئے اور امام بن کر بقیہ نماز مکمل کروائے اور امام صاحب، جن کا وضو ٹوٹ گیا ہے وہ جاکر دوبارہ وضو کرسکتے ہیں۔ نیا امام نماز کو اسی طرح جاری رکھے گا اور خود امام اور تمام مقتدیوں کی نماز درست مانی جائے گی۔ اگر امام صاحب جماعت چھوڑ کر جاتے ہوئے کسی کو امام نہ بنائیں تو مقتدیوں میں سے کوئی آگے بڑھ کر امامت کے فرائض سنبھال سکتا ہے اور بقیہ نماز اسی طرح جاری رکھتے ہوئے مکمل کرواسکتا ہے۔

۲۔ انفرادی نماز کو نماز باجماعت میں بدل دینے کی جو صورت آپ نے تحریر کی ہے وہ قابل قبول ہے۔ بعض مکاتب فکر کے مطابق کوئی شخص نفل نماز ادا کررہا ہے اور کوئی دوسرا شخص آکر اسے امام بناتے ہوئے اس کے ساتھ نماز میں شامل ہوجاتا ہے تو پہلے شخص کو چاہیے کہ وہ آنے والے کو اشارہ کرے کہ وہ نماز میں اس کے ساتھ شریک نہ ہو۔ اگر پہلا شخص اشارہ نہیں کرتا تو آنے والا خیال کرے گا کہ پہلا شخص فرض نماز ادا کررہا ہے اور وہ اس کے ساتھ شامل ہوسکتا ہے۔ بعد میں آنے والے شخص کی نماز بھی درست مانی جائے گی اور دونوں کو نماز باجماعت کا ثواب ملے گا۔

دوسری فقہ کے امام کے پیچھے نماز ادا کرنا

سوال: میں شافعی فقہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ کیا میں ایک حنفی امام کی اقتداء میں نماز ادا کرسکتا ہوں جبکہ ان کے یہاں فجر کی نماز میں قنوت نہیں پڑھی جاتی۔ دوسرے فقہی مسالک کے بارے میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

جواب: کیا آپ نے کبھی یہ ہوتے دیکھا ہے کہ مسجد میں نماز سے پہلے مقتدیوں نے امام سے یہ پوچھا ہو کہ اس کا فقہی مسلک کیا ہے۔ یقیناً ایسا کہیں نہیں ہوتا۔ اگر کبھی وہ امام موجود نہیں ہوتے جو روزانہ نماز پڑھاتے ہیں تو نمازیوں میں سے کسی کو بھی امامت کے لیے مقرر کرلیا جاتا ہے اور اس سے یہ سوال نہیں کیا جاتا کہ وہ کس مسلک سے تعلق رکھتا ہے۔ امام کا انتخاب اس بات پر کیا جاتا ہے کہ وہ قرآن کا کتنا علم رکھتا ہے۔

امام کا تعلق کسی بھی فقہی مسلک سے ہو یا وہ کسی بھی فقہی مسلک پر عمل نہ کرتا ہو، اس کے پیچھے نماز ادا کرنے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ چار فقہی مسالک (حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی) کا آغاز دوسری صدی (ہجری) میں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ فقہی مسالک اس وقت سامنے آئے جب اسلام خاصا مستحکم ہو چکا تھا۔ اس لیے فقہی مسالک کے بارے میں ہمیں اپنا رویہ معتدل رکھنا چاہیے۔ اگر ان فقہی مسالک کے بارے میں شدت کا رویہ اختیار کیا گیا تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے نزدیک ان تمام مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے جو امام ابوحنیفہؒ یا امام مالکؒ سے پہلے اسلام کو اپنا دین قرار دے کر زندگی بسر کرتے رہے؟

آپ کے سوال کا سادہ اور آسان جواب یہ ہے کہ مسجد میں نماز کی ادائیگی کے وقت کسی بھی فقہ کا امام امامت کر رہا ہو، اس کے پیچھے نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ آپ کو امام کا فقہی مسلک دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح امام نماز ادا کرے، اسی طریقے سے آپ بھی نماز ادا کریں۔ صحیح صورتحال یہ ہے کہ فقہی مسالک، محض بعض معمولی امور میں اختلاف رکھتے ہیں، اسلام کے بنیادی عقائد اور تعلیمات کے بارے میں ان میں باہم کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مثال کے طور پر کوئی بھی فقہ یہ نہیں کہتی کہ ہمیں پانچ کی بجائے چار یا چھ دفعہ نماز ادا کرنی چاہیے۔ کوئی فقہ یہ دعویٰ نہیں کرتی کہ مغرب کی نماز میں چار رکعتیں پڑھی جانی چاہئیں۔ ان میں اگر اختلاف رائے ہے تو ثانوی یا دوسرے درجہ کی باتوں پر ہے۔ قنوت اس کی ایک مثال ہے۔ اگر آپ کسی حنفی امام کے پیچھے نماز ادا کر رہے ہیں جو قنوت کو سنت نہیں سمجھتے تو آپ کو بالکل اسی طرح نماز ادا کرنی چاہیے جس طرح امام ادا کر رہے ہیں۔ آپ کی نماز ادا ہو جائے گی اور آپ کو قنوت نہ پڑھنے کی تلافی کے لیے کوئی عمل نہیں کرنا ہوگا۔ آپ کو قنوت پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس کی تلافی کی ضرورت ہے۔ اگر آپ اس کے خلاف کریں گے تو ایک ایسے عمل کے مرتکب ہوں گے جس کی ممانعت ہے یعنی غیر ضروری طور پر امام سے اختلاف کرنا۔ مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور نماز باجماعت میں امام و مقتدیوں کے عمل میں ہم آہنگی مسلمانوں کی خصوصیات ہیں اور اتحاد کی یہ خصوصیت ایک سنت کی ادائیگی سے زیادہ اہم ہے۔

یہ بات بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک مسلمان چار فقہی مسالک میں سے کسی ایک کو لازماً اختیار کرے۔ اگر وہ دین کا کافی علم رکھتا ہے اور اس علم کی بنیاد پر مختلف فقہی مسالک کے درمیان موازنہ کر کے اپنے لیے راہ منتخب کر سکتا ہے تو ایسے شخص کو اپنے علم پر بھروسا کرنا چاہیے۔

جمعہ کی نماز سے رخصت

سوال ۱: اگر کوئی شخص ناگزیر صورتحال کی بناء پر جمعہ کی نماز ادا کرنے سے قاصر ہو تو اسے جمعہ کے روز ظہر کی نماز کس وقت ادا کرنی چاہیے۔ کیا وہ اسے ظہر کا وقت ہوتے ہی ادا کر سکتا ہے یا اسے نماز جمعہ کے ختم ہونے کا انتظار کرنا چاہیے؟

سوال ۲: اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور اس کے کانوں میں اذان کی آواز آئے تو کیا اس کی نماز درست ہوگی یا اسے نماز دہرانا ہوگی۔

جواب ۱: مجھے یہ سوال پڑھ کر شدید حیرت ہوئی ہے۔ جب تک کوئی شخص بیمار نہ ہو یا کسی جسمانی معذوری کا شکار نہ ہو جس کے باعث وہ نماز جمعہ کے لیے مسجد نہ جا سکے، اس وقت تک وہ شخص نماز جمعہ ترک نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے نماز جمعہ کے اوقات میں ہر قسم کے کاروبار اور لین دین کی ممانعت کی ہے۔ اس ممانعت کا اطلاق ہر اس کام پر ہوتا ہے جسے مؤخر کیا جا سکتا ہو، چاہے اس طرح کچھ مشکلات پیدا ہوتی ہوں۔ کسی ایسے شخص کے لیے، جو تندرست ہو اور اس کے پاس نماز جمعہ کی ادا نہ کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ نہ ہو، محض اس بنا پر نماز جمعہ ترک کرنا جائز نہیں کہ اسے کسی فوری نوعیت کے کاروباری معاملے کو نمٹانا ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص واقعی نماز جمعہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہے تو وہ نماز ظہر کے اوقات میں کسی بھی وقت نماز ظہر ادا کر سکتا ہے۔

جواب ۲: اگر کسی شخص کو نماز شروع کرنے کے بعد اذان کی آواز سنائی دے اور اسے یہ احساس ہو جائے کہ میں نے نماز کا وقت ہونے سے پہلے ہی نماز شروع کر دی ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی رکعتیں مکمل کرے اور دو یا چار رکعتوں کے بعد سلام پھیر دے۔ اس کی یہ رکعتیں نفل مانی جائیں گی۔ اگر وہ مسجد میں موجود ہے تو اسے نماز باجماعت کا انتظار کرنا چاہیے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنی چاہیے۔ اگر وہ گھر پر نماز ادا کر رہا ہے تو اسے اب فرض نماز ادا کرنی چاہیے کیونکہ وہ اس سے قبل جو نماز ادا کر رہا تھا وہ نفل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

غیر مسلم ملک میں نماز جمعہ کی ادائیگی

سوال۱: اگر کوئی مسلمان شخص کسی ایسے ملک میں ہو جہاں کوئی مسجد نہ ہو، نماز جمعہ کا کوئی اہتمام نہ ہوتا ہو اور وہاں مسلمان بھی بہت تھوڑی تعداد میں ہوں تو اس شخص کو کیا کرنا چاہیے؟

سوال۲: نماز عصر کے بعد قیلولہ کرنا یا سو جانا کیوں ناپسندیدہ ہے؟

جواب۱: مسلمان کسی بھی علاقے میں ہوں خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو یا دور دراز واقع ہو، انہیں نماز جمعہ کی ادائیگی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ حنفی مسلک کے مطابق نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے تین افراد کا موجود ہونا کافی ہے۔ دیگر مکاتب فکر کے خیال میں اس غرض سے کم از کم ۱۲ افراد کی موجودگی ضروری ہے جبکہ شافعی مسلک کے مطابق نماز جمعہ کے درست ہونے کے لیے چالیس افراد کا اجتماع ہونا لازمی ہے۔

اگر کسی جگہ تین یا زائد مسلمان ہیں تو انہیں نماز جمعہ کی ادائیگی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کسی بھی ایسی جگہ کو مسجد کا درجہ دیا جاسکتا ہے جہاں تک پہنچنا اور جسے مسجد کے طور پر استعمال کرنا تمام نمازیوں کے لیے آسان ہو۔ نمازیوں میں سے کوئی ایک جمعہ کا خطبہ دے سکتا ہے اور نماز جمعہ کی امامت کرسکتا ہے۔ اگر نمازیوں کی تعداد اس سے بھی کم ہے تب ان پر نماز جمعہ کی شرائط کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مسلمان ایسی صورتحال سے دوچار ہوتو اسے عام دنوں کی طرح جمعہ کے روز بھی نماز ظہر ادا کرنی چاہیے۔ امام حزمؒ کے نزدیک ایک شخص کو بھی نماز جمعہ ہی پڑھنی چاہیے اسے خود ہی خطبہ دینا ہوگا اور جمعہ کی نماز ادا کرنی ہوگی۔

جواب۲: عصر کی نماز کے بعد قیلولہ یا جھپکی لینا اس لیے ناپسندیدہ ہے کہ جسم پر اس کے برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ آپ خود نوٹ کرسکتے ہیں کہ اگر آپ عصر کے بعد سو جائیں تو جب آپ بیدار ہوں گے، آپ خود کو تازہ دم محسوس نہیں کریں گے۔

نماز عشاء میں وتر کی اہمیت

سوال: براہ کرم نماز عشاء میں وتر کی اہمیت پر روشنی ڈالیے؟

جواب: بعض فقہاء کے نزدیک رضاکارانہ پڑھی جانے والی نمازوں میں وتر سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اسے واجب کا درجہ دیتے ہیں۔ یعنی پانچ وقت کی فرض نمازوں سے

قریب تر۔ بہرحال آپ کسی بھی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں، آپ کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں فجر کی سنتیں اور وتر کی نماز کبھی ترک نہیں کی ہیں۔

نماز کے دوران رقت طاری ہونا

سوال: نماز باجماعت کے دوران جب امام قرآنی آیات کی تلاوت کرتے ہیں تو بعض اوقات سننے والے پر رقت طاری ہوجاتی ہے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ خاص طور پر ایسی آیات کی تلاوت کے موقع پر جن میں کافروں کو اللہ کے غضب سے ڈرایا گیا ہو، یا ایمان لانے والوں کو انعامات کی نوید سنائی گئی ہو۔ ازراہ کرم اس صورتحال پر روشنی ڈالیے۔

جواب: نماز کے دوران قرآنی آیات کی تلاوت سننے سے رقت طاری ہونا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہونا ایمان کی علامت ہے جس پر تشویش کی ضرورت نہیں ہے۔ جب بھی یہ صورتحال قدرتی طور پر پیدا ہو اور اس میں تصنع شامل نہ ہو، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ درحقیقت یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ شخص حضوریٔ قلب کے ساتھ نماز ادا کر رہا ہے اور قرآنی آیات میں کافروں کے لیے عذاب اور ایمان لانے والوں کے لیے انعام کی جو بات کہی گئی ہے اس پر صمیم قلب کے ساتھ یقین رکھتا ہے۔

بے نمازی کے لیے موت کی سزا

سوال: ''نماز'' کے موضوع پر ایک ریڈیو پروگرام میں تقریر کرتے ہوئے ایک عالم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص مسلسل تین دن تک پانچ وقت کی نماز ادا نہ کرے تو اسے موت کی سزا دی جاسکتی ہے۔ ازراہ کرم اس مسئلے کے بارے میں اظہار خیال فرمایے۔

جواب: مسلسل تین دن تک پانچ وقت کی نماز ادا نہ کرنے والے کے لیے آپ کے سوال میں کسی کی تقریر کے حوالے سے موت کی جو سزا تجویز کی گئی ہے وہ نہایت احمقانہ ہے۔ بے نمازی کے لیے موت کی سزا تجویز کرنے کا سیدھا سادا مطلب اسلام اور اس کی تعلیمات سے ناواقفیت ہے۔ لیکن میں اس طرز فکر کا اندازہ کرسکتا ہوں جس کے نتیجے میں انہوں نے یہ بات کہی ہے، بشرطیکہ ان کی یہ بات صحیح دہرائی گئی ہے۔ بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ جو شخص نماز ادا نہیں کرتا، وہ کافر ہے۔ اگر ایک شخص مسلمان تھا اور بعد میں وہ اس حالت کو پہنچا (کہ بے نمازی ہوگیا) تو، بعض لوگ دلیل دیتے ہیں کہ ایسا شخص مرتد ہے اور مرتد قابل گردن زدنی ہے۔ لیکن یہ طرز فکر کچھ اس قسم کا ہے کہ جو سفید

ہے وہ دودھ ہے اور چونکہ انڈہ سفید ہے اس لیے انڈہ بھی دودھ ہے۔

آیئے اب ایک ایسے شخص کا جائزہ لیں جو مسلسل تین دن نماز ادا نہیں کرتا۔ علماء کفر کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق یقین سے ہے کہ ایک شخص کسی بات پر یقین رکھتا ہے یا کسی بات کو جھٹلاتا ہے۔ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص ایک ایسی بات کو جھٹلاتا ہے جو اسلام کا لازمی جزو ہے، تو وہ شخص کافر ہے۔ اگر اس اصول کا اطلاق نماز پر کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر ایک مسلمان اس بات کا منکر ہے کہ نماز اسلام کا حصہ ہے یا یہ کہے کہ نماز تو پڑھی جائے لیکن اس تعداد اور اس طریقے سے انکار کرے جس کی تعلیم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے ___ تو ایسا شخص یقیناً کافر ہوگا۔ اگر اسلام قبول کرنے کے تھوڑے عرصے بعد ہی کوئی شخص نماز سے انکار کرے تو یہ شخص مرتد ہوگا۔ ایک اسلامی ریاست میں مرتد کو یہ موقع دیا جاتا ہے کہ اسے مسلمان جج کی عدالت میں پیش کیا جائے اور اس کے معاملے کی غیر جانبدارانہ سماعت ہو۔ اگر قاضیٔ عدالت ضروری سمجھے تو وہ یہ حکم دے سکتا ہے کہ علماء اس شخص سے ملاقات کریں اور اس کے سامنے اسلامی تعلیمات پیش کریں اور اس کے اعتراضات کا جواب دیں۔ اگر اس سب کے باوجود وہ اپنے نظریات پر اصرار کرے تو اسے اپنے موقف پر نظرثانی کرنے اور پھر توبہ کرنے کے لیے تین دن کا موقع دیا جائے اور اگر تین دن بعد بھی اس کے موقف میں تبدیلی نہ آئے تو اسے موت کی سزا دی جا سکتی ہے۔

یہاں یہ وضاحت کرنا چاہوں گا کہ یہ معاملہ کوئی سیدھا سادا معاملہ نہیں ہے بلکہ نہایت پیچیدہ معاملہ ہے۔ یعنی اس کے لیے ضروری ہے کہ متعلقہ شخص نے اپنے ایسے نظریات کی تشہیر شروع کر دی ہو، جو اسلام کے منافی ہوں اور جو اسلامی معاشرے کی اقدار کو سبوتاژ کرتے ہوں۔ اگر متعلقہ شخص اپنے خیالات و نظریات (خواہ وہ کیسے ہی ہوں) کو اپنے تک محدود رکھے تو کوئی بھی اس سے ان کے بارے میں سوالات نہیں کرے گا اور جب اس سے اس بارے میں سوال کیا جائے گا تو اسے اپنی غلطی کی تصحیح کرنے کا ہر موقع فراہم کیا جائے گا۔ ملک کے چوٹی کے علماء کو بلا کر یہ کوشش کی جائے گی کہ وہ اس سے گفتگو کریں اور اسے دلیل کے ساتھ اسلامی عقائد و نظریات کا قائل کریں۔ اگر وہ اس سب کے باوجود اپنے عقائد سے باز نہ آئے تو بے شک اسے موت کی سزا سنا دی جائے لیکن اسے توبہ اور نظرثانی کے لیے تین دن کا موقع ضرور دیا جائے۔ اگر وہ شخص چاہے تو یہ اعلان کر کے سزا سے بچ سکتا ہے کہ وہ اپنے گمراہ کن نظریات سے تائب ہو گیا ہے۔

میں جس بات کی اہمیت واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرے میں مسلم حکومت کو لوگوں کے خیالات و نظریات کا کھوج لگانے سے دلچسپی نہیں ہوتی کہ کون شخص صحیح عقیدہ

رکھتا ہے اور کون اپنے دماغ میں مضحکہ خیز خیالات لیے پھرتا ہے۔ اسلامی حکومت گھروں میں لوگوں کی نگرانی اور تعاقب نہیں کرتی کہ ان کے اصل خیالات و نظریات کو بے نقاب کیا جائے۔ لہٰذا ایک شخص بغیر کسی خوف اور اندیشے کے کسی بھی قسم کے احمقانہ خیالات اور عقائد رکھ سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہمیں ایک واضح اصول بتایا گیا ہے کہ ''دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔''

اگر منحرفانہ خیالات رکھنے والا کوئی شخص (مسلمان) اپنے نظریات کی تشہیر شروع کر دیتا ہے تو درحقیقت وہ اسلامی معاشرے کے بنیادی تصورات کے خلاف بغاوت کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایسے شخص کے عمل کے نتیجے میں معاشرہ اختلاف اور تفریق کا شکار ہو سکتا ہے۔ جب بھی اس قسم کی صورتحال پیدا ہوتی ہے تو اسلام حرکت میں آتا ہے اور ایسے نقصان دہ محرکات کی ان کے آغاز ہی کے وقت روک تھام کر دیتا ہے۔

اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے متعلقہ فرد کو یہ موقع فراہم کیا جائے کہ وہ اپنے باغیانہ نظریات کو تبدیل کرے، سزا سے بچنے کے لیے اسے محض یہ اعلان کرنا ہوگا کہ وہ اپنا سابقہ بیان واپس لیتا ہے خواہ وہ دل میں اپنے نظریات پر یقین ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس عمل سے اسلام کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس نقص امن کو روکا جائے جو ایک شخص کے باغیانہ خیالات سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر وہ شخص اپنے خیالات کو اپنے تک محدود رکھتا ہے تو پھر کسی کو اس کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایمان کی دوسری قسم عمل سے تعلق رکھتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی نافرمانی کے بعض اعمال کو کفر قرار دیا ہے۔ ان کا ارتکاب کرنے والے شخص سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا اور اسے اسلامی رویے کے بارے میں بتایا جائے گا۔ اگر ایک شخص نے اللہ کی نافرمانی کا کوئی ایسا کام کیا ہے جس کی کوئی خاص سزا اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھی ہے ___ اور اس نافرمانی کے عمل کی مطلوبہ تعداد میں گواہی مل جائے یا وہ شخص خود رضاکارانہ طور پر اپنے جرم کا اعتراف کر لے تو اسے مقررہ سزا دی جائے گی۔ اس سزا کو کوئی بھی مقتدر تبدیل نہیں کر سکتا۔ ایسے شخص کے معاملے میں جو نماز ادا نہ کرے، کوئی سزا مقرر نہیں ہے۔

صلوٰۃ التراویح ___ فرض یا نفل؟

سوال: تراویح لازمی عبادت ہے یا نفلی؟ بیشتر مساجد میں رمضان کے دوران تراویح میں قرآن مجید شروع سے آخر تک پڑھا جاتا ہے۔ کیا یہ عمل بھی سنت ہے؟

جواب: تراویح ایک مصدقہ سنت ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ ایک ایسی نفلی عبادت ہے جس کی

ادائیگی پر زور دیا گیا ہے۔ اگر کسی شخص نے اپنی زندگی میں ایک بار بھی تراویح نہیں پڑھی تو واضح ہے کہ تراویح ادا نہ کر کے اس نے خود کو اس عظیم ثواب سے محروم رکھا، جو تراویح ادا کرنے پر اسے حاصل ہوتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح پڑھنے کی ہدایت کی اور سب سے پہلے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح ادا کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے میں صحابہ کرامؓ کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے کہ وہ رمضان کے دوران رات کا کم سے کم ایک حصہ عبادت میں گزاریں۔ تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لازمی قرار نہیں دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص نے رمضان کی راتوں میں خلوص کے ساتھ عبادت کی اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے گناہ معاف فرمادیں گے اور اس سے راضی ہوجائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات واضح طور پر بتادی ہے کہ رمضان میں رات کی عبادت (تراویح) نفلی عبادت ہے۔ رمضان کے دوران تراویح میں قرآن مجید شروع سے آخر تک تلاوت کرنا بھی نفل ہے۔ علماء کا کہنا ہے کہ رمضان میں تراویح میں ایک مرتبہ قرآن مجید پڑھنا بہترین طریقہ ہے۔ جبکہ ایک بار سے زیادہ پڑھنا بعض لوگوں کے لیے بہت زیادہ مشقت کا سبب ہوسکتا ہے اور پورے قرآن مجید کی بجائے کم پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ عبادت گزار مکمل قرآن سننے کی برکتوں سے محروم ہوگئے۔

نماز اور طہارت

سوال: میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ مجھے میٹرنٹی ہوم میں اکثر خواتین کی زچگی کروانی پڑتی ہے۔ اس عمل کے دوران میرے لباس پر بھی ناپاکی کے چند قطرے گر جاتے ہیں۔ کیا میں اپنے اسی لباس کو پہنے پہنے نماز ادا کرسکتی ہوں؟ کیونکہ میں لباس تبدیل کرنے کے لیے گھر نہیں جاسکتی۔

جواب: میرا خیال ہے کہ جو ڈاکٹر زچگی کے عمل کی دیکھ بھال کرتے ہیں وہ عام طور پر اپنے لباس کے اوپر مخصوص گاؤن پہن لیتے ہیں۔ اگر اس گاؤن پر ناپاکی کے قطرے گر جائیں تو آپ اس گاؤن کو اتار کر اپنے اسی لباس میں نماز ادا کرسکتی ہیں۔ کبھی کبھار ایسا ہوسکتا ہے کہ آپ کی شلوار پر بھی ناپاکی کے قطرے گر جائیں جو کہ گاؤن سے پوری طرح ڈھکی ہوئی نہیں ہوتی۔ چونکہ ایسا ہوجانا ممکن ہے اس لیے آپ کو چاہیے کہ ایک صاف ستھری شلوار اسپتال میں لاکر میں رکھا کریں اور نماز کے وقت شلوار تبدیل کرلیا کریں۔ اگر آپ کے اسپتال کے مخصوص حالات کے پیش نظر یہ بھی ممکن نہیں تو آپ شلوار کے اس حصے کو دھولیا کریں جس پر ناپاکی کے قطرے گرے ہوں۔ امید ہے کہ

اللہ تعالیٰ آپ کی عبادات قبول فرمائیں گے۔

نماز مختصر یا طویل؟

سوال: کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ مختصر نمازیں ادا کرتے ہیں اور اپنی نمازوں میں قرآن پاک کی مختصر سورتیں یا چند آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس طرح وہ زیادہ نفل نمازیں پڑھ سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے پر کچھ لوگ قرآن کریم کی طویل سورتوں یا آیات کی تلاوت کو ترجیح دیتے ہیں اور کم نوافل ادا کرتے ہیں لیکن غالباً اتنا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ وقت نفل نمازوں کو دیتے ہیں جتنا وقت پہلی قسم کے لوگ دیا کرتے ہیں۔ ان دونوں میں سے کون سا طریقہ قابل ترجیح ہے؟ اس کے علاوہ مجھ جیسا فرد، جس کی مادری زبان عربی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کسی عرب کے مقابلے میں سجدوں کی حالت میں کم مرتبہ کرسکتا ہے۔ کیا جو شخص اللہ تعالیٰ کی تقدیس اور حمد وثنا زیادہ کرتا ہے، وہ زیادہ اجر پائے گا، حالانکہ وہ بھی اسی باجماعت نماز میں شامل ہے جس میں دوسرے شامل ہیں۔

جواب: نماز کے دوران انسان کب سب سے بہترین حالت میں ہوتا ہے، سجدہ کی حالت یا قیام میں، تلاوت کلام پاک کی حالت، اس بارے میں مختلف علماء کرام کا نقطۂ نظر مختلف ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ سجدہ کی حالت میں انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی عظمت کے اعتراف کا سب سے واضح انداز اختیار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سجدے کی حالت میں اپنے مالک کے سب سے اعلیٰ ہونے کا اعتراف بھی کر رہا ہوتا ہے۔

دوسرے گروہ کی رائے میں قیام کی حالت میں جب آپ تلاوت کر رہے ہوتے ہیں تو آپ اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ کو دہرا رہے ہوتے ہیں۔ جب ہم ان دونوں صورتوں کا موازنہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کسی نتیجے پر پہنچنا دشوار محسوس ہوتا ہے۔ آپ جس صورت کو بھی اختیار کریں مساوی طور پر درست ہوگی تاہم میں ذاتی طور ترجیح اس بات کو دیتا ہوں کہ نماز میں طویل قیام کر کے قرآن پاک کی دیر تک تلاوت کی جائے۔

غالباً کسی کو اس مسئلے پر دیر تک بحث ومباحثہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر آپ عبادت کر رہے ہیں تو عبادت میں آپ جتنی توجہ دیں گے اور جتنا وقت صرف کریں گے، اللہ تعالیٰ اسی اعتبار سے آپ کو اجر عطا فرمائیں گے۔ ایک فرد ہے جو نصف گھنٹے میں نفل نماز کی صرف دو رکعتیں ادا کرتا ہے، دوسری جانب دوسرا فرد ہے جو اتنے ہی وقت میں دس رکعتیں پڑھ لیتا ہے۔ ان دونوں افراد کا موازانہ مشکل ہے۔ اس طرح رمضان المبارک میں کچھ لوگ تراویح کی صرف آٹھ رکعتیں، فرض

کیجیے کہ 30 منٹ میں ادا کرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں کچھ لوگ اتنی ہی وقت میں 20 رکعتیں ادا کر لیتے ہیں۔ 20 رکعتیں پڑھنے والے اتنے کم وقت میں اپنی نماز پر مشکل ہی توجہ دے پاتے ہوں گے۔ ان کے پاس سجدوں کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرنے کا بہت کم وقت میسر ہوگا۔ یہ جلدی میں پڑی گئی نماز ہے جو رسول کریم صلی اللہ کی تعلیمات کے منافی ہے۔

آپ عربی نہ جاننے کی وجہ سے اگر سجدے کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح صرف تین بار ادا کر پاتے ہیں تو آپ کو آپ کی کوشش کا اجر ملے گا اور ممکن ہے کہ یہ اجر اس شخص کو ملنے والے اجر سے کم نہ ہو جو سجدہ کی حالت میں فرض کیجیے، دس مرتبہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر فرد کی نیت سے واقفیت ہیں اور وہ اعمال کا فیصلہ نیتوں کی بنیاد کرتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر فرمادیا ہے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

نماز کی جگہ

سوال: بعض افراد کسی بھی جگہ نماز ادا کرتے ہیں مثلاً کسی فٹ پاتھ پر، کسی احاطے میں یا کھلے یا میدان میں یا کھیت میں۔ کچھ لوگ تو نماز پڑھنے کے لیے جائے نماز، مصلّٰی، کپڑے کی چادر یا کاغذ بھی نہیں بچھاتے حالانکہ جن جگہوں کا میں نے ذکر کیا، ممکن ہے وہ سب کی سب پاک صاف نہ ہوں۔ ایسا کرنا کس حد تک جائز ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو سہولتیں دی ہیں جن کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پوری زمین میرے لیے مسجد (عبادت گاہ) اور پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ بنا دی گئی ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ایک مسلمان اس زمین پر کسی بھی جگہ نماز ادا کرسکتا ہے بشرطیکہ وہ جگہ ناپاک نہ ہو۔ یہ بات اس جانب اشارہ کرتی ہے کہ پاکی تیمم سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے، چنانچہ یہ بالکل جائز ہے کہ ان جگہوں پر نماز ادا کرلی جائے، جن کا آپ نے تذکرہ فرمایا بشرطیکہ ان جگہوں پر کوئی ناپاکی نہ ہو۔ فٹ پاتھ، سڑک کے کنارے، کھیت، میدان یا باغ یا کسی اور جگہ نماز پڑھنا بالکل درست ہے۔ کسی مصلے یا جائے نماز یا چٹائی کی ضرورت نہیں ہے۔

نماز مغرب سے قبل نوافل

سوال: کیا مغرب کی نماز سے قبل نوافل ادا کرنا منع ہے؟ اگر ہم مغرب کی نماز ادا کرنے کے لیے

مسجد میں داخل ہوں تو ہم تحیۃ المسجد کیسے ادا کریں گے؟

جواب: جب سورج غروب ہو رہا ہو تو نماز ادا کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ لیکن مغرب کی نماز کا وقت اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ سورج غروب نہ ہو جائے چنانچہ مغرب کا وقت ہو جانے کے بعد نفل ادا کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے بلکہ یہ مستحب ہے کہ مغرب کی نماز ادا کرنے سے قبل دو رکعت نفل ادا کر لیے جائیں۔

اگر آپ مغرب کے وقت مسجد میں جائیں تو مغرب کا وقت ہو جانے کے بعد آپ دو رکعتیں نفل ادا کریں اور انہی میں تحیۃ المسجد کی نیت بھی کر لیں اس طرح آپ دو رکعت نفل ادا کریں گے لیکن آپ کو چار رکعت نفل کا ثواب ملے گا۔

بعض فقہی مسالک کے نزدیک یہ دو رکعتیں موکدہ نہیں ہیں بلکہ غیر موکدہ ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی نماز ادا کرنے سے قبل ان دو رکعتوں کو صرف کبھی کبھی ادا فرمایا۔

نماز پڑھتے ہوئے آنکھیں بند کر لینا

سوال: میری عادت ہے کہ میں نماز ادا کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیتا ہوں اس طرح مجھے نماز پر اپنی توجہ مرکوز رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ایسا کرنا پسندیدہ نہیں ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حوصلہ شکنی فرمائی ہے۔ کیونکہ یہ یہودیوں کا معمول تھا۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: یہ بات درست ہے کہ نماز کے دوران آنکھیں بند کرنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے تاہم اس کا سبب یہ نہیں ہے جیسا کہ آپ کو بتایا گیا ہے کہ یہودی جو کچھ کرتے ہیں، مسلمانوں کو لازماً اس سے مختلف عمل کرنا چاہیے۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ نماز ادا کرنے والا فرد اپنے اطراف ہونے والے واقعات یا اس تک آنے والی چیزوں سے باخبر رہے۔ اگر کوئی خطرناک کیڑا (غیر خطرناک بھی پسند نہیں کیا جاتا) ایسے فرد کے پاس پہنچ جائے جو کسی میدان یا کھلی جگہ نماز ادا کر رہا ہو اور اگر اس نے آنکھیں بند کر رکھی ہوں تو اسے اس کیڑے کی آمد کا پتا ہی نہ چلے گا شاید آپ کو علم ہوگا کہ اگر نماز میں مصروف کسی فرد کے پاس کوئی سانپ یا بچھو آ جائے تو وہ فرد اس سانپ یا بچھو کو مار سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رات کے وقت کسی کمرے میں روشنی کیے بغیر نماز پڑھنے کو بھی ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔

سورہ فلق میں ہم تاریکی کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں، اس لیے تاریکی میں نماز ادا کرنے کی شدید حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ تاہم اگر کسی کو یہ یقین ہو کہ وہ بالکل محفوظ ہے (لیکن جب

اس عمل کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے تو وہ کس طرح محفوظ ہوسکتا ہے؟) اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے نماز میں اپنی توجہ مرکوز رکھ سکتا ہے تو وہ ایسا کرسکتا ہے، پھر بھی ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ نماز کے دوران آنکھیں بند رکھنے کی عادت نہ ڈالیں۔

کسی ضرورت کی تکمیل کے لیے نماز

سوال: میرے بڑے بھائی گذشتہ دس سال سے سر کے درد میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے بے شمار طبی معائنے، میڈیکل ٹیسٹ کروانے اور ہرقسم کا علاج بھی کروایا مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ جب وہ سردرد میں مبتلا ہوتے ہیں تو تقریباً بے ہوش ہوجاتے ہیں اور کسی قسم کی غذا نہیں لیتے۔ اکثر اوقات جب وہ اگلی صبح بیدار ہوتے ہیں تو سر کا درد غائب ہو چکا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ شدید نقاہت محسوس کرتے ہیں۔ وہ فرض اور نفل عبادات کی ادائیگی پر مثالی توجہ دیتے ہیں لیکن سر کے درد کی وجہ سے اس عرصے میں ایک بھی روزہ نہیں رکھ سکے، اس کی وجہ سے وہ بہت رنجیدہ ہیں۔ ابھی حال ہی میں مجھے صلوۃ الحاجات کے متعلق معلومات حاصل ہوئی ہیں میں نے اپنے بھائی کو اس کے متعلق مشورہ دیا انہوں نے جواباً لکھا کہ وہ اس نماز کے بارے میں پہلے سے جانتے ہیں مگر وہ اس کو ادا نہیں کریں گے کیونکہ وہ اس بات کو عیب سمجھتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی بے انتہا مہربانیوں کے باوجود اس سے اس قسم کی درخواست کریں۔ براہ کرم صلوٰۃ الحاجات کے بارے میں وضاحت فرمائیں اور میرے بھائی کے نقطۂ نظر پر تبصرہ بھی کریں۔

جواب: مجھے آپ کے بھائی کی بیماری کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا بعض لوگ اس قسم کے سردرد میں مبتلا ہوتے ہیں جسے مگرین (درد شقیقہ) کہتے ہیں اور غالباً اس کے متعلق کوئی تسلی بخش وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ آپ کے بھائی صاحب کا مرض شدید نوعیت کا معلوم ہوتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس کا ابھی تک کوئی علاج نہیں دریافت ہوا ہے، البتہ چند دوائیں اس میں کچھ فائدہ دے سکتی ہیں۔

دینی فرائض کی طرف آپ کے بھائی صاحب کی بھرپور توجہ سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ ہمیں اپنی صحت کو فرائض کی ادائیگی سے مربوط کرنا چاہیے۔ مذہبی لوگ بھی بیماری سے اتنے ہی متاثر ہوتے ہیں جتنے کہ دوسرے افراد۔ ایک وائرس یا جرثومہ ایمان رکھنے والے کے جسم میں داخل ہو یا ایمان نہ رکھنے والے کے، دونوں صورتوں میں وہ ایک جیسی بیماری پیدا کرے گا۔ اس کے علاوہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے مومن بندوں کے ایمان کی پختگی کو بیماری کے ذریعے آزماتے ہیں۔ آپ کو یاد

رکھنا چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طویل عرصے کے لیے علیل ہوگئے تھے اور آپؐ نے شدید درد کو ہمت سے برداشت فرمایا تھا کیونکہ آپؐ جانتے تھے کہ یہ آزمائش تھی جس سے انہیں گزرنا تھا یقیناً آپؐ اس آزمائش میں کامیاب ہوئے تھے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضور اکرمؐ کے تمام امراض دور فرمائے اور آپؐ کی تمام خواہشات کو پورا کیا۔ ہم میں سے کوئی بھی خواہ کتنا ہی ایمان والا ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر ایک نبی علیہ السلام کسی بیماری میں مبتلا ہو سکتے ہیں تو کوئی بھی مومن اس سے بھی زیادہ شدید بیماری میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں بیمار آدمی پر روزہ فرض نہیں ہے۔ آپ کے بھائی کی صحت واقعی خراب ہے۔ اگر وہ روزے نہیں رکھ سکتے تو انہیں روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر مسئلہ اتنا شدید اور پرانا ہے جیسا کہ آپ کے بھائی کا ہے، تو انہیں رمضان کے ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہوگا۔ انہیں چاہیے کہ اس معیار کا دو وقت کا کھانا جیسا کہ وہ عام طور پر کھاتے ہیں، کسی غریب کو فراہم کردیں۔ اگر کوئی شخص پورے رمضان کے روزے نہ رکھ سکے تو اسے چاہیے کہ وہ ایک غریب کو 29 یا 30 دن تک دونوں وقت کھانا کھلائے، یا 29،30 غریبوں کو دو وقت کا کھانا کھلا دے۔ اگر آپ کے بھائی پچھلے دس برس سے اپنی بیماری کی وجہ سے روزے نہیں رکھ سکے ہیں تو انہیں بغیر کسی تاخیر کے ان روزوں کا فدیہ اس طرح ادا کرنا چاہیے۔ مجھے یہ جان کر بھی تعجب ہوا کہ آپ کے بھائی صلوٰۃ الحاجات ادا کرنے سے ہچکچاتے ہیں جو کہ کسی خاص مقصد یا ضرورت کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ آپ کے بھائی صاحب نے اس کا سبب یہ بتایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ویسے ہی ہمارے لیے اتنا مہربان ہے۔ یہ واقعتاً بالکل صحیح ہے لیکن کون کہتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مہربانیوں کی کوئی حد مقرر ہے۔ وہ ہمیں بے حد و بے حساب نعمتوں سے نواز سکتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی ضروریات کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کریں۔ ہمیں اللہ تبارک وتعالیٰ سے خواہشات بیان کرتے ہوئے شرمانا نہیں چاہیے، سوائے ان خواہشات کے جو ناجائز ہوں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے اچھی صحت، مال و دولت، یا اچھے نصب کے لیے اور اس کا شکرگزار بندہ ہونے کے لیے دعا کرنا بہت مناسب بات ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے اس کی نعمتوں کا سوال اللہ تبارک وتعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ وہ قرآن مجید میں فرماتے ہیں ''تمہارا مالک کہتا ہے مجھے پکارو، میں تمہیں جواب دوں گا۔'' جب ہمیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد کی ضرورت ہو اور اس رب کریم و جلیل سے نہ مانگیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

رہی نماز کی بات تو اس سلسلے میں ایک حدیث موجود ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ہے اگر کسی کو اللہ تبارک وتعالی سے کچھ مانگنا ہو تو وہ پہلے وضو کرے دو رکعت نفل ادا کرے، پھر اللہ تبارک وتعالی کی حمد وثنا بیان کرے، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے پھر یہ دعا پڑھے:

لا الہ الا اللہ الحلیم الکریم سبحان اللہ رب العرش العظیم والحمد للہ رب العالمین اسئلک مرجبات رحمتک و عزائم مغفرتک والغنیمة من کل بروالسلامة من کل اثم لا تدع لی ذنباً الا غفرته ولا هما الا فرجة ولا حاجته هی لک رضاً الا قضیتها یا ارحم الراحمین(ترمذی)

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالی کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بڑے بردبار اور بہت ہی کرم فرمانے والے ہیں، پاک و برتر ہیں اللہ جل شانہ، عرش عظیم کے مالک، شکر اور تعریف اللہ جل شانہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کے پروردگار ہیں۔ میں آپ سے ان چیزوں میں، جو آپ کی رحمت کو واجب کرنے والی اور آپ کی مغفرت کو لازم کرنے والی ہیں اور میں ہر بھلائی میں حصہ اور ہر گناہ سے سلامتی چاہتا ہوں۔ اے اللہ جل شانہ، آپ میرا کوئی گناہ بخشے بغیر اور کوئی دکھ اور غم دور کیے بغیر نہ چھوڑیے اور میری کوئی حاجت جو آپ کے نزدیک پسندیدہ ہو، پوری کیے بغیر نہ رہنے دیجیے، اے رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم فرمانے والے!

ساڑھی اور نماز

سوال: بعض افراد کہتے ہیں کہ ایک مسلمان عورت ساڑھی پہن کر نماز پڑھے تو یہ درست نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کے لباس سے نماز قبول نہیں ہوتی۔ براہ کرم وضاحت فرمائیں۔

جواب: ساڑھی ایک قسم کا لباس ہے جو پاکستان اور بھارت کی خواتین عام طور پر پہنتی ہیں۔ خواتین اسے مخصوص انداز سے اپنے جسم کے گرد لپیٹتی ہیں جو ان کے پورے جسم کو ڈھانک لیتی ہے البتہ بعض خواتین اپنے شکم کا ایک حصہ کھلا چھوڑ دیتی ہیں جو قطعاً درست نہیں ہے۔

قاری کے سوال کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ واضح کرنا ہوگا کہ اسلام کسی خاص لباس پر اپنے اصول نہیں بناتا اور نہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لباس کس نے پہنا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کے چند اصول ہیں۔ جو بھی لباس ان اصولوں کے مطابق ہوگا وہ قابل قبول ہوگا چنانچہ اگر ساڑھی خاتون کے پورے جسم کو ڈھانپتی ہے سوائے چہرے اور کلائیوں کے نیچے ہاتھوں کے، اور وہ شفاف نہیں ہے اور نہ اتنی زیادہ تنگ ہے کہ جسم عریاں ہو، تو ایسی ساڑھی زیب تن کرکے نماز ادا کی جاسکتی ہے۔

میں نے سنا ہے کہ بعض لوگ ساڑھی پر اس لیے اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بغیر سلی ہوئی ہے۔
یہ اعتراض غلط ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق نہیں۔

چالیس دن تک فجر کی نماز

سوال: بعض افراد کا کہنا ہے کہ اگر کوئی مسلسل چالیس دن تک فجر کی نماز ادا کرے تو اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے خصوصی انعام ملتا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: فجر کی نماز روزانہ اپنے وقت پر یعنی صبح صادق اور طلوع آفتاب کے درمیانی وقفے میں ادا کرنا ضروری ہے۔ چالیس دن تک مسلسل نماز پڑھنے میں کیا خاص بات ہے؟ اگر کوئی پچاس یا سو دن تک فجر کی نماز ادا کرے تو کیا وہ اس سے زیادہ خاص بات نہ ہوگی؟ میری رائے میں آپ نے بعض افراد کی کہی ہوئی جو بات لکھی ہے اس میں صداقت نہیں ہے۔

گیلا لباس پہن کر نماز ادا کرنا

سوال: کیا گیلا لباس پہن کر نماز ادا کرنے کی اجازت ہے؟ اگر کوئی فرد پیراکی کر کے آیا ہو اور اس کے لباس پر کوئی ناپاک شے لگ گئی تھی تو کیا وہ اسی لباس میں نماز ادا کر سکتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں پیراکی کرنے سے اس کے لباس کی ناپاکی دور ہوگئی تھی۔

جواب: اگر گیلا لباس پاک ہے تو اس کو پہنے پہنے نماز ادا کرنے کی اجازت ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی فرد بارش میں بھیگتا ہوا چلا جا رہا ہو بارش سے ظاہر ہے کہ اس کا لباس گیلا ہو چکا ہے۔ راستے میں مسجد دیکھ کر وہ نماز پڑھنے کے لیے اندر چلا جاتا ہے اور اسی گیلے لباس کو پہنے ہوئے نماز ادا کر لیتا ہے تو اس کی یہ نماز درست سمجھی جائے گی، البتہ اگر اس کے لباس پر کوئی ناپاک شے لگی ہو تو پہلے اس نجاست کو دور کر لینا ضروری ہوگا۔ پیراکی کی صورت میں، لباس پر لگی ہوئی ناپاکی عام طور پر دور ہو جاتی ہے اگر نجاست ٹھوس قسم کی ہے تو شاید وہ پیراکی سے دور نہ ہو، لہٰذا نجاست سے نجات حاصل کر لینا ضروری ہوگا (اس بات کا خیال رہے کہ پیراکی کا لباس ستر کی حدود کے مطابق ہو)۔

قضا نمازیں

سوال: کام کی کثرت کی وجہ سے دن کے اوقات میں مجھ سے نمازیں قضا ہو جاتی ہیں۔ کام سے

واپس جا کر شام کو تمام قضا نمازیں ادا کرلیتا ہوں۔ ہر نماز کے لیے میں پہلے اذان دیتا ہوں، اقامت پڑھتا ہوں، کیا یہ طریقہ درست ہے۔

جواب: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نماز کو ''وقت سے مشروط'' ایسی عبادت قرار دیا ہے جو ہر مسلمان پر فرض ہے۔ چونکہ اس فرض کی ادائیگی ''وقت سے مشروط'' ہے اس لیے ہر نماز اپنے مقررہ وقت پر ادا کرنا ضروری ہے۔ کام کی کثرت ایسا سبب نہیں ہے جو وقت پر نماز کی ادائیگی کی پابندی سے استثنا دیتا ہو۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ جہاں آپ کام کررہے ہوں، وہاں آپ کو کام کے دوران نماز ادا کرنے کی اجازت نہ ہو۔ ایسی صورت میں آپ کو دوسری ملازمت تلاش کرنا چاہیے۔ اگر ہاتھ میں موجود کام نماز کی وجہ سے مؤخر کرنے سے کام کو نقصان پہنچنے یا کمپنی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں مقررہ وقت پر نماز ادا نہ کرنا قابل معافی ہوگا بشرطیکہ کام مکمل ہوتے ہی وہ نماز ادا کرلی جائے۔ لیکن یہ بات روز کا معمول نہیں ہونی چاہیے۔ ہر شخص کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ نماز مقررہ وقت پر ادا کرے۔ کسی ہنگامی صورتحال میں ظہر اور عصر کی نمازوں کو ملا کر پڑھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں ایک ساتھ ادا کی جاسکتی ہیں۔ لیکن اسے بھی معمول نہیں بنایا جاسکتا۔

روزے کے مسائل

روزہ کس پر فرض ہے، کس پر نہیں ہے؟

رمضان المبارک کے روزے ہر اس مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہیں جو درج ذیل اہلیت رکھتا ہو:

۱۔ جو دماغی اور جسمانی طور پر صحت مند ہو۔

۲۔ سن بلوغت تک پہنچ چکا ہو، جو بالعموم ۱۴ سال کی عمر ہوتی ہے، اس سے کم عمر کے بچوں کو ان کی سہولت کے ساتھ روزہ رکھنے کی ترغیب دینی چاہیے، تاکہ وہ اس کے عادی ہو جائیں اور جب اپنی عمر کو پہنچیں تو ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہوں۔

۳۔ کسی جگہ مستقل مقیم ہو، یعنی اپنے گھر یا کاروبار کی جگہ پر مقیم ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ۵۰ میل یا اس سے زائد فاصلے کے سفر پر نہ ہو۔

۴۔ روزہ سے اس کی دماغی یا جسمانی صحت متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو، بھوک اور پیاس کا احساس، جو روزہ کی وجہ سے ہوتا ہے، وہ اس میں شامل نہیں ہے۔

روزہ نہ رکھنے کی اجازت

روزہ سے رخصت کی جن حالات میں اجازت دی گئی ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ وہ بچے جو بلوغت کی عمر تک نہ پہنچے ہوں۔

۲۔ ہوش وحواس سے عاری شخص یعنی دیوانہ، مجنوں، جس کی حرکات کے لیے اس سے جواب طلب

نہ کیا جا سکتا ہو۔

درج بالا دونوں اقسام کے لوگوں پر روزہ فرض نہیں ہے اور انہیں روزہ نہ رکھنے کے عوض کسی قسم کا کفارہ نہیں دینا ہوتا۔

۳۔ انتہائی ضعیف مرد اور عورت جو ضعیف العمری کی وجہ سے روزہ رکھنے کی قوت نہ رکھتے ہوں، ایسے لوگوں کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے، لیکن ان کے لیے ضروری ہے کہ کم سے کم ایک محتاج شخص کو کم سے کم ایک وقت کا کھانا، ہر نہ رکھے گئے روزے کے بدلے کھلائیں یا اس کھانے کی قیمت ادا کریں۔ اس رعایت کا مطلب یہ ہے کہ ایسے ضعیف افراد بھی جب کبھی روزہ رکھنے کی استطاعت پائیں، خواہ وہ ایک دن کے لیے ہی کیوں نہ ہو، انہیں روزہ رکھ لینا چاہیے۔ انہیں باقی نہ رکھے جانے والے روزوں کا کفارہ دینا ہوگا۔ بصورت دیگر وہ اپنی غفلت کے لیے جوابدہ ہوں گے۔

۴۔ ایسے بیمار افراد جن کے روزہ رکھنے سے ان کی بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ ایسے افراد اس وقت تک اپنے روزے ملتوی کر سکتے ہیں، جب تک ان کی صحت پوری طرح بحال نہ ہو جائے۔

۵۔ ایسے لوگ جو ۵۰ میل یا اس سے زیادہ فاصلے کے سفر میں ہوں۔ مسافر کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے، لیکن اگر کسی نقصان کے بغیر مسافر روزہ رکھ سکتا ہے تو اسے روزہ رکھ لینا چاہیے۔

۶۔ حاملہ خواتین اور ایسی خواتین جو اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہوں، وہ بھی روزہ نہ رکھنے کی سہولت سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں، بشرطیکہ روزہ رکھنے سے انہیں یا ان کے بچے کی صحت اور زندگی متاثر ہونے کا اندیشہ ہو۔ ایسی خواتین کو بعد میں قضا روزوں کے بدلے روزے رکھنے ہوں گے۔

۷۔ ایسی خواتین جو اپنے ایام سے ہوں انہیں روزہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ خواہ وہ روزہ رکھنے کی استطاعت رکھتی ہوں۔ ان خواتین کو ایام سے پاکیزگی کے بعد روزے پورے کرنے ہوں گے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ان تمام امور پر نیک نیتی، اللہ تعالیٰ کے حضور بندگی اور اطاعت کے جذبے اور نیت کے ساتھ عمل کیا گیا ہو۔

روزہ کب ٹوٹتا ہے؟

روزے کے دوران ارادی طور پر کوئی چیز کھانے یا پینے یا تمباکو نوشی کرنے یا منہ کے ذریعہ جسم میں کسی چیز کے داخل ہونے یا مباشرت کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر کسی معقول جواز

کے بغیر ان میں سے کوئی بھی عمل بالا ارادہ سرزد ہوا ہو تو اس کے کفارے کے لیے ہر ایک روزے کے بدلے ساٹھ روزے متواتر رکھنے ہوں گے یا ساٹھ مساکین کو پیٹ بھر کر کھلانا ہوگا۔

رمضان کے روزوں کے علاوہ، عام دنوں میں کسی معقول وجہ کی بنا پر روزہ توڑا گیا ہو تو اس شخص کو بعد میں ہر روزہ کے بدلے ایک روزہ رکھنا ہوگا۔

غلطی سے کھا، پی لینا

اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں غلطی سے کوئی چیز کھا لے یا پی لے یا ایسا فعل انجام دے جس سے روزہ ساقط ہوتا ہو، تو اس شخص کا روزہ نہیں ٹوٹے گا، بشرطیکہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ اس پر اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہو۔

روزے کے احکام

سوال: ازراہ کرم وضاحت فرمایے کہ کیا روزے کی حالت میں مندرجہ ذیل کام کرنے کی اجازت ہے۔ ٹوتھ برش کا استعمال، نہانا، شیو کرنا یا خط بنانا، سر میں تیل لگانا، کریم یا خوشبو استعمال کرنا اور تمباکو نوشی۔

جواب: باوجود اس کے کہ ٹوتھ پیسٹ صرف منہ تک رہتی ہے اور کھائی نہیں جا سکتی، یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا کچھ حصہ حلق سے نیچے اتر جاتا ہے یا نہیں۔ اسی بنا پر تمام علماء روزے کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ کا استعمال ممنوع قرار دیتے ہیں۔ صرف ٹوتھ برش (بغیر ٹوتھ پیسٹ کے) یا ترجیحی طور پر مسواک کا استعمال دن کے پہلے نصف حصے میں کیا جا سکتا ہے۔ تاہم دن کے آخر نصف حصے میں ٹوتھ برش یا مسواک کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے کیونکہ روزے کی حالت میں دن کے آخر نصف حصے میں منہ کے اندر ایک مخصوص مہک پیدا ہو جاتی ہے، ممکن ہے کہ یہ مہک ہمیں پسند نہ ہو لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ روزے دار کے منہ کی یہ مہک اللہ کے نزدیک مشک سے بڑھ کر ہے۔ برش یا مسواک استعمال کرنے سے یہ مہک باقی نہیں رہتی اس لیے تمام مسالک کے علماء نے دوپہر کے بعد روزے کی حالت میں مسواک کا استعمال ممنوع قرار دیا ہے۔

روزے کے دوران غسل کی اجازت ہے خواہ یہ پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے کیا جائے یا صفائی کے لیے یا گرم موسم میں جسم کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے، تاہم غسل کے دوران اس بات کا خیال

رکھنا ضروری ہے کہ پانی حلق سے نیچے نہ جائے۔

روزے میں شیو کرنے، خط بنانے، کریم لگانے اور سر میں تیل استعمال کرنے کی بھی اجازت ہے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی چیز جسم کے اندر داخل نہیں ہوتی، تاہم شیو کرنا، ایک مسلمان کے لیے مذہبی فریضہ نہیں ہے۔ اس لیے اسے کسی بھی دن پسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سگریٹ یا پائپ کے ذریعہ تمباکو نوشی روزے کو ختم کر دیتی ہے کیونکہ منہ سے جسم کے اندر داخل ہونے والی کوئی بھی چیز روزہ برقرار نہیں رہنے دیتی۔ خواہ یہ غذا ہو یا پانی ہو یا تمباکو کا دھواں ہو۔

روزہ اور تیمّم

سوال: روزہ رکھنے کی نیت سے ایک شخص فجر سے پہلے بیدار ہوتا ہے تو خود کو جنابت کی حالت میں پاتا ہے کیا اسے سحری کر کے روزہ کی نیت کر لینی چاہیے۔؟

جواب: اگر ماہ رمضان کا آغاز ہو گیا ہے اور فجر کے وقت کوئی شخص خود کو بیدار ہونے پر حالت جنابت میں پاتا ہے تو وہ سحری کر کے روزہ رکھ سکتا ہے، تاہم جس قدر جلد ممکن ہو، اسے پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے غسل کرنا ہوگا۔ خاص طور پر نماز فجر کی ادائیگی کے لیے سحری کے فوراً بعد یہ ضروری ہوگا۔

روزے میں آنکھوں یا کانوں کی دوا کا استعمال

سوال: کیا روزے کی حالت میں آنکھوں میں یا کانوں میں قطرے والی دوائی ڈالی جا سکتی ہے؟

جواب: بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ روزے میں اگر آنکھ یا کان میں قطرے والی دوا استعمال کی جائے تو اس سے روزہ ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ یہ دوا بالآخر معدے میں پہنچتی ہے۔ یہ بات قابل فہم ہے کہ ماضی میں انسانی جسم اور اس کے اندرونی نظام کے بارے میں پوری طرح واقفیت نہ ہونے کی بنا پر علماء کی یہ رائے ہو۔

جو باتیں روزہ ٹوٹنے کا سبب بنتی ہیں ان میں کھانا، پینا اور جنسی عمل شامل ہے۔ آنکھ یا کان میں دوا ڈالنا نہ تو کھانے کے زمرے میں آتا ہے اور نہ پینے کے۔ امام ابن حزم رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں واضح طور پر کہا ہے کہ چونکہ کوئی شخص آنکھ یا کان کے ذریعہ کھا پی نہیں سکتا اس لیے آنکھ یا کان کی دوا کے استعمال سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ میرے خیال میں یہ نقطہ نظر درست ہے۔

تاخیر سے سحری

سوال: رمضان کے دوران ایک دن میں سحر کے وقت دیر سے اٹھا، لیکن اس تاخیر کا مجھے علم نہیں تھا۔ میں نے معمول کے مطابق سحری کی اور کھانا ختم کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ سحری ختم ہونے کا وقت گزر چکا ہے اور میرے کھانا ختم کرنے سے ۱۵ منٹ پہلے فجر کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ تاہم میں نے روزہ جاری رکھا۔ ازراہ کرم بتایئے کہ یہ روزہ درست ہوگا یا مجھے دوبارہ رکھنا ہوگا؟

جواب: اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ تاخیر سے روزہ شروع ہونے کی وجہ محض ایک غلطی تھی، لہٰذا اس بنا پر روزہ میں تاخیر کی وجہ سے آپ کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ایسے اعمال نظر انداز فرما دیتے ہیں جو غلطی کی وجہ سے، مجبوری کی حالت میں یا بھول کے سبب ہوئے ہوں۔''

یہاں میں یہ وضاحت کرنا چاہوں گا کہ جس دن کا آپ نے تذکرہ کیا ہے اس دن آپ کا روزہ نامکمل رہا۔ چنانچہ وہ مؤثر نہیں ہوا۔ روزہ کے شروع ہونے کا صحیح وقت طلوع سحر ہے جبکہ آپ نے ۱۵ منٹ بعد روزہ شروع کیا۔ لہٰذا آپ کو چاہیے کہ آئندہ رمضان سے قبل آپ ایک دن روزہ رکھ کر اس کمی کو پورا کر لیں۔ تاہم آپ کا وہ عمل بالکل درست تھا کہ تاخیر سے روزہ شروع کرنے کے باوجود آپ نے روزہ جاری رکھا۔ اگر ایک مسلمان کا روزہ کسی وجہ سے غیر مؤثر ہو جائے تب بھی اسے روزے کا احترام کرنا چاہیے اور دوسروں کے سامنے کھانے پینے سے اجتناب برتنا چاہیے۔

رمضان کے چاند کا تاخیر سے اعلان

سوال: بعض اوقات رمضان کا چاند نظر آنے کا اعلان رات گئے بہت تاخیر سے کیا جاتا ہے اور بیشتر لوگ اس وقت تک سو چکے ہوتے ہیں۔ تاہم بعض حضرت اعلان سے بغیر روزہ رکھ لیتے ہیں اور ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر اگلے دن رمضان ہوا تو یہ ان کا فرض روزہ ہوگا بصورت دیگر یہ نفلی روزہ ہوگا۔ ازراہ کرم بتایئے کہ کیا اس طریقے سے روزہ رکھنے کی اجازت ہے؟

جواب: اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طرح کے حالات میں عبادت کے طریقوں کی تعلیم دی ہے۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہمارا دین اور ہماری عبادات صرف وہی ہیں جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے اور عمل کر کے دکھایا ہے اور یہ بات تو ایمان کا جزو ہے کہ اسلام دین کامل ہے۔

رمضان کے روزوں کے بارے میں پیغمبر اسلام نے واضح اصول بیان فرمائے ہیں۔ روزہ رکھنے کے بارے میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہدایت ہے کہ:

''چاند دیکھ کر روزے رکھو اور چاند دیکھ کر روزے ختم کرو۔ اگر (بادلوں کی وجہ سے) ۲۹ شعبان کو چاند نظر نہ آئے تو شعبان کے ۳۰ دن کی گنتی پوری کرو۔'' (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

یہ ایک مصدقہ حدیث مبارک ہے جو رمضان کے روزے رکھنے کے بارے میں بنیادی اصول واضح طور پر بیان کرتی ہے۔

اس حدیث مبارک سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ روزے رکھنے کا طریقہ محض رمضان کے چاند کا طلوع ہونا نہیں ہے بلکہ چاند اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ممکن ہے کہ رمضان کا چاند ہو گیا ہو، لیکن چونکہ دکھائی نہیں دیا، اس لیے روزے شروع نہیں ہوں گے۔ اس ہدایت کی روشنی میں ہمیں طلوع ماہتاب کے وقت چاند دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر مطلع صاف ہو تو غروب آفتاب کے ۲۰،۱۵ منٹ بعد ماہ نو کا ہلال نظر آ جاتا ہے۔ تمام اسلامی ممالک میں حکام کو یہ چاہیے کہ وہ چاند دیکھنے والے گواہوں کو آگے کر کے رویت ہلال کی گواہی دینے کے طریقے کی حوصلہ افزائی کریں اور اس سلسلہ میں سہولتیں بہم پہنچائیں۔ جب اسلامی احکام کے مطابق رویت ہلال رمضان کی شہادتیں مہیا ہو جائیں تب حکام کو اس بات کا اعلان کر دینا چاہیے۔

بالعموم رویت ہلال کے اعلان میں تاخیر کا سبب یہ ہوتا ہے کہ حکام چاند کے دکھائی دینے کے بارے میں، بالکل یقین کر لینا چاہتے ہیں۔ اسی ضمن میں یہ غلطی بھی ہو سکتی ہے کہ چاند تو ہو گیا ہو لیکن دیکھا نہ جا سکا ہو۔ اس صورت میں لوگوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق شک والے دن روزہ رکھنا ممنوع ہے۔ اسی لیے لوگوں کو چاہیے کہ وہ ۳۰ دن پورے کرنے کے لیے ایک دن کا روزہ نہ رکھیں کیونکہ اس سے یہ قباحت پیدا ہو سکتی ہے، کہ بعض لوگوں کے لیے رمضان ۳۱ دن کا ہو جائے گا کیونکہ انہوں نے ایک دن پہلے سے روزہ رکھنا شروع کر دیا تھا۔ ۳۱ دن کا مہینہ کسی صورت قبول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس طرح اسلامی عبادات میں ایک ایسی بات کا اضافہ ہو جائے گا جو اس عبادت (رمضان کے روزے) کا حصہ نہیں ہے لہٰذا ہر مسلمان کو اس سے بچنا چاہیے۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس غلطی کے بارے میں کیا کرنا چاہیے کہ رمضان کا نیا چاند نظر آ سکتا تھا لیکن کسی شخص نے آگے بڑھ کر رویت ہلال کی شہادت نہیں پیش کی۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مبارکہ ہماری رہنمائی کرتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''روزے اس دن سے شروع ہوتے ہیں جب لوگ روزہ رکھیں اور عید اس دن واجب ہوتی ہے جب لوگ عید منائیں۔''

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر رویت ہلال میں کوئی غلطی ہوئی ہے تو وہ قابل معافی ہے۔ اللہ تعالیٰ روزے اس دن سے قبول کرتے ہیں، جس دن سے ان کا آغاز کیا جائے۔ شرط یہ ہے کہ جو غلطی ہوئی ہے وہ واقعتاً محض سہو ہو۔ یعنی ہم نے پہلی رمضان کا چاند نہیں دیکھا اور شعبان کے ۳۰ دن پورے کیے اور دوسری طرف ۲۸ رمضان کی شام کو شوال کا چاند نظر آ گیا اور تب احساس ہوا کہ رمضان کا چاند دیکھنے میں غلطی ہوئی۔ اس غلطی کا ازالہ اس طرح کیا جانا چاہیے کہ یکم شوال کو عید الفطر منائی جائے اور رمضان کا ایک روزہ بعد میں رکھا جائے۔ اس قسم کی غلطی کا کوئی بھی ذمہ دار قرار نہیں پائے گا۔

روزے کے دوران غسل

سوال: کیا کوئی شخص جنابت کی حالت میں بھی روزہ رکھ سکتا ہے اور غسل کو طلوع آفتاب کے بعد تک مؤخر کر سکتا ہے۔ ازراہ کرم یہ وضاحت فرمائیے کہ جنابت کی حالت میں کیا دوپہر سے پہلے غسل کرنا ضروری ہے؟

جواب: اگر ایک شخص روزہ رکھنے کے بعد صبح جب سو کر اٹھتا ہے اور خود کو جنابت کی حالت میں پاتا ہے تو اس کا روزہ بدستور قائم رہے گا۔ اسے صرف غسل کرنا ہوگا۔ اسی طرح رات کے دوران جنابت کی حالت اختیار کرنے کے بعد غسل کو صبح تک مؤخر کیا جا سکتا ہے۔ اس حالت میں رہنے سے روزہ متاثر نہیں ہوگا۔ یہ بات ضرور ہے کہ اگر وہ غسل کو مؤخر کرے گا تو فجر کی نماز وقت پر ادا نہیں کر سکے گا۔

دوپہر سے پہلے غسل کر لینا بہتر ہے لیکن اگر ایسا نہ کیا جا سکے تو مزید تاخیر سے روزہ متاثر نہیں ہوگا۔ ایسے معاملے میں اہمیت نماز کی ہے، جو وقت پر ادا کرنی چاہیے۔ بصورت دیگر روزہ قائم رہتا ہے۔ نماز قضا کرنے سے بھی روزے پر اثر تو نہیں پڑتا لیکن یہ بات قابل تعریف ہرگز نہیں ہے۔ نماز اور روزہ، دو الگ عبادات ہیں اور ان دونوں کا اہتمام علیحدہ علیحدہ ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں سے کسی ایک کی بھی عدم ادائیگی ایک ایسا فعل ہے جس سے کسی بھی مسلمان کو گریز کرنا چاہیے۔

سفر کی وجہ سے روزوں کی تعداد کا فرق

سوال: گزشتہ برس جب رمضان کا آغاز ہوا تو میں پاکستان میں تھا۔ چونکہ پاکستان میں رمضان کا چاند سعودی عرب کے مقابلے میں ایک دن بعد نظر آیا تھا اس لیے سعودی عرب کے حساب سے میں نے روزے ایک دن بعد رکھنے شروع کیے تھے۔ رمضان کے دوران میں واپس سعودی عرب آ گیا اور روزہ کا اختتام سعودی عرب میں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے صرف ۲۸ روزے رکھے۔ ایک روزہ میں نے بعد میں ادا کیا لیکن عملاً یہ ہوا کہ پاکستان میں شوال کا چاند، سعودی عرب کے مقابلے میں دو دن بعد نظر آیا۔ اس طرح پاکستان میں ۳۰ روزے رکھے گئے۔ ازراہ کرم یہ بتایئے کہ مجھے بعد میں دو روزے رکھنے چاہیے تھے یا ایک؟

جواب: دو ملکوں کے درمیان سفر اور دونوں جگہ رویت ہلال کے فرق کے پیش نظر ایک روزہ رکھ کر، روزوں کی تعداد پوری کرنا مناسب طریقہ ہے۔ روزوں کا اختتام اس ملک کے لوگوں کے ساتھ کرنا چاہیے جہاں آپ موجود ہوں اور اگر اس طرح آپ کے روزوں کی تعداد ۲۹ سے کم ہو تو ایک یا دو روزے رکھ کر آپ کو اپنے روزے ۲۹ یا ۳۰ کر لینے چاہئیں۔

آپ نے جو صورتحال بتائی ہے اس کے مطابق آپ کو ۲۹ روزے پورے کرنے چاہیے تھے۔ یعنی رمضان کے بعد ایک روزہ رکھنا چاہیے تھا، کیونکہ آپ نے سعودی عرب کے لوگوں کے ساتھ رمضان کا مہینہ مکمل کرلیا تھا۔ لیکن اگر آپ دو روزے رکھتے ہیں تب بھی آپ کو کوئی نقصان نہیں ہے بلکہ فائدہ ہی ہوگا اور آپ کا اضافی روزہ نفلی روزہ تصور کیا جائے گا جس کا اجر آپ کو ملے گا۔

اس معاملے کی ایک دوسری صورت بھی ہے۔ اگر ایک شخص آپ کے برخلاف، مخالف سمت میں سفر کرتا ہے تو اسے بالکل مختلف صورتحال کا سامنا کرنا ہوگا۔ وہ ایک دن پہلے روزے رکھنا شروع کردے گا اور جب سفر کرکے دوسرے ملک پہنچے گا اور وہاں رہتے ہوئے جب ۳۰ روزے مکمل کرے گا تو اسے پتا چلے گا کہ یہاں کے لوگ ابھی مزید روزے رکھ رہے ہیں۔ ایسی صورتحال میں ۳۰ روزوں سے زیادہ روزے نہیں رکھنا چاہئیں لیکن اسے اس امر کی تشہیر بھی نہیں کرنا چاہیے کہ وہ روزے سے نہیں ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ کسی بھی سال کے دوران رمضان کا مہینہ ۳۰ دن سے زیادہ دنوں کا نہیں ہوتا۔

سفر کے دوران روزہ رکھنا

سوال: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی سہولت اور آرام کے لیے سفر کے دوران نمازوں کو مختصر کرنے اور اگر رمضان کا مہینہ ہو تو بیماروں کی طرح مسافر کو بھی اس وقت روزہ نہ رکھنے اور اس کی قضا بعد میں ادا کرنے کی رعایت دے رکھی ہے۔ آج کل کے دور میں ذرائع مواصلات کی ترقی کے نتیجے میں سفر آسان اور آرام دہ ہوگیا ہے۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا آج کل سفر کے دوران روزہ رکھا جاسکتا ہے۔ ایسا کرنے والا اللہ کی حکم عدولی کا مرتکب تو نہیں ہوگا؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے بیمار اور مسافر کو یہ رعایت دیتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

''اور تم میں سے جو بیمار ہو یا سفر میں ہو، اسے چاہیے کہ اتنے ہی دنوں کے روزے بعد میں رکھے'' (جتنے دن کے روزے بیماری یا سفر کی وجہ سے چھوٹ جائیں)۔

قرآن کے کسی حکم کو سمجھنے کے لیے سیاق و سباق پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ آیت میں دو افراد کو رعایت دی گئی ہے، جن میں سے ایک بیمار اور دوسرا مسافر ہے۔ لیکن آیت میں نہ تو بیماری کی شدت اور نوعیت کا ذکر ہے اور نہ سفر کی طوالت اور کیفیت کا۔ بیماری شدید اور پیچیدہ نوعیت کی بھی ہوسکتی ہے اور معمولی سر کا درد بھی بیماری میں شمار ہوتا ہے۔ علماء کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ بیماری کی شدت ضروری نہیں ہے بلکہ کوئی بھی ایسی تکلیف جو روزے کی وجہ سے بڑھ جائے، بیماری ہے اور اس حالت میں اس رعایت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

یہی صورتحال ''سفر'' کی ہے۔ جس کا اطلاق صرف پرانے زمانے کے سخت اور دشوار گزار سفر پر نہیں کیا جاسکتا۔ عالم الغیب کو اس قرآنی آیت کے نازل کرنے سے پہلے بخوبی یہ علم رہا ہوگا کہ انسان سفر کے تیز رفتار اور آرام دہ ذرائع ایجاد کرلے گا۔ اس کے باوجود احکم الحاکمین نے اپنے اس حکم کو خاص شرائط سے مخصوص کرنے کے بجائے عمومی انداز میں بیان فرمایا۔ علماء کے مطابق اس سہولت کا اطلاق ہر نوعیت کے سفر پر ہوتا ہے، خواہ وہ دشوار سفر ہو یا آرام دہ۔ جب کوئی شخص گھر سے نکلے اور اس کی مسافت پر سفر کا اطلاق ہوتا ہو، تو وہ اس سہولت سے استفادہ کرسکتا ہے۔

بعض حضرات اس کے باوجود بیماری اور سفر کے دوران روزے رکھتے ہیں اور وہ اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہ قول دہراتے ہیں کہ جس قدر مشقت برداشت کی جائے ثواب اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ یہ قول تو صحیح ہے لیکن اسے سمجھنے میں وہ غلطی کا شکار ہوجاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو غیر ضروری طور پر تکلیف میں مبتلا کرنا پسند نہیں کرتے اور نہ ہی ان کا بوجھ بڑھانا چاہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ پسند فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بندوں کو جو رعایتیں دی ہیں وہ انہیں استعمال کریں۔ ان سہولتوں کو استعمال نہ کرنا ایک طرح کی نافرمانی ہے۔ یہاں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اگر کوئی شخص سفر کے باوجود رمضان میں روزہ رکھنے کو بعد میں قضا ادا کرنے سے بہتر اور آسان سمجھتا ہے تو اس کا روزہ درست ہوگا۔ ایک مصدقہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ سفر کر رہے تھے، جن میں سے بعض نے روزہ رکھا ہوا تھا اور بعض نے روزہ نہیں رکھا تھا۔ اس کے علاوہ بعض دیگر احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ رمضان میں سفر کے دوران روزہ رکھا جا سکتا ہے لیکن افضل یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی رعایت سے فائدہ اٹھایا جائے۔

روزے میں کھانا چکھنے کی اجازت

سوال: میں نے کہیں پڑھا ہے کہ ایک عورت روزہ کے دوران اپنے شوہر کے لیے کھانا تیار کرتے وقت، کھانا چکھ سکتی ہے۔ اگر اس کا شوہر سخت مزاج کا ہو اور کھانے کا ذائقہ صحیح نہ ہونے پر غصہ کرتا ہو۔ اسی طرح ایک ماں اپنے بچے کے لیے غذا تیار کرتے وقت اسے چکھ سکتی ہے۔ براہ کرم اس مسئلہ پر روشنی ڈالیے۔

جواب: پہلے ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کھانے اور چکھنے میں فرق ہوتا ہے۔ کسی چیز کا ذائقہ چکھنے کے لیے اس چیز کو بڑی مقدار میں کھانا، چبانا اور نگلنا ضروری نہیں ہے۔ اگر کوئی عورت چمچہ بھر غذا اپنے منہ میں ڈالتی ہے، اسے چباتی ہے اور نگل لیتی ہے تو یقیناً اس نے اپنے روزے کو ضائع کر دیا۔ اب یہ حرکت خواہ اس نے اپنے شوہر کے غصہ کی وجہ سے کی ہو یا کسی اور وجہ سے، اس صورتحال میں حکم یہی لاگو ہوگا، کیونکہ اس نے غذا کو کھا لیا ہے، جو روزے کی حالت میں ممنوع ہے۔

کسی غذا کا ذائقہ چکھنے کے لیے اس کو نگلنا ضروری نہیں۔ ذائقہ چکھنے کا کام زبان کی نوک انجام دیتی ہے۔ اگر ایک عورت غذا کا بہت تھوڑا سا حصہ منہ میں لیتی ہے اور ذائقہ دیکھنے کے بعد، غذا حلق تک پہنچنے سے پہلے اسے تھوک دیتی ہے تو اس کا روزہ برقرار رہے گا۔ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ اجازت صرف اس وقت ہے جب اس کی واقعی ضرورت ہو۔ کھانے کے ذائقہ پر شوہر کے غصہ کا اندیشہ ایسی ہی ایک صورت ہے۔

بچے کے لیے غذا تیار کرتے وقت اسے چکھنے کا مسئلہ کم شدید نوعیت کا ہے۔ بچے کی غذا کے

گرم ہونے کا اندازہ ہاتھ سے لگایا جاسکتا ہے جبکہ اس میں شکر یا نمک کی مقدار ــــ اس غذا کے پکانے کے نسخہ سے درست رکھی جاسکتی ہے۔ تاہم اگر اس صورت حال میں بھی غذا کا ذائقہ اوپر بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق پرکھا جائے تو اس سے روزہ ساقط نہیں ہوگا۔

پیشہ ورانہ فرض کی وجہ سے روزہ میں رعایت

سوال: شریعت کے مطابق ایک مسلمان صرف سفر کی صورت میں یا بیماری کی حالت میں رمضان کے روزے قضا کرسکتا ہے۔ لیکن ایک صنعتی کارکن نے، جو ایک سیمنٹ فیکٹری میں بھٹی کے نزدیک کام کرتا ہے، یہ سوال اٹھایا ہے کہ کام کے دوران انتہائی شدید درجہ حرارت کی وجہ سے اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ جلد جلد پانی پیے، ورنہ اس کی صحت کو سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس صنعتی کارکن کے معاملے میں خصوصی نوعیت کے پیش نظر اسے رمضان کے روزوں کے لیے کیا رعایت دی جاسکتی ہے جبکہ حدیث مبارکہ میں کہا گیا ہے کہ روزہ نہ رکھنے کا کوئی بھی متبادل قابل قبول نہیں ہے؟

جواب: رمضان المبارک میں روزہ نہ رکھنے کے بدلے کوئی بھی معاوضہ ناقابل قبول ہونے کی جو بات آپ نے کہی ہے وہ بالکل درست ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے جان بوجھ کر رمضان میں ایک روزہ نہ رکھا، اگر وہ اپنی پوری زندگی روزے رکھتا رہے تو اس نافرمانی کا کفارہ ادا نہیں کرسکتا جو اس نے ایک روزہ نہ رکھ کر کی ہے۔ یہ صرف اس بناء پر ہے کہ روزہ نہ رکھنے والا عمداً اللہ کی حکم عدولی کر رہا ہے۔

کسی شخص کو روزہ نہ رکھنے کی رعایت صرف دو وجوہات کی بناء پر دی گئی ہے۔ ایک سفر اور دوسری بیماری۔ مسافر کو یہ سہولت حاصل ہے کہ اگر وہ چاہے تو رمضان میں سفر کے دوران روزے نہ رکھے، اسی طرح مریض کو روزہ نہ رکھنے کی رعایت ہے۔ ان دونوں صورتوں میں سفر کے اختتام پر یا بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد اتنے ہی روزے رکھنا ضروری ہیں، جتنے روزے رمضان میں قضا ہوئے۔ قضا روزوں کی یہ ادائیگی اگلے رمضان سے قبل ہونا چاہیے۔ جب کوئی شخص قضا روزے رکھتا ہے تو اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ متواتر روزے رکھے۔

سخت حالات میں کام کرنے والوں کے روزوں کے بارے میں سوال اکثر اوقات کیا جاتا ہے۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ نہ ہی اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ ہم سخت مشکلات میں مبتلا ہوں۔ علماء کا کہنا ہے کہ سخت حالات میں کام کرنے والے شخص کو روزوں کے معاملے میں وہی رعایت حاصل ہے جو مسافر اور مریض کو دی گئی

ہے، اور اگر اس کے لیے ممکن ہو تو اسے وہی فدیہ ادا کرنا چاہیے جو مسافر یا مریض کے لیے لازم ہے۔ اگر وہ شخص سال کے ہر دن یکساں سخت حالات میں کام کرتا ہے، تو اسے ہر روزے کے بدلے کسی غریب شخص کو دو وقت کا کھانا کھلانا چاہیے۔ (اور اگر اسے یہ سہولت حاصل ہے کہ چھٹیوں میں روزے رکھ سکے تو متبادل روزے رکھ کر رمضان کے روزے پورے کرنا چاہئیں)۔

لیکن اس معاملے میں اہم بات یہ ہے کہ ''سخت حالات'' کی تعریف کیا ہے۔ سخت حالات کا مطلب جسمانی مشقت نہیں ہے کیونکہ بہت سے لوگ جسمانی مشقت کے باوجود روزے رکھتے ہیں۔ ''سخت حالات'' کی تعریف کو عام نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ بہت سے لوگ اس رعایت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگیں گے۔ ''سخت حالات'' سے مراد کام کی ایسی نوعیت ہے، جس میں روزہ رکھنا ناممکن ہو جائے۔ آپ نے اپنے سوال میں جس شخص کے حالات کا تذکرہ کیا ہے، وہ ''سخت حالات'' کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ یہ خیال رہے کہ یہ رعایت انفرادی سطح پر متعلقہ شخص کے حالات کار کو جانچنے کے بعد ہی دی جا سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی جیسے حالات کار میں دو مختلف افراد کی قوت برداشت مختلف ہو اور زیادہ قوت برداشت رکھنے والا شخص روزہ رکھ سکتا ہو جبکہ دوسرے کے لیے یہ ناممکن ہو۔ ''سخت حالات'' میں کام کرنے والے شخص کو رمضان کے دوران درج ذیل طریقۂ کار اختیار کرنا ہوگا:

پہلی رمضان کو وہ روزہ رکھے گا اور اس کے بعد اس وقت تک روزے رکھتا رہے گا جب تک اس میں قوت برداشت ہے۔ جب حالات کی شدت اس کے لیے اس درجہ پر پہنچ جائے جہاں اس کے لیے روزہ رکھنا ممکن نہ ہو، تو وہ روزے نہ رکھے۔

اگر اس شخص کو ہفتے میں ایک یا دو دن کی چھٹی ملتی ہے تو اسے ان چھٹیوں کے دنوں میں روزہ رکھنا چاہیے۔ رمضان کے بعد اسے اتنے ہی روزے رکھنے ہوں گے جتنے اس نے رمضان میں قضا کیے۔ اگر روزے رکھنا اس کے لیے ممکن نہ ہو تو اسے ہر روزے کے بدلے کسی غریب شخص کو دو وقت کھانا کھلانا ہوگا۔

سخت حالات میں کام کرنے والا شخص یہ بھی کر سکتا ہے کہ اپنی سالانہ چھٹیاں رمضان کے مہینے میں لے۔ اگر یہ ممکن ہو تو وہ اللہ کے حکم کی تعمیل قدرے آرام کے ساتھ کر سکے گا۔ میں یہاں ایک بات کہنا چاہوں گا۔ آپ نے اپنے سوال میں صنعتی کارکن کے حوالے سے جو مسئلہ پیش کیا ہے، اسے، ایک کارخانے اور اس کے کارکنوں کے باہمی معاملے کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ اس قسم کی صنعتوں میں کام کرنے والے محنت کشوں کو رمضان کی آمد سے قبل اپنی انتظامیہ سے مذاکرات کرنے چاہئیں اور افہام و تفہیم سے مسئلے کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ شاید یہ ممکن ہو کہ دن کے بجائے

صرف رات کو کام کرلیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کام کے اوقات کم کر دیے جائیں یا اگر ممکن ہو تو رمضان کے مہینے میں کارخانہ بالکل بند کر دیا جائے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی صورت ممکن ہو تو اسے ضرور اختیار کرنا چاہیے۔ اگر انتظامیہ، اللہ کے حکم کی تعمیل کرنے میں کارکنوں کی مدد کرے گی تو یقیناً اس کا فائدہ اسے بھی حاصل ہوگا۔

روزے رکھنے کے بجائے غریبوں کو کھانا کھلانا

سوال: ازراہ کرم یہ بتایئے کہ روزہ رکھنے کے بجائے کسی ضرورت مند کو کھانا کھلانے کے بارے میں قرآن مجید میں کیا حکم دیا گیا ہے؟

جواب: روزوں کا حکم جب پہلی بار دیا گیا تو یہ صرف چند مہینوں کے لیے تھے۔ ہجرت کے دوسرے سال رمضان کے پورے مہینے کے روزے ہر اس مسلمان بالغ مرد وعورت پر فرض کر دیے گئے جو روزہ رکھنے کی قوت رکھتا ہو۔ صرف دو صورتوں میں سے کسی ایک میں مسلمان کو یہ اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے۔ پہلی صورت سفر کی اور دوسری بیماری کی ہے۔ ان دو وجوہ کی بنا پر روزہ قضا کرنے والے پر یہ لازم ہے کہ وہ رمضان کے بعد جب سفر یا بیماری کی حالت میں نہ ہو تو قضا روزوں کی تعداد کے برابر روزے رکھے۔ قضا روزوں کے لیے یہ سہولت دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے تو وہ مسلسل روزے نہ رکھے، وہ اپنی سہولت سے وقفہ کر کے رکھ سکتا ہے۔ دوسری رعایت یہ ہے کہ قضا روزے رمضان کے بعد فوری طور پر رکھنا لازمی نہیں ہے، یہ آئندہ رمضان کے آغاز سے پہلے سال کے دوران کسی بھی وقت رکھے جا سکتے ہیں۔

اسلام کے ابتدائی دور میں رمضان کے روزے تمام مسلمانوں پر فرض نہیں تھے۔ روزہ رکھنے کی ترغیب دی گئی تھی اور یہ اجازت تھی کہ جو روزہ نہ رکھے وہ روزہ کے بدلے ایک غریب شخص کو ایک دن کا کھانا کھلا دے۔ اس بات کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی کہ ایک سے زائد غرباء کو کھانا کھلایا جائے۔ بعد میں جب روزے فرض کر دیے گئے تو روزہ نہ رکھنے کے بدلے مستحقین کو کھانا کھلانے کی سہولت واپس لے لی گئی۔ اب ہر بالغ مسلمان پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا تاہم ایسے افراد کے لیے یہ سہولت بحال رہی جو کسی معقول عذر کی بناء پر سال بھر روزہ نہیں رکھ سکتے۔ ان میں ضعیف افراد اور مہلک امراض میں مبتلا افراد شامل ہیں جو کمزوری یا بیماری کی وجہ سے پورے سال روزہ نہیں رکھ سکتے۔ ایسے افراد اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ ہر روزہ کے بدلے ایک مستحق شخص کو کھانا کھلائیں۔

یہ رعایت ایسی حاملہ خاتون کو بھی حاصل ہے جو رمضان کے دوران، حمل کی وجہ سے اور زچگی کے بعد بچے کو دودھ پلانے کی وجہ سے پورے سال روزہ نہ رکھ سکتی ہو۔ ممکن ہے کہ اگلے رمضان سے قبل وہ پھر حاملہ ہو جائے اور بچہ کی ولادت کے بعد رضاعت کی وجہ سے پھر روزہ نہ رکھ سکتی ہو۔ یہ صورتحال مسلسل کئی برس جاری رہ سکتی ہے۔ ایسی خاتون کو یہ رعایت مسلسل حاصل رہے گی۔ روزہ کے سلسلہ میں ضعیف اور بیمار افراد اور حاملہ خاتون کو دی گئی یہ رعایت اسلام کی وہ خصوصیت ہے جو اسلامی عبادات پر عمل کو آسان بناتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی فرض عبادت کے لیے جو اجر رکھا ہے وہ بہ مجبوری اس عبادت کو انجام نہ دینے اور اس کے عوض متبادل طریقہ پر عمل کرنے پر بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک اور واضح مثال سفر کے دوران نماز کو مختصر کر کے پڑھنا ہے۔

رمضان میں ٹوتھ برش کا استعمال

سوال: اگر ایک شخص دن میں سونے کے بعد دوپہر ۲ بجے کے قریب بیدار ہوتا ہے تو کیا وہ روزے کی حالت میں منہ دھوتے وقت ٹوتھ برش استعمال کر سکتا ہے۔

جواب: روزے کی حالت میں دانتوں کی صفائی کے لیے ٹوتھ برش استعمال کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس بات کا احتمال رہتا ہے کہ پانی اندر چلا جائے۔ تاہم ٹوتھ پیسٹ کے بغیر ٹوتھ برش استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن مسنون طریقہ یہ ہے کہ دانتوں کی صفائی کے لیے مسواک استعمال کی جائے۔ مسواک کے ہر وقت استعمال کی ترغیب دی گئی ہے تاہم روزے کی حالت میں دوپہر سے سورج غروب ہونے تک استثنا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سبب بیان فرماتے ہوئے یہ کہا کہ اس وقت کے دوران، روزے دار کے منہ کے پچھلے حصے سے جو مہک آتی ہے، وہ اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو کی طرح ہے۔ اگر اس دوران ٹوتھ برش استعمال کیا جائے گا تو یہ مہک متاثر ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ روزے کی حالت میں دوپہر کے بعد دانتوں کو برش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کیونکہ فجر کے بعد سے کوئی چیز کھائی نہیں جاتی۔ سحری کے فوراً بعد دانتوں کو برش یا مسواک کر لینا چاہیے۔ اس کے بعد افطار کے بعد تک صفائی کی ضرورت نہیں رہتی۔

رمضان میں عمرے کی ادائیگی اور روزہ

سوال: اگر میں رمضان کے دوران عمرے کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ جاؤ چاہوں تو مجھے روزہ رکھنا

چاہیے یا نہیں؟

جواب: عمرہ اور رمضان کے روزے دو مختلف عبادات ہیں جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ رمضان المبارک کے دوران کوئی بھی سفر کیا جائے، ہر شخص اس سفر میں روزہ نہ رکھنے کی اس رعایت سے استفادہ کرسکتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے مسافر کو دی ہے۔ اگر وہ شخص (مسافر) سفر کے دوران روزہ نہ رکھے تو اسے رمضان کے بعد سفر سے واپسی پر برابر کی تعداد میں روزے رکھنے ہوں گے۔ عمرے کے لیے کیے جانے والے سفر کے لیے بھی یہ رعایت حاصل ہے۔ عمرہ اس رعایت کو ختم نہیں کرتا۔

یہاں یہ واضح کرنا مناسب ہوگا کہ سفر کی وجہ سے روزہ نہ رکھنے کی جو رعایت دی گئی ہے اس سے استفادہ کرنے کا اختیار متعلقہ شخص پر منحصر ہے۔ ایک مصدقہ حدیث سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کے ہمراہ سفر کر رہے تھے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس سفر میں روزہ رکھا ہوا تھا اور بعض نے روزہ نہ رکھنے کی رعایت سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اگر رمضان میں سفر کے دوران آپ روزہ رکھنا پسند کریں تو روزہ رکھ سکتے ہیں اور اگر روزہ نہ رکھنے کی رعایت سے استفادہ کرنا چاہیں تو یہ بھی کر سکتے ہیں۔

رمضان میں وقت گزارنے کے مشغلے

سوال: کیا اس بات کی اجازت ہے کہ رمضان میں روزہ رکھتے ہوئے وقت گزارنے کے لیے فلمیں اور ٹیلی ویژن دیکھا جائے، ریڈیو سنا جائے، اندرون خانہ کھیلے جانے والے کھیلوں میں مصروف رہا جائے یا ناول اور رسالے وغیرہ پڑھے جائیں؟

جواب: ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ رمضان، عبادات کا مہینہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی ہے کہ رمضان المبارک کے مہینے میں جس قدر بھی وقت ملے، اس میں قرآن مجید کی تلاوت کی جائے، نوافل ادا کیے جائیں یا کائنات میں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوقات پر غور وفکر کیا جائے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ بھی تعلیم دی ہے کہ رمضان کی راتوں میں بیشتر وقت نفل نمازوں میں صرف کیا جائے۔ خاص طور پر تراویح کی نمازوں کا اہتمام کیا جائے۔ اس ماہ مبارک میں کثرت سے عبادات کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مہینے میں نیکیوں کا اجر زیادہ عطا کرتے ہیں۔ لہٰذا رمضان میں وقت گزارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ عبادات

میں مشغول رہا جائے۔

کسی شخص کے ساتھ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی وقت اپنی عبادت پر توجہ مرکوز نہ رکھ سکے۔ اللہ تعالیٰ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ انسان ہر وقت ایک ہی مصروفیت میں مشغول نہیں رہ سکتا اسے تبدیلی درکار ہوتی ہے۔

اگر تبدیلی مصروفیت کے لیے اس قسم کے مشاغل کی ضرورت ہے تو اس معاملے میں ممنوعہ قسم کی مصروفیات سے مکمل طور پر اجتناب کیا جائے اور بالکل بے ضرر اشیاء کا انتخاب کیا جائے جو کسی بھی لغویت سے پاک ہو۔ یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ تبدیلی کی مقدار اس قدر نہ ہو کہ تمام وقت اس کی نذر ہوجائے اور اس مبارک مہینے کی مقدس ساعتوں میں آپ عبادات سے محروم رہ جائیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ رمضان کو اللہ تعالیٰ نے برکتوں اور رحمتوں کا مہینہ قرار دیا ہے۔ اس کا پہلا عشرہ رحمت، دوسرا مغفرت اور تیسرا جہنم کی آگ سے نجات کا عشرہ ہوتا ہے۔ جس مسلمان کو اپنی زندگی میں یہ موقع میسر آرہا ہو، اسے درحقیقت کسی اور جانب توجہ کرنی ہی نہیں چاہیے کیونکہ کسی اور مصروفیت میں وقت صرف کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس مبارک مہینے کی سعادتوں اور اللہ کی رحمت وعنایت سے محروم رہا جائے۔

جمعتہ الوداع

سوال: کیا رمضان المبارک کا آخری جمعہ کسی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے یہاں رمضان المبارک میں جمعتہ الوداع نہایت اہتمام سے منایا جاتا ہے اور اس روز مٹھائی کی تقسیم کی جاتی ہے۔ براہ کرم اظہار خیال فرمایے۔

جواب: رمضان المبارک کے آخری جمعہ کی کوئی مخصوص اہمیت نہیں ہے۔ آپ کی یہ بات درست ہے کہ مسلم دنیا کے بعض علاقوں میں یہ دن خاصے اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے لیکن قرآن مجید یا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہمیں اس بارے میں کوئی بات نہیں ملتی۔

تاہم ہر جمعہ، مسلمانوں کے نزدیک ایک اہم دن ہے، کیونکہ اس دن کا ایک خاص وقت ایسا ہوتا ہے جب دعائیں اور عبادات مقبول ہوتی ہیں۔ اگر ایسا مبارک دن، رمضان کے روزوں کی عبادت کے ساتھ وابستہ ہوجائے تو اس کی برکتیں دوچند ہوجاتی ہیں۔ اگر ایک شخص متقی ہو اور وہ رمضان کے روزے، اس عبادت کے تمام تقاضے پورے کرتے ہوئے رکھتا ہو تو وہ اس کی برکتوں کو، سال کے عام دنوں کے مقابلے میں محسوس کرسکتا ہے۔ رمضان کے روزوں کو اللہ نے منفرد عبادت

قرار دیا ہے اور جب روزے کی یہ عبادت جمعہ کے دن ہو تو عبادت کرنے والا خود کو اللہ سے قریب تر محسوس کرتا ہے۔ اس کی عبادات اور دعاؤں کا جواب ملتا ہے۔ لیکن اس دن کو کسی خاص طور سے منانے کی ضرورت نہیں ہے۔

عید کے دن روزہ

سوال: بعض حضرات کہتے ہیں کہ رمضان کے اختتام پر عید کے دن صبح طلوع آفتاب سے اس وقت تک روزہ رکھنا جب تک امام نماز عید کا خطبہ ختم نہ کرلے، نہایت افضل ہے اور اس عبادت کا رمضان کے پورے روزے رکھنے کے برابر ثواب ملتا ہے۔ براہ کرم یہ فرمائیے کہ کیا یہ بات درست ہے۔

جواب: یہ بات قطعی غلط ہے اسے کسی بھی صورت میں درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بخاری شریف میں مولا ابن ازہر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ عشاء کی نماز ادا کرنے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ ایک دن وہ جب تم روزے ختم کرو اور دوسرا دن وہ جب تم قربانی کا گوشت کھاؤ۔'' اس مستند حدیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عید کے دن روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ بات کیسے درست تسلیم کی جاسکتی ہے کہ عید کے دن روزہ رکھنے کا ثواب رمضان کے روزے سے بھی زیادہ ہوگا۔

شوال کے روزے

سوال: رمضان کے روزے مکمل کرنے کے بعد کیا شوال کے چھ روزے بھی فرض ہیں۔؟

جواب: جی نہیں، شوال کے روزے فرض نہیں ہیں، لیکن رمضان کے بعد شوال کا پہلا دن (عید الفطر) چھوڑ کر باقی ایام میں چھ دن روزے رکھنے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ روزوں کا دس گنا اجر عطا فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کے ایک ماہ کے روزوں کا اجر دس ماہ کے برابر ملتا ہے اور شوال کے چھ روزے، ساٹھ دن (دو ماہ) کے برابر اجر کے حامل ہوتے ہیں۔ اس طرح جس شخص نے پورے رمضان روزے رکھنے کے بعد شوال کے چھ روزے بھی رکھے، اسے پورے سال روزے رکھنے کے برابر ثواب مل جائے گا۔ جو شخص اپنی تمام عمر رمضان اور شوال کے

روزے رکھتا رہا، اللہ تعالیٰ اسے پوری زندگی میں روزے رکھنے کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

رویت ہلال

سوال: رویت ہلال کے مسئلہ پر روشنی ڈالیے۔

جواب: ہر سال رمضان المبارک کے موقع پر رویت ہلال کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے اس دور میں پرانے طریقوں کو چھوڑ کر ریاضی کے طریقوں سے چاند نکلنے کا پتا کیا جاسکتا ہے اس لیے جدید طریقے استعمال کرنا چاہئیں۔ یہ دلیل منطقی تو ہے لیکن اس بارے میں قطعی فیصلہ مسلم علماء کی کوئی کونسل کرسکتی ہے اور مسلمان ممالک کی حکومتیں ہی ایسے فیصلے پر عمل کرسکتی ہیں۔

اسلام دین فطرت ہے، ۱۴ سو سال پہلے اس کا آغاز ہوا اور یہ قیامت تک باقی رہے گا۔ اسلام جب بنی نوع انسان کی زندگی کے معاملات سے بحث کرتا ہے تو وہ رہنمائی کے چند اصول متعین کردیتا ہے تاکہ ہر مسلم معاشرہ اپنی تہذیب اور ترقی کی مناسبت سے ان اصولوں کے مطابق مسائل کا حل تلاش کرلے۔ برخلاف اس کے دوسرے معاملات میں، خاص طور پر ایسے معاملات جو انسان کی اندرونی شخصیت کو متاثر کرتے ہیں اور جن میں عام طور پر کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، اسلام تفصیل کے ساتھ قواعد وضوابط کا نفاذ کرتا ہے جو ہر دور اور ہر زمانے میں موثر ہیں۔

اسلام نے قمری مہینوں کا انتخاب کیا ہے کیونکہ ان کے مطابق کیلنڈر مرتب کرنا آسان ہے اور قدیم دور سے اب تک ہر معاشرے میں قمری مہینوں کا طریقہ ہی رائج رہا ہے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے آغاز کے بارے میں نہایت واضح طور پر ہدایت فرمائی ہے اور رویت ہلال کے مختلف مسائل کے بارے میں رہنمائی کی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک حدیث حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''جب تک نیا چاند نہ دیکھ لو، روزہ نہ رکھو، اور روزے اس وقت تک ختم نہ کرو جب تک اگلا چاند نظر نہ آجائے۔ اگر مطلع ابر آلود ہو تو اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرو۔''

اس حدیث سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ بغیر چاند دیکھے روزہ نہیں رکھنا چاہیے اور اگر رویت ہلال کے بارے میں ابر کی وجہ سے شبہ ہو تو دوسری احادیث کے مطابق اپنی صوابدید پر فیصلہ کرنا چاہیے۔

قمری مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے یا پھر ۳۰ دن کا۔ اس لیے ۲۹ ویں دن کی شام کو کھلی جگہ جاکر چاند دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے اگر مطلع ابر آلود ہوگا تو چاند نظر نہیں آئے گا اور اگلے دن کے بارے

میں یہ شبہ رہے گا کہ وہ شعبان کا آخری دن ہے یا رمضان کا پہلا دن۔ اس شبہ کی وجہ سے بہت سے حضرات روزے کے حق میں فیصلہ دے سکتے ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے:

''جس نے مشکوک دن روزہ رکھا اس نے ابوالقاسمؑ کی اطاعت نہ کی''

(ابوالقاسمؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ہے)

لہٰذا ایک دن پہلے روزہ رکھنا بھی درست نہیں ہے۔ اگر اس شبہ کے دن روزہ رکھ لیا گیا اور حقیقتاً رمضان اگلے دن شروع ہوا اور پھر مہینہ ۳۰ دن کا ہوا تو اس صورت میں روزوں کی تعداد ۳۱ ہوجائے گی جب کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے حکم کے مطابق عمل کیا جائے اور حکم یہ ہے کہ رمضان میں روزے رکھو اور رمضان ۲۹ یا ۳۰ دن کا ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے رویت ہلال، ایک نہایت اہم معاملہ ہے۔ اب ان دوسری متبادل صورتوں پر غور کیجیے جو مطلع ابر آلود ہونے پر، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ممکن ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مہینے میں ۲۹ راتیں ہوتی ہیں۔اس وقت تک روزہ نہ رکھو جب تک اسے (نیا چاند) نہ دیکھ لو۔ اگر ابر کی وجہ سے (چاند) نظر نہ آئے تو گنتی ۳۰ تک مکمل کرو۔'' (پچھلے مہینے کی)

ایک اور حدیث مبارکہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب چاند نظر آجائے تو روزے رکھو اور جب (اگلا چاند) نظر آئے تو روزے ختم کردو۔ اگر مطلع ابر آلود ہو تو شعبان کے ۳۰ دن شمار کرو۔''

ان احادیث سے یہ ثابت ہوگیا کہ شک کی صورت میں شعبان کا چاند ۳۰ دن کا ہوگا اور یہ وہ ''صوابدید'' ہے جس کا پہلی حدیث میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہی طریقہ رمضان کے مہینے کے اختتام کے بارے میں ہے۔ اگر ۲۹ رمضان کو ابر کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے تو رمضان ۳۰ دن کا ہوگا۔

زکواۃ اور زکواۃ الفطر

زکواۃ کن لوگوں کو دی جا سکتی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں نہ صرف زکواۃ کی اہمیت وعظمت اور تاکید بیان فرمائی ہے بلکہ صراحت کے ساتھ اس کے مصارف بھی بیان فرما دیئے ہیں۔ سورہ التوبہ کی آیت ۶۰ میں ارشاد ہے:

''یہ صدقات تو صرف فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے ہیں جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے ہیں جن کی تالیف قلب مطلوب ہو اور گردنوں کو چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے کے لیے ہیں اور خدا کی راہ میں اور مسافر نوازی میں صرف کرنے کے لیے ہیں۔'' (التوبہ۔۶۰)

اس آیت مبارکہ کے مطابق زکواۃ مندرجہ ذیل ۸ قسم کے افراد کو دی جا سکتی ہے یا ان مدوں میں خرچ کی جا سکتی ہے۔

۱۔ فقراء ۲۔ مساکین ۳۔ عاملین زکواۃ ۴۔ تالیف قلب کے لیے
۵۔ غلام کو آزاد کرانے کے لیے ۶۔ قرض دار کا قرض ادا کرنے کے لیے
۷۔ فی سبیل اللہ ۸۔ مسافر کی بہتری اور امداد کے لیے۔

۱۔ فقیر: فقیر سے مراد ہر وہ عورت، مرد ہے جو اپنی گزر اوقات کے لیے دوسروں کی مدد اور تعاون کا محتاج ہو۔ اس میں وہ تمام نادار، محتاج اور معذور داخل ہیں جو مستقل طور پر یا عارضی طور پر مالی تعاون کے مستحق ہوں۔ معذور، اپاہج، یتیم، ضعیف، بے روزگار اور وہ لوگ جو ناگہانی حادثے کا شکار ہو گئے ہو، زکواۃ کی مدد سے ان کی وقتی اعانت بھی کی جا سکتی ہے اور مستقل وظیفے بھی مقرر کیے جا سکتے ہیں۔

۲۔ مساکین: اس سے مراد وہ شریف غرباء ہیں جو نہایت خستہ حال ہوں لیکن اپنی عزتِ نفس اور

شرم کی وجہ سے کسی کے آگے دستِ سوال بھی دراز نہ کرنا چاہتے ہوں۔ اپنی روزی کمانے کے لیے وہ ہاتھ پیر مارتے ہوں لیکن دوڑ دھوپ کے باوجود انہیں ضرورت بھر نہ ملتا ہو اور لوگوں پر وہ اپنا حال کھلنے نہ دیتے ہوں۔

۳۔ عاملین زکوٰۃ: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ اور عشر کی وصولی، حفاظت، تقسیم اور اس کے حساب کتاب کے ذمے دار ہوں۔ خواہ وہ لوگ صاحب نصاب ہوں یا نہ ہوں۔ ہر حال میں ان کی تنخواہیں زکوٰۃ کی مد سے دی جاسکتی ہیں۔

۴۔ مؤلفتہ القلوب: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی تالیف قلب مطلوب ہو۔ اسلام اور اسلامی مملکت کے مفاد میں ان کو ہموار کرنا اور مخالفت کے جوش کو ٹھنڈا کرنا پیش نظر ہو، یہ کافر بھی ہوسکتے ہیں اور وہ مسلمان بھی جن کا اسلام، ان کو اسلام اور اسلامی مملکت کے مفاد کی خدمت پر ابھارنے کے لیے کافی نہ ہو۔ یہ لوگ اگر صاحب نصاب بھی ہوں تو ان کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

۵۔ غلام کو آزاد کرانا: جو غلام اپنے آقا سے یہ معاہدہ کرچکا ہو کہ اگر میں تمہیں اتنی رقم ادا کردوں تو تم مجھے آزاد کردو گے، ایسے غلام کو مکاتب کہتے ہیں۔ مکاتب کو آزادی کی قیمت ادا کرنے کے لیے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ عام غلاموں کو زکوٰۃ کی رقم سے خرید کر آزاد کرنا جائز نہیں (امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک اس مد سے عام غلاموں کو بھی آزاد کرایا جاسکتا ہے) اگر کسی زمانے میں غلام موجود نہ ہوں تو یہ مد ساقط رہے گی۔

۶۔ قرض دار: ایسے لوگ جو قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہوں اور اپنی ضروریات سے بچا کر قرض ادا نہ کر پا رہے ہو۔ خواہ بے روزگار ہوں یا کمانے والے اور ان کے پاس اتنا نہ ہو کہ اگر اپنا قرض چکائیں تو ان کے پاس بقدر نصاب باقی رہے۔ اس سے وہ لوگ بھی مراد ہیں جو کسی ناگہانی حادثے کا شکار ہوگئے ہوں، کوئی تاوان یا غیر معمولی جرمانہ دینا پڑا یا کاروبار میں ناکامی ہوئی یا کوئی اور حادثہ پیش آیا اور سارا اثاثہ تباہ ہوگیا ہو۔

۷۔ فی سبیل اللہ: اس سے مراد راہ خدا میں جہاد ہے۔ جہاد کا لفظ قتال کے مقابلے میں عام ہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں وہ ساری کوششیں شامل ہیں جو مجاہدین، نظام کفر کو مٹا کر نظام اسلامی کو قائم کرنے کے لیے کریں، چاہے وہ قلم و زبان سے ہو یا تلوار سے یا ہاتھ پاؤں کی محنت اور دوڑ دھوپ سے۔ اس کا دائرہ نہ تو اتنا محدود ہے کہ اس سے مراد محض قتال ہو اور نہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں رفاہ عام کے سارے کام شامل سمجھ لیے جائیں۔ جہاد فی سبیل اللہ سے عام طور پر صرف وہی کوششیں مراد لی جاتی ہیں جو دینِ حق کو قائم کرنے، اس کی اشاعت و تبلیغ کرنے اور اسلامی مملکت کی حفاظت و دفاع کے لیے کی جائیں۔ اس جدوجہد میں جو لوگ شریک ہوں ان کے مصارفِ سفر،

سواری، آلات واسلحہ اور سروسامان کی فراہمی کے لیے زکواۃ کی رقم صرف کی جاسکتی ہے۔

نیز اس سے مراد وہ زائرین حرم بھی ہیں جو حج کے ارادے سے روانہ ہوں اور راہ میں کسی حادثے کا شکار ہوکر مالی تعاون کے محتاج ہو جائیں اور وہ طلبہ بھی مراد ہیں جو دین کا علم حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہوں اور حاجت مند ہوں۔

۸۔ مسافر: مسافر خواہ اپنے گھر میں خوش حال اور دولت مند ہولیکن حالت سفر میں اگر وہ مالی مدد کا محتاج ہے تو زکواۃ کی مد سے اس کی مدد کی جاسکتی ہے۔

(مولانا محمد یوسف اصلاحی کی کتاب ''آسان فقہ'' سے اخذ کیا گیا)

زکواۃ کے مستحقین

سوال: جب میں چھٹیوں کے دوران گھر جاتا ہوں تو میرے اعزا میں سے جو حضرات مشکلات کا شکار ہوتے ہیں وہ مالی اعانت کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ گو اس وقت رمضان کا مہینہ نہیں ہوتا، لیکن مجھ سے جو بھی ممکن ہوتا ہے، میں زکواۃ کی رقم میں سے ان حضرات کی اعانت کرتا ہوں ــــ کیا یہ طریقہ درست ہے؟ میں دولت مند نہیں ہوں البتہ ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے کچھ بچالیتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کیا میں اپنی بچت بینک میں رکھ سکتا ہوں؟

جواب: زکواۃ اس وقت ادا کرنا چاہیے جب اس کی ادائیگی واجب ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی کسی شخص کے پاس زکواۃ کے نصاب کے برابر رقم (۶۳۴ گرام چاندی) ہوجائے تو اسے وہ تاریخ یاد کرلینی چاہیے اور آیندہ برس، اسی تاریخ کو اسے اپنے سال بھر کے مال کا حساب کرنا چاہیے۔ اگر اس وقت بھی اس کے پاس زکواۃ کے نصاب سے زیادہ مال ہو، تو اب اسے ڈھائی فیصد کی شرح سے زکواۃ ادا کرنا ہوگی۔ زکواۃ کی رقم جتنی جلد مستحقین کو ادا کردی جائے، اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ لیکن بالعموم لوگ رمضان کے مہینے میں زکواۃ ادا کرتے ہیں کیونکہ اس سے انہیں اس نیکی کا زیادہ اجر ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بالعموم سخاوت کا مظاہرہ فرماتے تھے لیکن رمضان کے مہینے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سخاوت اپنی انتہا پر ہوتی تھی۔ آپ جب اپنے رشتے داروں کی مالی اعانت کریں تو یہ زکواۃ کی رقم سے کرسکتے ہیں، خواہ زکواۃ ادا کرنے کی مدت پوری ہوئی ہو یا نہیں۔ زکواۃ پیشگی ادا کرنے کی اجازت ہے۔ زکواۃ کی ادائیگی کی تاریخ پر آپ اپنا حساب کرسکتے ہیں اور جو زکواۃ پیشگی ادا کردی ہے وہ رقم زکواۃ کی رقم سے منہا کرسکتے ہیں۔

یہاں میں یہ وضاحت کرنا چاہوں گا کہ زکواۃ کی رقم ان رشتے داروں کو ادا نہیں کی جاسکتی جن کی کفالت آپ کے ذمے ہے۔ مثلاً آپ کے والدین یا بیوی اور بچے۔ یہ رقم ان عزیزوں کو دی جاسکتی ہے جو غریب ہوں اور جن کی کفالت کی ذمہ داری زکواۃ کو ادا کرنے والے پر نہ ہو۔ ایسے عزیزوں میں چچا، ماموں، خالہ اور عم زاد شامل ہیں۔

جب آپ اپنی بچت بینک میں جمع کرتے ہیں تو اس رقم پر آپ کو سود ادا کیا جاتا ہے۔ سود لینے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر آپ صرف حفاظت کے نقطۂ نظر سے اپنی رقم بینک میں رکھتے ہیں یا اسے کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع کرتے ہیں جس پر سود ادا نہیں کیا جاتا، تو اس کی اجازت ہے۔

زکواۃ کی رقم سے دینی کتاب کی اشاعت

سوال: کیا زکواۃ کی رقم سے دینی کتب شائع کی جاسکتی ہیں، ان کتابوں کو مفت تقسیم کیا جائے گا۔

جواب: استثنائی حالت کے علاوہ اس مقصد کے لیے زکواۃ کی رقم استعمال کرنے کا جواز مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ آپ کو علم ہے کہ زکواۃ کی رقم صرف ان آٹھ مدات میں خرچ کی جاسکتی ہے جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ ان آٹھ میں سے ایک ''اللہ کے کام کو آگے بڑھانا'' ہے۔ بالعموم اس سے مراد مسلم فوج لی جاتی ہے یا ایسے مسلمان مراد لیے جاتے ہیں جو اسلام یا مسلمانوں کے دفاع کے لیے جدوجہد کر رہے ہوں۔ اگر کسی سماج میں کوئی غریب شخص باقی نہ رہا ہو، کوئی غلام نہ ہو جسے آزاد کرایا جائے، کوئی مقروض نہ ہو، جس کا قرض ادا کر کے اس کو نجات دلائی جاسکے اور زکواۃ کی جمع شدہ رقم خاصی کثیر مقدار میں موجود ہو، تو ایسی صورت میں اس رقم کو کسی ایسے مصرف میں لانے کا سوچا جاسکتا ہے جس سے اسلام کی ترویج و اشاعت ہوتی ہو۔ یہ صورت بھی اسی وقت ممکن ہے جب وہ مسلم ریاست اپنے تمام ہمسایوں کے ساتھ امن کے ساتھ رہ رہی ہو۔ ایسی صورتحال میں اگر مسلمان حکمراں یہ سمجھے کہ دینی کتاب کی اشاعت سے اسلام کی ترویج و تبلیغ میں مدد ملے گی اور لوگ اسلام کو بہتر طور پر سمجھ کر اسے قبول کرنے پر تیار ہوسکیں گے تو ایسے حالات میں وہ حکمراں زکواۃ کی رقم کو دینی کتاب کی اشاعت کے لیے استعمال کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ انفرادی طور پر ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

خاندان میں زکواۃ کے مستحق

سوال: خاندان کے لوگوں میں سے زکواۃ کا مستحق کون ہے؟

جواب: رشتہ داروں میں جو بھی غریب ہوں انہیں زکواۃ دی جا سکتی ہے لیکن جن رشتہ داروں پر آپ کی کفالت کی ذمہ داری ہے، یا جو آپ کے زیر کفالت ہیں یعنی والدین، سرپرستوں، دادا، دادی، نانا، نانی، اولاد اور پوتے، پوتی یا نواسے، نواسیوں کو زکواۃ نہیں دی جا سکتی۔ اگر شادی شدہ بہن کا خاندان غریب ہو تو انہیں زکواۃ دی جا سکتی ہے۔

زکواۃ ___ غربت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا نظام

سوال: ایک ایسے ملک میں جہاں زکواۃ کے اسلامی طریقے پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا، کیا یہ بات قابل قبول ہے کہ ایک صاحب زکواۃ قرآنی احکامات سے قطع نظر کرتے ہوئے مستحقین زکواۃ کی اقسام کے علاوہ اپنے کسی رشتہ دار کو زکواۃ ادا کر دے تاکہ وہ بتدریج خوشحال ہو سکے؟

جواب: اسلامی نظام میں ایک اصول نہایت اہم ہے جو قانونی اور سماجی دونوں قسم کے مقامات پر لاگو ہوتا ہے۔ اس اصول کے مطابق جن معاملات میں قرآن کا واضح حکم یا حدیث کی واضح ہدایات موجود ہوں، ان میں کسی بھی قسم کا امتیاز نہیں برتا جا سکتا۔ اس اصول کے پس پردہ جو حکمت ہے وہ نہایت صاف ہے۔ جب کسی معاملے میں اللہ تعالیٰ کا واضح فرمان یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت موجود ہے تو اس سے ہٹ کر عمل کرنا ہر حالت میں غلط ہوگا کیونکہ کسی واضح حکم یا ہدایت سے روگردانی کے نتیجہ میں انتشار پیدا ہونے کا امکان ہے اور اس طرح اس مقصد کی نفی ہوتی ہے جس مقصد کے لیے کوئی قانون وضع کیا گیا ہے۔

زندگی کے دو شعبے، جہاں اس اصول کا اطلاق واضح طور پر ہوتا ہے، زکواۃ اور ورثے کی تقسیم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ورثاء میں سے ہر ایک کا حصہ واضح طور پر متعین فرما دیا ہے۔ کسی کو فائدہ پہنچانے کے لیے اس کے حصے کو بڑھانے یا کسی کی حق تلفی کرتے ہوئے اس کا حصہ کم کرنے کا مطلب اللہ کے احکام سے روگردانی کرنا ہے۔ ایک مسلمان سے اس قسم کی حرکت کی توقع نہیں کی جاتی۔ اسی طرح زکواۃ کے معاملے میں بھی اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر مستحقین زکواۃ کی آٹھ اقسام متعین کر دی ہیں۔ کسی کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ ان آٹھ اقسام میں اضافہ کرے یا ان میں کمی کرے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو آدمی آئے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سوال کیا کہ زکواۃ کی رقم میں سے انہیں حصہ دیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے کسی فرشتے یا کسی پیغمبر کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ زکواۃ کی رقم کی تقسیم میں اپنا حکم عائد کرے۔ اللہ

نے یہ قانون خود بنایا ہے اور زکواۃ کو آٹھ قسم کے افراد میں تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر تم مستحقین زکواۃ کے ان آٹھ زمروں میں آتے ہو، تو میں تمہیں زکواۃ دوں گا اور اگر ایسا نہیں ہے تو اللہ کے حکم کے خلاف عمل نہیں کروں گا۔

ایک اور حدیث کے مطابق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''زکواۃ میں اس شخص کا کوئی حصہ نہیں ہے جو امیر ہو یا توانا ہو اور ذہنی یا جسمانی طور پر معذور نہ ہو۔''

ان احادیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مستحقین زکواۃ کی آٹھ اقسام کے علاوہ کسی اور شخص کو زکواۃ نہیں دی جاسکتی۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے پاس جو مال و دولت ہے وہ اللہ کا ہے۔ ہمیں اس مال و دولت کا امین بنایا گیا ہے۔ اس لیے ہمارا یہ فرض ہے کہ اس مال و دولت کو اسی طرح خرچ کریں جس سے اللہ راضی ہو۔ زکواۃ کی تقسیم کے معاملے میں ہم اللہ کے مقرر کردہ احکامات کے خلاف عمل نہیں کرسکتے۔

میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر زکواۃ کے نظام کا اصل مقصد واضح کرنا چاہتا ہوں۔ زکواۃ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ غریب اور ضرورت مند لوگوں کو تھوڑی سی رقم دے دیں، جس سے وہ اپنی ایک دو دن یا ایک دو ہفتے کی ضروریات پوری کرسکیں اور دوبارہ اسی معاشی بدحالی میں مبتلا ہوجائیں۔ اس طرح کی مدد فراہم کرنا بھی ایک نیکی ہے لیکن یہ مسئلے کا عارضی حل ہے۔ اسلام میں نظام زکواۃ کا مقصد یہ ہے کہ غربت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ لہٰذا نظام زکواۃ میں اس بات کی اجازت ہے کہ ایک مستحق زکواۃ کو اس قدر رقم فراہم کردی جائے کہ وہ غریبوں کی صف سے نکل جائے اور معاشی طور پر خود کفیل ہوجائے۔ اس بات کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ فرض کیجیے آپ کے پڑوس میں ایک بے روزگار شخص رہتا ہے اور اس کے بارے میں آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ شخص محنتی بھی ہے اور اس کا کردار بھی صحیح ہے۔ اس صورتحال میں آپ دیگر پڑوسیوں اور اپنے احباب سے رابطہ کرکے ایک زکواۃ فنڈ قائم کرسکتے ہیں جس کا مقصد یہ ہو کہ بے روزگار ہمسائے کو خودکفیل بنادیا جائے۔ جب اس فنڈ میں خاصی رقم جمع ہوجائے تو آپ اپنے بے روزگار پڑوسی کو اس رقم سے اپنا کاروبار شروع کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ بے روزگار ہمسایہ ایک اچھا ترکھان (کارپینٹر) ہے۔ آپ اسے کرائے کی دوکان دلواسکتے ہیں اور مختلف اقسام کی لکڑی اور ضرورت کے اوزار خریدواسکتے ہیں تاکہ وہ اپنا کاروبار شروع کرسکے۔ یہ تمام اخراجات زکواۃ کی رقم سے پورے کیے جاسکتے ہیں۔

میں یہاں ایک واقعہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جن دنوں میرا قیام برطانیہ میں تھا، سعودی عرب میں مقیم ایک دوست نے اپنی زکواۃ کی رقم میں سے کچھ رقم مجھے دی تاکہ یہ برطانیہ میں مستحقین

کو دی جاسکے۔ میں کسی ضرورت مند کی تلاش میں ایک چھوٹی مسجد میں گیا جہاں ویسٹ انڈیز کے مسلمان نماز ادا کرنے کے لیے آتے تھے۔ جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ان میں سے بیشتر بے روزگار ہیں اور حکومت کی جانب سے ملنے والے سماجی تحفظ کے وظیفے پر گزر بسر کر رہے ہیں۔ ان لوگوں سے بات چیت کے بعد طے ہوا کہ قریبی بازار میں مختلف اشیاء کی فروخت کے تین اسٹال قائم کیے جائیں۔ ہر اسٹال پر دو کارکن کام کریں گے۔ اسٹال پر مال کی فراہمی کے لیے ایک پرانی گاڑی خریدی گئی اس گاڑی کے لیے ان ہی بے روزگار مسلمانوں میں سے ایک شخص کو ڈرائیور رکھا گیا۔ ایک اور شخص کو تھوک بازار سے مال خریدنے اور اسٹالوں پر باقاعدگی سے فراہم کرنے کے لیے ملازم رکھا گیا۔ مال ذخیرہ کرنے کے لیے ایک جگہ بھی کرائے پر حاصل کی گئی۔ اس منصوبے کے اخراجات کا تخمینہ چار ہزار ایک سو پاؤنڈ تھا جس میں مال کی خریداری، گاڑی کی قیمت، ذخیرہ گاہ کا چھ ماہ کا کرایہ، اسٹال کے لیے مقامی انتظامیہ سے اجازت نامے کی فیس اور بازار میں اسٹالوں کے قیام کے اخراجات شامل تھے۔ ان افراد سے کہا گیا کہ اس منصوبے کو جاری رکھنے کے لیے وہ سولہ سو پاؤنڈ ان اسٹالوں کی آمدنی سے جمع کریں۔ اس کا مقصد یہ تھا اگر یہ آٹھ افراد واقعی سنجیدگی سے محنت اور دیانت داری سے کام کرنا چاہتے ہیں اور سرکاری وظیفہ کے بجائے اپنی محنت سے پیدا کردہ روزی کو باعزت زندگی سمجھتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک دو سو پاؤنڈ کی رقم جمع کرلے گا۔ ایک ماہ بعد یہ حضرات اپنے بینک کے حساب کے ساتھ آئے جس کے مطابق انہوں نے سولہ سو پاؤنڈ کی رقم ایک ماہ کے اندر جمع کرلی تھی۔ میں نے ڈھائی ہزار پاؤنڈ کی وہ رقم ان کے حوالے کردی جو میرے سعودی دوست نے اس منصوبے کو جاری رکھنے کے لیے دی تھی۔

بہرحال زکوٰۃ کی رقم کو استعمال کرنے کا صرف یہی شرعی طریقہ نہیں ہے تاہم یہ ایک بہترین طریقہ ضرور ہے کیونکہ اس طریقے سے زکوٰۃ حاصل کرنے والے، مستحقین زکوٰۃ کی صف سے نکل کر زکوٰۃ ادا کرنے والوں کی صف میں شامل ہوجاتے ہیں۔

جہاں تک آپ کے عزیز کو زکوٰۃ کی ادائیگی کا تعلق ہے، میں اس سلسلہ میں یہ کہوں گا کہ اگر وہ مستحق زکوٰۃ کی شرائط پر پورے اترتے ہیں تو آپ انہیں زکوٰۃ دے سکتے ہیں تاکہ وہ خود کفالت حاصل کرسکیں۔ اس معاملے میں یہ بات قابل توجہ نہیں ہے کہ آپ انہیں صرف ایک سال زکوٰۃ کی پوری رقم دیتے ہیں یا اس وقت تک دیتے رہتے ہیں جب تک وہ ضرورت مند ہیں۔ بس اس بات کا خیال رکھنا لازم ہے کہ وہ مستحق زکوٰۃ ہوں۔ دوسری بات قابل توجہ یہ ہے کہ آپ کے یہ عزیز، ان قرابت داروں میں سے نہیں ہونے چاہئیں جن کی غربت کی وجہ سے ان کی کفالت آپ کی ذمے داری ہے۔ اگر یہ دونوں شرائط پوری نہیں ہوتیں، تب بھی آپ ان کی مدد جاری رکھ سکتے ہیں لیکن

اس کے لیے زکواۃ کی رقم استعمال نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دوسروں کی مدد کے لیے زکواۃ ہی کا طریقہ نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ اہل ثروت کو زکواۃ کے علاوہ بھی غریبوں کی امداد کرنا چاہیے۔ جب آپ زکواۃ کے علاوہ ضرورت مندوں کی مدد کریں گے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں سے ملے گا۔

زکواۃ کس شرح سے منہا کی جائے؟

سوال: میں اپنی بیٹیوں کے جہیز کے لیے سونا جمع کر رہا ہوں کیا اس سونے پر زکواۃ ادا کرنا ہوگی یا یہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ زکواۃ کا تعین کس شرح سے کیا جائے کیونکہ سونے کی قیمت تو ہر وقت بدلتی رہتی ہے؟

جواب: جو سونا آپ اپنی بیٹیوں کے لیے جمع کر رہے ہیں وہ اس وقت تک آپ ہی کی ملکیت ہے جب تک وہ عملاً انہیں نہیں دے دیا جاتا۔ جب تک یہ آپ کے پاس رہے گا۔ آپ کو اس پر زکواۃ ادا کرنا ہوگی۔ سونے کے لیے زکواۃ کا نصاب ۸۵ گرام ہے جس پر ڈھائی فیصد کی شرح سے زکواۃ ادا کی جائے گی، بشرطیکہ سونا ایک سال کی مدت تک آپ کے پاس رہا ہو۔ سونے کی قیمت کا اتار چڑھاؤ غیر متعلق مسئلہ ہے۔ آپ جس دن زکواۃ نکال رہے ہیں اس دن سونے کا جو بھاؤ ہوگا، زکواۃ اسی دن کی سونے کی قیمت پر وضع کی جائے گی۔

جب آپ سونا اپنی بیٹیوں کو دے دیں گے تب زکواۃ کی ادائیگی ان پر فرض ہوگی، بشرطیکہ ان کے پاس مقررہ نصاب سے زائد سونا ہو۔ یہاں مجھے یہ اضافہ کرنے کی اجازت دیجیے کہ جب آپ نے ایک بار سونا اپنی بیٹیوں کو دے دیا تو پھر وہ ان کی ملکیت ہے۔ اب آپ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی ہنگامی ضرورت کے وقت آپ اپنی بیٹی کی الماری میں سے سونا نکالیں اور اپنی ضرورت کے لیے استعمال کریں۔ اس نیت سے اس سونے کی طرف دیکھنا بھی غلط ہوگا۔

میں یہ نشاندہی کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ شادی کے وقت بیٹیوں کو سونا دینا بعض ممالک کا مقامی طریقہ ہے، شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایک لڑکی کی شادی اس وقت بھی ہوسکتی ہے جب اس کے پاس ایک اونس سونا بھی نہ ہو۔ سونے کی ملکیت شادی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

زندگی کے اخراجات، بانڈز، حصص اور سرمایہ کاری پر زکواۃ؟
اسپتال کی تعمیر اور نقصان اٹھانے والے کاروباری کو زکواۃ کی ادائیگی؟

سوال: ازراہ کرم یہ وضاحت فرمایے کہ زکواۃ کا حساب کرنے سے پہلے کیا ایک شخص کو اپنے اخراجات مثلاً بچوں کے اسکول کی فیس، گاڑی اور آمدورفت کے اخراجات وغیرہ، زندگی کے اخراجات میں شامل کرنے چاہئیں؟

۲۔ اگر کوئی صاحب کاروبار میں میرے شریک ہوں اور ہمیں کاروبار میں نقصان کا سامنا کرنا پڑے تو کیا میں اپنے کاروباری شریک کے نقصان کو کم کرنے کے لیے زکواۃ میں سے ادائیگی کرسکتا ہوں جبکہ مجھے یہ علم ہو کہ وہ دیوالیہ ہو رہے ہیں۔

۳۔ کیا زکواۃ کی ادائیگی قسطوں میں کی جاسکتی ہے؟

۴۔ بانڈز، حصص، دیگر مالی تمسکات اور اثاثوں پر زکواۃ ادا کی جاتی ہے۔ جائیداد پر زکواۃ کیوں عائد نہیں ہوتی؟

۵۔ کیا ایک اسپتال کی عمارت کی تعمیر اور اس کی دیکھ بھال کے لیے زکواۃ کی رقم استعمال ہوسکتی ہے؟

جواب: جب آپ زکواۃ ادا کرتے ہیں تو یہ گزرے ہوئے سال پر ادا کی جاتی ہے۔ آنے والے سال کے لیے پیشگی زکواۃ ادا نہیں کی جاتی۔ جب آپ گزرے ہوئے سال کی زکواۃ کا حساب کر رہے ہوں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ صاحب نصاب ہوں۔ یعنی آپ کے پاس سال بھر کے ضروری اخراجات زندگی کے بعد ۶۱۲ گرام چاندی یا اس کے مساوی رقم موجود ہو۔ فرض کیجیے کہ پہلی رجب کو آپ کے پاس اتنی رقم موجود ہے تو آئندہ برس اسی تاریخ کو آپ کو دیکھنا ہوگا کہ آپ کے پاس کتنی رقم موجود ہے اس رقم پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکواۃ منہا کرنی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اور آپ کے خاندان کی زندگی کے تمام ضروری اخراجات کے لیے (جن میں بچوں کے اسکول کی فیس، گاڑی اور آمدورفت کے اخراجات شامل ہیں) رقم ادا کی جاچکی ہے اور اب جو خالص بچت ہے وہ قابل زکواۃ ہے۔

درحقیقت زکواۃ ایک طرح کا اسلامی ٹیکس ہے جو آمدنی پر لاگو نہیں ہوتا بلکہ ''دولت'' پر عائد ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے طور پر زکواۃ کی ادائیگی کے لیے جو بھی تاریخ مقرر کی ہے اس تاریخ پر آنے والے سال کے متوقع اخراجات سے زکواۃ نہیں نکالی جاتی۔ جب مقررہ تاریخ کے بعد ایک سال پورا ہوجائے گا تو پھر اس بیتے برس کی ''دولت'' پر زکواۃ کا حساب پورا کیا جائے گا۔

۲۔ جب آپ کسی شخص کو زکواۃ کی رقم ادا کرتے ہیں تو وہ شخص اس رقم کا مالک بن جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ اسے یہ جتائیں کہ یہ زکواۃ ہے کیونکہ بعض افراد زکواۃ کا سن کر رقم قبول کرنے میں تامل کرتے ہیں۔ کسی شخص کے ہاتھ میں رقم دیے بغیر اسے زکواۃ کا فائدہ نہیں پہنچایا جاسکتا، لہٰذا اگر کسی شخص پر آپ کی کچھ رقم واجب الادا ہے، جیسا کہ آپ کے سوال کے مطابق اس صورت حال میں وہ شخص آپ کا کاروباری شریک ہے، جسے کاروبار کے نقصان میں شریک ہونا ہے، یا کوئی اور شخص جو آپ کا مقروض ہو۔ ان معاملوں میں آپ قابل وصول رقم کو کم کر کے زکواۃ کی ادائیگی نہیں کرسکتے۔ زکواۃ کی ادائیگی کے لیے لازم ہے کہ آپ جسے بھی رقم دیں وہ اسے اپنی ملکیت سمجھے اور جہاں چاہے خرچ کرے۔ اگر زکواۃ وصول کرنے والا بلا جبر واکراہ اس رقم سے اپنے نقصان کے حصے کی ادائیگی کرنا چاہے یا اپنا قرض ادا کرنا چاہے تو آپ اس رقم کو بطور حصہ نقصان یا قرض وصول کرسکتے ہیں۔ اس فیصلے کا اختیار آپ کو نہیں ہے کہ دوسرے کی زکواۃ کی رقم کہاں خرچ کی جائے۔

۳۔ زکواۃ اپنی مقررہ تاریخ پر واجب الادا ہوتی ہے جب آپ زکواۃ نکال لیں تو اسے اپنی بقیہ رقم سے الگ کرلینا چاہیے۔ آپ چاہیں تو زکواۃ کی رقم کو ایک خاص عرصہ کے دوران ادا کرسکتے ہیں بشرطیکہ آپ یہ سمجھتے ہوں کہ اس طریقے سے زکواۃ زیادہ بہتر طور پر استعمال ہوسکے گی۔ دوسری جانب آپ اپنی زکواۃ کی کل رقم یا اس کا کچھ حصہ پیشگی بھی ادا کرسکتے ہیں تاہم یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ زکواۃ کی رقم کو دس ماہ کے طویل عرصے میں ادا کریں۔

۴۔ بانڈز اور دیگر مالی تمسکات، سرمایہ کاری کی مد میں آتے ہیں اس لیے ان پر اسی طرح زکواۃ عائد ہوتی ہے جس طرح دیگر تجارتی اشیا پر۔ اسی طرح اگر آپ نے کسی مکان یا پلاٹ میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے تو اس جائیداد میں لگائے گئے سرمائے اور اس کی آمدنی پر (اگر کوئی ہے) زکواۃ ادا کرنی ہوگی۔

۵۔ زکواۃ کی رقم سے اسپتال کی عمارت تعمیر نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اس رقم سے اس عمارت کی دیکھ بھال کی اخراجات پورے کیے جاسکتے ہیں۔ ان اخراجات کے لیے صدقات کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے۔ زکواۃ صرف آٹھ اقسام کے مستحق افراد میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ ان کے علاوہ نہ تو کسی غیر شخص کو زکواۃ ادا کی جاسکتی ہے اور نہ کسی اور مد میں اسے خرچ کیا جاسکتا ہے۔

رہائشی مکان پر زکواۃ کی ادائیگی

سوال: میری ملکیت میں دو مکان ہیں جو میں نے کرائے پر دے رکھے ہیں۔ دوسرے مکان کی تعمیر میں نے بینک سے قرضہ لے کر کی ہے۔ دونوں مکانوں کا کرایہ میرے گھر کے اخراجات کے لیے کافی ہوتا ہے اور جو تنخواہ مجھے ملتی ہے اس سے میں بینک کے قرضے کی قسط ادا کر دیتا ہوں۔ کیا مجھے اپنی تنخواہ کے ساتھ مکانات کی قیمت پر بھی زکواۃ ادا کرنا ہوگی؟

۲۔ تنخواہ کے علاوہ میرے پاس ایک قطعہ زمین ہے۔ میری بیوی کے پاس چند زیورات ہیں جو انہیں اپنے والدین سے ملے ہیں۔ دوسری طرف مجھے اپنے دوستوں اور عزیزوں کا قرضہ ادا کرنا ہے جو میں نے ان سے لیا تھا۔ از راہ کرم بتایئے کہ میں زکواۃ کس طریقے سے ادا کروں؟

جواب: اپنے وطن سے دور رہ کر کام کرنے والے حضرات میں، اپنے محدود وسائل کی وجہ سے بینک سے قرضہ لے کر مکان تعمیر کرنے کا رجحان بہت عام ہے، تاہم اسلامی نقطۂ نظر سے یہ پسندیدہ کام نہیں ہے کہ بینک سے قرض لے کر مکان بنایا جائے اور اس قرضے پر سود ادا کیا جائے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب ایک آدمی کے پاس رہنے کے لیے مکان ہو اور وہ قرضہ لے کر دوسرا مکان بنائے۔ سود کا لین دین اسلام میں قطعی ممنوع ہے۔ سودی قرضے کے بارے میں صرف اسی وقت سوچا جا سکتا ہے جب کوئی شخص نامساعد حالات کا شکار ہو جائے اور اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہ رہے۔ مالی خوشحالی اور مستقبل کے تحفظ کے لیے سودی قرضہ حاصل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بہرحال چونکہ آپ یہ اقدام کر چکے ہیں اس لیے اب اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے کہ اپنے اس فعل پر پشیمانی کا اظہار کریں۔ اللہ تعالیٰ سے معافی کے طالب ہوں اور جلد از جلد بینک کے سودی قرضے کے وبال سے جان چھڑائیں اگر آپ بلاسود قرضہ حاصل کر سکیں تو وہ بہتر اور مناسب طریقہ ہوگا اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو بینک کے قرضہ کو اولیت دیتے ہوئے اسے جلد از جلد ختم کر دیں۔

زکواۃ وضع کرنے کے لیے آپ یہ کریں کہ دونوں مکانوں سے حاصل ہونے والی کرائے کی رقم میں اپنی تنخواہ کی رقم جمع کریں اور اس مجموعی رقم میں سے اپنے اہل خانہ کے اخراجات کی رقم نکال دیں۔ اس کے بعد جو رقم بچے اس میں سے قرضہ ادا کریں۔ اگر تمام قرضہ ادا ہو جاتا ہے تو بہتر ہے اور اگر بچت کی رقم سے قرضہ پورا ادا نہ ہو تو آپ کو زکواۃ نہیں دینا ہوگی۔ اگر قرض کی ادائیگی کے بعد بھی رقم بچ رہے اور وہ اس قدر ہو کہ اس پر زکواۃ واجب ہو اور اسے ایک سال گزر گیا ہو تو اس پر ڈھائی فیصد کی شرح سے زکواۃ ادا کر دیں۔ اگر بچت کی رقم زکواۃ کے نصاب سے کم ہو تو آپ کو زکواۃ

ادا کرنا نہیں ہوگی تاہم آپ چاہیں تو صدقہ یا خیرات نکال سکتے ہیں۔

سونے کے لیے زکوٰۃ کا نصاب ۸۵ گرام سونا ہے۔ اگر اس کے برابر رقم یا تمسکات موجود ہوں اور انہیں ایک سال کی مدت گزر چکی ہو تو اس پر اسی شرح سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ امام شافعیؒ کے نزدیک خواتین کے جو زیورات ان کے استعمال میں ہوں ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ ''معقول مالیت'' کے ہوں ''معقول مالیت'' کا تعین ہر شخص اپنے سماجی مرتبہ کے مطابق کرسکتا ہے۔

سرمایہ کاری اور زکوٰۃ کا تعین

سوال: میں نے اپنی بچت کی کچھ رقم سے ایک کمپنی کے حصص خرید رکھے ہیں۔ ازراہ کرم بتایئے کہ اس صورت میں مجھے صرف اصل رقم پر زکوٰۃ دینی ہوگی یا صرف منافع پر زکوٰۃ دینی ہوگی؟

جواب: اس سوال کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کی سرمایہ کاری کی نوعیت کیا ہے۔ اس معاملے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہوگی کہ آپ نے جو حصص لے رکھے ہیں، انہیں ''جنس تجارت'' سمجھا جائے جس کے ذریعے کاروبار کیا جارہا ہے۔ اس صورت میں اگر اچانک حصص کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں تو آپ منافع حاصل کرنے کے لیے انہیں فروخت کردیں اور بصورت دیگر اگر حصص کی قیمت گر رہی ہو تو آپ انہیں اس وقت تک اپنے پاس رکھیں جب تک ان کی قیمت بہتر نہ ہوجائے، یا مستقبل میں حصص کی قیمت بہتر ہونے کی امید نہ ہو تو آپ اپنے نقصان کو کم سے کم کرنے کے لیے انہیں فروخت کردیں۔ اس صورت میں ان حصص کی حیثیت مال تجارت کی ہوگی اور ان پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ یعنی حصص کی جو بھی مالیت ہے، اس رقم پر بھی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی اور ان پر جو منافع مل رہا ہے وہ بھی قابل زکوٰۃ ہوگا۔

اس معاملے کی دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ آپ اپنے حصص کو وہ اصل رقم سمجھیں جو کاروبار میں لگی ہوئی ہے، عام حالات میں آپ انہیں فروخت نہ کریں بلکہ اپنے سرمائے کو کاروبار میں لگا رہنے دیں اور اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لیے یا تو اس میں سے تھوڑا سا منافع لے لیں یا وہ بھی نہ لیں۔ آپ کے لیے ان حصص کی حیثیت وہی ہوگی جو کسی کاروباری کے لیے اس کے کاروبار میں لگی ہوئی رقم کی۔ اس صورت میں حصص کی اصل قیمت پر زکوٰۃ لاگو نہیں ہوگی بلکہ اس سرمایہ کاری سے جو منافع آپ کو حاصل ہوگا صرف اس پر زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔

زکواۃ اور انکم ٹیکس

سوال: کیا زکواۃ اور انکم ٹیکس ایک ہی وقت ادا کیے جاسکتے ہیں جبکہ حکومت کی جانب سے انکم ٹیکس لاگو کیا گیا ہو؟

جواب: زکواۃ ـــــ انکم ٹیکس سے مختلف چیز ہے۔ کوئی حکومت اپنے تمام شہریوں پر کسی خاص شرح سے انکم ٹیکس نافذ کرسکتی ہے۔ انکم ٹیکس کی جمع شدہ رقم ایسے کاموں پر خرچ کی جاتی ہے، جو حکومت کے خیال میں ضروری ہوتے ہیں۔ اس رقم کا کچھ حصہ سڑکوں کی تعمیر پر خرچ ہوتا ہے اور کچھ بعض دوسری خدمات پر صرف کیا جاتا ہے جن میں تھیٹر، تفریحی میدان، پیراکی کے تالاب اور کوڑا ٹھکانے لگانے کے مقامات شامل ہیں۔

اس کے برخلاف زکواۃ کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور اس سے حاصل شدہ رقم صرف انہی مدات میں خرچ کی جاسکتی ہے جن کا تعین کردیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی درجہ بندی کردی ہے جو زکواۃ کی رقم حاصل کرسکتے ہیں۔ تعداد میں ان کی آٹھ اقسام ہیں اور ان آٹھوں قسموں کے علاوہ کسی اور کو زکواۃ نہیں دی جاسکتی۔ اسی لیے زکواۃ کا انکم ٹیکس سے موازنہ درست نہیں ہے۔

ایک مصدقہ حدیث کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''زکواۃ کے علاوہ لوگوں کی رقوم پر محصول عائد کیا جاسکتا ہے۔'' اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان حکمراں، اپنے شہریوں پر زکواۃ سے الگ کوئی محصول (ٹیکس) عائد کرسکتا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ہر حکومت کو ملک کا انتظام چلانے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورتیں حکومت لوگوں پر محصول عائد کرکے ہی پوری کرتی ہے۔

درج بالا امور کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر حکومت کوئی محصول عائد کرے تو مسلمانوں کو وہ بھی ادا کرنا چاہیے۔

زکواۃ کا معیار ـــــ سونا یا چاندی؟

سوال: زکواۃ کی ادائیگی کے لیے سونے اور چاندی کی مختلف مقداریں بیان کی جاتی ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب کسی شخص کے پاس اس کم سے کم مقررہ مقدار سے زائد ہو تو اس پر زکواۃ کی ادائیگی ڈھائی فیصد کی شرح سے فرض ہوجاتی ہے لیکن سونے اور چاندی کی قیمتوں میں بہت زیادہ فرق کی

وجہ سے یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے کس کو معیار بنایا جائے۔ مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ۱۰۴ گرام سونے یا ۷۲۵ گرام چاندی کی مالیت کے برابر رقم پر زکواۃ لاگو ہو جاتی ہے۔ آج کل ان دونوں اشیاء کی قیمتوں کا جو تناسب ہے اس کے مطابق سونے کی مقررہ حد (یعنی ۱۰۴ گرام) کی قیمت پانچ گنا چاندی کی قیمت کے برابر ہے اس صورتحال میں ہمیں سونے اور چاندی میں سے کس کو معیار بنانا چاہیے؟

جواب: زکواۃ کی ادائیگی کے لیے سونے اور چاندی کی جو مقدار آپ نے بیان کی ہے اسے درست کر لیجیے۔ زکواۃ کی ادائیگی کے لیے سونے کی مقدار ۸۵ گرام اور چاندی کے لیے ۶۳۴ گرام ہے اس مقدار کا تعین پرانے زمانے میں رائج چاندی کے سکے یعنی درہم کے وزن و قیمت کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر تمہارے پاس دوسو درہم ایک سال تک رہیں تو اس میں سے پانچ درہم زکواۃ کے طور پر ادا کرو۔ اس وقت کا ایک درہم آج کل کے ۳٫۱۷ گرام کے برابر ہوتا ہے اور اس کی بنیاد پر چاندی کی موجودہ مقدار ۶۳۴ گرام کے برابر ہوتی ہے جو ۸۵ گرام سونے کی مالیت سے کم ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ سونے اور چاندی میں سے کس کو معیار بنایا جائے؟ اگر ہمیں ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو ہمیں لازماً چاندی کا انتخاب کرنا چاہیے۔ حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے ''اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چاندی پر زکواۃ کی ادائیگی کا حکم دیا تھا۔ بعد میں مسلمان سونے پر زکواۃ ادا کرنے لگے۔ ان کا یہ عمل یا تو کسی ایسی حدیث کی بنیاد پر ہے جو ہم تک نہیں پہنچی یا پھر چاندی کی بنیاد پر فرض کی گئی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں بحرین کا خلیفہ بنا کر بھیجا تو روانگی سے پہلے انہیں ایک خط میں ان کے فرائض سے آگاہ کیا گیا اور زکواۃ کے سلسلے میں ہدایت کی کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو زکواۃ کی ادائیگی کا حکم دیا ہے ___ چاندی کا نصاب دوسو درہم ہے جس پر دسویں حصے کا ایک چوتھائی زکواۃ دی جائے۔ مزید وضاحت کی گئی کہ دوسو درہم وہ کم سے کم حصہ ہے جس پر زکواۃ لاگو ہوتی ہے۔ ایک سو نوے درہم کی مالیت پر زکواۃ فرض نہیں ہے لیکن اگر کوئی چاہے تو رضا کارانہ طور پر زکواۃ دے سکتا ہے۔

ان تمام روایات سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ زکواۃ کا نصاب چاندی کی مقدار پر متعین کیا گیا جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں بنیادی سکے کے طور پر استعمال ہوتی تھی اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے زکواۃ کا نصاب بنایا تھا۔ سونے کی مقدار کا اضافہ بعد میں کیا گیا جو

اس مالیت (دوسو درہم) کے برابر مالیت کے سونے کی مقدار ہے۔

جائیداد پر زکواۃ کی ادائیگی

سوال: چند سال قبل میں نے ایک پلاٹ اس نیت سے خریدا کہ یا تو اس پر فلیٹس بناؤں گا یا بیٹی کی شادی کے موقع پر اسے فروخت کردوں گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس پلاٹ پر مجھے زکواۃ ادا کرنی ہوگی۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس قطعہ اراضی پر نہ تو کاشت کی جاتی ہے اور نہ ہی اسے کرائے پر اٹھایا گیا ہے؟

جواب: اس سوال کے جواب کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ اس پلاٹ کو کس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں اگر آپ نے اسے اپنی بچت کے طور پر خریدا ہے یا خریدتے وقت آپ کا یہ ارادہ تھا کہ جب زمین کی قیمت بڑھے گی تو اسے فروخت کردیں گے تو ان دونوں صورتوں میں یہ زمین تجارتی زمین سمجھی جائے گی اور اس پر زکواۃ ادا کرنا ہوگی۔ اگر آپ کی واضح نیت یہ ہے کہ اس پلاٹ پر مکان یا فلیٹس بنائیں گے تو اس پر زکواۃ واجب نہیں ہوگی۔

مویشیوں اور ڈیری فارم پر زکواۃ کی ادائیگی

سوال: مویشیوں کی افزائش کے فارم پر زکواۃ کا تعین کس طرح کیا جائے گا؟ فرض کیجیے ایک فارم میں گائیں ہیں جو دودھ کے لیے پالی گئی ہیں، اس فارم پر زکواۃ کا حساب کیسے لگایا جائے گا؟

جواب: اگر ایک شخص کے پاس کسی خاص قسم کے مویشی ہیں تو اسے مویشیوں کی تعداد کے حساب سے زکواۃ دینی ہوگی، مثلاً چالیس بھیڑوں کی ملکیت کی صورت میں سال کے خاتمے پر ایک بھیڑ بطور زکواۃ دی جائے گی۔ اسی طرح تیس گائیں رکھنے والے شخص کو سال کے اختتام پر ایک ایسا بچھڑا بطور زکواۃ دینا ہوگا جس کی عمر ایک سال ہوچکی ہو۔ چالیس گائیں رکھنے والے شخص کو دو سال کی عمر کا بچھڑا بطور زکواۃ دینا ہوگا۔ یہ اصول ان افراد کے لیے ہے جو مویشیوں کو افزائش کے لیے یا ان سے حاصل ہونے والی پیداوار کے لیے پرورش کریں۔

موجودہ دور میں مویشیوں کے بڑے بڑے فارم ہیں، جہاں مویشیوں کی بڑی تعداد کو کسی خاص مقصد سے پالا جاتا ہے۔ مثلاً ڈیری فارموں میں گایوں کی پرورش اس لیے کی جاتی ہے کہ ان سے دودھ حاصل کیا جائے یہ دودھ یا تو فروخت کردیا جاتا ہے یا اس سے دوسری مصنوعات تیار کی

جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں گائیں صرف دودھ دینے والے جانور کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ ایسے معاملوں میں زکواۃ کا حساب کس طرح لگایا جائے؟

اس مسئلے کے بارے میں مختلف ادوار میں مختلف علماء کرام کی مختلف آراء رہی ہیں۔ تاہم عصر حاضر کے ایک ممتاز عالم شیخ یوسف القرضاوی نے جو زکواۃ کے امور پر تخصیص رکھتے ہیں اس معاملے میں جو رائے دی ہے وہ میں دوسرے علماء کرام کی آراء کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ گایوں کو اگر دودھ حاصل کرنے کے لیے پالا جائے تو اس صورت میں زکواۃ پیداوار یعنی دودھ پر عائد ہوتی ہے، گایوں پر عائد نہیں۔ لہٰذا مالک کو چاہیے کہ وہ ایک سال کے دوران دودھ کی پیداوار کا حساب لگائے۔ اس دودھ سے حاصل ہونے والی آمدنی میں سے پیداواری اخراجات، یعنی مشینوں کی قیمت، جانوروں کا چارہ یا خوراک، دیکھ بھال کرنے والے ملازمین کی تنخواہیں، بجلی، گیس وغیرہ کے اخراجات اور اگر آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے تو زکواۃ ادا کرنے والا، اپنے اور اپنے اہل خانہ کی ضروریات زندگی کے لیے بھی رقم منہا کرے۔ (یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس مد میں وہ تمام رقم شامل نہیں ہوگی جو وہ اپنے خاندان پر خرچ کرے گا۔ بلکہ صرف اہل خانہ کی بنیادی ضروریات زندگی کے لیے کافی رقم منہا کی جائے گی) یہ تمام اخراجات منہا کرنے کے بعد جو رقم بچے، اگر وہ زکواۃ کے نصاب کے برابر ہو یعنی ۶۳۴ گرام چاندی کی قیمت کے مساوی یا اس سے زائد ہو تو اسے اس رقم پر ۱۰ فیصد کی شرح سے زکواۃ یا عشر ادا کرنا ہوگا۔ یہ اصول جانوروں کی افزائش یا ڈیری فارم سمیت ہر ایسی سرمایہ کاری پر عائد ہوتا ہے جس کے نتیجے میں کسی بھی قسم کی آمدنی حاصل ہو رہی ہو۔ اگر کسی وجہ سے، اس قسم کی سرمایہ کاری میں حساب کتاب نہ رکھا جاسکتا ہو تو زکواۃ کی شرح ۵ فیصد ہوگی۔ چونکہ ڈیری فارم وغیرہ کا حساب کتاب رکھا جاتا ہے، اور رکھا جاسکتا ہے اس لیے بالکل درست حسابات کی بنیاد پر زکواۃ ادا کرنی چاہیے جو خالص آمدنی پر واجب ہوتی ہے۔ ۱۰ فیصد کی شرح سے زکواۃ کی ادائیگی ایسی زمینوں کی پیداوار پر بھی ہے جہاں صرف بارش کے پانی کی آبیاری ممکن ہو۔

ماہانہ بچت پر زکواۃ کی ادائیگی؟

سوال: میں ہر مہینے اپنی بچت میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا رہتا ہوں۔ اس صورت میں کیا مجھے ہر مہینے زکواۃ ادا کرنی چاہیے۔ ازراہ کرم یہ بھی وضاحت فرمایئے کہ میں زکواۃ کا حساب کس طرح لگاؤں؟ بعض ساتھیوں کا کہنا ہے کہ اگر والدین ضرورت مند ہوں تو زکواۃ انہیں بھی دی جاسکتی ہے۔ یہ بات کس طرح درست ہوسکتی ہے کیونکہ اولاد کی آمدنی پر تو ماں باپ کا حق ہوتا ہے۔

جواب: زکواۃ کا تعین کرنے کا اصول بہت آسان ہے۔ ہر شخص کو ایک تاریخ مقرر کر لینی چاہیے جس کے لحاظ سے وہ زکواۃ کی ادائیگی کے لیے اپنے سال کا تعین کر سکے۔ مقررہ تاریخ پر اس کے پاس اپنی ذاتی ضروریات، خاندان کے اخراجات اور زیر کفالت افراد کے اخراجات کے لیے ضروری رقم کے علاوہ جو رقم بچے، اگر وہ اس قدر ہے جس پر زکواۃ عائد ہوتی ہے، (۶۳۴ گرام چاندی کی رقم کے مساوی) تو اسے اس رقم پر زکواۃ ادا کر دینی چاہیے۔ اس طریقے اور اصول کے مطابق اسے ہر سال، اپنی مقرر کردہ تاریخ پر زکواۃ ادا کرنی ہوگی۔ زرعی اراضی، زرعی پیداوار اور مویشیوں وغیرہ پر زکواۃ کی ادائیگی کی شرح مختلف ہے۔ زکواۃ کی ادائیگی کے لیے اس بات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا کہ مقررہ تاریخ پر جس مالیت کی رقم کا وہ مالک ہے، وہ اس وقت اس کے قبضے میں ہے یا نہیں۔ زکواۃ کے نصاب کا تعین ایک سال کی مدت پر ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اپنی ماہ بہ ماہ بچت پر زکواۃ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ زکواۃ صرف سالانہ ادا کی جاتی ہے۔ اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ کچھ رقم آپ کے پاس صرف ایک ماہ رہی ہو، لیکن چونکہ سال بھر کے دوران آپ کے پاس مقررہ نصاب سے زیادہ رقم رہی، اس رقم پر بھی زکواۃ ادا کرنی ہوگی۔

والدین کو زکواۃ ادا نہیں کی جا سکتی، خواہ وہ غریب ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ کے جو دوست یہ بات کہتے ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اگر ایک شخص کے والدین غریب ہیں تو اولاد کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کی اسی طرح مدد اور دیکھ بھال کرے جس طرح والدین نے اپنی اولاد کی اس وقت کی تھی جب وہ بچہ تھا، کمزور تھا اور والدین کا محتاج تھا۔ جب اولاد جوان ہو جائے اور والدین ضعیف العمری کے دور میں ہوں تو ان کی دیکھ بھال اولاد کا لازمی فرض ہے۔ بچے، والدین اور بیوی، ایک شخص کی آمدنی کے شریک ہوتے ہیں اس لیے ان میں سے کسی کو زکواۃ نہیں دی جا سکتی۔

حصص اور کرائے کے مکان پر زکواۃ

سوال: زکواۃ کے مسئلے پر کسی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے ایک بار فرمایا تھا کہ اگر مکان کرائے پر دیا گیا ہو تو اس کے کرائے پر زکواۃ ادا کرنی ہوگی لیکن اگر کسی شخص نے سرمایہ کاری کے مقصد سے حصص خرید رکھے ہوں تو اسے حصص کی مالیت اور ان پر حاصل ہونے والے منافع ___ دونوں پر زکواۃ ادا کرنا ہوگی۔

میرے خیال میں ان دونوں معاملوں کی نوعیت یکساں ہے کیونکہ جو مکان کرائے پر اٹھایا گیا ہے وہ بھی سرمایہ کاری کے مقصد سے خریدا گیا ہے اور حصص بھی اسی مقصد سے خریدے گئے ہیں۔ اس صورت میں دونوں پر یکساں اصولوں کا اطلاق ہونا چاہیے۔

جواب: آپ نے جو دو مثالیں بیان کی ہیں ان دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ جب ایک شخص حصص خریدتا ہے تو انہیں ایسی جنس تصور کیا جاتا ہے جو کسی بھی فروخت کے لیے ہر وقت دستیاب ہے۔ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ حصص خریدنے والا صرف اسی وقت حصص فروخت کرتا ہے جب اس کے خیال میں موزوں وقت ہو۔ علاوہ ازیں حصص کی قیمت فروخت اور ان کی اصل قیمت خرید کے درمیان خاصا فرق ہوتا ہے۔ اس لیے حصص کا شمار عام جنس تجارت کے طور پر کیا جاتا ہے اور زکواۃ کے معاملے پر ان پر اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے جو تجارتی اشیاء پر ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سال حصص یا دیگر مالیاتی تمسکات کی قیمت کا تعین کر کے ان کی موجودہ مالیت اور ان سے حاصل ہونے والے منافع پر ڈھائی فیصد کی شرح سے زکواۃ ادا کرنی چاہیے۔ شرط یہی ہے کہ حصص کی مالیت اور ان کے منافع کی رقم کی مالیت اس حد سے زائد ہو جو زکواۃ کے لیے لازمی ہے۔ یا پھر حصص اور ان کا منافع، دیگر ذرائع آمدنی کے ساتھ مل کر حد نصاب سے بڑھ جاتا ہو۔ اگر گھر کے اخراجات اسی آمدنی سے پورے ہوتے ہیں تو زکواۃ کا حساب کرنے سے پہلے ضروریات زندگی کے اخراجات کے لیے رقم نکال لینی چاہیے۔

کرائے پر اٹھائے گئے گھر کی حیثیت وہی ہے جو زرعی اراضی کی ہے، باوجود اس کے کہ دونوں کی نوعیت میں فرق ہے۔ زرعی اراضی میں ہم صرف اس اراضی سے حاصل ہونے والی آمدنی پر زکواۃ ادا کرتے ہیں۔ اس لیے مکان کے کرائے سے حاصل ہونے والی آمدنی پر زکواۃ ادا کرنی ہوگی۔ زکواۃ کی ادائیگی سے پہلی مکان کی مرمت یا دیگر مدات کے اخراجات آمدنی میں سے منہا کر لیے جائیں گے۔ زرعی اراضی پر زکواۃ کی شرح آبیاری کے نظام کے مطابق ۵ سے ۱۰ فیصد تک ہوتی ہے۔ بارانی اراضی پر ۱۰ فیصد زکواۃ اور نہری اراضی پر ۵ فیصد زکواۃ ادا کی جاتی ہے۔ چونکہ عمارات اور مکانات کی دیکھ بھال، مرمت وغیرہ پر اخراجات خرچ ہوتے رہتے ہیں اس لیے یہ کہنا مناسب ہے کہ ایسی جائیداد پر ۵ فیصد کی شرح سے زکواۃ نکالی جائے۔

زرعی پیداوار پر زکواۃ

سوال: ہمارے پاس تھوڑی سی زرعی زمین ہے جس کی پیداوار سے خاندان کی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں کیا اس پر زکواۃ واجب ہے۔ اور اگر واجب ہے تو اس قسم کی زرعی پیداوار پر کس شرح سے زکواۃ ادا کرنی چاہیے؟

جواب: زکواۃ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے تیسرا اہم رکن ہے۔ اس کی اہمیت اس قدر ہے

کہ قرآن مجید میں بار بار "نماز قائم کرو اور زکواۃ ادا کرو" کی ہدایت کی گئی ہے اور زکواۃ کی ادائیگی کے بارے میں واضح ہدایات دی ہیں۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا 'پانچ وسق سے کم مقدار پر زکواۃ نہیں ہے۔" یہ حدیث زرعی پیداوار پر زکواۃ کی ادائیگی اور اس کی شرح کا پتہ دیتی ہے۔ وسق" ایک پیمانہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عرب میں استعمال ہوتا تھا۔ اس کی مقدار ۱۶۰۰ پونڈ یا ۷۲۵ کلوگرام کے مساوی ہے۔

زرعی پیداوار میں بھی کن اشیاء پر زکواۃ دی جائے، اس کی وضاحت ایک دوسری حدیث میں کی گئی ہے جو صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے۔ اس حدیث کے مطابق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ "جو، گندم، کھجور اور انگور کے سوا کسی چیز پر زکواۃ نہ نکالو۔" شافعی مسلک میں ان چار اشیاء کے ساتھ مکئی پر بھی زکواۃ لگائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی زرعی زمین سے ان چار یا پانچ اشیاء کی حاصل ہونے والی مجموعی مقدار ۷۲۵ کلوگرام کے مساوی ہو تو اس پر زکواۃ ادا کی جائے گی۔ اس سلسلے میں یہ بات قطعی غیر متعلق ہے کہ یہ پیداوار خاندان کی ضرورت کے لیے کافی ہے یا ناکافی ہے۔ یہ اللہ کی ذات ہے جو اپنے بندوں کو ان کی ضرورت کی چیزیں عطا کرتی ہے اور وہی ان کے نیک اعمال کا اجر بھی عطا کرے گا۔

زرعی پیداوار پر زکواۃ کی شرح، آبیاری کے اس نظام پر منحصر ہے جس سے اس زمین کو سیراب کیا جاتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے زرعی زمینوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جن کی آبیاری کا انحصار بارش یا قدرتی چشمے سے حاصل ہونے والے پانی پر ہو اور دوسری وہ جس کی آبیاری کے لیے انسان محنت کرے (یعنی کنواں کھودے، نہر بنائے۔) عام بول چال میں پہلی قسم کو بارانی اور دوسری کو نہری زمین کہتے ہیں۔ بارانی زمینوں کی پیدوار پر زکواۃ کی شرح پیداوار کا دسواں حصہ ہے اور نہری زمین کی پیداوار پر زکواۃ کی شرح پیداوار کا بیسواں حصہ ہے۔ اس نصاب زکواۃ کی وضاحت ایک اور حدیث میں کی گئی ہے جو بخاری شریف میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دسواں حصہ اس فصل کے لیے ادا کیا جائے جو بارش یا چشمے کے پانی سے سیراب ہوئی یا گہری جڑوں نے خود زمین کی گہرائی سے پانی حاصل کیا اور اس دسویں حصے کا نصف اس فصل کے لیے جس کی آبیاری انسانی کوششوں سے کی گئی۔" دونوں قسموں کی فصل پر زکواۃ کی شرح میں یہ فرق منطقی بھی ہے اور عام فہم بھی۔ جو انسان اپنی زمین کی آبیاری کے لیے کنواں یا نہر کھودے گا اس کے اخراجات زیادہ ہوں گے۔ اس لیے اس کی فصل پر عائد ہونے والی زکواۃ کی شرح کم رکھی گئی ہے۔ بمقابلہ اس انسان کے جس کو فصل کی آبیاری کے

لیے کوئی محنت نہیں کرنا پڑی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب زرعی زکواۃ کا تخمینہ لگانے کے لیے زکواۃ افسر کو کسی زرعی علاقے میں بھیجتے تھے تو اسے ہدایت کرتے تھے کہ وہ تخمینہ لگانے میں سختی نہ برتیں بلکہ رعایت سے کام لیں اور پیداوار کا مناسب حصہ گھر والوں کے استعمال کے لیے اور عزیزوں، رشتہ داروں کو تحفے میں دینے کے لیے چھوڑ دیں تاکہ اچھی فصل کی خوشی میں سب لوگوں کو حصہ مل سکے۔

مقروض بھی، صاحب نصاب بھی

سوال: میں نے اپنے ایک عزیز اور ایک بینک سے قرضہ لے کر اپنا مکان تعمیر کیا جس میں میں رہتا ہوں۔ اس مکان کا ایک حصہ کرائے پر دے دیا گیا ہے اور کرائے کی آمدنی سے ماہانہ اقساط کی صورت میں قرض کی ادائیگی کی جارہی ہے، مذکورہ قرض اپنی جگہ ہے اور اس کے ساتھ ہی میں صاحب حیثیت بھی ہوں۔ سوال یہ ہے کہ مذکورہ قرضے کی صورت میں جو میں یکمشت ادا نہیں کرسکتا، کیا مجھے زکواۃ ادا کرنی چاہیے۔ اگر ہاں، تو زکواۃ کا حساب کس طرح لگایا جائے گا؟

جواب: زکواۃ اس شخص پر عائد ہوتی ہے جس کے پاس اپنی اور اپنے خاندان کی ضرورت سے زائد رقم ہو، جو ۶۱۲ گرام چاندی کی مقدار کے برابر ہے۔ اگر سال بھر کے دوران آپ اتنی رقم بچا لیتے ہیں اور ایک سال مکمل ہوجاتا ہے تو آپ کو حساب لگانا چاہیے کہ ضروری ادائیگیوں کے بعد آپ کے پاس کتنی رقم بچتی ہے۔ اس رقم پر ڈھائی فیصد شرح سے زکواۃ وضع کی جائے گی۔ زکواۃ کا حساب لگانے کا یہ ایک عام طریقہ ہے جس کا اطلاق آپ کے معاملے میں بھی ہوتا ہے۔

آپ نے خود کو ''صاحب حیثیت'' لکھا ہے جس سے مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی آمدنی آپ کے عمومی اخراجات سے زائد ہے اور آپ ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے کچھ رقم بچا لیتے ہیں۔ آپ کے مکان کے کرائے سے جو آمدنی ہوتی ہے اس سے آپ قرضے کی اقساط ادا کرتے ہیں اور یہ طریقہ آپ کو آسان محسوس ہوتا ہے اور آپ اسے جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری جانب حقیقت یہ ہے کہ بینک نے آپ کو جو قرضہ دیا ہے وہ اس کی وصولیابی سود کے ساتھ کر رہا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ اس بوجھ سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کریں۔ آپ نے لکھا ہے کہ قرضہ کی یکمشت ادائیگی آپ کے لیے ممکن نہیں ہے، اس صورت میں آپ یہ کرسکتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ بچت کرکے، ہر چند ماہ بعد یا ہر سال آپ بینک کو اضافی رقم ادا کردیں اور اپنے قرض کی اصل رقم کو کم کرلیں اس طرح آپ کم وقت میں بینک کا قرضہ ادا کرسکیں گے اور اگر آپ ماہانہ اقساط کی ادائیگی بھی جاری

رکھیں گے تو ایک تو بینک کا سود کم ہو جائے گا اور دوسری طرف کم وقت میں زیادہ رقم بینک کو ادا ہو جائے گی۔ قرض کی ادائیگی کے بعد آپ کو محسوس ہوگا کہ زندگی زیادہ سہل ہو گئی ہے۔ ہر ماہ قسط کی ادائیگی کے بوجھ سے آپ کو نجات حاصل ہو جائے گی اور کم وقت میں ادائیگی کے ذریعے آپ کے مکان کی لاگت میں بھی کمی ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ جب آپ بینک جائیں اور انہیں قرضے کی جلد ادائیگی کا بتائیں تو نئے شدہ انتظام میں تبدیلی کی فیس وصول کریں۔ اس صورت میں بھی بینک کے قرضے کو جلد از جلد ادا کر دینا آپ کے لیے سود مند ہوگا۔

بینک کے قرض کی جلد ادائیگی کے لیے جب آپ ہر ماہ کی بچت، قرض کی ادائیگی میں صرف کر دیں گے تو سال بھر بعد آپ خود کو زکواۃ کی ادائیگی کا اہل نہیں پائیں گے۔ قرض سے نجات حاصل کرنے کے بعد آپ زکواۃ کی ادائیگی کا سلسلہ شروع کر سکتے ہیں۔

زکواۃ الفطر ___ اجتماعی خوشیوں کا ذریعہ

ہر سال جب مسلمان پورے ایک مہینے تک ہر روز صبح سے شام تک روزہ رکھتے ہیں اور اللہ کی طرف سے عائد کردہ ایک فرض کو بحسن و خوبی ادا کر لیتے ہیں تو وہ اس کے اختتام پر بطور شکر جشن مناتے ہیں جسے عید الفطر کہا جاتا ہے۔ اس پر مسرت جشن کا آغاز اجتماعی عبادت (دوگانہ عید) سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد لوگ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کے لیے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں۔ یہ تقریب ایک طرح کا اظہار مسرت و تشکر ہے کہ اللہ نے انہیں رمضان کے روزے رکھنے کی توفیق دی، جس کے نتیجے میں ان کے سابقہ گناہوں کی تلافی ہو سکتی ہے۔ یہ پورا موقع مسرت و شادمانی اور خوشی و انبساط کا ہوتا ہے۔ لوگ اچھے اچھے کھانے پکاتے ہیں، بچوں کو نئے کپڑے خرید کر دیتے ہیں اور اظہار مسرت کے لیے مختلف کام کرتے ہیں۔

مسلمانوں کی مسرت و شادمانی کے اس موقع پر ہر ایک کو ان خوشیوں میں شریک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہم پر زکواۃ الفطر (فطرہ) کی ادائیگی واجب کی ہے۔ فطرے کی ادائیگی کا بہترین وقت نماز عید الفطر سے قبل تک ہے (تاہم ائمہ اربعہ کے نزدیک فطرہ عید کے دن نماز مغرب سے پہلے پہلے دیا جا سکتا ہے)۔

یہ زکواۃ (فطرہ) اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے مثال ہے جو مقدار میں نہایت کم ہے لیکن ہر اس شخص پر واجب ہے جس کے گھر میں ماہ رمضان کے آخری دن کھانے کی اچھی خاصی مقدار موجود ہو۔ (امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فطرہ کی ادائیگی کے لیے صاحب نصاب ہونا ضروری ہے) یہ زکواۃ مال پر نہیں بلکہ افراد پر عائد کی گئی ہے اور ہر شخص کو یہ زکواۃ اپنے بیوی بچوں اور دیگر زیر کفالت

افراد کی طرف سے ادا کرنی ہوتی ہے۔ جن کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا صرف ان پر یہ زکواۃ واجب نہیں ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس زکواۃ کو وصول کرنے کے حقدار ہیں۔

اس تمام عمل کا مقصد یہی ہے کہ پورے مسلم معاشرے کی ایک اجتماعی تقریب کی خوشیوں میں اس معاشرے کا ہر شخص شریک ہو اور کم سے کم اس ایک دن، جب ہر طرف جشن کا سماں ہو، محتاجوں اور ناداروں کی پریشانیاں کم ہوسکیں۔ اس مقصد کی وضاحت ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلم معاشرے میں سماجی رشتے اور تعلقات مستحکم ہونے چاہئیں۔ اسلام کے نزدیک ایک اجتماعی خوشی کے موقع پر بعض پریشان حال لوگوں کا اپنی معاشی مشکلات کی وجہ سے ان خوشیوں میں شریک نہ ہونا، ناقابل قبول ہے۔ زکواۃ الفطر ہی وہ طریقہ ہے جس سے عید الفطر کی اجتماعی خوشی میں ہر ایک کی شرکت یقینی ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ یہ وہ زکواۃ ہے جو ''مال'' کی بجائے ''افراد'' پر عائد کی گئی ہے۔ اس لیے اس کی ادائیگی خاندان کے ہر فرد کے ذمے ہے۔ خواہ وہ فرد ـــــ ایسا نوزائیدہ بچہ ہو جو نماز عید سے چند لمحے قبل پیدا ہوا ہو۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ مستقبل میں باپ بننے والے شخص کو بھی اپنی اولاد کی طرف سے فطرہ ادا کرنا چاہیے۔

فطرہ کے مستحق معاشرے کے وہ نادار پریشان حال لوگ ہیں جو معاشی مشکلات کی وجہ سے زندگی کی مسرتوں سے محروم ہوں۔ اگر ہمیں کسی شخص کے بارے میں علم ہو کہ وہ غربت و افلاس کا شکار ہے تو اسے فطرہ دے دینا چاہیے۔ اس بات کی پوچھ گچھ کے بغیر کہ اس سے پہلے اسے کیا کچھ مل چکا ہے۔

فطرہ کی ادائیگی کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ یہ جنس کی شکل میں دیا جائے یعنی گیہوں، کھجور، مکئی، جو، چاول یا کوئی اور غذائی جنس جو اس معاشرے میں عام طور پر استعمال ہوتی ہو۔ اس کا پیمانہ عام طور پر دو کلوگرام سے زائد گندم یا اس کے مساوی ہے یا ایک اوسط آدمی کی دونوں ہتھیلیوں کو ایک پیالے کی شکل میں ملا کر رکھا جائے اور چار مرتبہ اس میں جتنا گندم آ جائے ـــــ وہ پیمانہ ہوگا۔ بعض علماء کے نزدیک فطرہ کی ادائیگی نقد رقم کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے، بشرطیکہ اس علاقے میں بازار اور دوکانیں موجود ہوں اور ان دکانوں میں کھانے پینے کی اشیاء بہ افراط پائی جاتی ہوں۔ ایسے معاشرے میں جہاں صرف چند دکانیں ہوں یا کھانے پینے کی اشیاء بہ افراط نہ ہو (یا ان پر کنٹرول ہو) وہاں فطرہ کی ادائیگی نقد کے بجائے لازماً جنس کی صورت میں کرنا چاہیے۔

فطرے کی ادائیگی کی آخری حد نماز عید الفطر سے پہلے کا وقت ہے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ رمضان کے آخری دنوں میں ادا کر دینا چاہیے جبکہ بعض کا خیال ہے کہ یہ رمضان کے مہینے

میں کسی بھی وقت ادا کیا جا سکتا ہے۔

فطرہ کی رقم سے غریب لڑکیوں کی شادی؟

سوال: کیا فطرے کی رقم غریب مسلمان لڑکیوں کی شادی کرانے کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے؟

جواب: فطرہ، ہر اس مسلمان کے لیے لازم ہے، جو اپنی اور اپنے زیر کفالت افراد (بیوی، بچے اور دیگر اہل خانہ) کی ضروریات پوری کرسکتا ہو اور اس کے بعد اس کے پاس کچھ رقم محفوظ رہ سکتی ہو۔ یہ ایک اسلامی فلاحی فنڈ ہے، جو رمضان کے آخر میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس زائد از ضرورت رقم سے وہ اپنے علاقے کے دوسرے ضرورت مند مسلمانوں کی مدد کرسکتا ہے۔ فطرے کی ادائیگی اشیاء کی صورت میں بھی کی جاسکتی ہے اور نقد رقم سے بھی ممکن ہے۔

فطرے کا اصل مقصد یہ ہے کہ جو مسلمان اس قابل نہیں ہیں کہ اپنی ضروریات پوری کرسکیں، فطرے کی رقم سے ان کی ضروریات پوری کر کے ان مسلمان بھائیوں کو بھی عید کی مسرتوں میں شامل کیا جائے۔ اسلام جس اخوت کا مطالبہ کرتا ہے، یہ عمل اس کا تقاضا بالکل احسن طور پر پورا کرتا ہے۔

اس تمام تناظر میں ہم اب اس مسئلے کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا فطرہ کی رقم غریب مسلمان لڑکیوں کی شادی کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک بالکل مختلف معاملہ ہے۔ اگرچہ یہ ایک نیک مقصد ہے کہ ان غریب لڑکیوں کے گھر آباد کیے جائیں ____ لیکن یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ فطرہ کا مقصد چونکہ بنیادی طور پر غریب مسلمانوں کو عید کی خوشیوں میں شریک کرنا ہے اس لیے یہ رقم اسی خاص مقصد کے لیے استعمال کرنی چاہیے۔

اسلامی شریعت کے مطابق شادی کے لیے ضروری ہے کہ لڑکا (دولہا) لڑکی (دلہن) کو مہر ادا کرے تاکہ شادی عمل میں آسکے۔ علاوہ ازیں شادی کے بعد نئے گھر کی ضروریات کی تکمیل بھی مرد ہی کے ذمے ہے۔ جن مسلم ممالک میں اس سے ہٹ کر عمل ہو رہا ہے اور غیر ضروری رسوم و رواج نے شادی کو دشوار مرحلہ بنا دیا ہے اسلام اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ لوگوں نے رسوم و رواج اپنا کر زندگی کو خود اپنے لیے مشکل بنا دیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اسلام کے طریقے پر عمل کریں اور زندگی کے دوسرے معاملات کی طرح شادی کے سلسلہ میں بھی سادگی اختیار کریں۔ اسلام کے احکامات کو علاقائی رسوم و رواج کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی علاقے میں جہاں مسلمان معاشرہ ہے، کسی لڑکی کے لیے لازم کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کو زر و مال کی ایک خاص مقدار ادا کرے تو

یہ قطعاً اسلامی طریقہ نہیں ہے۔ ایسے رسوم و رواج غیر مسلم معاشروں سے لیے گئے ہیں۔ بحیثیت مسلمان ہم کو اپنے معاشرے سے ایسی رسوم کو نکال باہر کردینا چاہیے۔

فطرے کا مقصد غریب اور ضرورت مند مسلمانوں کو خوشی میں شامل کرنا ہے۔ حضرت نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے والی کے نام حکم فرمایا کہ ''امیروں سے فطرہ لو اور غریبوں میں تقسیم کردو۔'' اس کی افادیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں ان کے گورنروں نے انہیں لکھا کہ ہم نے مستحقین کو تلاش کیا، لیکن کوئی لینے والا نہیں تھا۔ سب خوشحال ہوچکے تھے۔ اس کی افادیت صرف مسلمانوں تک نہیں، غیر مسلموں کو بھی پہنچتی ہے۔

عاملین کے اس جواب پر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ ''پھر فطرے کی رقم مستحق عیسائیوں اور یہودیوں میں تقسیم کردی جائے۔'' گورنروں نے جواب دیا کہ ان میں بھی کوئی مفلوک الحال باقی نہیں رہا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے حکم دیا کہ ''اس رقم کو غلام مسلمانوں کی آزادی کے لیے استعمال کیا جائے۔''

حج اور عمرہ

حج وعمرہ: چند عمومی سوالات

حج کے موقع پر جو چند سوالات بار بار سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ اگر ایک شخص موسم حج میں حج کا ارادہ نہیں رکھتا تو کیا شوال اور ذی قعد کے مہینوں میں عمرہ ادا کرسکتا ہے؟

۲۔ مکہ مکرمہ سے بہت دور رہنے والے شخص کے لیے کیا یہ ممکن ہے کہ اگر وہ اپنے مقام سے قربانی کا جانور ساتھ لے کر نہ چلے تو وہ قران کے طریقے سے حج ادا کرسکے؟

۳۔ کیا سعودی عرب سے باہر قربانی کرنا جائز ہے۔ کیا اس بات کی اجازت ہے کہ منیٰ میں قربانی کے گوشت کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے قربانی کے جانور کی قیمت کے مساوی رقم غرباء کو دے دی جائے؟

۴۔ کہا جاتا ہے کہ احرام کی حالت میں کوئی شخص غسل نہیں کرسکتا۔ اگر کسی شخص کو حالت احرام میں بدخوابی ہوجائے تو اسے پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

۵۔ جمرہ کے مقامات پر رمی کے وقت زبردست ہجوم ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جمرات پر ساتوں پتھر بیک وقت مارے جائیں؟

۶۔ ایک شخص نے صرف حج کا ارادہ کیا ہے لیکن بعد میں وہ اپنے ارادے میں تبدیلی کرکے عمرہ بھی

ادا کر لیتا ہے کیا احرام کے کسی بھی طریقے میں یہ ممکن ہے؟

جوابات:

۱۔ عمرہ کسی بھی وقت ادا کیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص حج کا ارادہ نہیں رکھتا تو وہ شوال یا ذی قعد میں عمرہ ادا کرسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں چار عمرے ادا کیے اور وہ تمام ذی قعد کے مہینہ میں کیے گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمرہ کی ادائیگی میں کوئی پابندی نہیں ہے۔

اس معاملے میں غلط فہمی یا الجھن اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ اگر ایک شخص حج کی نیت نہیں رکھتا اور شوال یا ذیقعد یا ذی الحجہ کے ابتدائی نو دنوں میں عمرہ کرتا ہے لیکن بعد میں (اسی سال) حج بھی کر لیتا ہے تو اس شخص کا حج تمتع کے طریقے کے مطابق ہوگا جس کے تحت اسے ایک بھیڑ قربان کرنی ہوگی۔ یہ قربانی اس بات کے شکرانے کے لیے ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ہی موسم حج میں ــــ حج اور عمرہ دونوں ادا کرنے کی سعادت بخشی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ایک موسم حج میں عمرہ ادا کرلیا جائے تو حج کی ادائیگی لازمی ہوجاتی ہے۔ اس قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔

۲۔ کوئی بھی شخص قران کے طریقے سے حج کرسکتا ہے خواہ وہ قربانی کا جانور اپنے ہمراہ لے کر آئے یا نہیں۔ تاہم یہ بات احسن سمجھی جاتی ہے کہ حج کا ارادہ کرنے والا ہر شخص اپنے طریقۂ حج کا پہلے سے واضح طور پر انتخاب کر لے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سال فریضہ حج ادا کیا اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ایک لاکھ افراد تھے۔ تمام صحابہؓ نے اپنی آمد کے موقع پر طواف اور سعی کی اور وہ یہ نیت رکھتے تھے کہ حج کی ادائیگی تک حالت احرام میں رہیں گے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے احرام کھول دیں، یعنی تمتع کے طریقے سے حج کریں۔ صحابہ کرامؓ کو احرام کھولنے میں تامل ہوا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات پر اصرار کیا کہ احرام کھول دیے جائیں۔ صحابہ کرامؓ نے احرام کھول دیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ خود اس طریقے پر عمل نہیں کریں گے کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) قربانی کا جانور اپنے ہمراہ لے کر آئے ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وضاحت فرمائی کہ اگر قربانی کا جانور ہمراہ نہ لاتے تو احرام کھول دیتے اور عمرہ مکمل فرمالیتے۔

اس واقعہ کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ اگر کوئی شخص حدود حرم اور (حرم کے) پہاڑی علاقے کے باہر سے آیا ہو، حج کے لیے اس نے قران کے طریقے کا انتخاب کیا ہو اور وہ قربانی کے لیے جانور بھی ساتھ لایا ہو تو اسے قران کا طریقہ جاری رکھنا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے ہمراہ قربانی کا جانور نہ لایا ہو تو اس کے لیے یہ بہتر ہے کہ وہ تمتع کا طریقہ اختیار کرے۔

۳۔ حج سے متعلق ہر قسم کی قربانی، خواہ وہ اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے ہو یا حج کے دوران کسی سہو کا ازالہ کرنے کے لیے، حدودِ حرم میں یعنی مکہ مکرمہ یا منیٰ میں ادا کرنی ہوتی ہے۔ قربانی کا گوشت حدودِ حرم سے باہر لے جایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ حدودِ حرم میں بسنے والے مستحقین کی ضرورت پوری ہو چکی ہو۔ قربانی کے جانور کی قیمت کے برابر رقم کسی غریب کو دینے کی اجازت نہیں ہے۔ جانور کی قربانی اور قربانی کے گوشت کی غرباء میں تقسیم لازمی ہے۔ قربانی کے گوشت کے ضیاع کو بچانے کے لیے گزشتہ کئی برسوں سے جس نظام پر عمل درآمد ہو رہا ہے وہ نہایت مؤثر ہے۔ یہ گوشت ان مسلم ممالک کو بھیج دیا جاتا ہے جہاں لوگ افلاس کا شکار ہیں۔ یہ گوشت بنگلہ دیش، افریقہ، اردن، شام، لبنان اور افغان مہاجرین کے لیے بھیجا جاتا رہا ہے۔

۴۔ ہر حاجی کو غسل کی اجازت ہوتی ہے اس لیے اگر کوئی شخص جسمانی پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے غسل کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ حالتِ احرام میں غسل پر پابندی نہیں ہے۔

۵۔ جمرات پر رمی علیحدہ علیحدہ ہی کرنی چاہیے۔ ہر رمی پر حاجی اللہ کی ثناء کرتا ہے اور خود کو یہ احساس دلاتا ہے کہ یہ ایک علامتی فعل ہے۔ رمی جمرات یا شیطان کو کنکریاں مارنے کا عمل، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس عمل کی یاد تازہ کرتا ہے جب آپ اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے لیے نکلے تھے اور جب ان مقامات پر شیطان نے آپ کو ورغلانے کی کوششیں کی تھیں تو آپ نے اس پر کنکریاں مار کر بھگایا تھا۔ ہم ان شیاطین پر کنکریاں پھینک کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہر حالت میں اللہ کے حکم کی تعمیل کریں گے خواہ اس تعمیل کے لیے کیسی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ ہم دنیا کی ہر آسائش اور راحت کو پسِ پشت ڈال کر اللہ کا فرمان بجا لائیں گے۔ یہ عمل اس بات کی علامت ہے کہ بندے کا اللہ سے رشتہ دنیا کے ہر انسانی رشتے سے زیادہ مضبوط اور عزیز ہے۔

۶۔ اس سوال کا جواب، دوسرے سوال کے جواب کے ضمن میں دیا جا چکا ہے۔ یہ بہتر سمجھا جاتا ہے کہ جس شخص نے گھر سے نکلتے وقت قران یا افراد کے طریقے سے حج ادا کرنے کی نیت کی ہو وہ تمتع کا طریقہ اختیار کر لے۔ سوائے اس صورت کے کہ وہ قربانی کے لیے جانور اپنے ہمراہ لے کر نکلا ہو۔

حج کی اصطلاحیں، حج کے طریقے اور رسول کریمؐ کا طریقۂ حج

یہ سوال عام طور پر کیا جاتا ہے کہ حج کس طریقے سے کرنا چاہیے؟ حج کے مہینوں (شوال، ذیلقعدہ اور ذی الحجہ) کے دوران عمرہ کی ادائیگی کے بارے میں بھی بعض غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اس ابہام کو دور کرنے کے لیے ہم یہ جائزہ لیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طریقے سے حج اور عمرہ ادا کیا اور مختلف حالتوں کے لیے کیا ہدایت فرمائی۔ عمرہ اور حج کے مختلف طریقوں کے لیے جو اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں، پہلے ہم ان کی تعریف پر غور کرتے ہیں۔

عمرہ: عمرہ اللہ کی بندگی و عبادت کا ایسا طریقہ ہے جو احرام باندھنے کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد طواف کعبہ کیا جاتا ہے، سعی کی جاتی ہے اور سر منڈایا جاتا ہے۔ بیشتر فقہا کے نزدیک عمرے کی ادائیگی ہر اس مسلمان پر واجب ہے جو اس کی اہلیت رکھتا ہو، بعض فقہا اسے سنت یا نفل عبادت قرار دیتے ہیں۔ عمرہ سال کے کسی بھی دن ادا کیا جا سکتا ہے۔

حج: اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔ عمرہ میں جو عبادت کی جاتی ہے، حج میں اس کے علاوہ بعض دیگر امور اور ارکان شامل ہیں، جن میں ایک خاص دن عرفات میں قیام، ایک رات کے لیے مزدلفہ میں وقوف، منیٰ میں دو راتوں کا قیام اور جمرات پر رمی (یعنی شیاطین کو کنکریاں مارنا) شامل ہیں۔ حج کے تین طریقے ہیں اور حج کے ارادے سے احرام باندھتے وقت مندرجہ ذیل تین طریقوں میں سے ایک طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

حج اِفراد: حج افراد کے معنی ہیں عمرہ کو شامل کیے بغیر حج کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عازمِ حج میقات کے مقام پر احرام باندھتا ہے اور پھر یوم النحر (قربانی کے دن) تک حالت احرام میں رہتا ہے۔ بیشتر حضرات جو اس طریقے سے حج کرتے ہیں، عام طور پر حج کی ادائیگی کے بعد عمرہ ادا کرتے ہیں۔ اس نکتہ کی مزید وضاحت بعد میں کی جائے گی۔

حج تمتع: تمتع کے طریقے سے حج کرتے وقت حج سے پہلے عمرہ ادا کیا جاتا ہے۔ یہ احرام باندھنے کا وہ طریقہ ہے جس میں عازمِ حج مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے ہی عمرہ کے ارکان (طواف، سعی، سر منڈانا) ادا کرتا ہے اور عمرہ مکمل کر لیتا ہے۔ اس کے بعد ۸ ذی الحجہ تک کے لیے احرام کھول دیا جاتا ہے۔ لفظ تمتع کے ایک معنی سہولت اور آسانی کے بھی ہیں۔ حج کے اس طریقے کو یہ نام اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ عمرہ کی ادائیگی کے بعد عازم حج احرام کھول کر ان پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے جو احرام کے ساتھ عائد ہوتی ہیں، اس طرح عمرہ کی ادائیگی کے بعد اور حج کے آغاز سے قبل تک عازم حج سہولت کے ساتھ رہ سکتا ہے۔

حج قران: قران کے معنی دو چیزوں کے یکجا کرنے کے ہیں۔ حج کے اس طریقے میں حج اور عمرہ کا احرام ایک ساتھ باندھا جاتا ہے اور حج و عمرے کے مناسک ادا کیے جاتے ہیں۔ حج قران کا احرام میقات کے مقام پر باندھا جاتا ہے۔ عازم حج کو یوم النحر تک حالت احرام میں رہنا ہوتا ہے اس طریقے سے حج کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ حج و عمرہ اکٹھے ادا ہوجاتے ہیں۔ مکہ مکرمہ پہنچ کر پہلے عمرے کے افعال پورے کیے جائیں۔ یعنی طواف اور سعی کی جائے مگر احرام نہ کھولا جائے۔ باقی لوازمات حج افراد کے طریقے کے مطابق ہوتے ہیں لیکن اس طریقے سے حج کرنے والے کو عمرے اور حج، دونوں کا ثواب ملتا ہے۔ تمتع اور قران کے طریقوں میں اس بات کے شکرانے کے طور پر کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی سال میں عمرہ اور حج کی ادائیگی کی سعادت بخشی ایک جانور ذبح کیا جاتا ہے، یہ قربانی واجب ہے اس قربانی کا گوشت قربانی کرنے والا خود بھی استعمال کرسکتا ہے اور اپنے خاندان کو بھی اس میں شریک کرسکتا ہے۔

افراد کے مقابلے میں تمتع یا قران کے طریقے کی فضیلت یہ ہے کہ ان طریقوں میں عمرہ اور حج دونوں کی ادائیگی ایک ہی سال میں ہوجاتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ دونوں طریقے قابل ترجیح ہیں۔ ہجرت کے دسویں سال، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا ارادہ کیا تو صحابہ کرامؓ کی بڑی تعداد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ تھی۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ''ہم اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ روانہ ہوئے سب کو یقین تھا کہ یہ سفر حج کے لیے ہے۔ جب ہم مکہ پہنچے تو ہم نے کعبہ کا طواف کیا اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام لوگوں کو احرام کھولنے کا حکم دیا جو قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہیں لائے تھے۔ ہر اس شخص نے احرام کھول دیا جو قربانی کا جانور ساتھ نہیں لایا تھا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ازواج نے بھی یہی کیا'' (بخاری شریف)۔

یہ واقعہ بیشتر صحابہ کرامؓ کے ساتھ پیش آیا جو اس سال حج کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ درحقیقت بیشتر صحابہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر عمل کرنے میں تامل تھا کیونکہ یہ طریقہ ان کے لیے اجنبی اور نامانوس سا تھا۔ اسلام سے قبل عربوں کی روایت اور عقیدے کے مطابق حج کے مہینوں میں عمرے کی ادائیگی کو بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ حج کے مہینوں سے مراد شوال، ذیقعدہ کے مہینے اور ذی الحجہ کے ابتدائی دس دن ہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر احرام کھولنے کا حکم دیا تو یہ سمجھا گیا کہ حج کے ارادے سے مکہ آنے والے شخص کے لیے احرام کھولنا موزوں نہیں ہے اس لیے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: ''یا رسول اللہ کون سا احرام کھولا جائے۔'' صحابہ کرامؓ یہ سمجھتے تھے کہ حالت احرام سے نکلنے کے دو

مرحلے میں پہلے طریقے کے مطابق عام لباس پہنا جا سکتا ہے خوشبو استعمال کی جا سکتی ہے اور دیگر ایسے امور انجام دیئے جا سکتے ہیں جو حالت احرام میں ممنوع ہوتے ہیں۔ (سوائے اپنی زوج کے ساتھ صحبت کے) صحابہ کرامؓ کے سوال کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زور دے کر کہا: ''مکمل طور پر احرام کھولا جائے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود احرام نہیں کھولا کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) قربانی کا جانور ساتھ لائے تھے اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قران کے طریقے سے حج کی ادائیگی لازم ہوئی۔

یہاں اس بات پر توجہ دینا ضروری ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھولنے کا حکم ان لوگوں کو دیا تھا جو قربانی کا جانور ساتھ نہیں لائے تھے۔ جب بعض صحابہؓ نے یہ سوال اٹھایا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں احرام کھولنے کا حکم دیا ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود احرام نہیں کھولا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قربانی کا جانور ساتھ لائے ہیں۔

دین و دنیا کے تمام معاملات میں اور خاص طور پر دینی امور وعبادات کی ادائیگی میں سب سے بہتر طریقہ وہی ہے جس کی ہدایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی اور اپنی سنت کے ذریعے عمل کر کے بتایا۔ اس خاص معاملے میں یہ پتا چلتا ہے کہ حج کی ادائیگی کے لیے تمتع کا طریقہ مستحسن ہے، ان لوگوں کے استثناء کے ساتھ جو قربانی کا جانور آغاز سفر کے مقام سے اپنے ساتھ لائے ہوں۔ موجودہ دور میں یہ طریقہ ان لوگوں کے لیے موزوں ہے جو زمینی سفر اختیار کرتے ہیں۔ بعض حالات میں یہ ان کے لیے بھی دشوار ہو سکتا ہے۔ قربانی کے لیے جانور کثرت کے ساتھ دستیاب ہیں۔ اس لیے عازمین حج کی بڑی تعداد یہیں خرید کر قربانی کرنا پسند کرتی ہے۔ اس کے باوجود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حکم اپنی جگہ ہے کہ اگر کوئی شخص قربانی کا جانور ساتھ لائے تو اس کے لیے قران کا طریقہ مستحسن ہے۔

''تمتع'' اور ''قران'' کے طریقے سے حج کی ادائیگی مکہ کے باشندوں کے لیے نہیں ہے، انہیں صرف حج ادا کرنا ہوگا، عمرے کے ساتھ ادائیگی ممکن نہیں ہوگی۔ حدود حرم کے باہر سے آنے والوں کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ ''افراد'' کے طریقے سے حج کرتے ہیں اور عمرے کی ادائیگی حج کے بعد کی جاتی ہے تاہم یہ طریقہ اسلام کے ابتدائی دور میں عام طور پر رائج نہیں تھا۔ لوگ یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ عمرہ اور حج کے سفر کا زیادہ ثواب حاصل کرنے کی غرض سے ہر عبادت کے لیے علیحدہ سفر کیا جائے۔ جب دونوں عبادات کی ادائیگی کے لیے ایک ہی سفر کیا جا رہا ہو تو اس صورت میں تمتع یا

قران کے طریقوں میں سے کوئی ایک طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔

اب سوال رہ جاتا ہے حج کے مہینوں میں عمرے کی اس طرح ادائیگی کہ اس کے بعد حج نہ کیا جائے۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اس کی اجازت نہیں ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں تین عمرے، ذیقعدہ کے مہینے میں کیے اور اس سال آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حج نہیں کیا۔ اگر کسی شخص نے شوال یا ذیقعدہ کے مہینے میں عمرہ ادا کیا اور اس نے ابتداء میں حج کی نیت نہیں کی لیکن بعد میں اس کے لیے اسی سال حج کی ادائیگی ممکن ہے تو اسے تمتع کے طریقے سے حج کرنا ہوگا اور اس بات کے اظہار تشکر کے لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ہی سال میں عمرے اور حج کی سعادت بخشی، اسے ایک جانور کی قربانی کرنا ہوگی۔

حج کا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے؟

سوال: ہمارا ارادہ ہے کہ دمام سے بذریعہ طیارہ پہلے مدینہ اور پھر وہاں سے جدہ جائیں اور تمتع کے طریقے سے حج ادا کریں۔ ازراہ کرم بتایئے کہ اس کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟

جواب: تمتع کے طریقہ سے احرام باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو مکہ پہنچنے کے فوراً بعد عمرہ ادا کرنا ہے اور طواف وسعی کے بعد حلق یا قصر کرا کے احرام کھول دینا ہے۔ احرام کھولنے کے بعد وہ شخص احرام کی پابندیوں سے اس وقت تک آزاد ہوجاتا ہے جب ۸ ذی الحجہ کو وہ دوبارہ حالت احرام میں داخل ہو۔ احرام باندھنے کے بعد ان تمام باتوں سے اجتناب لازم ہوتا ہے جو حالت احرام میں ممنوع قرار دی گئی ہیں۔

اگر آپ پہلے مدینہ آئیں اور وہاں سے جدہ آنا چاہیں تو آپ کے لیے سب سے بہتر یہ ہوگا کہ آپ ایئرپورٹ روانہ ہونے سے قبل یا ایئرپورٹ پر احرام باندھ لیں۔ تاہم عمرے کی نیت آپ اس وقت تک نہ کریں جب تک آپ کا طیارہ فضا میں نہ پہنچ جائے۔ اگر آپ ایک روز یا اس سے زیادہ عرصے کے لیے جدہ میں قیام کا ارادہ رکھتے ہیں تب بھی آپ احرام کی حالت میں رہیں گے۔ اگر آپ ایسا نہیں کرتے اور اپنے عام لباس میں جدہ پہنچتے ہیں تاکہ وہاں اپنے کاروباری امور انجام دے سکیں، تو آپ کو احرام باندھنے کے لیے میقات پر واپس آنا ہوگا اس صورت میں آپ کے لیے رابغ کا میقات سب سے نزدیک ہوگا جو جدہ سے صرف ۶۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اگر آپ یہ بھی نہیں کرتے اور جدہ میں رہتے ہوئے احرام باندھتے ہیں تو اس صورت میں آپ کو دم دینا ہوگا، یعنی ایک بھیڑ کی قربانی کرنی ہوگی۔

دوسری طرف اگر آپ کسی کاروباری معاملے کے لیے جدہ آ رہے ہیں اور حج یا عمرہ کی نیت نہیں رکھتے لیکن آپ کے کاروباری معاملے میں کچھ تاخیر کے امکان کی وجہ سے آپ اس دوران عمرے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اس صورت میں آپ جدہ میں احرام باندھ سکتے ہیں۔ ان دونوں معاملوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں آپ عمرے کی نیت کر کے جدہ میں داخل ہوئے تھے جب کہ دوسری صورت میں آپ اپنے ذاتی کام کی وجہ سے جدہ آئے تھے۔ جدہ میں آپ کی آمد جس سبب سے ہوئی اسی کے مطابق آپ کو یہ پابندی کرنا ہوگی کہ آپ احرام کہاں باندھیں۔ بہر حال آپ کو یہ خیال لازماً رکھنا ہے کہ اولاً آپ کی کیا نیت تھی، اپنی سہولت کے لیے کوئی ناجائز فائدہ حاصل کرنا بالکل غلط ہوگا۔ جب ادائیگی فرض کا معاملہ ہو تو اس میں سہولت کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ اگر آپ کو جدہ میں ذاتی کام ہے تو اس صورت میں بھی بہتر یہی ہے کہ آپ عمرے کی نیت کریں۔ پہلے مکہ جا کر عمرہ ادا کریں اور اس کی تکمیل کے بعد احرام کھول دیں۔ جدہ آئیں اور اپنا کام انجام دیں۔

حج اور عمرہ کے لیے زبان سے نیت کے الفاظ کی ادائیگی

سوال: حج کے موضوع پر دارالافتاء کا شائع کردہ ایک کتابچہ میری نظر سے گزرا جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حج اور عمرے کے سوا، دیگر عبادات کی ادائیگی سے پہلے نیت کے الفاظ زبان سے ادا کرنا ایک اختراع ہے۔ اس کے برخلاف میں نے اپنے وطن میں ایک کتاب میں یہ پڑھا ہے کہ باقاعدہ نیت کے بغیر ہماری عبادات مثلاً طواف، قبول نہیں ہوتیں۔ براہ کرم وضاحت فرمایئے کہ کون سا موقف درست ہے۔ علاوہ ازیں اس حدیث کی کیا اہمیت ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے؟

جواب: دونوں موقف ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہیں، بلکہ دونوں درست ہیں۔ ہم جو کام بھی انجام دیتے ہیں اس کے پیچھے ہمارا ارادہ اور نیت ضرور ہوتی ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ کے ایک دوست آپ کے گھر آتے ہیں اور آپ ان کی آمد پر مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اگر آپ کے اس عمل کا مقصد یہ ہے کہ دوست کی حیثیت سے آپ کے تعلقات میں اضافہ ہو، تو آپ کو اس عمل کا اجر ملے گا۔ یہاں آپ کی نیت اور ارادے نے آپ کے عمل کو ایک خاص رنگ دے دیا جو اجر کا مستحق ہے۔ اس کے برخلاف اگر آپ کا مہمان نوازی کا مظاہرہ اس لیے تھا کہ آنے والا شخص کسی خاص عہدے پر فائز ہے اور آپ اس سے اس قسم کے معاملات طے کرنا چاہتے ہیں جو

مشکوک ہیں تو اس صورت میں آپ کو اس مہمان نوازی کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔ بلکہ یہ سزا کا مستحق قرار پائے گا۔ ایک ہی جیسے عمل کو پرکھنے کا اصل معیار وہ نیت اور ارادہ ہے جس کے ساتھ وہ عمل انجام دیا گیا ہے۔ نیت اور عمل کے حوالے سے آپ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے اس کے اصل معنی یہی ہیں۔ ایک شخص اگر اس مقصد سے عبادت کرتا ہے کہ لوگ اسے متقی اور عبادت گزار شخص کے طور پر پہچانیں تو اس کو اپنی عبادت کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔ جو شخص محض اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں عبادت کرتا ہے وہ ان کا اجر پائے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کسی کے عمل کے اخلاص کا اندازہ کس طرح لگائیں۔ کیا محض اس وجہ سے کہ ایک شخص زبان سے یہ کہتا ہے کہ میں اپنے اس دوست کی مہمان نوازی فلاں فلاں وجہ سے کرتا ہوں۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیونکہ اس کی اصل نیت اور ارادہ اس کے ذہن میں ہے۔ اسی اصول کا اطلاق عبادت پر ہوتا ہے۔ آپ نماز کے لیے قبلہ رو کھڑے ہو جائیں اور وہ تمام اعمال انجام دیں جو نماز میں ہوتے ہیں، لیکن آپ نے نماز کی نیت نہیں کی ہو، تو جو کچھ آپ نے کیا، وہ نماز نہیں ہوگی۔ نماز کے لیے کھڑے ہوتے وقت آپ کے ذہن میں لازماً یہ بات ہونی چاہیے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ یہی نماز کی نیت ہے اور یہ فرض ہے، اس کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی۔

حج کا معاملہ یوں ہے کہ حج کے پورے عمل یا عمرے کا آغاز زبان سے ادا کی گئی نیت سے ہوتا ہے۔ آپ جس وقت احرام پہنتے ہیں اس وقت زبان سے یہ الفاظ ادا کرتے ہیں کہ

"لبیک اللہم حجہ" یا "لبیک اللہم عمرہ"

جس کے معنی ہیں: "اے اللہ میں حاضر ہوں حج کے لیے" یا "اے اللہ میں حاضر ہوں عمرے کے لیے" یہ حج یا عمرہ کی نیت کا زبان سے اعلان ہے اور حج یا عمرے کی ادائیگی کے لیے فرض ہے۔ نیت کے اس اعلان کے ساتھ ہی حج یا عمرہ کے ارکان کا آغاز ہوتا ہے۔

اس بیان کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ دونوں کتابوں میں علماء نے جو بیان کیا ہے وہ ایک دوسرے کے متضاد نہیں ہے۔ حج یا عمرے کی صورت میں زبان سے نیت کا اظہار حج یا عمرے کے پورے عمل کا آغاز ہے۔ جبکہ دیگر عبادات میں بھی نیت فرض ہے لیکن اس کا مطلب ارادے کا آپ کے ذہن میں موجود ہونا ہے۔

حج کے لیے تمتع کا طریقہ

سوال: میں اپنی زوجہ کے ساتھ حج کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میری زوجہ خاصی کمزور ہیں اور زیادہ

فاصلے تک پیدل نہیں چل سکتیں۔ انشاء اللہ ہم دونوں تمتع کے طریقہ سے حج ادا کریں گے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ابھی عمرہ ادا کرلیں اور پھر بعد میں حج کے لیے براہ راست منٰی چلے جائیں۔ اس صورت میں کیا ہمیں طواف زیارت کے بعد سعی کرنا ہوگی۔ ازراہ کرم ایسے طریقے کی وضاحت فرمائیے جس میں کم سے کم رسومات ادا کرنے کی ضرورت ہو۔ براہ کرم حج افراد کے طریقے کی تفصیل بھی بیان فرمایئے؟

جواب: آپ کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ آپ کو طواف زیارت کے بعد سعی کرنا ہوگی۔ آپ نے اپنے حالات کے لحاظ سے حج کی ادائیگی کے موزوں طریقے یعنی تمتع کا انتخاب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ شوال کے مہینے کے آغاز کے بعد اور حج سے پہلے کسی بھی وقت عمرہ ادا کرسکتے ہیں۔ عمرے کی تکمیل پر آپ احرام کھول دیں گے اور پھر ۸ ذی الحجہ کو دوبارہ احرام باندھیں گے۔ احرام باندھ کر آپ منٰی جائیں گے جہاں ایک رات قیام ہوگا۔ یہاں آپ کو ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں عرفات کے لیے روانہ ہونے سے قبل ادا کرنی ہوں گی۔ ۸ ذی الحجہ کو منٰی کا یہ قیام سنت ہے۔ آپ چاہیں تو ۹ ذی الحجہ کو براہ راست عرفات کے لیے روانہ ہوسکتے ہیں۔ چونکہ تمتع کے طریقے میں عمرہ اور حج علیحدہ علیحدہ ادا کرنے ہوتے ہیں، اس لیے عمرے کے لیے آپ کی سعی علیحدہ ہوگی اور حج کے لیے علیحدہ ہوگی۔ حج کی سعی آپ کو طواف زیارت کے بعد کرنا ہوگی۔ چونکہ آپ کی زوجہ کمزور ہیں، اس لیے وہ سعی اور طواف پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر کرسکتی ہیں۔ حرم شریف میں ایسی کرسیاں موجود ہیں۔ آپ چاہیں تو خود یا حرم شریف کا کوئی شخص آپ کی اہلیہ کی پہیوں والی کرسی دھکیل سکتا ہے۔ پہیوں والی کرسی میں بیٹھ کر، خانہ کعبہ کے نزدیک طواف کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لیے حرم کی دوسری منزل زیادہ موزوں ہے۔

افراد کے طریقے سے حج کرنے میں عمرہ ادا نہیں کرنا ہوگا۔ جدہ میں رہائش رکھتے ہوئے آپ آٹھ یا نو ذی الحجہ کو جدہ سے حج کے لیے روانہ ہوسکتے ہیں۔ مکہ مکرمہ پہنچنے پر آپ چاہیں تو پہلے طواف قدوم کرلیں۔ یہ طواف سنت ہے۔ اس کے بعد آپ منٰی یا عرفات کے لیے روانہ ہوجائیں۔ باقی ارکان آپ اسی طرح ادا کریں گے جیسے تمتع کے طریقے میں کیے جاتے ہیں۔ حج کا اختتام طواف وداع پر ہوگا، حج کے تینوں طریقوں میں طواف وداع ادا کرنا ہوتا ہے۔ افراد کے طریقے سے حج کرتے ہوئے فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ آپ کو قربانی کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جبکہ تمتع اور قران کے طریقوں سے حج کرتے ہوئے قربانی کرنا واجب ہے۔ یہاں یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ اگر آپ عمرہ نہیں کریں گے تو آپ کو اس کا ثواب نہیں ملے گا۔

حرم شریف کی زیارت اور احرام

سوال: میں مکہ مکرمہ اور حرم شریف جانا چاہتا ہوں۔ لیکن میری صحت ایسی نہیں ہے کہ عمرہ ادا کرسکوں۔ اس صورتحال میں احرام کی پابندی کرنی ہوگی؟

جواب: اگر آپ نے ابھی تک حج اور عمرہ ادا نہیں کیا ہے تو اس صورت میں مکہ مکرمہ اور حدود حرم میں آپ کی پہلی آمد دونوں میں سے کسی ایک فریضے کی ادائیگی کے لیے ہونی چاہیے۔ اگر آپ پہلے عمرہ ادا کر چکے ہیں تو آپ مکہ مکرمہ اور حرم شریف میں بغیر احرام کے جاسکتے ہیں اور جتنی مرتبہ چاہیں طواف کرسکتے ہیں۔ ایک طواف خانہ کعبہ کے گرد سات مرتبہ چکر لگانے سے مکمل ہوتا ہے۔ اگر آپ مکہ مکرمہ کی سمت آتے وقت میقات سے گزرتے ہیں (آپ کے لیے میقات ینبوع ہوگی) اور عمرے کی نیت نہیں رکھتے، لیکن راستے میں آپ کا ارادہ تبدیل ہوجاتا ہے اور عمرہ کا ارادہ کرلیتے ہیں تو اس صورت میں آپ کو واپس میقات آنا ہوگا اور یہاں احرام باندھ کر عمرے کی نیت کر کے آگے بڑھنا ہوگا۔ اگر آپ میقات واپس نہیں جاتے اور راستے میں احرام باندھ کر عمرہ ادا کرلیتے ہیں تو اس صورت میں آپ کو بطور دم ایک بھیڑ قربان کرنا ہوگی۔

سفر شروع کرنے سے پہلے اپنے ذہن میں یہ بات واضح کرلینی چاہیے کہ آپ مکہ مکرمہ کس لیے جارہے ہیں۔

احرام کے بغیر مکہ میں حاضری

سوال: جدہ میں بسنے والے کسی شخص کو کیا یہ اجازت ہے کہ وہ نماز اور طواف کی نیت سے حرم کعبہ میں احرام کے بغیر حاضر ہوجائے؟

جواب: حالت احرام صرف اس وقت ضروری ہے جب کوئی شخص عمرہ یا حج کی ادائیگی کی نیت سے مکہ آئے۔ سال میں ایک عمرے کی ادائیگی کافی ہے، اس کے بعد ایک شخص کسی بھی کام سے مکہ جاسکتا ہے۔ اسے احرام کی پابندی نہیں کرنا ہوگی۔ صرف طواف اور حرم شریف میں نماز کی ادائیگی کے لیے احرام ضروری نہیں ہے۔

کیا مکہ میں داخلے کے لیے احرام ضروری ہے

سوال: ازراہ کرم یہ بتایے کہ کیا حدود حرم میں رہنے والے شخص کو احرام پہنے بغیر مکہ مکرمہ میں داخلے

کی اجازت ہے۔ کیا ایسے شخص کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ پہلے جدہ جا کر عزیز واقارب سے ملاقات کرے اور پھر احرام باندھ کر عمرے کی نیت سے مکہ مکرمہ میں داخل ہو۔ برائے مہربانی حدیث بیان فرمایئے جس میں بتایا گیا ہو کہ ایک سال میں ایک عمرہ ادا کرنا کافی ہے؟

جواب: ایک ایسے شخص کو جو اپنے کاروبار کے سلسلہ میں یا عزیز واقارب سے ملاقات کے لیے مکہ مکرمہ آرہا ہے، مکہ میں داخل ہونے کے لیے احرام پہننا لازمی نہیں ہے۔ تاہم اگر وہ عمرے کی نیت کرے اور احرام کے ساتھ مکہ میں داخل ہونے کے بعد عمرہ ادا کرے تو یقیناً اس کا اجر اسے ملے گا۔

اگر کوئی شخص دور فاصلے، مثلاً ریاض یا کسی دوسرے ملک سے جدہ پہنچتا ہے تو اس کی حیثیت کا انحصار اس کی اس نیت پر ہوگا، جو اس نے سفر پر روانہ ہوتے وقت کی ہوگی۔ اگر سفر پر روانگی کے وقت اس کا ارادہ محض یہ تھا کہ وہ جدہ میں اپنے عزیزوں سے ملاقات کرے گا اور جدہ پہنچنے کے بعد اس کا ارادہ عمرے کا ہوگیا، تو اس صورت میں اسے جدہ میں احرام پہننا ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر اس کے سفر کا بنیادی مقصد عمرہ تھا تو عزیزوں سے ملاقات کی پھر کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ اس صورت میں اسے میقات پر احرام پہننا ہوگا۔ دراصل یہ نیت ہی ہے جس پر اس شخص کی حیثیت کا تعین کیا جائے گا۔

اس قسم کی کوئی حدیث نہیں ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ مسلمان کے لیے سال میں ایک عمرہ کافی ہے۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ سال میں ایک عمرہ ادا کرنا مناسب ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں کسی ایک سال میں ایک سے زائد عمرے نہیں فرمائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار مرتبہ عمرہ ادا کیا اور ان چاروں ادائیگیوں میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک عمرہ مکمل کرنے کے بعد فوراً دوسرا عمرہ ادا کرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ آپ ایک بار بھی (عمرہ ادا کرنے کے بعد) مکہ سے باہر نہیں گئے کہ دوسرے عمرے کے لیے احرام باندھ کر دوبارہ مکہ میں داخل ہوں اور دوسرا عمرہ ادا کریں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عملی مثال سے یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ایک سال میں ایک عمرہ ادا کرنا کافی ہے۔

باب السلام کے ذریعے داخلہ افضل ہے؟

سوال: مسجد الحرام میں باب السلام کے ذریعہ داخل ہونا سنت ہے، یا داخلے کے لیے کسی بھی دروازے کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ باب السلام کے ذریعہ مسجد الحرام میں داخل ہونے کی فضیلت کیا ہے؟

جواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی جو روداد ہم تک پہنچی ہے، اس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم باب السلام کے ذریعہ مسجد الحرام میں داخل ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء اس بات کو افضل قرار دیتے ہیں کہ سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع کیا جائے اور جب مسجد الحرام میں داخل ہوں تو باب السلام سے داخل ہوا جائے۔

اس قسم کی کوئی بات شہادت کے ساتھ موجود نہیں ہے کہ بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو یہ وضاحت فرمائی ہو کہ کسی خاص وجہ سے وہ عمداً باب السلام سے داخل ہوئے تھے اور نہ ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کسی صحابیؓ کو یہ ہدایت فرمائی کہ داخلے کے لیے باب السلام کو ترجیح دی جائے۔

یہ بات واضح ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا افضل ہے۔ اگر کسی معاملے میں کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خاص عمل کو قابل ترجیح قرار دیا ہو تو اس کے مطابق عمل کرنا باعث خیر و برکت ہے۔ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کسی عمل کی ادائیگی کے لیے کسی خاص طریقے کی نشاندہی کی ہو تو اس طریقے کو اختیار کرنا فرض ہے۔ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کوئی عبادت کی ہو، تو اس عبادت کی ادائیگی سنت ہے اگر کوئی عمل، عبادت نہ ہو، روزمرہ زندگی کا عام سا حصہ ہو اور اس کے لیے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنایا ہوا طریقہ اختیار کریں تو یہ معاملہ ذاتی پسند کا ہو جاتا ہے۔ (کوئی بھی عمل جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو، اگر اسے اتباع رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نیت سے کیا جائے تو وہ عمل افضل ہوتا ہے)۔

حج کی ادائیگی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سہولت کے مطابق باب السلام سے مسجد میں داخل ہوئے اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس دروازے سے مسجد میں داخلہ سنت ہے تاہم اگر کوئی شخص اس نیت کے ساتھ باب السلام سے بیت اللہ میں داخل ہو کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی اتباع کر رہا ہے تو یقیناً اس کا یہ عمل افضل قرار پائے گا۔

حج کے دوران جب لاکھوں آدمی مکہ میں حاضر ہوتے ہیں، اس وقت یہ کوشش کرنا کہ کسی خاص دروازے سے بیت اللہ میں داخل ہوا جائے خود اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے۔

صرف طواف کے لیے احرام باندھنا ضروری ہے؟

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ جدہ یا طائف میں رہنے والے ایسے باشندوں کو جو روزگار کے سلسلہ میں کسی اور ملک سے سعودی عرب آئے ہوئے ہیں، کسی ذاتی کام سے یا صرف طواف کی نیت سے مکہ

جاتے وقت احرام باندھنا ضروری ہے؟

جواب: اس سوال کے حوالے سے دو مختلف اقسام کے لوگوں کے لیے مختلف احکامات ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ ''آفاقی'' کہلاتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو مکہ کے پہاڑی علاقے سے باہر رہتے ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جو میقات کے پانچ مقامات کو ملانے والے فرضی خط کے کھینچنے سے، اس خط کے اندر وجود میں آتا ہے۔ میقات کے پانچ مقامات یہ ہیں:

۱۔ مدینے سے آنے والوں کے لیے ذوالحلیفہ (جسے آج کل ابیارعلی کہا جاتا ہے اور یہ مدینہ منورہ سے ۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے)۔

۲۔ شام سے آنے والوں کے لیے جحفہ (جو رابغ کے قریب ہے اور مکہ مکرمہ سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر واقع ہے)۔

۳۔ اہل نجد کے لیے قرن المنازل (جسے آج کل ''سیل'' کہا جاتا ہے اور یہ مکہ مکرمہ سے تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے)۔

۴۔ عراق سے آنے والوں کے لیے ذات عرق (جو سیل کے شمال میں مکہ سے ۷۷ میل کے فاصلے پر واقع ہے)۔

۵۔ یمن سے آنے والوں کے لیے یلم لم (جسے ان دنوں سعدر کہا جاتا ہے اور یہ مکہ مکرمہ سے خشکی کے راستے سے ۶۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے)۔

ان حدود کے اندر رہنے والے باشندوں کے لیے ہدایت یہ ہے کہ وہ جب بھی عمرے یا حج کا ارادہ کریں تو عمرے یا حج کے لیے سفر شروع کرنے سے پہلے اپنے گھر میں احرام پہن لیں۔ جو لوگ میقات کے مقامات کے باہر سے آئیں گے انہیں ہدایت ہے کہ وہ میقات یا اس کے متوازی مقام پر احرام باندھیں، لیکن احرام کی شرط ان لوگوں کے لیے ہے جو مکہ کا سفر عمرہ یا حج کی نیت سے کر رہے ہوں۔ یہ وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمائی جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے میقات کے مقامات کی نشاندہی فرمائی۔ ''یہ (مقامات میقات) ان (ممالک) اور دوسرے علاقوں کے ان لوگوں کے لیے ہیں جو ان سے گزریں اور ان کی نیت حج یا عمرے کی ہو۔'' اس حدیث مبارکہ سے واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میقات کے مقامات کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح فرما دیا کہ سفر کا مقصد کیا ہونا چاہیے۔

آپ جانتے ہیں کہ احرام کی پابندی صرف اس وقت کی جاتی ہے جب آپ ان دونوں میں سے کوئی ایک فرض ادا کرنے کی نیت رکھتے ہوں۔ اگر آپ کسی اور کام سے مثلاً کسی عزیز یا دوست

سے ملاقات کے لیے یا کسی کاروباری مقصد سے یا حرم کعبہ میں نماز کی ادائیگی اور طواف کی نیت سے مکہ آرہے ہیں تو احرام کی پابندی ضروری نہیں ہے۔

طواف کے دوران حجر اسود کی سمت اشارہ

سوال: طواف کے دوران کیا یہ ضروری ہے کہ ہر شوط کا آغاز حجر اسود (کو چھو کر یا اس) کی سمت ہاتھ اٹھا کر اشارہ، اس لکیر پر کھڑے ہو کر کیا جائے جو سنگ سیاہ سے فرش پر نمایاں کی گئی ہے؟

جواب: طواف کے دوران خانہ کعبہ کے گرد ہر چکر (شوط) حجر اسود کو چھو کر، یا بوسہ دے کر شروع کرنا چاہیے۔ اگر ہجوم کی وجہ سے حجر اسود کو چھونا ممکن نہ ہو تو اگلے چکر کا آغاز حجر اسود کی سمت ہاتھ اٹھا کر کیا جاسکتا ہے۔ ہر چکر کا نقطۂ آغاز حجر اسود یا اس کے متوازی نقاط ہیں جن کو صحن طواف کے فرش پر سنگ سیاہ کی لکیر سے ظاہر کیا گیا ہے۔ طواف کے دوران اس لکیر پر پہنچتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا جاسکتا ہے اور اگلا شوط شروع کیا جاسکتا ہے۔ تاہم اس عمل کے لیے رکنا نہیں چاہیے۔ طواف کرنے والا جب اس سیاہ لکیر کے نزدیک پہنچے تو حجر اسود کی سمت ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرے اور آگے بڑھ جائے۔

طواف عمرہ یا سعی میں ایک کندھا کھلا رکھنا

سوال: طواف یا سعی کے دوران تین چکر پورے کرنے کے بعد کیا کاندھے کو ڈھانپنا ضروری ہوتا ہے؟

جواب: احرام پہننے کا عمومی طریقہ یہ ہے کہ چادر کا اوپر کا حصہ دونوں کاندھوں پر ڈال لیا جاتا ہے، تاہم بیشتر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ احرام کی حالت میں سیدھا کندھا کھلا رہنا چاہیے، یہ تصور غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ نماز کے دوران کندھوں کو کھلا رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ طواف القدوم اور طواف العمرہ کے پہلے تین چکروں میں سیدھے کندھے کو کھلا رکھنا سنت ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور موقع پر یہ ضروری نہیں ہے۔

ہجرت کے ساتویں برس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہ کرامؓ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ آئے تو اس موقع پر کفار مکہ نے یہ افواہ اڑائی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھی ایک بیماری کی وجہ سے خاصے کمزور ہیں۔ یہ بیماری مدینہ میں عام تھی۔ اس افواہ کے تدارک کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو ہدایت کی کہ طواف کے

پہلے تین چکروں میں اپنا دایاں کندھا کھلا رکھیں اور ان تین چکروں میں سینہ آگے کر کے تیز قدم چلیں تا کہ دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ مسلمان پوری طرح صحت مند ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے اس عمل کو تازہ رکھنے کے لیے مسلمان طواف کے دوران اس سنت پر عمل کرتے ہیں۔

احرام کی حالت میں دوسروں کے بال تراشنا

سوال: پہلے دن بڑے شیطان کو کنکریاں مارنے اور قربانی کے بعد میں نے احرام کھولنے سے پہلے دوسرے حجاج کے بال تراشے۔ کیا یہ عمل غلط تھا؟

جواب: آپ نے کوئی غلطی نہیں کی۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ حالت احرام میں دوسرے شخص کے بال نہیں تراشنے چاہئیں۔ لیکن اس خیال کی تصدیق کے لیے کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اگر آپ کسی دوسرے شخص کے بال تراشتے ہیں تو اس طرح آپ ایک فرض کی تکمیل میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ اس عمل سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا۔

احرام کی حالت میں کاندھا ڈھانپ کر رکھنا

سوال: عمرہ ادا کرتے ہوئے سعی کے دوران ہم دائیں کاندھے کو کھلا رکھنا بھول گئے لیکن کچھ دیر بعد ہمیں اس غلطی کا احساس ہو گیا اور اسے دور کر لیا گیا۔ کیا ہمیں دم دینا ہو گا؟

براہ کرم یہ بھی بتایئے کہ سعی کے دوران کاندھے کو ڈھانپے رکھنے پر دم کس طرح دیا جائے۔

بعض حضرات احرام کو کاندھے پر سیفٹی پن لگا کر رکھتے ہیں۔ کیا یہ طریقہ درست ہے۔

جواب: طواف قدوم اور عمرے کے طواف کے پہلے تین چکروں کے دوران دائیں کاندھے کو کھلا رکھنا فرض نہیں، بلکہ سنت ہے۔ اسی طرح طواف کے پہلے تین شوط (چکر) تیز قدموں سے پورے کرنا بھی فرض نہیں ہے، سنت ہے۔ طواف کے پہلے تین چکروں کے سوا عمرے کے باقی ارکان میں دایاں کاندھا ڈھانپے رکھنا چاہیے، لیکن اگر یہ کھلا رہے تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر اس دوران کوئی سہو سرزد ہو گئی ہے تو اس کے لیے دم لازم نہیں ہے۔ احرام میں سیفٹی پن استعمال کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

سعی کے بعد اپنے بال خود تراشنا

سوال: رمضان المبارک میں عمرہ ادا کرنے کے دوران سعی کے بعد میں نے کوہ مروہ پر ایک بچے سے قینچی مستعار لی اور اپنے بال تھوڑے سے کاٹ لیے، اس موقع پر ایک بزرگ نے مجھ سے کہا کہ میرا یہ عمل درست نہیں ہے اور میں اپنے بال خود نہیں تراش سکتا۔ انہوں نے کہا کہ اس غلطی کی تلافی کے لیے مجھے ایک بھیڑ کی قربانی کرنا ہوگی۔ ازراہ کرم اس معاملے پر روشنی ڈالیے۔

جواب: یہ مفروضہ میرے بھی علم میں آیا ہے کہ کوئی شخص جو حالت احرام میں ہو، خود کو حالت احرام سے نکالنے کے لیے اپنے بال خود نہیں کاٹ سکتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ لوگوں نے یہ مفروضہ کس طرح اختیار کیا ہے اور اس کی بنیاد کیا ہے۔ شاید انہوں نے اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ اصول اپنے طور پر وضع کرلیا ہو کہ چونکہ حالت احرام میں اپنے بال تراشنے اور شیو کرنے کی ممانعت ہے، اس لیے احرام کھولتے وقت بھی یہ پابندی برقرار رہے گی۔

یہ دو مختلف معاملے ہیں اور ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ آپ حالت احرام میں ہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ آپ احرام کھولنا چاہتے ہیں۔ پہلی صورت میں جس کام کی (یعنی اپنے بال تراشنے کی) ممانعت ہے، دوسری صورت میں وہ ایک ضروری امر ہے۔ یعنی احرام کھولنے سے پہلے اپنے سر کے بال تراشنا لازمی ہے اور اس لازمی فعل کو انجام دیتے ہوئے یہ بات ملحوظ خاطر نہیں رکھی جاتی کہ یہ کام کون کر رہا ہے۔ اس معاملے میں اصل بات عمل کی ہے۔ حالت احرام میں نہ تو آپ خود اپنے بال تراش سکتے ہیں اور نہ کوئی دوسرا آپ کے بال تراش سکتا ہے۔ دوسری طرف ایک صحیح وقت پر یہ کام ایک لازمی ضرورت بن جاتا ہے کہ آپ کو احرام کھولنے سے پہلے بال تراشنے ہیں خواہ یہ کام آپ خود کریں یا کوئی دوسرا انجام دے۔ مختصر یہ کہ آپ کا فعل بالکل درست تھا، آپ کو دم دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

عرفات کے دن نمازوں کی ادائیگی

سوال: عرفات کے دن، میں مسجد نمرہ میں نماز ادا نہیں کرسکا۔ معلم بار بار ہمیں یہ تاکید کرتے رہے کہ اپنے خیمے میں نماز کی ادائیگی زیادہ مناسب ہے۔ کیا یہ درست ہے۔ یوم عرفات میں نمازیں مختصر کرنے کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے جبکہ ہم حج کی ادائیگی کے لیے جدہ سے آئے ہیں اس لیے ایک دوست کا یہ اصرار ہے کہ ہمیں مقامی لوگوں کی طرح اپنی نمازیں معمول کے مطابق ادا کرنی چاہئیں ازراہ کرم ان امور کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب: آپ کے معلم نے جو کہا وہ درست ہے۔ ہر حاجی کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ نماز اپنے خیمہ ہی میں ادا کرے۔ ان حجاج کے سوا جو مسجد نمرہ میں داخل ہو جائیں تمام حجاج، اسی طرح نماز ادا کرتے ہیں۔ مسجد نمرہ میں نماز کی ادائیگی سنت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں نماز ادا کی تھی۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ مسجد نمرہ کا صرف ایک حصہ عرفات میں شامل ہے۔ مسجد کا جو حصہ مزدلفہ کی جانب ہے وہ عرفات کی حدود میں شامل نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص مسجد نمرہ میں داخل ہوتا ہے اور اس کا قیام تمام دن اس حصہ میں رہا، جو عرفات میں شامل نہیں ہے تو اس کا حج نہیں ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ عرفات میں داخل ہو۔ جہاں تک خطبہ سننے کا تعلق ہے تو وہ ریڈیو پر نشر ہوتا ہے اور با آسانی سنا جا سکتا ہے۔ اس بات کا تو تصور بھی دشوار ہے کہ بیس بائیس لاکھ افراد کو کسی ایسی جگہ جمع کیا جا سکے جہاں وہ تمام خطبہ بھی سن سکیں اور ایک امام کی اقتدا میں نماز ادا کر سکیں جبکہ ان کے خیمے عرفات کے پورے میدان میں بکھرے ہوتے ہیں۔

عرفات کے دن نماز مختصر کرنے کے سلسلے میں، آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی جانب متوجہ کروں گا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حج کے آغاز میں صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اپنے (حج کے) ارکان مجھ سے سیکھو۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقے سے حج کیا وہی حج کی ادائیگی کا صحیح طریقہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات کے دن نمازیں مختصر بھی کیں اور ملا کر پڑھیں۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جتنے بھی مسلمان حج کر رہے تھے ان میں مکہ کے باشندوں کی بھی بڑی تعداد تھی اور ان سب نے اسی طریقہ پر عمل کیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے مسلمانوں کو کسی علیحدہ طریقہ سے نماز پڑھنے کی ہدایت نہیں فرمائی اور نہ ہی یہ ہدایت کی کہ مکہ کے مسلمان اپنی نماز مختصر اور مشترک نہ کریں۔ لہٰذا تمام حجاج کو خواہ وہ مکہ کے باشندے ہوں، حج کا وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر کی نمازیں ملا کر پڑھیں اور ہر نماز کو صرف دو دو رکعات تک محدود رکھا، پھر جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مزدلفہ پہنچے تو وہاں آپ نے مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کیں اور عشاء کی نماز کو مختصر کیا۔ ہمیں اپنی عبادت میں وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس طریقے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت فرمائی۔

طواف کی تاخیر سے ادائیگی

سوال: میرے والد خرابی صحت کی وجہ سے اپنے حج کے دوران طواف افاضہ ادا نہیں کر سکے۔ انہوں

نے میرے چھوٹے بھائی کو ہدایت کی کہ وہ طواف اور سعی ان کی (والد) جانب سے ادا کردیں۔ چھوٹے بھائی نے والد کی طرف سے یہ دونوں ارکان ادا کیے۔ کیا یہ طریقہ درست ہے؟ دو ماہ بعد جب والد کی طبیعت بہتر ہوئی تو انہوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید متبادل طواف اور سعی (جو انہوں نے بیٹے کے ذریعے ادا کرائی) درست نہ ہو، یہ دونوں ارکان خود ادا کیے۔ اس تاخیر کے بارے میں بھی وضاحت فرمایے۔

۲: میں پاکستانی باشندہ ہوں اور کام کے سلسلہ میں تبوک میں رہ رہا ہوں۔ طویل عرصہ سے قیام کی وجہ سے خود کو مقامی باشندہ ہی سمجھتا ہوں۔ گزشتہ بار جب میں نے عمرہ ادا کیا تو جدہ پہنچ کر احرام باندھ لیا۔ میرے والد پاکستان سے آئے تھے، انہوں نے بھی عمرے کے لیے جدہ میں احرام باندھا۔ کیا ہم دونوں کا یہ طریقہ درست تھا۔ ازراہ کرم یہ بھی فرمایے کہ حرم مکہ میں بغیر احرام داخل ہوا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب: حج کے ارکان میں بعض ایسے ہیں، جن کی ادائیگی میں کوئی غلطی سرزد ہوجائے یا وہ رہ جائیں تو روزہ رکھ کر یا قربانی دے کر ان کا کفارہ ادا کیا جاسکتا ہے۔ بعض اصولی ارکان حج کے لیے کوئی کفارہ نہیں ہے اس لیے اگر ان کی ادائیگی نہیں ہوپاتی تو وہ ادائیگی قضا کے طور پر واجب رہتی ہے، اگر انہیں ادا نہ کیا جائے تو حج ادا نہیں ہوتا اور اگر کرلیا جائے تو حج مکمل ہوجاتا ہے۔ ان اصولی ارکان میں سے ایک میدان عرفات میں حاضری ہے۔ اگر کسی عازم حج نے تمام ارکان ادا کیے لیکن ۹ ذی الحجہ کو عرفات میں حاضر نہ ہوسکا (خواہ یہ حاضری چند منٹ کی ہی کیوں نہ ہو) تو اس کا حج ادا نہیں ہوگا۔ جو عازم حج بیمار ہوں، ان کے لیے بھی کوئی رعایت نہیں ہے، انہیں میدان عرفات میں لازماً حاضر ہونا ہے۔ کسی دوسرے کے ذریعے اس رکن کی ادائیگی ممکن نہیں ہے، ہر حاجی کو بذات خود حاضر ہونا ہے۔

طواف افاضہ بھی ایک ایسا ہی رکن ہے۔ اس کی اہمیت بھی وہی ہے اور اتنی ہی ہے جتنی عرفات میں حاضری کی۔ فرق صرف یہ ہے کہ میدان عرفات میں ایک خاص مقررہ وقت کے دوران پہنچنا ضروری ہے جبکہ طواف افاضہ بعد میں بھی کیا جاسکتا ہے، اس طواف کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ جس قدر جلد ممکن ہو، بذات خود ادا کرلینا چاہیے۔ انڈونیشیا یا جاپان جیسے دور دراز ممالک کے کسی حاجی سے طواف افاضہ کی ادائیگی رہ گئی ہے اور وہ واپس اپنے ملک چلا گیا ہے تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ دوبارہ مکہ آئے اور یہ طواف ادا کرے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب تک طواف افاضہ ادا نہ کیا جائے، احرام برقرار رہتا ہے۔ (یہ فرض کیا گیا ہے کہ حج کے دیگر ارکان مثلاً شیطان کو کنکریاں مارنا اور بال چھوٹے کرانا یا سر منڈانا وغیرہ مکمل کر لیے گئے ہیں) اور وہ تمام امور انجام دینے کی اجازت ہوتی ہے جو احرام کے ساتھ نہیں کیے جا سکتے (سوائے مباشرت کے)۔

آپ کے والد نے دو ماہ بعد طواف کر کے، اپنا حج مکمل کر لیا ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اس موقع پر طواف اور سعی بذات خود کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا عمرہ شمار نہیں کیا جائے گا۔ یہ طواف اور سعی جو انہوں نے کی، وہ طواف افاضہ اور حج کی سعی شمار ہوگی۔ یہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس دو ماہ کے عرصے میں انہوں نے حالت احرام کے اصولوں کی خلاف ورزی نہ کی ہو۔

۲۔ کوئی بھی شخص خواہ وہ سعودی عرب کا باشندہ ہو یا کسی اور جگہ کا، جب وہ عمرے یا حج کی ادائیگی کے لیے مکہ کے پہاڑی علاقہ کے باہر سے مکہ میں داخل ہوگا تو اسے میقات کے مقام پر احرام باندھنا ہوگا اور اس کے بعد مکہ کا رخ کرنا ہوگا۔ جدہ میقات کے اندر شمار ہوتا ہے۔ آپ چونکہ کراچی سے آرہے تھے اس لیے آپ کو کراچی میں یا طیارے کے اندر احرام باندھنا چاہیے تھا، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا اس لیے اس غلطی کے کفارہ کے طور پر قربانی کرنا چاہیے اور یہ خیال رکھنا چاہیے کہ قربانی کا گوشت حرم کی حدود میں، غربا اور مساکین میں تقسیم کیا جائے۔

جو شخص حج ادا کر چکا ہے، اس کو یہ اجازت ہے کہ وہ عام لباس کے ساتھ دوبارہ مکہ میں داخل ہو اور صرف طواف کرے۔ اگر کوئی شخص حرم کے باہر سے آرہا ہے تو اس کے لیے یہ بات زیادہ مستحسن ہے کہ وہ عمرہ ادا کرے۔

اگر کوئی شخص کاروبار کے سلسلے میں جدہ گیا ہے، وہاں اس کے پاس وقت ہے اور وہ چاہتا ہے کہ عمرہ ادا کر لے تو اسے جدہ میں احرام باندھنا ہوگا۔ یہ اجازت صرف اس لیے ہے کہ گھر سے روانگی کے وقت اس کا ارادہ عمرہ کا نہیں تھا۔ اگر گھر سے چلتے وقت ہی نیت عمرے کی بھی ہو تو اس صورت میں میقات کی پابندی لازمی ہوگی۔ یہ پابندی سب کے لیے ہے خواہ وہ سعودی ہو یا غیر سعودی۔

مزدلفہ نہیں پہنچ سکا

سوال: عرفات سے واپسی پر جس جگہ میں نے رات کو قیام کیا، میرے خیال میں وہ مزدلفہ کی حدود

میں تھی لیکن صبح منیٰ کی جانب روانہ ہوا تو چند منٹ کے فاصلے پر تختی نظر آئی جس پر لکھا تھا کہ ''مزدلفہ کی حدود یہاں سے شروع ہوتی ہے'' مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ ازراہ کرم بتایئے کہ میرے عمل سے حج کے ارکان کی خلاف ورزی ہوئی ہے یا نہیں۔ اگر ہوئی ہے تو اس کا کفارہ کیا ہوسکتا ہے۔ یہ بھی وضاحت فرمایئے کہ ۱۲ ذی الحجہ کو دوپہر سے پہلے جمرہ پر کنکریاں مارنا مناسب ہے؟

جواب: اگر یہ غلطی واقعی غلطی تھی اور آپ اس بات سے بالکل ناواقف تھے کہ جہاں قیام کر رہے ہیں وہ جگہ مزدلفہ کی حدود سے باہر ہے تو میں توقع کرتا ہوں اور دعا بھی کرتا ہوں کہ آپ کا حج مکمل ہوگیا اور درست ہوا۔ اللہ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''اللہ نے میری امت کی وہ غلطیاں معاف کردی ہیں جو سہواً سرزد ہوں یا بھول کا نتیجہ ہوں یا جو ان سے جبر کی حالت میں کرائی گئی ہوں۔'' اس حدیث کے مطابق آپ کا عمل ایک سہو کا نتیجہ ہے۔ برخلاف اس کے اگر یہ واقعتاً غلطی نہیں ہے اور آپ مقام کے بارے میں پہلے ہی مشکوک تھے تو آپ کو کفارے کے طور پر قربانی کرنا چاہیے۔

۱۱ اور ۱۲ ذی الحجہ کو جمرہ پر کنکریاں مارنے کا صحیح وقت دوپہر کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اکثر لوگ، خاص طور پر تیسرے دن، اس وقت سے پہلے بھی کنکریاں مارتے ہیں۔ یہ عمل درست نہیں ہے۔ اگر ایک شخص نے پہلے دو دن صحیح وقت پر رمی کی ہے، لیکن آخری دن اس نے مقررہ وقت سے پہلے رمی کی، تو اسے کفارہ ادا نہیں کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ تین دن یا چار دن رمی کرنا ایک ہی فرض شمار ہوتا ہے اور اس فرض کا بڑا حصہ درست وقت پر ادا کیا جاچکا ہے لیکن اگر وقت کی خلاف ورزی ایک دن سے زیادہ دن ہوئی ہے تو پھر قربانی کی صورت میں اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ میں آپ کے معاملے میں تجویز کروں گا کہ آپ حرم کی حدود کے اندر کچھ رقم خیرات کردیں۔

مزدلفہ بذریعہ مکہ مکرمہ

سوال: گزشتہ سال حج کے دوران ہم نے عرفات سے مزدلفہ جانے کے لیے ٹیکسی کرائے پر حاصل کی۔ راستہ میں زبردست ہجوم کی وجہ سے گاڑیوں کی نقل وحرکت معطل ہوگئی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا اور واپسی کے راستے سے مزدلفہ لے گیا۔ اس طرح ہم شہر مقدس (مکہ مکرمہ) میں دوبارہ داخل ہوئے۔ کیا ہمارا یہ فعل درست تھا۔

جواب: آپ نے جو اطلاعات اپنے سوال میں فراہم کی ہیں ان کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کے سامنے دو راستے تھے، ایک تو وہ جس پر ٹیکسی ڈرائیور نے عمل کیا اور دوسرا یہ کہ آپ رات کو مزدلفہ

میں قیام سے محروم رہ جاتے۔ عرفات میں دن گزارنے کے بعد رات کو مزدلفہ میں قیام حج کا ایک اہم رکن ہے۔ اس صورتحال میں دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب واضح ہے۔ آپ کے ڈرائیور نے صحیح کیا کہ متبادل راستے سے آپ کو مزدلفہ پہنچا دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایسی کوئی ہدایت نہیں ہے جس میں عرفات جانے یا وہاں سے واپس آنے کے لیے کسی خاص راستہ کی نشاندہی کی گئی ہو۔ یہ فرض کیا جاتا ہے کہ لوگ وہ راستہ اختیار کریں جو سیدھا ہو، کیونکہ یہی منطقی راستہ ہوسکتا ہے۔ لیکن چونکہ اس راستے کے ذریعہ مزدلفہ پہنچنے کی آپ کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی تھی اس لیے آپ نے جو متبادل راہ اختیار کی اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

قران کے طریقے سے حج اور عرفات میں نمازوں کی علیحدہ علیحدہ ادائیگی

سوال: میں نے اپنے اہل خانہ کے ساتھ فریضہ حج قران کے طریقے سے ادا کیا۔ احرام باندھنے کے بعد ہم طائف میں داخل ہوئے اور طواف وسعی کے ذریعہ عمرہ ادا کیا۔ اس کے بعد ہم نے طواف قدوم ادا کیا لیکن دوسری بار سعی نہیں کی۔ عرفات کے دن ہم نے ظہر اور عصر کی نمازیں ان کے اپنے اپنے وقت پر ادا کیں۔ منیٰ میں ہم نے قربانی کے لیے جانور خریدے۔ ازراہ کرم بتایئے کہ اس طریقہ کار کی وجہ سے ارکان حج میں کیا کمی رہ گئی ہے اور اس کا ازالہ کس طرح کیا جاسکتا ہے؟

جواب: قران کے طریقے سے احرام باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ عمرہ اور حج کے ارکان کو مکمل طور پر یکجا کر دیا جائے اور بیک وقت ادا کیا جائے۔ بالالفاظ دیگر جب کوئی شخص قران کی نیت کرتا ہے تو اسے عمرے کے فرائض حج کے فرائض سے علیحدہ ادا نہیں کرنے ہوں گے۔ عمرے کا مطلب یہ ہے کہ آپ احرام باندھ کر طواف اور سعی کریں اور احرام اتارنے سے پہلے اپنے بال چھوٹے کرائیں یا سر منڈائیں۔ یہ تمام ارکان، حج کا بھی حصہ ہیں۔ جب کوئی شخص احرام کا دوسرا کوئی طریقہ اختیار کرتا ہے، تو وہ عمرے کے ارکان علیحدہ ادا کرتا ہے (اور حج کے لیے یہی ارکان دوبارہ ادا کرتا ہے)۔ قران کے طریقے میں یہ تمام ارکان صرف ایک بار ادا کیے جاتے ہیں اور حج وعمرے دونوں کے لیے بیک وقت ادا ہوجاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس طریقے سے حج ادا کرنے والا وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو صرف حج کی نیت سے حج کی ادائیگی کرنے والا اختیار کرتا ہے، یعنی افراد کا طریقہ، اور حج کے اختتام پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے عمرہ اور حج دونوں ادا کرلیے اور اسے دونوں کا اجر ملے گا۔ اسے شکرانے کے طور پر ایک جانور کی قربانی کرنا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے دونوں فرائض

بیک وقت ادا کرنے کی توفیق عطا کی۔ عملی طور پر ایک شخص جو قران یا افراد کا طریقہ اختیار کرے، اسے مکہ میں آمد کے بعد براہِ راست کعبہ میں حاضری دینی ہوتی ہے جہاں اسے طواف قدوم ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد سعی کی جاتی ہے لیکن وہ احرام نہیں کھول سکتا اوران تمام باتوں سے اجتناب اس پر فرض ہوتا ہے جو احرام میں ممنوع قرار دی گئی ہیں۔ یہ پابندیاں آٹھ ذی الحجہ تک برقرار رہتی ہیں، جب وہ منیٰ کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ رات کو منیٰ میں قیام کے بعد اگلے دن وہ عرفات روانہ ہوتا ہے۔ رات کو عرفات سے واپس مزدلفہ آتا ہے اور رات کو یہاں قیام کرتا ہے پھر منیٰ روانہ ہو جاتا ہے جہاں تین دن قیام کے دوران رمی جمار کرتا ہے۔ قربانی کے دن اسے قربانی کرنی ہے بشرطیکہ اس نے قران کے طریقے سے حج کیا ہو، افراد کے طریقے سے حج کرنے میں قربانی نہیں کرنی ہوگی، اس کے بعد مکہ آ کر طواف افاضہ ادا کرنا ہوگا۔ اگر اس شخص نے طواف قدوم کے وقت سعی نہیں کی تھی تو اب طواف افاضہ کے بعد وہ سعی کر سکتا ہے۔ قربانی کے بعد وہ احرام کھول دے گا۔ اگر وہ چاہے تو اسی روز رمی جمار اور قصر یا حلق کے بعد عام لباس پہن سکتا ہے۔ احرام کی حالت سے وہ مکمل طور پر اس وقت نکلے گا جب وہ طواف افاضہ ادا کر لے، خواہ کسی وجہ سے اس کی ادائیگی میں تاخیر ہی کیوں نہ ہو۔ منیٰ میں قیام اور رمی جمار کے بعد یہ شخص مکہ جاتا ہے اور مکہ سے رخصت ہونے سے تھوڑی دیر قبل طواف وداع ادا کرتا ہے۔

آپ نے اس تمام تفصیل سے یہ اندازہ لگایا ہوگا کہ صرف حج کرنے اور قران کے طریقے سے حج اور عمرہ ایک ساتھ ادا کرنے میں فرق یہ ہے کہ دوسرے طریقہ میں ایک قربانی کرنی ہوتی ہے۔ اس قربانی کے گوشت میں حصہ لیا جا سکتا ہے بلکہ یہ افضل ہوتا ہے کیونکہ یہ قربانی اللہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہوتی ہے کسی غلطی یا سہو کے ازالے کے لیے نہیں ہوتی۔

آپ نے جس طریقے سے حج ادا کیا اس کے مطابق آپ نے طواف قدوم سے پہلے عمرہ ادا کیا۔ اس طرح آپ کا عمرے کا طواف ہی طواف قدوم ہو گیا۔ اس لیے اس مرحلہ پر آپ کو کسی قسم کا کفارہ ادا نہیں کرنا ہوگا۔ آپ سے غلطی یہ ہوئی ہے کہ یوم عرفات کو آپ نے ظہر اور عصر کی نمازیں علیحدہ علیحدہ ادا کیں جب کہ یہ آپ کو ملا کر پڑھنی چاہیے تھیں۔ اسی طرح مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز ملا کر ادا کرنی چاہیے تھی۔ تاہم یہ ایک ایسی غلطی ہے جس کے لیے آپ کو کوئی کفارہ ادا نہیں کرنا ہوگا۔

اگر ایک شخص قربانی کے لیے جانور مکہ یا منیٰ سے خریدے تو وہ ایسا کر سکتا ہے ایسا کرنے میں کوئی غلطی سرزد نہیں ہوگی اور نہ اسے کسی قسم کے کفارے کی ضرورت ہوگی۔

طواف سے پہلے سعی اور قربانی کی عدم ادائیگی

سوال: گزشتہ سال جب میں نے حج کیا تو میں بہت سی باتوں سے ناواقف تھا اور یہ بھی صحیح علم نہ تھا کہ کون سا کام کس وقت کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے طواف قدوم سے پہلے سعی کرلی۔ دوسری کوتاہی یہ ہوئی کہ میں قربانی نہ دے سکا۔ جب میں بینک گیا تو انہوں نے قربانی کے لیے میری رقم لینے سے اس لیے انکار کردیا کہ میں بہت تاخیر سے پہنچا تھا۔ اس طرح میں طواف وداع بھی نہ کرسکا۔ ازراہ کرم یہ بتایئے کہ ان تمام خامیوں کے باوجود کیا میرا حج ادا ہوگیا؟

جواب: سعی ہمیشہ طواف ادا کرنے کے بعد کرنا چاہیے۔ یہ طواف قدوم یا طواف افاضہ کے بعد ادا کی جاسکتی ہے۔ اگر آپ نے یہ سوال حج کے دوران پوچھا ہوتا تو میں تجویز کرتا کہ آپ طواف افاضہ کے بعد دوبارہ سعی کرلیں۔ لیکن آپ حج کرچکے ہیں اور گھر پہنچ چکے ہیں اس لیے میں یہ توقع کرتا ہوں کہ آپ کی یہ غلطی، غلطیوں کی اس قسم میں سے ہے جن کا ازالہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

> ''میری امت کی ان غلطیوں کو معاف کردیا گیا ہے جو سہواً سرزد ہوجائیں یا بھول کی وجہ سے ہوئیں یا ایسے کام جن پر انہیں مجبور کیا گیا۔''

میری دعا ہے کہ آپ کی سہو کا شمار اسی ذیل میں ہو۔ جہاں تک قربانی کا تعلق ہے وہ آپ پر واجب ہے۔ آپ اس سال قربانی کرسکتے ہیں اور اگر آپ حج کے دوران نہ کرسکیں تو بعد میں بھی کرسکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اپنے کسی دوست سے جو حج پر جارہے ہوں، یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ آپ کی جانب سے قربانی کا واؤچر خریدیں اور دیگر ضروری کام انجام دیں۔ اگر آپ اسے مزید مؤخر کرنا چاہتے ہیں تو آپ خود مکہ جاکر یا کسی ایسے شخص سے کہہ کر جو مکہ جارہا ہو، قربانی کرسکتے ہیں۔

طواف وداع کی عدم ادائیگی کے لیے آپ کو ایک جانور کی قربانی کرنی ہوگی۔ یہ قربانی بھی اسی طریقے سے کی جاسکتی ہے، جو اوپر بتایا گیا ہے۔

عرفات کے دن نماز کی ادائیگی

سوال: یوم عرفات کو فرض نمازوں کی ادائیگی کے بارے میں وضاحت مطلوب ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص اس روز مسجد میں امام کے ساتھ نماز ادا نہ کررہا ہو تو اسے پوری نمازیں ادا کرنا ہوں گی۔ یعنی وہ فرض نمازیں مختصر کرکے نہیں پڑھ سکتا۔ اس کے برخلاف بعض لوگوں کا کہنا

ہے کہ نمازیں مختصر کر کے پڑھی جا سکتی ہیں، خواہ نماز کہیں بھی ادا کی جا رہی ہو۔

سوال ۲: قربانی کے دن دو حاجی رمی کرنے کے بعد احرام کھولنا چاہیں تو کیا وہ ایک دوسرے کے سر کے بال کاٹ یا مونڈھ سکتے ہیں؟

جواب ۱: عرفات کے دن فرض نمازوں کی ادائیگی کے بارے میں کوئی ابہام نہیں ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں تمام حجاج کو ایک ہی ہدایت ہے خواہ وہ کہیں سے بھی آئے ہوں۔ اس ہدایت پر وہ حجاج بھی عمل کرتے ہیں جو مکہ مکرمہ میں رہتے ہیں۔ ہدایت یہ ہے کہ تمام حجاج یوم عرفات کو ظہر اور عصر کی فرض نمازیں مختصر کر کے اور ملا کر پڑھیں گے یعنی چار چار رکعت کے بجائے دو دو رکعت ادا کریں گے۔ نماز خواہ مسجد میں ادا کی جا رہی ہو یا اپنے خیمے میں، ہر حاجی کو اسی طریقے پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ عرفات کے ایک علاقے میں مقیم حجاج اور دوسرے علاقے میں مقیم حجاج کے درمیان نمازوں کی ادائیگی کے لیے علیحدہ علیحدہ ہدایات نہیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''حج کی ادائیگی کا طریقہ مجھ سے سیکھو۔'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عرفات کو نمازیں ملا کر اور مختصر کر کے ادا فرمائیں۔ لہٰذا ہمیں بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طریقے پر عمل کرنا ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت کے مطابق حج کے مناسک کی ادائیگی کرنا ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ ہدایت فرمائی ہوتی کہ اگر امام کے ساتھ نماز ادا نہ کر سکو تو پھر دوسرے طریقے پر عمل کرو۔ تب ہم آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بتائے ہوئے دوسرے طریقے پر عمل کرتے۔ لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس قسم کی کوئی ہدایت نہیں دی۔ علاوہ ازیں حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہ صحابہ کرامؓ بھی تھے جو مکہ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازیں مختصر کر کے پڑھیں۔ اس موقع پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مکہ کے رہنے والے صحابہؓ کو دوسرے طریقے سے نمازیں ادا کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی تھی۔ ان معروضات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یوم عرفات کو ہر حاجی کو خواہ وہ کہیں سے بھی آیا ہو، فرض نمازیں مختصر کر کے پڑھنی چاہئیں۔ یعنی ظہر اور عصر کی نمازیں دو دو رکعت ملا کر اس طرح پڑھے کہ ظہر کے آخر وقت میں دو رکعت ادا کرنے کے فوراً بعد عصر کے اول وقت میں عصر کے دو فرض ادا کر لے۔

مغرب اور عشاء کی نمازیں مزدلفہ میں ادا کرنی ہوتی ہیں اور یہاں بھی یہ دونوں نمازیں ملا کر اور مختصر کر کے پڑھی جاتی ہیں۔ یعنی مغرب کی نماز کے فرض ادا کرنے کے فوراً بعد عشاء کے دو

فرض پڑھ لیے جاتے ہیں۔ یہاں وتر بھی ادا کرنے ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق ہے اور ہمیں اسی پر عمل کرنا چاہیے۔

جواب ۲: احرام کھولتے وقت اپنے یا دوسرے کے بال تراشنا یا سر مونڈنا عمرے کے فرائض میں سے ایک ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سر کے بال تراشنے یا مونڈنے والا شخص حالت احرام میں نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تصور قطعی غلط ہے۔ اگر آپ خود اپنے بال تراشتے ہیں یا کسی دوسرے کے بال تراشتے ہیں تو آپ ایک فرض ادا کرتے ہیں اور اس فرض کی ادائیگی کے وقت کسی قسم کا تردد نہیں ہونا چاہیے۔

منیٰ میں قیام ضروری ہے؟

سوال: کیا منیٰ میں قیام کرنا حج کے بنیادی ارکان میں شامل ہے؟

جواب: حجاج کرام فریضہ حج کی ادائیگی کے دوران دو مرتبہ منیٰ جاتے ہیں۔ پہلی مرتبہ ۸ ذی الحجہ کی دوپہر اور اس کے بعد سے آمد شروع ہوتی ہے اور رات کو یہاں قیام کیا جاتا ہے۔ منیٰ میں قیام کے دوران پانچ وقت کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں جو ظہر کی نماز سے شروع ہو کر اگلے دن فجر کی نماز پر ختم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد حجاج عرفات کی جانب روانہ ہو جاتے ہیں۔ منیٰ میں یہ پہلا قیام فرض تو نہیں ہے لیکن اس کی فضیلت بہت زیادہ ہے اور لوگ کوشش کرتے ہیں کہ اس موقع کو ضائع نہ کریں تاہم کسی مجبوری کی وجہ سے کوئی شخص اس دن منیٰ میں قیام نہ کر سکے تو اس کے لیے دم نہیں دینا پڑتا۔

منیٰ میں دوسری بار قیام یوم النحر (قربانی کے دن) سے شروع ہوتا ہے جو تین یا چار دن تک جاری رہتا ہے (دو یا تین راتیں)۔ ان ایام کے دوران حجاج رمی کرتے ہیں۔ یہ قیام فرض ہے اور حج کے ارکان میں سے ایک ہے۔ اگر یہ چھوٹ جائے تو گائے یا اونٹ کا ساتواں حصہ یا پھر بھیڑ یا بکری کی قربانی کی صورت میں دم دینا ہوگا۔ متعلقہ شخص یا اس کے اہل خانہ اس جانور کا گوشت استعمال نہیں کر سکتے۔ منیٰ میں دوسری بار قیام کا مطلب یہ ہے کہ حدود منیٰ میں نصف شب سے زیادہ مدت تک دو تین راتیں گزاری جائیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق ''رات'' کا مطلب غروب آفتاب سے اگلے دن طلوع آفتاب کے دوران کا وقت ہے۔ اگر یہ دورانیہ دس گھنٹے کا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر رات کو ۵ گھنٹوں سے زیادہ وقت وہاں گزارا جائے۔ تاہم منیٰ میں تمام رات قیام کرنا مستحسن ہے۔ اگر کوئی شخص صرف دو راتیں قیام کرنا چاہے اور تیسرے دن یعنی ۱۲ ذی الحجہ کو رخصت ہونا چاہے تو اسے لازماً اس روز غروب آفتاب سے پہلے رخصت ہو جانا ہوگا۔ اگر سورج

غروب ہونے کے وقت وہ شخص منیٰ میں موجود رہا تو اس پر لازم ہوگا کہ وہ رات وہیں قیام کرے اور اگلے دن دوپہر کے بعد رمی کرے۔

عرفات سے پہلے منیٰ میں قیام

سوال: گزشتہ برس میری زوجہ حجاج کے ایک گروپ کے ساتھ سری لنکا سے حج کی ادائیگی کے لیے آئیں۔ گروپ کے ہر فرد نے تمتع کے طریقے سے حج ادا کرنے کی نیت کی تھی۔ ۹ ذی الحجہ کو ان حضرات کو منیٰ سے گزارے بغیر براہ راست عرفات لے جایا گیا اور رات کو وہیں قیام کیا گیا۔ انہیں بتایا گیا کہ اگر منیٰ گئے تو اندیشہ ہے کہ ہجوم کی وجہ سے تاخیر ہوجائے اور اگلے دن عرفات نہ پہنچ سکیں۔ معلم نے کہا کہ منیٰ میں قیام حج کے فرائض میں شامل نہیں ہے۔ ازراہ کرم اس صورتحال پر تبصرہ فرمائیے۔

جواب: اگر حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حج کے لیے ۸ ذی الحجہ کو مکہ سے منیٰ کے لیے روانہ ہوجانا چاہیے اور دوپہر میں منیٰ پہنچ کر باقی تمام دن اور اگلی رات منیٰ میں قیام کرنا چاہیے۔ اس قیام کے دوران پانچ وقت کی نمازیں منیٰ میں ادا کرنی ہوں گی یعنی ۸ ذی الحجہ کو ظہر اور عصر کی نمازیں اور پھر ۹ ذی الحجہ کو مغرب عشاء اور فجر کی نمازیں منیٰ میں ادا کی جائیں گی۔ ۹ ذی الحجہ کی صبح عرفات کے لیے روانہ ہوجانا چاہیے اور عرفات میں دن گزارنے اور سورج غروب ہونے کے بعد مزدلفہ کا رخ کرنا چاہیے۔ یہ رات مزدلفہ میں بسر کی جائے گی اور اگلے دن طلوع آفتاب سے پہلے مزدلفہ سے منیٰ کے لیے روانہ ہوکر منیٰ واپس آنا ہوگا۔ منیٰ میں حجاج بہت سے مناسک ادا کرتے ہیں جن میں یہاں دو یا تین رات کا قیام بھی شامل ہے۔

منیٰ میں پہلا قیام، یعنی عرفات سے پہلے منیٰ کا قیام سنت ہے۔ جبکہ یوم عرفات کے بعد منیٰ میں قیام فرض ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ۸ ذی الحجہ کو منیٰ میں قیام نہیں کرپاتا تو اس سے ایک سنت ادا ہونے سے رہ جاتی ہے لیکن اس کا حج مؤثر رہتا ہے اور اسے بھیڑ کی قربانی یا کسی اور صورت میں دم دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن عرفات سے واپسی میں ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ ذی الحجہ کو منیٰ میں قیام فرض ہے۔ حنبلی مسلک کے مطابق اگر اس فرض کی ادائیگی چھوٹ جاتی ہے تو اس کے لیے دم دینے کی ضرورت نہیں ہے، امام احمدؒ کا کہنا ہے حج کے اس رکن کی عدم ادائیگی احسن نہیں ہے، اس لیے اگر اس کے بدلے کچھ خیرات کیا جائے تو وہ بہتر ہوتا ہے۔ شافعی مسلک کے مطابق ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ ذی الحجہ کو منیٰ

میں قیام نہ کرنے کی صورت میں ایک بھیڑ کی قربانی کرنی ضروری ہے۔ شاید وہ اس نقطۂ نظر کی بنیاد پر دم کے حق میں ہیں، جس کے مطابق حج کے کسی رکن کی ادائیگی پر ایک بھیڑ قربان کرنے اور اس کا تمام گوشت حدودِ حرم میں مقیم مستحقین میں تقسیم کرنے کی ہدایت ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی رائے میں منیٰ میں تشریق کی راتیں بسر کرنا سنت ہے اور اگر یہ رہ جائے تو دم کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ کی زوجہ اور ان کے گروپ کے افراد کو ۸ ذی الحجہ کو منیٰ میں قیام کے بغیر براہ راست عرفات میں یہ کہہ کر لے جایا گیا کہ تاخیر کی صورت میں عرفات کا قیام چھوٹ جانے کا خدشہ تھا۔ یہ بات گو درست ہے کہ ۹ ذی الحجہ کو منیٰ اور عرفات کے راستے میں زبردست ہجوم ہوتا ہے اور تمام حجاج عرفات کی سمت رواں دواں ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود خاصا وقت ہوتا ہے اور یہ فاصلہ پیدل چل کر تین گھنٹوں میں طے کیا جاسکتا ہے جبکہ بس یا گاڑی میں ہجوم کے باوجود یہ فاصلہ طے کرنے میں ۳۰-۴۰ منٹ لگتے ہیں۔ اگر کوشش کی جاتی تو منیٰ میں قیام کیا جاسکتا تھا اور بروقت عرفات بھی پہنچا جاسکتا تھا۔

رات منیٰ میں قیام نہ کرسکے

سوال: گزشتہ سال ہم نے فریضہ حج ادا کیا۔ عرفات میں قیام سے پہلے ایک رات منیٰ میں گزاری اور دس ذی الحجہ کو واپس آکر رمی اور قربانی کی۔ مغرب سے پہلے ہم مکہ مکرمہ چلے گئے تاکہ طواف افاضہ (یا زیارۃ) ادا کریں۔ حرم میں زبردست ہجوم تھا اور چونکہ ہمارے ساتھ خواتین بھی تھیں اس لیے ہمیں حرم کی پہلی منزل پر طواف کرنا تھا۔ اس فریضے کی ادائیگی تک رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ تقریباً تمام لوگ خاص طور پر ہمارے ساتھ کی ضعیف خواتین بے حد تھک گئی تھیں اس لیے ضروری تھا کہ منیٰ واپسی سے پہلے کچھ دیر آرام کرلیا جائے۔ ہم نے مکہ میں صبح تک قیام کیا اور فجر کی نماز حرم میں ادا کی، اس کے بعد منیٰ چلے گئے اور رات وہاں بسر کی۔ ۱۲ ذی الحجہ کی سہ پہر کو منیٰ سے روانہ ہوگئے۔ ازراہ کرم بتایئے کہ منیٰ میں اس قلیل مدت کے قیام کی تلافی کس طرح کی جائے؟

جواب: اس مخصوص دن، طواف اور سعی کی ادائیگی میں جتنا وقت صرف ہونا تھا آپ نے اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ چونکہ آپ کے ساتھ بزرگ خواتین تھیں اس لیے آپ کو منیٰ سے مکہ کے لیے دو گھنٹے پہلے روانہ ہوجانا چاہیے تھا۔ آپ بخوبی واقف ہیں کہ عرفات کے بعد منیٰ میں دو رات کا قیام لازمی ہے۔ آپ سے یہ فروگزاشت اس لیے ہوئی کہ آپ کو حج کا ایک اور اہم فریضہ ادا کرنا تھا۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے جو بالعموم ہوجاتی ہے۔ اگر آپ اس بات کا صحیح اندازہ کرلیتے کہ طواف میں

آپ کو کتنا وقت لگے گا تو شاید آپ کو زیادہ وقت مل جاتا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ آپ وقت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے۔ آپ ایک اہم فریضے کی ادائیگی میں مصروف رہے اور اس فرض کی ادائیگی نے آپ کو ایک اور فوری فریضے، یعنی منیٰ میں رات کو قیام سے روک دیا۔ اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہیں۔ وہ اپنے بندوں کی ان غلطیوں پر گرفت نہیں کرتے جو واقعی غلطی سے سرزد ہو جائیں اور اس لیے میرے خیال میں آپ کو اس غلطی کے لیے کسی عمل کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص لاپرواہی یا کاہلی کی وجہ سے کسی غلطی کا مرتکب ہو اسے اپنی کوتاہی کی تلافی کرنی ہوتی ہے۔ ناگزیر حالات یا محض غلطی کی بناء پر جو کوتاہی ہو جائے اس کے لیے تلافی ضروری نہیں۔ آپ کا فریضہ حج درست شمار ہوگا۔

دوسرے کی طرف سے رمی کیسے کی جائے؟

سوال: حج کے دوران جمرات پر رمی کرنے کے معاملے میں ازراہ کرم یہ وضاحت فرمائیں کہ جب کوئی شخص اپنی کسی عزیزہ یا کسی معذور شخص کی جانب سے بھی رمی کرنا چاہتا ہو تو اسے یہ کام کس طرح انجام دینا ہوگا۔ کیا یہ ضروری ہے کہ وہ تینوں جمرات پر پہلے اپنی جانب سے رمی کرے اور پھر دوسرے شخص کی جانب سے از سرنو تینوں جمرات پر رمی کرے، یا یہ ممکن ہے کہ وہ ہر جمرات پر رمی کرتے وقت بیک وقت دونوں کی جانب سے رمی کرے؟

جواب: جمرات پر رمی کے دوران زبردست ہجوم کی وجہ سے تمام علماء کی یہ رائے ہے کہ خواتین اور معذور یا ضعیف العمر افراد کی جانب سے ان کا کوئی عزیز رمی کر سکتا ہے۔ ایک شخص جسے کسی دوسرے کی جانب سے بھی رمی کرنی ہو، یہ کام بیک وقت کر سکتا ہے۔ یہ ضرورت نہیں ہے کہ پہلے تینوں جمرات پر وہ خود رمی کرے اور پھر دوسرے شخص کی جانب سے از سرنو، تینوں جمرات پر رمی کرے۔ اگر آپ ایک سے زائد افراد کی جانب سے بھی رمی کر رہے ہوں تو یہی طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔ یعنی پہلے جمرے پر اپنی جانب سے اور دیگر تمام افراد کی جانب سے رمی کریں، اس کے بعد آگے بڑھیں اور دوسرے جمرے پر اپنی جانب سے اور دیگر افراد کی جانب سے رمی کرنے کے بعد تیسرے جمرے پر رمی کریں۔ یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ حج کا مقصد اللہ کی اطاعت اور اس کے احکام کی تعمیل ہے۔ اپنی عبدیت کا اظہار اور بندگی کی تکمیل ہے اس کا مقصد قطعی یہ نہیں ہے کہ خود کو غیر ضروری تکالیف میں مبتلا کیا جائے۔

رمی جمار میں غلطی

سوال: میرے ایک دوست نے حج کے دوران غلطی سے رمی کے پہلے دن، جمرہ عقبہ کے بجائے جمرہ اولیٰ کی رمی کی۔ اس طرح جب میں پہلے دن رمی کے لیے گیا تو میرے لیے جمرے کے عقب سے ہی رمی کرنا ممکن ہوا۔ ازراہ کرم بتایئے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اگر آپ کے دوست نے محض غلطی سے جمرہ عقبہ کی بجائے جمرہ اولیٰ کی رمی کی ہے تو اس کے لیے کسی تلافی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جو غلطی واقعی غلطی سے ہو، اس کے لیے اللہ تعالیٰ ہم سے جواب طلب نہیں کریں گے۔ اگر انہیں منیٰ سے روانہ ہونے سے پہلے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا تو انہیں چاہیے تھا کہ وہ واپس جا کر صحیح طریقے سے رمی کرتے اور اگر منیٰ سے روانہ ہونے کے بعد تک انہیں اپنی غلطی کا علم نہیں ہوا تو اب انہیں کسی تلافی کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ کا جمرے کے عقب سے رمی کرنا قابل قبول ہے گو کہ یہ رمی کرنے کی مناسب جگہ نہیں ہے۔ حج کے دوران ہجوم کی وجہ سے تمام لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ رمی کے لیے درست مقام تک پہنچ سکیں۔ اس لیے اگر وہ رمی کرتے وقت یہ بات یقینی سمجھیں کہ ان کے پھینکے ہوئے کنکر صحیح جگہ لگ رہے ہیں تو یہ درست ہوگا۔

دس ذی الحجہ کو مناسک حج کی ترتیب

سوال: اپنی زوجہ اور ہمشیرہ کے ساتھ حج ادا کیا تو ۱۰ ذی الحجہ کو رمی کے بعد اپنی اور اپنی بیگم و ہمشیرہ کی جانب سے قربانی کی اور اس کے بعد بال کٹوائے اور احرام اتار دیا۔ دونوں خواتین بھی احرام کی پابندی سے آزاد ہوگئیں تاہم انہوں نے رمی جمار کی ادائیگی احرام اتارنے سے قبل نہیں کی تھی۔ کیونکہ میں نے پڑھا تھا کہ خواتین کو اس بات کی اجازت ہے کہ رمی میں تاخیر کرسکتی ہیں اور ہجوم کم ہوجانے پر اس کی ادائیگی ممکن ہے۔ کافی عرصہ گزرنے کے بعد میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ مناسک حج کی ادائیگی کے دوران ۱۰ ذی الحجہ کے دن فرائض کی ترتیب یوں ہے کہ پہلے رمی جمار پھر قربانی پھر سر منڈوانا۔ یہ ترتیب برقرار نہ رہے تو دم کرنا ہوتا ہے۔ ازراہ کرم بتایئے کہ کیا مجھ پر یا دونوں خواتین پر دم واجب ہے یا نہیں؟

جواب: آپ نے اور آپ کے ساتھ آپ کی بیگم و ہمشیرہ نے مناسک حج جس طرح ادا کیے ہیں وہ

درست ہیں اور آپ کو دم کی ضرورت نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حج ادا کیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ کرامؓ کو مناسک حج کی تعلیم دی۔ ۱۰ ذی الحجہ کو بعض صحابہ کرامؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس دن ادا کیے جانے والے مناسک حج کی ترتیب کے بارے میں سوالات کیے۔ ایک صحابیؓ نے یہ بات دہرا کر کہی کہ انہوں نے ایک فریضہ، دوسرے سے پہلے ادا کرلیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ "اس میں کوئی حرج نہیں۔" بعض صحابہؓ نے ۱۰ ذی الحجہ کے مناسک کی ترتیب میں، جتنی بھی تبدیلیاں ہوسکتی تھیں، ان کے بارے میں دریافت کیا اور ہر بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی جواب دیا۔ اس واقعہ کی روشنی میں آپ کا عمل درست قرار پاتا ہے۔

صرف ایک مکتب فکر مناسک حج کی ادائیگی میں اس ترتیب پر عمل کرتا ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے دوران خود اختیار کی، لیکن باقی تمام مکتبہ فکر کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ ذی الحجہ کو جس ترتیب سے مناسک حج ادا کیے وہ ترتیب برقرار رکھی جائے تو سب سے افضل ہے، لیکن اگر ترتیب بدل جائے تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیے گئے واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سے زائد بار کیے گئے سوال کے جواب میں فرمایا۔

عمرے کے بعد حلق نہ کرانے پر دم

سوال: عمرے کے اختتام پر اگر کوئی شخص حلق یا قصر (بال چھوٹے کرانا یا سر منڈانا) نہ کرائے تو اسے کیا کرنا ہوگا؟

جواب: عمرے کے اختتام پر حلق یا قصر کرانا فرض ہے۔ حلق یا قصر عمرے کا رکن ہے اور اس کے بعد ہی عمرہ کرنے والا احرام کھول سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ رکن ادا نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ایک فرض عبادت کا رکن چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے دم دینا ہوگا۔

قربانی کہاں کی جائے؟

سوال: ایشیائی ممالک سے تعلق رکھنے والے وہ باشندے جو سعودی عرب میں مقیم ہیں، ان کا یہ عام طریقہ ہے کہ حج کے موقع پر وہ قربانی کے لیے رقم اپنے وطن میں عزیزوں کو بھیج دیتے ہیں تاکہ عید الاضحیٰ کے موقع پر ان کی طرف سے وطن میں قربانی کردی جائے۔ ان میں سے بعض حضرات ایسے

ہوتے ہیں جو اپنے اہل خانہ کے ساتھ سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ کیا ان کا یہ طریقہ درست ہے۔

جواب: عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کا عام طریقہ تو یہی ہے کہ قربانی کرنے والا جہاں رہتا ہے، وہیں قربانی کرے، تاہم اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ سعودی عرب کے بجائے اپنے ملک میں قربانی کرنا زیادہ مناسب ہے جہاں قربانی کے گوشت سے زیادہ لوگ جن میں اس کے والدین، دیگر عزیز واقارب اور پڑوسی وغرباء شامل ہیں، فائدہ اٹھاسکیں گے تو اس کا یہ اقدام بالکل درست ہوگا۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ اس صورتحال کا اطلاق صرف ایشیائی ممالک کے ان باشندوں پر کیا جاسکتا ہے جو سعودی عرب میں کام کر رہے ہیں۔

حج کے موقع پر سعودی عرب میں جو جانور قربانی کے دوران ذبح کیے جاتے ہیں ان کے گوشت کی بڑی مقدار، حرم کے غرباء کی ضرورت پوری کرنے کے بعد، مسلم دنیا کے غرباء میں تقسیم کے لیے بھیج دی جاتی ہے۔ اگر یہ طریقہ حج کی قربانی کے لیے اختیار کیا جاسکتا ہے جو کہ فرض ہے، تو نفلی یا سنت قربانی کے لیے بھی اسے اختیار کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں قربانی سخاوت کا عمل ہے اور جو شخص اپنی دولت دوسروں کے فائدے کے لیے خرچ کر رہا ہو اس پر یہ پابندی عائد نہیں کی جاسکتی کہ وہ فلاں جگہ خرچ کرے۔

قربانی کے اوقات

سوال: حج کے موقع پر میں نے قربانی سے پہلے سر منڈوالیا، حالانکہ میری نیت یہ تھی کہ پہلے قربانی دوں گا اور پھر بال صاف کرواؤں گا، کیا میرا اقدام درست تھا؟

جواب: عید الاضحیٰ یعنی ۱۰ ذی الحجہ کو جن ارکان کی ادائیگی لازم ہے ان میں رمی، طواف افاضہ، قربانی اور سر کے بال چھوٹے کروانا یا سر صاف کروانا شامل ہیں۔ یہ ارکان کسی بھی ترتیب سے ادا کیے جاسکتے ہیں، لہٰذا آپ کا قربانی سے پہلے سر منڈوانے کا عمل درست تھا۔

متبادل قربانی

سوال: کیا کوئی شخص عید قرباں کے موقع پر اپنے کسی مرحوم عزیز کی جانب سے قربانی کرسکتا ہے؟

جواب: قربانی، ایک واجب عمل ہے۔ اگر ایک مسلمان اپنی پوری زندگی میں قربانی نہ کرے تو یہ کوئی گناہ نہ ہوگا اور نہ ہی قربانی نہ کرکے وہ احکام خداوندی کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوگا۔ لہٰذا کسی

متوفی عزیز کی جانب سے قربانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اگر آپ اپنے عزیز ترین شخص کے لیے ثواب کا کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کی جانب سے حج کر سکتے ہیں یا اس شخص کی جانب سے غرباء کی امداد کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ اللہ تعالیٰ سے مرحوم کی مغفرت کی اور اسے جنت میں بھیجے جانے کی دعا کر سکتے ہیں۔ ایسی دعائیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہوتی ہیں۔

طواف وداع کی اہمیت

سوال: گزشتہ حج کے دوران وقت کی کمی اور بعض دوسرے مسائل کی وجہ سے طواف وداع ادا نہیں کر سکا۔ ازراہ کرم بتایے کہ مجھے اس غلطی کا ازالہ کس طرح کرنا ہوگا؟

جواب: اگر کوئی عازم حج، حج کے ارکان ادا کیے بغیر مکہ سے رخصت ہو جاتا ہے تو اسے غیر ادا شدہ رکن کی ادائیگی کے لیے لازماً واپس مکہ آنا ہوگا۔ حج کے تمام ارکان دس ذی الحجہ سے قبل ادا کر لینے چاہئیں کیونکہ حج کا فریضہ دس ذی الحجہ کے بعد ادا نہیں کیا جا سکتا۔ طواف وداع حج کی وہ آخری عبادت ہے جو حاجی مکہ میں رہتے ہوئے کرتا ہے۔ یہ لازماً مکہ سے رخصت ہونے سے ذرا پہلے ادا کرنا چاہیے۔ علماء اس بات پر زور دیتے ہیں کہ طواف وداع کے لیے روانہ ہونے سے قبل اپنا سامان سفر باندھ لینا چاہیے۔ اور طواف وداع کی ادائیگی کے بعد جائے قیام واپس آ کر سامان اٹھا کر روانہ ہو جانا چاہیے۔ اگر کسی وجہ سے روانگی مؤخر ہو جائے تو طواف وداع دوبارہ کرنا ہوگا۔

امام ابن حزمؒ کے مطابق اگر کوئی شخص طواف وداع ادا نہ کر سکا ہو تو اسے واپس آ کر حج کا یہ رکن ادا کرنا ہوگا۔ خواہ وہ اپنے گھر ہی کیوں نہ پہنچ چکا ہو اور خواہ اس کا گھر مکہ مکرمہ سے بہت دور ہی کیوں نہ ہو۔ امام ابن حزمؒ اندلس میں رہتے تھے اور ان کو اندازہ تھا کہ ان کے اس فتویٰ کا کیا مطلب ہے۔ دیگر علماء کی رائے یہ ہے کہ طواف وداع اگر رہ جائے تو اس کی تلافی حدود حرم میں ایک بھیڑ کی قربانی سے ہو سکتی ہے۔ آپ اپنے کسی جاننے والے سے جو مکہ جا رہا ہو، یہ کہیں کہ وہ حدود حرم میں آپ کی جانب سے قربانی کر دے۔

طواف وداع کے سلسلے میں اس پابندی سے ان خواتین کو استثنیٰ حاصل ہو جاتا ہے، جو مکہ سے روانگی کے وقت مخصوص ایام میں ہوں۔ علاوہ ازیں خواتین کے معاملے میں اکثر یہ صورتحال پیش آتی ہے کہ انہیں کسی خاص وقت پر روانہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے ساتھ کے لوگ کسی خاص وقت پر روانہ ہو رہے ہوں اور خاتون کا ان کے ساتھ سفر کرنا ضروری ہو یا یہ کہ وہ کسی خاص پرواز سے روانہ ہو رہی ہوں اور پرواز چھوڑنا ان کے لیے ممکن نہ ہو۔

ایسی صورتحال میں خواتین، طواف وداع کے بغیر مکہ مکرمہ سے روانہ ہوسکتی ہیں۔ اس کے لیے انہیں دم دینے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ خواتین کے معاملے میں یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت سے بالکل واضح ہے، جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک محترم صحابیہؓ کو دی تھی، جو مکہ سے روانگی کے وقت اسی قسم کی صورتحال سے دوچار تھیں۔

طواف وداع کی تاخیر سے ادائیگی

سوال: میں نے فریضہ حج ادا کیا تو طواف وداع مکمل نہیں کرسکا۔ ایک ماہ بعد میں دوبارہ مکہ مکرمہ گیا اور یہ فریضہ ادا کیا۔ کیا یہ صورت قابل قبول ہے۔ مزید برآں فریضہ حج کے بعد میں مدینہ منورہ نہیں جاسکا اور اس وجہ سے وہاں ۸ دن قیام کرکے مسجد نبویؐ میں چالیس فرض نمازیں ادا نہیں کرسکا۔ کیا یہ نمازیں بعد میں ادا کی جاسکتی ہیں؟

جواب: آپ کو چاہیے تھا کہ مکہ مکرمہ سے روانہ ہونے سے پہلے طواف وداع ادا کرتے۔ یہ عمل ان تمام لوگوں پر فرض ہے جو مکہ یا حدودِ حرم میں نہیں رہتے۔ علاوہ ازیں طواف وداع کی ادائیگی روانگی سے بالکل پہلے کرنی چاہیے۔ مثلاً اگر آپ سہ پہر میں مکہ سے روانہ ہو رہے ہیں تو طواف وداع صبح نہیں کرسکتے۔ یہ آپ کو روانگی سے فوراً پہلے اس طرح ادا کرنا ہے کہ اگر آپ کے ساتھ دوسرے لوگ ہوں تو انہیں تکلیف نہ ہو اور اگر آپ کسی پبلک ٹرانسپورٹ سے جارہے ہوں تو گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ چونکہ آپ نے ایک ماہ بعد جاکر طواف وداع ادا کرلیا اس لیے اب مزید کسی تلافی کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ یہ نہ کرتے تو اس وقت آپ کو طواف وداع ادا نہ کرنے کی تلافی کے طور پر مکہ مکرمہ یا حدودِ حرم میں ایک بھیڑ کی قربانی کرنا ہوتی جس کا تمام گوشت غرباء و مساکین میں تقسیم کیا جاتا۔ آپ یا آپ کے اہل خانہ اس میں شریک نہیں ہوسکتے تھے۔

مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ میں حاضری دینا، ایک سنت ہے جو آپ سال کے دوران کسی بھی وقت کرسکتے ہیں۔ یہ فریضہ حج کا حصہ نہیں ہے۔ جو حضرات حج کے لیے سعودی عرب کے باہر سے آتے ہیں وہ عام طور پر مدینہ منورہ بھی جاتے ہیں تاکہ ایک ہی مرتبہ کے سفر میں دونوں مقامات مقدسہ کی زیارت سے فیضیاب ہوجائیں۔ یہ حضرات یا تو حج سے قبل مدینہ منورہ جاتے ہیں یا حج کے بعد۔ حج کی ادائیگی کے وقت اگر آپ مدینہ منورہ نہیں جاسکے تو اس سے آپ کے حج کی تکمیل پر قطعی کوئی اثر نہیں پڑا۔ مدینہ منورہ آپ کسی وقت بھی جاسکتے ہیں۔ چونکہ آپ جدہ میں رہتے ہیں اس لیے آپ کے لیے مناسب یہ ہے کہ آپ مدینہ منورہ اس وقت جائیں جب وہاں زائرین کا

ہجوم نہ ہو۔ یہ بہتر ہی ہے کہ آپ موسم حج کے دوران مدینہ منورہ نہیں گئے اس وقت روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری اور سلام پیش کرنے میں ہجوم کی وجہ سے آپ کو دشواری ہوتی اور دوسروں کو بھی۔

طواف وداع ادا نہیں ہوسکا

سوال: گزشتہ سال میں نے اپنی زوجہ کے ساتھ فریضہ حج ادا کیا۔ میری بیوی ان دنوں حاملہ تھیں اور ۱۲ ذی الحجہ کو ان کی طبیعت زیادہ خراب تھی اس لیے وہ طواف وداع ادا نہیں کرسکیں۔ ہم کئی دن انتظار کرتے رہے کہ ان کی طبیعت بہتر ہو جائے لیکن یہ طواف ابھی تک ادا نہیں ہوسکا ہے۔ ریاض واپس پہنچنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ اس قسم کی صورتحال میں بیگم کی طرف سے کوئی دوسرا شخص طواف وداع ادا کرسکتا ہے۔ یہ معلوم ہونے پر جدہ میں مقیم میرے ایک عزیز نے میری بیگم کی طرف سے طواف وداع ادا کیا۔ ازراہ کرم بتایے کہ کیا یہ طریقہ درست ہے؟

جواب: حج کے چند ارکان ایسے ہیں جو ایک شخص کی جانب سے دوسرا شخص ادا کرسکتا ہے، لیکن بعض ارکان ایسے ہیں جنہیں لازماً خود ہی ادا کرنا ہوتا ہے۔ پورا حج مکمل طور پر کسی دوسرے شخص کی جانب سے (حج بدل کے طور پر) ادا کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح رمی جمار بھی کسی دوسرے شخص کی طرف سے کی جاسکتی ہے، خصوصاً خواتین کے لیے یہ بات زیادہ بہتر ہے کہ زیادہ ہجوم کی صورت میں ان کی طرف سے مرد رمی کریں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعیف اور بیمار خواتین کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ عرفات کے بعد مزدلفہ میں رات قیام نہ کریں اور آدھی رات کے بعد منیٰ روانہ ہو جائیں۔ اسی طرح قربانی بھی دوسرے شخص کی جانب سے کی جاسکتی ہے، تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ متعلقہ شخص خود کو قربانی کرنے کا اہل نہ پاتا ہو۔ یہ وہ سہولتیں ہیں جن کی اجازت دی گئی ہے۔ ان کے علاوہ حج کے دیگر تمام ارکان ہر شخص کو خود ادا کرنے ہوتے ہیں۔ طواف بھی ان ارکان میں شامل ہے جو ذاتی طور پر ادا کرنے ہوتے ہیں۔ آپ نے حج کے دوران دیکھا ہوگا کہ معذور، بیمار اور ضعیف حضرات ڈولیوں میں سوار ہوکر یا دوسرے شخص کے کاندھوں پر طواف کرتے ہیں۔ اسی طرح معذور افراد سعی کے لیے پہیوں والی کرسی استعمال کرتے ہیں۔ آپ کی زوجہ کے معاملے میں صورتحال یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے بیماری کی وجہ سے طواف وداع ادا نہیں کیا اس لیے اس کے ازالے کے لیے ان کی جانب سے ایک جانور کی قربانی دے دی جائے۔ یہ قربانی حدود حرم میں کسی بھی وقت کی جاسکتی ہے اور یہ قربانی آپ کی بیوی کی جانب سے کوئی بھی شخص ادا کرسکتا ہے۔

طواف وداع

سوال: حج کے تمام فرائض ادا کرنے کے بعد، میں اور میری زوجہ ۱۲ویں ذی الحجہ کی صبح مکہ سے روانہ ہوگئے۔ میری زوجہ نے روانگی سے پہلے رمی کرلی تھی جبکہ میں نے کسی اور سے یہ درخواست کی کہ وہ میری طرف سے بعد دوپہر رمی کردے۔ ہم دونوں پہلے جدہ اور پھر مدینہ منورہ چلے گئے جہاں چندروز قیام کے بعد واپسی کے سفر کے لیے واپس مکہ آئے جہاں ہم نے ۲۳ ذی الحجہ کو طواف وداع ادا کیا۔ ازراہ کرم بتائیے کہ کیا یہ طریقۂ کار درست تھا؟

جواب: ذاتی طور پر مجھے یہ طریقۂ کار پسند نہیں ہے کہ لوگ رمی خود کرنے کے بجائے کسی دوسرے کو کہہ دیتے ہیں کہ وہ ان کی طرف سے رمی کردے۔ رمی، حج کا ایک رکن ہے اور حج انفرادی عبادت ہے۔ اس لیے حج کے تمام ارکان، حاجی کو خود ادا کرنا چاہئیں۔ البتہ جہاں واقعی کوئی حقیقی مجبوری ہو اس صورت میں ایک شخص، کسی اور سے یہ درخواست کرسکتا ہے کہ وہ اس کی جانب سے رمی کردے۔ آپ کی زوجہ کے پاس اس بات کا معقول عذر تھا کہ ان کی طرف سے کوئی اور رمی کرے، کیونکہ خواتین کو ہجوم اور بھیڑ بھاڑ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ میرے نزدیک بہتر یہ ہوتا کہ آپ دونوں سہ پہر تک یہاں ٹھہرتے اور آپ خود دونوں کی جانب سے۔ یعنی اپنی جانب سے بھی اور اپنی زوجہ کی جانب سے بھی۔ رمی کرتے۔ بہرحال، چونکہ اب یہ معاملہ گزر گیا، اس لیے میں یہ کہوں گا جو ہوا وہ درست تھا۔

آپ کو جدہ روانگی سے پہلے طواف وداع ادا کرلینا چاہیے تھا۔ طواف وداع کا موزوں وقت وہی تھا لیکن چونکہ آپ نے ذوالحجہ کے مہینے میں ہی واپس مکہ آکر طواف وداع ادا کرلیا، اس لیے آپ کی جانب سے فرض ادا ہوگیا۔ چونکہ آپ نے کوئی غلطی نہیں کی اور نہ کوئی رکن چھوڑا، اس لیے آپ کو دم کی صورت میں کسی قسم کا کفارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ امام ابن حزمؒ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص طواف وداع ادا نہ کرسکے تو اسے لازماً واپس آکر حج کا یہ رکن ادا کرنا چاہیے، خواہ وہ دنیا کے آخری کونے ہی میں کیوں نہ جاچکا ہو۔

سوال: ازراہ کرم طواف وداع کی اہمیت واضح کیجیے اور یہ بھی بتایے کہ اس کی ادائیگی لازمی ہے یا اختیاری؟ کون شخص اس کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہے؟

جواب: طواف وداع مناسک حج کا آخری فریضہ ہے۔ جب اسے فریضہ قرار دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ادائیگی لازمی ہے، یہ سنت نہیں ہے فرض ہے۔ چار بڑے فقہی مسالک میں سے تین میں طواف وداع کو''واجب'' قرار دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مکہ مکرمہ سے رخصت ہونے سے پہلے اس کی ادائیگی ہر عازم حج کے لیے ضروری ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک طواف وداع کی اہمیت فرض سے کم ہے لیکن اس کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ کسی بھی وجہ سے طواف وداع ادا نہ کیا جائے۔ طواف وداع لازماً ادا کرنا چاہیے۔ جس کسی سے یہ فرض ادا نہ ہو سکے اسے چاہیے کہ حدود حرم میں ایک بھیڑ کی قربانی کرے اور وہ شخص یا اس کے اہل خانہ قربانی کا گوشت استعمال نہ کریں۔ طواف وداع مکہ مکرمہ سے رخصت ہونے سے ذرا پہلے ادا کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس شہر مقدس سے روانگی کا ارادہ ہو تو روانگی کے انتظامات مکمل کر لیے جائیں اور پھر خانہ کعبہ میں حاضر ہو کر طواف وداع ادا کیا جائے اس کے فوراً بعد مکہ مکرمہ سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ اگر ایک شخص عصر کے وقت مکہ سے روانگی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ صبح کے وقت طواف وداع ادا کرے یا ایک شخص صبح روانہ ہونا چاہتا ہے تو وہ یہ نہیں کر سکتا کہ رات کو سونے سے پہلے طواف وداع ادا کرے۔ جہاں تک ممکن ہو، طواف وداع روانگی کے آخری لمحات میں ادا کرنا چاہیے۔

جو لوگ مکہ مکرمہ کے اندر یا اس کے قرب و جوار میں رہتے ہیں صرف انہیں یہ اجازت ہے کہ وہ طواف وداع ادا نہ کریں۔ جدہ یا طائف کے رہنے والوں پر بھی اس کی ادائیگی لازمی ہے۔ سعودی عرب کے باہر سے آنے والے عازمین اگر کسی ضرورت سے جدہ جانا چاہیں یا مدینہ میں مسجد نبویؐ میں حاضری دینا چاہیں تو انہیں بھی مکہ مکرمہ سے روانگی سے پہلے طواف وداع ادا کرنا ہوگا خواہ مکہ مکرمہ سے باہر ان کا سفر تھوڑی مدت ہی کا کیوں نہ ہو۔ جب وہ دوبارہ مکہ مکرمہ میں آئیں گے تو ان کی ہر آمد نئی شمار ہوگی۔ اگر وہ مناسک حج کے دوران عمرہ ادا کر چکے ہیں تو دوبارہ عمرے کی ادائیگی ان پر لازمی نہیں ہے۔ تاہم اگر وہ نیا عمرہ ادا کریں تو انہیں اس کا اجر ملے گا۔ اگر ایک شخص طواف وداع ادا کیے بغیر مکہ مکرمہ سے جدہ چلا جاتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوبارہ مکہ مکرمہ میں آئے اور طواف وداع ادا کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اسے بطور دم حدود حرم میں ایک بھیڑ کی قربانی کرنا ہوگی۔

حقوق العباد اور حج: کیا بندوں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟

سوال: یہ مسئلہ میرے ایک دوست کا ہے، جس کے ساتھ اس کے اعزہ واقرباء نے کافی ناانصافیاں

کی ہیں، اب وہ لوگ حج کے لیے گئے ہیں۔ میرے دوست نے تو خود کوئی بدلہ نہیں لیا۔ سارا معاملہ اللہ کے انصاف پر چھوڑ دیا ہے، لیکن چونکہ حج سے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں اس لیے میرا دوست الجھن میں ہے کہ اس کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے، کیا حج کرنے سے اللہ تعالیٰ، ان لوگوں کے یہ گناہ بھی معاف کردے گا۔ واضح رہے کہ وہ خود اب بھی ان لوگوں سے کسی طرح بدلے کی خواہش نہیں رکھتا!

جواب: یہ درست ہے کہ حج کرنے سے اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف فرمادیتے ہیں، اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ کی رحمت وکرم ہمارے گناہوں سے بہت زیادہ ہے۔ ہم خواہ کتنے ہی گناہ گار ہوں، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے کرم سے معاف کرنے کا اختیار اور قدرت رکھتے ہیں۔ اس کا ادراک ہم نہیں کرسکتے۔ اسی طرح ہم کوئی نیکی کرتے ہیں تو اس کا اجر بھی ہمیں اس سے کم سے کم دس گنا زیادہ ملتا ہے۔ ہر وہ شخص جو حج کرنے نکلتا ہے، وہ سفر کی مشقت اٹھاتا ہے، تکلیفیں جھیلتا ہے، اپنی خون پسینے کی کمائی اس سفر پر خرچ کرتا ہے۔ یہ سب باتیں اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہیں، لہٰذا اس کے صلے میں اللہ اس کا درجہ بلند کرتے ہیں اور اس کے عمل کا کثیر اجر عطا فرماتے ہیں۔

مگر اب سوال یہ ہے کہ اس سفر (حج) کا اتنا کثیر اجر کیوں ہے؟

یہاں بنیادی طور پر یہ سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ اسلامی عبادات کی روح ہی یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو بھی حکم ملے، اسے بے چون و چرا بجالایا جائے، اس کے آگے اپنی مرضی اور پسند سے دستبردار ہوجایا جائے۔ ظاہری و باطنی طور پر، بندہ خواہ کسی حیثیت اور مرتبے کا مالک ہو لیکن اللہ کے سامنے وہ دوسرے بندوں کی طرح ایک بندہ ہے۔ اس کے جاہ ومنصب کی اللہ کی نظر میں اہمیت نہیں، صرف بندگی کے جذبے کی پرکھ ہے۔ چاہے اس نے درجنوں حج کیے ہوں۔ اگر یہ جذبہ نہیں تو یہ بے شمار سفر بھی اللہ کو خوش نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ہر عبادت صرف اللہ کی رضا سے مشروط ہے، اس لیے جو بھی حج، اخلاص سے کیا جاتا ہے، اللہ اس کو تمام گناہوں سے پاک وصاف فرمادیتا ہے۔

یہاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔ ایک شخص، جو چاہتا ہے کہ وہ حج سے پاک صاف ہوکر واپس آئے اور ایک نئی اور پاکیزہ زندگی کا آغاز کرے، اسے چاہیے کہ اس سفر کے آغاز سے پہلے اور بعد میں بھی گناہوں سے حتی الامکان بچے۔ کیونکہ حج کرلینے کا مطلب یہ نہیں کہ چونکہ پہلے کے گناہ معاف ہوگئے، اس لیے اب وہ جتنے چاہے گناہ کرے۔ اس بنا پر یہ سخت ہدایت کی گئی ہے۔ مثلاً قرضہ یا امانت کی بابت کہ یا تو پہلے ہی اسے واپس کردیا جائے، یا مناسب اہتمام کردیا جائے کہ امانت یا قرضہ متعلقہ شخص کو واپس کیا جاسکے۔

کیونکہ ممکن ہے عازم حج دوران سفر وفات پا جائے۔ اسی طرح حقوق العباد کی ادائیگی میں بھی کوتاہی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی ہوگئی ہے تو جانے سے پہلے ہی اس کی تلافی کردی جائے۔

اب ہم اصل سوال کی طرف آتے ہیں کہ ایک عازم حج، جس نے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہو، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق نہیں، اس کی کیا حیثیت ہوگی۔

یہاں دو باتیں ہیں۔ ایک حقوق اللہ، دوسرے حقوق العباد، حقوق اللہ کے معاملے میں تو یہ ہوسکتا ہے کہ اگر کسی نے نمازیں یا روزے چھوڑ دیے ہوں تو وہ ان نمازوں کی قضا ادا کرے اور روزے بھی رکھ کر ان کی قضا کی جاسکتی ہے۔ یہ معاملہ خالصتاً اللہ اور بندے کے درمیان کا ہے، چونکہ عبادتیں خالصتاً اللہ کا حق ہیں لہٰذا ان کی تلافی بھی اسی کی عبادت کرکے ہی کی جاسکتی ہے اور اللہ اپنی رحمت سے اسے قبول کرکے اس گناہ کو معاف کرسکتے ہیں۔

جبکہ دوسری قسم کے گناہ حقوق العباد سے متعلق ہیں، ان کو چھیننے یا صحیح طرح ادائیگی نہ کرنے سے یہ حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ حج کرنے سے تمام کوتاہیاں جو حقوق اللہ کی ادائیگی میں سرزد ہوئی ہیں، معاف کردی جاتی ہیں۔ تاہم حقوق العباد کے بارے میں سب کی رائے یہ نہیں ہے۔ علماء کے مطابق کوئی شخص خواہ بالکل درست طریقہ سے حج ادا کرے لیکن اس سے حقوق العباد میں کی جانے والی غلطیاں اس وقت تک معاف نہیں ہوں گی جب تک متعلقہ فریق انہیں معاف نہ کرے یا اس کے معاملے میں کوتاہیوں کی تلافی نہ کردی جائے۔ علماء کے ایک دوسرے گروہ کی رائے کے مطابق ایسا نہیں ہے، بلکہ حج کرنے سے ان حقوق کی ادائیگی میں کی جانے والی کوتاہیاں بھی اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں۔ اب اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت وقدرت سے ایسا کرتے ہیں تو اس صورت میں وہ اس غلطی کی تلافی اور جس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے، اس کو اس کے صلے میں اچھا اجر فرمانے کی ذمہ داری بھی قبول کرلیتے ہیں۔

اب آپ کے دوست کو یقین کرنا چاہیے کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کا صلہ اللہ سے بہتر ملے گا۔ چاہے وہ ان اعزہ واقربا کی طرف سے تلافی کی صورت میں ہو یا خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست بہتر اجر کی شکل میں۔ تاہم ذاتی طور پر میں آپ کے دوست سے یہی کہوں گا کہ وہ اپنے اعزا کے اس نامناسب رویے کو اگر خود معاف کردیں تو یہ زیادہ اچھا ہوگا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرنا مناسب ہوگا۔ ابتدائی دور میں اہل ایمان کو بہت کم وسائل کے ساتھ ایک معرکہ درپیش تھا، ایک صحابیؓ بھی اس معرکے میں حصہ لینا چاہتے تھے، مگر اپنے حالات سے مجبور تھے، انہوں نے دعا کی۔

''اے اللہ میرے پاس تو آپ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور تو کچھ نہیں، اب صرف

یہی دعا کر سکتا ہوں کہ بس جس جس نے میرے ساتھ برا سلوک کیا ہے، اسے میں معاف کرتا ہوں۔''
اگلی صبح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کی محفل میں فرمایا، جن صاحب نے کل رات اللہ سے یہ دعا کی ہے وہ سامنے تشریف لائیں۔ محفل سے کوئی نہیں اٹھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال دہرایا۔ اس بار ان صحابیؓ نے خود کو پیش کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ نے تمہاری یہ نیکی قبول فرمائی ہے۔'' آپ کے دوست کو بھی ان صحابیؓ کے اسوہ پر عمل کرنا چاہیے، جو یقیناً آخرت میں بہترین اجر اور دنیا میں بہتر تعلقات کا سبب بنے گا۔

حج اور عمرہ: مغفرت کا ذریعہ؟

سوال: میں ایک ۲۵ سالہ جوان کو جانتا ہوں جو ہر سال چھٹیوں پر اپنے ملک جاتا ہے۔ ان چھٹیوں کے دوران وہ ہر قسم کے گناہ کا ارتکاب کر لیتا ہے اور بدکاری جیسے قبیح فعل سے بھی باز نہیں آتا۔ جب وہ چھٹیاں گزار کر سعودی عرب لوٹتا ہے تو عمرہ یا حج کرتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس طرح اللہ اس کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ اس کا کہنا کہاں تک درست ہے؟

جواب: حج اور عمرے کا اہم ترین اور بالکل واضح مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے حوالے کر دے، اس کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔ جس لمحہ ہم حج کا لباس یعنی احرام زیب تن کرتے ہیں، اسی لمحے ہم ہر اس شے کو پس پشت ڈال دیتے ہیں جو کسی فخر و مباہات یا مرتبہ کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اللہ کی پکار پر لبیک کہہ رہے ہیں جو اس نے ہم پر عائد کیا ہے۔ ہم اللہ کے عظیم پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یاد تازہ کرتے ہیں جن کے اعمال و افعال اللہ کی رضا کے آگے ان کی کامل سپردگی کے عکاس ہوتے تھے۔ ہم ہر اس شے کو ترک کر دیتے ہیں جن کا تعلق ذاتی اغراض اور خواہشات سے ہوتا ہے اور ہم اللہ کی پکار پر لبیک کہنے میں جلدی کرتے ہیں۔ جب ہم اس انداز میں اللہ کے آگے جھک جاتے ہیں اور خود کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں اور ہماری یہ سپردگی مخلصانہ ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس مبارک فریضے کے عوض ہمیں بڑے انعام سے نوازتے ہیں، ہمارے گناہوں کو معاف فرماتے ہیں جب ہم حج سے فارغ ہوتے ہیں تو بالکل پاک صاف ہوتے ہیں۔

یہ باتیں متعدد احادیث میں بیان کی گئی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے
''ایک عمرہ دوسرے عمرے تک کے لیے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔'' (بخاری و مسلم)
یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر اس فرد کی مغفرت فرما دیتے ہیں جو حقیقی

پشیمانی کے ساتھ اس کی طرف رجوع کرے۔ خواہ اس نے جو گناہ کیا ہو وہ شدید نوعیت کا ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ ''جو گناہ کرنے پر پشیمان ہوا اور توبہ کی وہ اس شخص کی طرح ہو جاتا ہے جس نے گناہ کیا ہی نہیں۔''

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارا طرز عمل مخلصانہ ہو، اللہ کے حضور ہی سپردگی مکمل ہو اور ہم نے خود کو اس کے پوری طرح حوالے کیا ہو۔ ہماری توبہ سچی توبہ ہو۔ ایک شخص یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ اپنے گناہ پر پشیمان ہے اور توبہ کر رہا ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر اسے گناہ کرنے کا ایک اور موقع ملا تو وہ ذرا بھی نہیں ہچکچائے گا۔ ایسے شخص کا گناہ شاید معاف نہ کیا جائے۔ اس کی توبہ محض زبانی توبہ ہے۔ حقیقی توبہ اور اس کے ساتھ مغفرت کی دعا کے نتیجے میں امید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں سے درگزر فرمائیں گے۔

حج وہ عظیم عبادت ہے جس کے ذریعہ ہم اللہ کے آگے اپنی مکمل سپردگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنے ہر قسم کے گناہوں پر معافی مانگتے ہیں اور آئندہ اچھے کام کرنے کا عزم کرتے ہیں۔ چنانچہ حج کا انعام اللہ کی طرف سے مکمل مغفرت اور جنت ہے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حج کا ذکر کیا ہے جو خود کو پورے طور پر اللہ کے حوالے کر کے کیا جائے۔ ہم محض یہ نہیں کہہ سکتے کہ اے اللہ ہم آپ کی پکار پر لبیک کہہ رہے ہیں اور ہم ماضی کے گناہوں پر شرمندہ ہیں لیکن یہ صرف حال تک کی بات ہے اور کل جب ہم واپس جائیں تو اپنی سابقہ روش اپنالیں۔ یہ اللہ کے سامنے جھکنا اور سر تسلیم خم کرنا تو نہیں ہوا۔ یہ اس بات کو ظاہر نہیں کرتا کہ ہمیں اپنے ماضی کے غلط افعال پر حقیقی پشیمانی ہے، بلکہ یہ اس امر کا غماز ہے کہ ابھی تک اللہ کی تعلیمات کا احترام ہم میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ ایسے شخص کو معاف کیسے کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایسا ہی معاملہ ہے جیسے کسی شخص نے گناہ کیا، اس پر توبہ کی اور اگلے ہی منٹ موقع ملنے پر وہی گناہ کرلیا۔ یہ توبہ کے عظیم تصور کے ساتھ کھیلنے کے مترادف ہے۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اگر کوئی شخص نہایت خلوص کے ساتھ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتے ہیں۔ اب اگر بشری کمزوری کی وجہ سے وہ دوبارہ گناہ کر بیٹھے تو اس کے حساب میں صرف وہی گناہ لکھا جائے گا (خود سری یا سرکشی کا جرم اس کے نامہ اعمال میں درج نہ ہوگا) کیوں کہ وہ اپنی توبہ کے وقت مخلص تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا واضح اظہار ہے کہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے بندے گناہ کر رہے ہیں لیکن جب وہ بندے عاجزی کے ساتھ اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں معاف کر دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جب کسی کا گناہ معاف کر دیں تو اس کے پچھلے گناہوں کو حساب میں برقرار نہیں

رکھا جاتا۔ ایک شخص ایک ہی گناہ کئی بار کرسکتا ہے لیکن اگر وہ ہر بار صدق دل سے توبہ کرے تو ہر بار اسے اللہ سے معافی مل جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ شخص مضبوط عزم کرے اور اپنی خواہشات کے آگے بند باندھنے کے قابل ہوجائے۔ جہاں تک آپ کے دوست کا تعلق ہے، ان کا رویہ کسی ایسے شخص کا رویہ ہے جو کھیل رہا ہو، یعنی یہ سوچنا کہ وہ ہر گناہ کرسکتا ہے اور پھر حج یا عمرہ کرکے پاک صاف ہوسکتا ہے۔ اس طرح اس کا رویہ اسلام کی تعلیمات سے بے پروائی اور بے توجہی کا ہے۔ یہ معاملہ بڑا مشکوک ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی عبادت کو قبول فرمائیں گے جس میں وہ پشیمانی کا اظہار کر رہا ہو لیکن درحقیقت وہ پشیمان نہیں ہے۔ یہ بات کہ وہ دوبارہ گناہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، ظاہر کرتی ہے کہ اس کا اظہار ندامت محض زبانی ہے۔ عمرہ اور حج انتہائی سنجیدہ عبادات ہیں۔ آپ اپنے دوست کو بتائیں کہ اس کے اس بے ضابطہ طرزِ عمل سے توقع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف کردیں گے۔ اسے اپنے حال پر غور کرنا چاہیے اور آئندہ جب وہ حج یا عمرہ کے لیے جائے تو اسے اپنے ماضی سے رشتہ توڑنے کا پختہ عزم کرنا چاہیے اور اپنی اس عبادت کو ایسی زندگی کا حقیقی آغاز بنانا چاہیے، جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے احکام کی پوری پوری تعمیل سے عبارت ہو۔

حج آخر عمر میں ادا کرنا چاہیے؟

سوال: میری عمر ۲۸ سال ہے اور ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ دو سال سے سعودی عرب میں کام کر رہا ہوں۔ اس سال جب میں نے اپنے چند دوستوں کے سامنے حج کا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے اس کے خلاف مشورہ دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جب ایک شخص نوجوانی میں حج کرتا ہے تو اس بات کی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ وہ اس کے بعد مستقبل میں کوئی گناہ اور غلطی نہیں کرے گا۔ ان کا مشورہ یہ تھا کہ حج ضعیف العمری میں کرنا چاہیے تاکہ زندگی بھر کے گناہ معاف ہوجائیں۔ براہ کرم اس بارے میں اپنا موقف واضح کیجیے۔

جواب: آپ کا حج کا ارادہ نہایت لائق تحسین ہے۔ آپ کے دوست قطعی طور پر غلط کہتے ہیں۔ حج ہر اس شخص پر فرض ہے جو اس کو ادا کرنے کی قوت رکھتا ہو اور اخراجات برداشت کرسکتا ہو۔ سعودی عرب میں رہتے ہوئے آپ کو اس بات کا بہتر موقع میسر ہے کہ آپ یہ فریضہ ادا کرلیں۔ یہاں آپ کے اخراجات بھی کم ہوں گے اور سفر اور وقت میں بھی بچت ہوگی۔ ان تمام سہولتوں کے پیش نظر جو آپ کو یہاں رہتے ہوئے حاصل ہیں، آپ پر حج فرض ہے۔ علماء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب حج فرض ہوجائے تو اسے جتنی جلد ادا کرلیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ بغیر کسی جواز کے حج کی ادائیگی

میں تاخیر مناسب نہیں ہے۔

اب ہم آپ کے دوستوں کی دلیل کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ یہ ضمانت نہیں دے سکتے کہ حج کی ادائیگی کے بعد آپ کوئی غلطی اور کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ ان کی بات یہاں تک درست ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا آپ حج پر نہ جانے کی صورت میں اس طرح کی ضمانت دے سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ لیکن جب آپ حج ادا کرلیں گے تو آپ کے تمام سابقہ گناہ معاف ہوجائیں گے اور اس صورت میں آپ کے اعمال میں صرف وہ گناہ شامل ہوں گے جو حج کے بعد سرزد ہوں۔ اس طرح یقیناً آپ پہلے کے مقابلے میں بہتر حیثیت میں ہوں گے۔ علاوہ ازیں جب آپ فریضہ حج ادا کرلیں گے تو آپ مسلمان پر عائد ایک بڑے فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہوجائیں گے۔ آپ کو اس کا اجر ملے گا۔ اگر آپ اس فرض کی ادائیگی میں تاخیر کرتے رہیں گے تو آپ کو کچھ نہیں علم کہ آپ زندگی میں اس فرض کو ادا کر بھی سکیں گے یا نہیں۔ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ آئندہ بھی آپ کو یہ موقع حاصل رہے گا جواب ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''فریضہ حج ادا کرو قبل اس کے کہ تم اسے ادا کرنے کے قابل نہ رہو'' آپ کے دوستوں کے سوال کا جواب واضح ہے۔

اگر آپ اس سال فریضہ حج ادا کرلیتے ہیں اور خدانخواستہ مستقبل میں آپ سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہوجاتا ہے، تو اس صورت میں آپ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے صدق دل سے معافی کے طلب گار ہوسکتے ہیں، عبادات کرسکتے ہیں اور یقیناً موقع ملے تو دوسرا حج کرسکتے ہیں۔ اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ اگر ممکن ہو تو ہر پانچ سال میں ایک بار حج ادا کیا جائے۔ ایک سے زیادہ بار حج کی ادائیگی سے آپ کو کوئی نہیں روک سکتا خواہ آپ سعودی عرب میں ہوں یا واپس اپنے وطن چلے جائیں۔ ایک مرتبہ حج ادا کرنے کے بعد اگر آپ سے کچھ غلطیاں اور گناہ سرزد ہوتے ہیں تو دوبارہ حج ادا کرنے پر وہ بھی معاف کردیئے جائیں گے علاوہ ازیں دوسرے حج کا بھی آپ کو ثواب ملے گا۔

اس کے برخلاف اگر آپ نے حج کی ادائیگی کا یہ موقع ضائع کردیا، تو آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ موقع آپ کو دوبارہ مل جائے گا۔ کیا آپ اس بات کی ضمانت دے سکتے ہیں کہ آئندہ حج کے موقع تک آپ زندہ رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔ تو پھر اس مقدس فریضہ کی ادائیگی میں تاخیر کیوں کی جائے۔

میں آپ کو ایک راز کی بات بتانا چاہتا ہوں اور یہ بات ایسی ہے جو ہر حاجی بخوبی جانتا ہے۔ حج، انسان کی زندگی کا ایک منفرد تجربہ ہوتا ہے! دنیا میں اس جیسا تجربہ کوئی دوسرا ممکن نہیں

ہے۔ جب آپ ایک مرتبہ اس تجربہ سے گزر جائیں گے تو آپ کی خواہش ہوگی کہ دوبارہ اس سے لطف اندوز ہوں۔ حج آپ کے ایمان کو تقویت بخشے گا اور آئندہ زندگی میں غلطیوں اور گناہوں کے خلاف ڈھال بن جائے گا۔ مختصراً یہ کہ حج کی ادائیگی کے بعد آپ ایک بہتر مسلمان بن جائیں گے۔ اپنے دوستوں کے مشورے پر کان نہ دھرے۔ اس سال حج ادا کیجیے۔ ممکن ہے کہ آپ اپنے دوستوں کو اس بات پر آمادہ کرلیں کہ وہ بھی آپ کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کرلیں اگر ایسا ہوگیا تو آپ کو اس کا بہتر سے بہتر اجر ملے گا۔

''حج اکبر'' کیا ہے؟

سوال: حج اکبر کیا ہے۔ کیا اس کی اہمیت عام حج کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اگر ہاں تو کیا مسلمان حکومتوں کو حج اکبر کے موقع پر حج ادا کرنے کے خواہش مند مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں نہیں دینی چاہئیں؟

جواب: عام طور پر لوگ ''حج اکبر'' کی اصطلاح اس موقع پر استعمال کرتے ہیں جب یوم الحج، یعنی وقوف عرفات، جمعہ کے دن ہو۔ عام تصور یہ ہے کہ اگر وقوف عرفات جمعہ کے دن واقع ہو تو اس حج کا ثواب، عام سال کے حج کے مقابلے میں سات گنا ہوتا ہے۔ یہ تصور محض ایک غلط فہمی ہے۔ میں ذیل میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں:

''حج اکبر'' کی اصطلاح قرآن مجید کی نویں سورۃ (سورۃ التوبہ) کی تیسری آیت میں استعمال کی گئی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ منافقین کو یہ واضح اعلان کردیا جائے کہ مسلم ریاست کے ساتھ ان کا معاہدہ ٹوٹ چکا ہے۔ یہ وہ موقع ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کرلیا تھا اور اسلامی شریعت نافذ کردی گئی تھی۔

بعض کافر قبائل اس کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی کوششوں میں مصروف تھے اور اس معاملے میں ان معاہدوں کا سہارا لے رہے تھے جو فتح مکہ سے قبل کیے گئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب تمام سابقہ معاہدوں کو کالعدم قرار دے کر ہر فریق کو یہ موقع فراہم کیا گیا کہ علاقہ کی نئی سیاسی صورتحال میں وہ اپنی حیثیت کا تعین کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر حکم دیا کہ جو قبائل سابقہ معاہدوں کا احترام اور ان پر عمل کرتے رہے ہیں، ان سے معاہدے کی شرائط کے مطابق معاملہ طے کیا جائے اور جو قبائل معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے رہے ہیں انہیں چار ماہ کا نوٹس دے دیا جائے کہ ان کے ساتھ معاہدے کالعدم قرار دے دیے گئے ہیں۔ چار ماہ کے اس نوٹس اور

معاہدوں کے بارے میں مسلمانوں کے فیصلے کا اعلان حج کے موقع پر کیا گیا تاکہ یہ اطلاع زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ اعلان میں اس دن کے لیے جو اصطلاح استعمال کی گئی اس کا ترجمہ یوں تھا کہ اس فیصلہ کا اعلان ''حج کے عظیم دن کیا گیا۔'' لہٰذا یہاں ''اکبر'' کا لفظ دن کے لیے استعمال ہوا ہے کہ اس روز حج ہے۔ ''اکبر'' کا لفظ حج کے لیے استعمال نہیں ہوا۔

علماء کے درمیان اس بات پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ ''حج کا عظیم دن'' کون سا ہے۔ بعض کی رائے ہے کہ ''وقوف عرفات'' کا دن عظیم دن ہے جبکہ دوسروں کی رائے ہے کہ عید الاضحیٰ کا دن ''حج کا عظیم دن'' ہے کیونکہ اس دن حجاج عرفات سے واپس آ کر رمی کرتے ہیں اور طواف افاضہ انجام دیتے ہیں۔

حج کا فریضہ اگر بالکل درست طریقے سے تمام احتیاط پیش نظر رکھ کر انجام دیا جائے تو اس فریضے کی تکمیل کے بعد انسان کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ اس میں یہ بات ملحوظ خاطر نہیں ہے کہ انہوں نے حج کس دن ادا کیا۔ جب ایک مسلمان حج کا ارادہ کرتا ہے تو اسے یہ علم نہیں ہوتا کہ حج یا وقوف عرفات کس دن ہوگا۔

عازمین حج کی اکثریت ذوالحجہ کے آغاز سے پہلے اپنا سفر شروع کر دیتی ہے۔ اس سفر کی تیاریوں کا سلسلہ کئی ہفتے پہلے شروع ہو جاتا ہے تاکہ پاسپورٹ، ویزا اور دیگر ضروریات سفر کی بروقت تکمیل ممکن ہو سکے۔ اس لیے عازم حج یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وقوف عرفات جمعہ کے دن ہوگا یا کسی اور دن۔ دوسری بات یہ ہے کہ حجاج کے ایک گروپ کو دوسروں کے مقابلے میں سات گنا زیادہ ثواب، ان کے کسی اضافی عمل کے بغیر دینا، اللہ تعالیٰ کی عدل و انصاف کی سنت کے مطابق نہیں ہے۔ تیسری بات یہ کہ اس بارے میں ہمیں کوئی حدیث بھی نہیں ملتی، سوائے اس کے کہ اگر حج صحیح طریقے سے کیا گیا ہے، خواہ وقوف عرفات کسی زمانے میں اور ہفتہ کے کسی بھی دن ہو، اس کے بعد انسان کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

اس تمام بحث کے پیش نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان حکومتوں کو کسی خاص موقع پر حج کے لیے خصوصی انتظامات کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ ہر مسلمان حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دے اور یہ اہتمام کرے کہ وہ کم سے کم اخراجات اور زیادہ سے زیادہ سہولت کے ساتھ سفر حج کر سکیں۔ سعودی عرب کی حکومت اس سلسلہ میں بھرپور کوششوں میں مصروف رہتی ہے کہ یہاں فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے آنے والے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ آرام اور آسائش فراہم کی جائے تاکہ وہ اطمینان اور سہولت کے ساتھ اپنا دینی فریضہ انجام دے سکیں۔

حج اور خواتین کے مسائل

سوال: میں نے گزشتہ سال ''قِران'' کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے حج ادا کیا۔ ابتدائی عمرے کے فوراً بعد مخصوص ایام شروع ہوگئے لیکن میں نے اسی حالت میں حج جاری رکھا صرف بعد کے طواف ادا نہیں کیے یعنی صحت کی خرابی کی وجہ سے طواف افاضہ، طواف وداع اور دوسری بار سعی کی ادائیگی نہیں ہوسکی۔ ایسی صورتحال میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟

الف: کیا میں ''طواف افاضہ'' ادا کرنے کے بعد سعی کر سکتی تھی؟

ب: کیا اسی احرام کے ساتھ عمرہ کیا جا سکتا ہے؟

ج: کیا عمرے کے بعد طواف وداع بھی ادا کرنا میرے لیے ضروری تھا؟

د: ارکان کی جو ترتیب اوپر بیان کی ہے کیا وہ درست ہے، اگر نہیں تو درست ترتیب کیا ہونی چاہیے؟

جواب: آپ نے اپنے سوال میں تو واضح طور پر یہ کہا ہے کہ آپ نے قران کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے حج ادا کیا لیکن بعد میں جو کچھ بیان کیا وہ بالکل مختلف طریقہ ہے۔ ''قِران'' حج کی ادائیگی کا وہ طریقہ ہے جس میں حج اور عمرہ ایک ہی عمل میں ادا کیے جاتے ہیں۔ جو عازم حج یہ طریقہ اختیار کرتا ہے اسے تقریباً ایسا ہی عمل کرنا ہوتا ہے جو ''افراد'' کے طریقہ میں کیا جاتا ہے، یعنی عمرے کی ادائیگی کے بغیر صرف حج ادا کرنا۔ فرق صرف یہ ہے کہ قران کے طریقے کے مطابق حج کرنے والے کے لیے ایک بھیڑ کی قربانی فرض ہے جبکہ افراد کے طریقے سے حج کرنے والے کے لیے قربانی ایک نفل عبادت ہے۔ قران کے طریقہ سے حج ادا کرنے والے کو عمرہ اور حج دونوں کا ثواب ملے گا۔

قران کے طریقۂ حج میں عازم حج کو مکہ مکرمہ پہنچتے ہی پہلا طواف کرنا ہوتا ہے اس کے بعد سعی کی جاتی ہے۔ لیکن حاجی کو سعی کے بعد نہ تو اپنے بال ترشوانے پڑتے ہیں اور نہ ہی احرام کھولنا ہوتا ہے۔ احرام باندھے ہوئے اسے دس ذی الحجہ تک تمام ارکان ادا کرنے ہوتے ہیں، جن میں شیطان کو کنکریاں مارنا اور بال ترشوانا شامل ہیں۔

آپ نے اپنے سوال میں ابتدائی عمرے کا ذکر کیا ہے۔ اگر آپ نے یہ عمرہ ادا کیا اور احرام کھول دیا تو آپ کے حج کا طریقہ ''قران'' نہیں ہے، یہ طریقہ ''تمتع'' کہلاتا ہے۔ اس طریقے میں حج کا آغاز ایک مکمل عمرے کی ادائیگی سے ہوتا ہے جس کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے۔ ۸ ذی

الحجہ کو دوبارہ احرام باندھا جاتا ہے اور حج کے ارکان ادا کیے جاتے ہیں۔ آپ نے جو کیفیت بیان کی ہے اس کے مطابق آپ کو طواف افاضہ کے بعد دوسری سعی کرنا چاہیے تھی اور فرض کے طور پر جانور کی قربانی بھی کرنا تھی۔ مذکورہ صورتحال میں جس قدر جلد ممکن ہو طواف افاضہ ادا کر لینا چاہیے کیونکہ یہ فرض رکن ہے جسے کسی صورت نہ تو نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کا کوئی متبادل ممکن ہے۔ اس وقت تک جب تک طواف نہ کرلیا جائے، احرام کی حالت میں رہنا ہوگا۔ اگر حج کے دوسرے ارکان ادا کر لیے گئے تو مذکورہ طواف کی ادائیگی سے قبل مباشرت نہیں کی جاسکتی۔

میں نے یہ تفصیل، طریقے کے اختلاف کی وجہ سے بیان کی ہے بصورت دیگر اگر قران کے طریقے سے حج کیا جارہا ہو تو اس میں دوسری سعی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن تمتع کے طریقے میں جو آپ نے اختیار کیا ہے، طواف افاضہ کے بعد دوسری سعی کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ایک اور عمرہ اسی احرام کے ساتھ ادا نہیں کیا جاسکتا جبکہ آپ دو عمرے اور حج ایک ہی عمل میں ادا کر چکی ہیں۔ علیحدہ سے اضافی عمرے کی ادائیگی کے لیے از سر نو اہتمام کرنا ہوگا۔ مذکورہ طواف کے بعد اگر عازم حج اپنے گھر نہیں جانا چاہتا تو اسے تنعیم یا الجیراناہ کے قریبی فاصلے تک جانا ہوگا تاکہ وہاں سے احرام باندھ کر عمرہ کی ادائیگی کے لیے دوبارہ حرم میں داخل ہوا جاسکے۔ مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران طواف وداع سب سے آخری عمل ہوتا ہے۔ میں نے عمرے کا جو طریقہ بیان کیا ہے، اس میں عمرے کی ادائیگی کے بعد، گھر روانگی سے پہلے طواف وداع کیا جاسکتا ہے۔

خواتین کا محرم کے بغیر حج کرنا

سوال: دو سال قبل میں نے اپنی زوجہ کو حج کے لیے بلایا۔ گزشتہ پانچ سال کے دوران میں نے حج ادا نہیں کیا تھا اس کے باوجود مجھے اس سال حج کی اجازت نہیں ملی لہٰذا میں نے اپنی زوجہ کو ان کی بہن اور بہنوئی کے ساتھ مکہ میں چھوڑا۔ یہ لوگ بھی حج کی ادائیگی کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ۷ یا ۸ ذی الحجہ کو اپنی زوجہ سے آن ملوں گا لیکن کوشش کے باوجود ان دنوں میں مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہوسکا۔ ازراہ کرم بتایئے کہ کیا میری زوجہ کا حج ادا ہوگیا؟

جواب: ایک عورت کے لیے یہ لازمی ہے کہ جب وہ طویل سفر کرے تو یا تو اس کا شوہر اس کے ہمراہ ہو یا کوئی محرم ساتھ ہو۔ یہ شرط حج اور عمرہ کے لیے بھی ہے۔ اگر عورت، حج کی ادائیگی کے لیے دیگر تمام شرائط پر پوری اترتی ہو لیکن سفر کے لیے محرم میسر نہ ہو تو اسے حج کے لیے اہل تصور نہیں کیا جائے گا۔ بعض مکاتب فکر میں اس شرط کو قدرے نرم کر دیا گیا ہے اور ان کے نزدیک کوئی

عورت عازمین حج کے ایسے گروپ کے ساتھ سفر کرسکتی ہے جو سفر کے دوران اس کا اسی طرح خیال رکھیں اور حفاظت کریں جس طرح ایک محرم کرسکتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو آپ کی زوجہ کا اپنی ہمشیرہ، اپنے بہنوئی اور ان کے گروپ کے دیگر عازمین حج کے ساتھ سفر کرنا درست ہے اور ان کا حج درست طریقے سے ادا ہوا ہے۔

اس معاملے میں یہ بات بھی واضح ہے کہ آپ اپنی زوجہ کا ساتھ دینا چاہتے تھے لیکن ناگزیر حالات کی وجہ سے جو یقیناً آپ کے اختیار سے باہر تھے، آپ ایسا نہ کرسکے۔ بہرحال آپ نے یہ اہتمام کیا تھا کہ وہ مخصوص گروپ کے ساتھ رہیں اور اگر آپ نہ بھی ہوں تو انہیں پریشانی نہ ہو۔

اگر وہ کسی شناسا گروپ میں نہ بھی ہوتیں لیکن خواتین کے ایک ایسے گروپ کے ساتھ ہوتیں جس میں ان کا سفر محفوظ ہوتا اور ان کا خیال رکھا جاتا تب بھی ان کے ساتھ سفر کرنا اور حج کرنا درست ہوتا۔

خاتون کے لیے بغیر محرم حج یا عمرہ کی ادائیگی

سوال: ایک پچاس سالہ بیوہ خاتون عمرہ ادا کرنا چاہتی ہیں لیکن ان کے قریبی اعزا (محرم) میں سے کوئی ان کے ساتھ سفر کے لیے دستیاب نہیں ہے۔ ان خاتون کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت واضح طور پر فرمایا ہے کہ ایک مسلمان خاتون کو پورے دن کی مسافت (یا اس سے زیادہ مسافت) اپنے شوہر یا کسی ایسے قریبی عزیز کی ہمراہی کے بغیر نہیں کرنا چاہیے جس سے اس کی شادی نہ ہوسکتی ہو یعنی والد، بیٹا، بھائی، بھتیجا، بھانجا وغیرہ۔ عمرہ یا حج کے لیے محرم کا ساتھ ضروری ہے۔ اگر کوئی خاتون محرم کے بغیر عمرہ یا حج ادا کرتی ہے تو وہ حج کے لیے ضروری ایک شرط کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوتی ہے لیکن اس کا عمرہ یا حج ادا ہوجائے گا۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں، بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ اگر ایک خاتون کو حج یا عمرہ کے سفر کے لیے محرم دستیاب نہ ہو تو وہ ''بااعتبار ہم سفر'' کے ساتھ سفر کرسکتی ہے۔ یہ اصطلاح نہایت اہم ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ متعلقہ خاتون کے ہمراہی ہر لحاظ سے قابل اعتماد ہونے چاہئیں۔ لہٰذا ایسی خاتون دوسری خواتین کے گروپ کے ساتھ سفر کرسکتی ہے جن میں کم سے کم ایک خاتون ایسی ہو جو سفر کے طریقے اور بندرگاہ یا ہوائی اڈہ کے مسائل سے واقف ہو، گروپ کی کم تجربہ رکھنے والی یا بالکل ناتجربہ کار خواتین کی رہنمائی اور دیکھ بھال کرسکے۔ دوسرے درجہ پر ''بااعتماد ہم سفر'' ایسا گروپ ہوسکتا ہے جو دو تین خاندانوں پر مشتمل ہو اور اس خاتون اور اس

کے خاندان سے بخوبی واقف ہو۔ علماء کی رائے میں ایسے ہم سفروں کے ساتھ ایک ایسی تنہا خاتون حج یا عمرہ کرسکتی ہے، جس کو محرم دستیاب نہ ہو۔

حج کے لیے خواتین کا تنہا سفر

سوال: کیا ایک مسلمان خاتون بغیر محرم کے حج کے لیے، یا دوسرے ملک میں ملازمت کرنے والے شوہر سے ملنے کے لیے تنہا سفر کرسکتی ہے؟

جواب: اسلام مسلمان خاتون کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی بھی ایسے فاصلے کے لیے جس کا سفر ایک رات سے زائد ہو، محرم کے بغیر، تنہا سفر کرے۔ شوہر، باپ، بھائی، بیٹے، بھانجے، بھتیجے وغیرہ محرم میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ پابندی اس وجہ سے ہے کہ خواتین کا سفر محفوظ ہو اور راستے میں ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کوئی قریبی شخص موجود ہو، جس سے پردہ ضروری نہ ہو۔ موجودہ زمانے میں سفر کے تیز رفتار وسائل کی موجودگی میں یہ ممکن ہے کہ ایک خاتون کو ایئرپورٹ تک کوئی قریبی عزیز چھوڑ دے اور طیارے میں پرواز کے بعد جب خاتون اپنی منزل پر پہنچیں تو وہاں شوہر یا کوئی دوسرا عزیز انہیں لینے کے لیے موجود ہو۔ میرے خیال میں اس قسم کے سفر میں خاتون تنہا سفر کرسکتی ہیں۔

حج اور عمرے کے لیے کسی خاتون کے بغیر محرم کے سفر کرنے کے بارے میں بیشتر علماء کی رائے یہ ہے کہ اگر خاتون ''محفوظ رفاقت'' میں ہوں تو وہ حج یا عمرے کے لیے سفر کرسکتی ہیں۔ ''محفوظ رفاقت'' کا مطلب دیگر خواتین کی کسی جماعت یا اپنے عزیزوں کے ساتھ سفر کرنا ہے۔

والدین کے لیے حج بدل کی ادائیگی

سوال: میں نے ۶ برس قبل فریضہ حج ادا کیا تھا۔ اس سال میں دوبارہ حج کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے والدین حیات ہیں۔ کیا میں ان کی جانب سے حج بدل کرسکتا ہوں۔ اس صورت میں مجھے پہلے کس کی جانب سے حج ادا کرنا چاہیے۔ کیا اس صورت میں مجھے قربانی کرنی ہوگی۔ قربانی کی صورت میں کیا میں گائے یا اونٹ میں حصہ لے سکتا ہوں؟

جواب: آپ یقیناً اپنے والدین میں سے کسی ایک کی جانب سے حج ادا کرسکتے ہیں، کیونکہ آپ اپنی جانب سے یہ فریضہ چھ برس قبل ادا کرچکے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب حج پر تشریف لے گئے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک شخص کو تلبیہ پڑھتے سنا۔ تلبیہ بندے کی طرف سے یہ اعلان

ہے کہ اے اللہ! میں تیرے حکم کی تعمیل میں حج کے لیے حاضر ہوں۔لیکن وہ شخص تلبیہ کے کلمہ کے آخر میں یہ اضافہ کر رہا تھا کہ وہ ایسا (حج) شبریمہ کی جانب سے کر رہا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ شبریمہ کون ہے۔اس شخص نے جواب دیا کہ یہ میرا بھائی ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تم حج ادا کر چکے ہو۔اس شخص نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا۔آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ پہلے تم خود حج کرو، اس کے بعد شبریمہ کی جانب سے حج ادا کر سکتے ہو۔اس واقعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج بدل کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ حج بدل کرنے والا پہلے خود حج کر چکا ہو۔

آپ اپنی والدہ اور والد، دونوں کی جانب سے بیک وقت حج ادا نہیں کر سکتے۔ایک وقت میں کسی ایک ہی شخص کی جانب سے حج کیا جا سکتا ہے۔یہ بات اہم نہیں ہے کہ پہلے آپ کس کی جانب سے حج ادا کریں۔بعض علماء کا خیال ہے کہ پہلے والدہ کی جانب سے حج بدل کرنا چاہیے اور بعض کی رائے یہ ہے کہ پہلے والد کی طرف سے حج کیا جانا چاہیے۔بہرحال آپ پہلے جس کی جانب سے حج بدل کریں وہ درست ہوگا۔

اگر آپ تمتع یا قران کے طریقے سے حج کریں گے تو یقیناً آپ کو قربانی بھی کرنا ہوگی۔والدین کی جانب سے حج کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے۔آپ گائے یا اونٹ کی قربانی میں شریک ہو سکتے ہیں۔

حج بدل ایک سہولت ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فراہم کی ہے، جو لوگ حج کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں، لیکن بیماری یا کسی اور جائز مجبوری کی وجہ سے حج کا سفر نہیں کر سکتے، انہیں یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنی جانب سے کسی دوسرے شخص کو حج پر بھیج دیں۔اس صورت میں انہیں حج بدل پر جانے والے شخص کے سفر کے تمام اخراجات ادا کرنا ہوتے ہیں۔جو حضرات ملازمت کے سلسلہ میں سعودی عرب میں مقیم ہیں انہیں یہ موقع میسر ہے کہ وہ اپنے والدین اور دیگر عزیزوں کی جانب سے فریضہ حج ادا کر سکیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو حضرات ایسا کرتے ہیں وہ اپنے والدین اور دیگر بزرگوں کے لیے نہایت خلوص اور فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہیں، تاہم انہیں یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ حج ایک شخصی عبادت ہے اور جو شخص سفر کرنے کی قوت رکھتا ہو، اسے خود یہ فرض ادا کرنا چاہیے۔

لہٰذا اگر آپ کے والد حج کے سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تو انہیں حج کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ وہ حج کی ادائیگی کی اہلیت نہیں رکھتے۔اگر آپ ان کے سفر کے اخراجات ادا کرنا چاہتے ہیں تو یہ بہت اچھا ہوگا۔اس صورت میں آپ کو چاہیے کہ آپ انہیں

ٹکٹ فراہم کریں تاکہ وہ خود آکر حج ادا کرسکیں۔ یقیناً آپ کو اس نیکی کا بڑا اجر ملے گا۔ آپ ان کی جانب سے حج ادا کرنے کا ارادہ اسی وقت کریں جب آپ کے لیے یہ ممکن نہ ہو کہ آپ والد کو سفر کے اخراجات فراہم کرسکیں۔

حج بدل کب ادا کرنا چاہیے؟

سوال: کیا میں ایسے افراد کی جانب سے عمرہ ادا کرسکتا ہوں جو بقید حیات ہیں لیکن مالی وسائل کی قلت یا خرابی صحت کی بناء پر خود عمرہ ادا کرنے کی استعداد نہیں رکھتے؟

جواب: آپ کا یہ سوال عمرے کی ادائیگی کے لیے اہلیت کی شرط سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ جس شخص کے پاس حج یا عمرے ادا کرنے کے لیے ضروری مالی وسائل دستیاب نہ ہوں، عمرہ یا حج اس پر واجب نہیں ہوتا۔ تاہم اگر ان واجبات کی ادائیگی میں خرابی صحت مانع ہے تو یہ ایک مختلف صورت ہوجاتی ہے۔ ایک صحابیہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ان کے والد خرابی صحت کی وجہ سے اونٹ پر بیٹھ کر سفر نہیں کرسکتے، اس صورت میں کیا وہ اپنے والد کی طرف سے حج ادا کرسکتی ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا۔

اگر کوئی شخص فریضۂ حج ادا کیے بغیر انتقال کرجائے تو اس کی اولاد میں سے کوئی ایک یا کوئی دوسرا رشتے دار، مرحوم کی جانب سے حج ادا کرسکتا ہے۔ اگر مرنے والا اپنی زندگی میں حج ادا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا اور اس صورت میں اس پر حج واجب نہیں تھا، تب بھی اس کے انتقال کے بعد اس کی جانب سے حج کی ادائیگی ایک مستحسن عمل ہے۔ کیونکہ اس طرح مرحوم کو حج کا ثواب مل جائے گا اور اس کے گناہ معاف ہوجائیں گے۔ یہ عمل لائق ستائش ہے لیکن ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ حج اور عمرہ ایسے فرائض ہیں جو ذاتی طور پر انجام دینے ہوتے ہیں۔ اپنے والدین کی طرف سے حج بدل یا عمرۂ بدل کی ادائیگی اولاد کی فرمانبرداری کا ثبوت ہے لیکن یہ طرز عمل مناسب نہیں کہ کوئی شخص اپنے طور پر ''عمرہ فنڈ'' قائم کرلے اور اسے اپنے عزیزوں اور دوستوں میں فراخ دلی سے تقسیم کرنا شروع کردے۔ اس رویے سے ان عزیزوں اور دوستوں کے دل میں یہ احساس پیدا ہونے کا اندیشہ ہے کہ چونکہ ان کی جانب سے حج یا عمرہ ادا کردیا گیا ہے اس لیے اب انہیں اس مقصد کے لیے سفر کرنے اور بذات خود حاضر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

متعدد لوگوں کی طرف سے حج رعمرہ کی ادائیگی

سوال: ایک شخص جب اپنی جانب سے عمرہ یا حج ادا کر رہا ہوتا ہے تو کیا وہ اسی وقت ایسے متعدد لوگوں کی جانب سے بھی یہ فریضہ ادا کرسکتا ہے جن کا انتقال ہو چکا ہو؟

جواب: حج بدل یا عمرہ بدل کے لیے پہلی شرط تو یہ ہے کہ جو شخص کسی اور کی جانب سے حج یا عمرہ ادا کر رہا ہو وہ پہلے اپنی جانب سے حج اور عمرہ ادا کر چکا ہو۔ حج بدل یا عمرہ بدل ایک وقت میں صرف ایک شخص کی جانب سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ ایک حج یا ایک عمرہ ایک سے زائد افراد کی جانب سے ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔ فرض کیجیے کوئی شخص اپنے والدین کی جانب سے حج بدل ادا کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کام کے لیے دو مرتبہ حج پر آنا ہوگا۔ ایک مرتبہ وہ اپنے والد کی طرف سے حج کرے گا اور دوسری مرتبہ اپنی والدہ کی جانب سے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ جس وقت وہ اپنے والد کی جانب سے حج بدل ادا کر رہا ہو تو اس وقت اپنے کسی دوست سے کہے یا کسی اور آدمی کی خدمات حاصل کرلے کہ وہ اس کی والدہ کی جانب سے حج ادا کرے۔

یہی صورت عمرے کی ہے۔ اگر ایک شخص مکہ مکرمہ آتا ہے اور عمرہ ادا کرتا ہے اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ کسی اور کی جانب سے بھی عمرے کی ادائیگی کرے تو اسے حدود حرم سے باہر جانا ہوگا۔ قریب ترین جگہ، جہاں لوگ عام طور پر اس مقصد سے جاتے ہیں وہ "تنعیم" ہے۔ کوئی شخص چاہے تو جدہ روڈ پر حدود حرم سے باہر جاسکتا ہے یا حدود حرم سے باہر کسی اور مقام تک جس میں اسے سہولت رہے، جاسکتا ہے۔ حدود حرم سے باہر جاکر دوبارہ احرام باندھنا ہوگا اور عمرہ کے مناسک ادا کرنے ہوں گے۔ اگر وہ شخص کسی تیسرے فرد کی جانب سے عمرہ ادا کرنا چاہتا ہے تو اسے یہی تمام عمل تیسری بار کرنا ہوگا۔

عمرہ اور حج بدل

سوال: موسم حج میں میں نے اپنی جانب سے عمرہ ادا کیا اور اس کے بعد افراد کے طریقے سے اپنے بھائی کی جانب سے حج بدل کیا۔ بیماری کی وجہ سے بھائی خود آنے سے قاصر تھے۔ حج کے بعد میں نے قربانی نہیں دی، کیا میرا یہ طریقہ درست تھا یا قربانی کے سلسلہ میں مجھ سے غلطی سرزد ہوئی۔ ازراہ کرم روشنی ڈالیے۔

جواب: آپ نے دو عبادات ادا کیں اور چونکہ یہ دونوں دو علیحدہ افراد کی جانب سے تھیں اس لیے ان کی نوعیت مختلف رہی۔ اگر آپ حج اور عمرہ اپنی جانب سے کر رہے ہوتے تو آپ تمتع کے طریقے

سے حج کرتے، باوجود اس کے کہ آپ نے نیت حج افراد کی کی ہوتی۔ آپ نے بھائی کی جانب سے جو حج بدل ادا کیا ہے، وہ ان کی جانب سے اسی وقت ادا ہوگا، جب آپ اس سے پہلے اپنی جانب سے حج ادا کر چکے ہوں۔ اگر آپ نے حج ادا نہیں کیا اور یہ آپ کا پہلا حج تھا تو یہ آپ کے بھائی کی جانب سے نہیں ہوگا بلکہ آپ کی جانب سے ہوگا۔ اس صورت میں آپ کو قربانی کرنا ہوگی۔ کیونکہ حج اور عمرہ دونوں عبادات آپ نے خود اپنے لیے ادا کیں۔ اگر آپ پہلے حج کر چکے ہیں تو یہ حج جو آپ نے اس وقت ادا کیا ہے، وہ آپ کے بھائی کی جانب سے ادا ہو جائے گا اور اس سلسلہ میں آپ کو قربانی نہیں کرنا ہوگی۔

دوسرے کی جانب سے عمرہ کرنا اور تمتع سے حج

سوال: میں تمتع کے طریقے سے حج کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے عزیزوں کی جانب سے عمرہ کرنا ہے۔ ازراہ کرم بتایے کہ مجھے کیا طریقہ اختیار کرنا ہوگا؟

۲۔ کیا مسجد نمرہ، عرفات میں شامل ہے؟

۳۔ ریاض سے بذریعہ کار آنے والے کے لیے میقات کا مقام کون سا ہوگا؟

جواب: تمتع کے طریقے سے حج کرتے وقت آپ میقات کے مقام پر احرام باندھیں گے اور عمرہ ادا کریں گے۔ طواف اور سعی کے بعد آپ اپنے بال کٹوائیں گے اور احرام کھول دیں گے۔ عام حالات میں آپ کو ۸ ذی الحجہ تک انتظار کرنا ہوگا، اور ۸ ذی الحجہ کو حج کی ادائیگی کے لیے دوبارہ احرام باندھنا ہوگا لیکن چونکہ آپ کو اپنے ایسے عزیزوں کی جانب سے عمرہ کرنا ہے جو علالت کی وجہ سے نہیں آسکتے یا وفات پا چکے ہیں، اس لیے آپ کو اپنا عمرہ مکمل کرنے کے بعد قریب ترین میقات، تک، جو تنعیم ہے، جا کر دوبارہ احرام باندھنا ہوگا اور پھر اپنے عزیز کی جانب سے عمرہ کرنا ہوگا۔

۲۔ مسجد نمرہ، عرفات کی حدود میں سے ایک ہے۔ مسجد کا آگے کا اور بڑا حصہ حدود عرفات میں شامل ہے جب کہ پچھلا حصہ عرفات میں نہیں ہے۔ اس لیے اگر کسی شخص نے ۹ ذی الحجہ کو مسجد نمرہ کے اس حصے میں قیام کیا ہے جو حدود عرفات میں نہیں ہے تو اس کا حج نہیں ہوگا۔

۳۔ ریاض سے بذریعہ کار آنے والوں کے لیے میقات قرن المنازل ہے۔ یہ طائف سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ اگر آپ بذریعہ طیارہ سفر کر رہے ہوں تو آپ کو ریاض سے احرام باندھ کر طیارے میں سوار ہونا چاہیے۔

والدین کو حج کے وسائل مہیا کرنا

سوال: ایک بار آپ نے کسی قاری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ بیوی کے حج کی ادائیگی کے سلسلہ میں شوہر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ کیا یہی بات والد کے معاملے پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ اس نے اپنے والد کو سفر حج کے اخراجات کے لیے رقم بھیجی ہے۔ کیا اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی؟

جواب: یہ بات پہلے بھی متعدد بار دہرائی جاچکی ہے کہ حج، ایک انفرادی عبادت ہے۔ اگر ایک شخص حج کی ادائیگی کے لیے ضروری شرائط پوری کرسکتا ہے تو اس پر حج فرض ہے اور اگر کوئی شخص ان شرائط کو پورا نہیں کرسکتا تو اس پر حج فرض نہیں ہے۔ اسلامی عبادت میں ایک شخص کے فرائض کی ادائیگی کا ذمہ دار دوسرے شخص کو نہیں بنایا گیا ہے۔ ہر شخص کو اپنا فرض خود ادا کرنا ہے۔ اور اگر کسی شخص کے حالات ایسے ہیں کہ وہ متعلقہ فرض ادا نہیں کرسکتا تو اس سے روز قیامت اس سلسلے میں جواب طلبی نہیں کی جائے گی۔

باپ اور بیٹے کے معاملے میں بھی یہی صورت ہے کہ اگر والد حج کے لیے ضروری شرائط پوری نہیں کرسکتے تو ان پر حج فرض نہیں ہوتا اور اگر بغیر حج ادا کیے ان کا انتقال ہوجاتا ہے تو ان سے اس بارے میں باز پرس نہیں ہوگی۔ لیکن بیٹے کا اس لائق ہونا کہ وہ اپنے والد کو سفر حج کے اخراجات فراہم کرے، بیٹے کی فرمانبرداری اور سعادت مندی کا ثبوت ہے۔ یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ باپ کے مذہبی فرائض، بیٹے کی ذمہ داری نہیں ہیں لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا واقعتا ایسا ہی ہے۔

ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا مجھے اپنے مرحوم والد کی جانب سے حج ادا کرنا چاہیے، کیونکہ وہ اپنی زندگی میں یہ فرض ادا نہیں کرسکے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تمہارے والد اپنے پیچھے کچھ قرض چھوڑ گئے تھے جو تمہیں ادا کرنے ہیں۔ صحابیؓ نے اس بات کا جواب اثبات میں دیا۔ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کا جو قرض باقی ہے اس کی ادائیگی بہتر ہے۔ اس حدیث مبارکہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ باپ کے قرضوں کی ادائیگی بیٹے پر واجب ہے۔ خواہ یہ قرضے دنیاوی اور مالی ہوں یا مذہبی عبادات کے سلسلے میں ہوں۔

مندرجہ بالا بیان کے مطابق اگر والد کی وفات کے بعد اس کے واجبات کی ادائیگی بیٹے کی ذمہ داری ہے تو والد کی زندگی میں ہی انہیں اپنے وسائل مہیا کرنا کہیں زیادہ بہتر ہے کہ وہ اپنے

مذہبی فرائض سے عہدہ برآ ہو جائیں۔ اولاد کا یہ فعل نہ صرف باپ کے لیے باعث مسرت واطمینان ہوگا بلکہ خود بیٹے کے لیے بھی باعث سعادت ہوگا اور اجر خیر کا موجب بنے گا۔ حرم کعبہ، یوم عرفات اور دیگر مقدس مقامات پر باپ کی جانب سے اپنی اولاد اور خاص طور پر اس بیٹے کے لیے جو اس فریضہ کی ادائیگی کا ذریعہ بنا، جو دعائیں مانگی جائیں گی، یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں قبولیت بخشیں گے۔

والدین کو حج پر بلانے اور بیٹی کی شادی کے بعد حج کرنے کا مسئلہ

سوال: میں نے اپنے والد کو دعوت دی کہ وہ عمرے اور حج کی ادائیگی کے لیے آئیں۔ ان کی عمر ۷۰ سال ہے، صحت اچھی نہیں ہے دل کا عارضہ بھی ہے۔ والد نے لکھا کہ جب تک تمہاری چھوٹی بہن کی شادی نہیں ہو جاتی میں حج نہیں کروں گا۔ میرے والد کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے گھر کے تمام اخراجات میرے ذمے ہیں اور ان کے حج کے اخراجات بھی میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان حالات میں میں اپنے والد اور والدہ کی جانب سے حج اور عمرہ ادا کر سکتا ہوں؟

سوال ۲: میری ایک بہن ہے جس کی عمر شادی کے قابل ہے، میں اپنی والدہ اور بڑے بھائی کو حج کے لیے بلانا چاہتا ہوں۔ میرے بزرگوں کا کہنا ہے کہ جب تک بہن کی شادی نہیں ہو جاتی، والدہ کو حج پر نہیں جانا چاہیے۔ والدہ کے حج کے اخراجات کے لیے مجھے اپنے ادارے سے پیشگی تنخواہ لینی ہوگی۔ ازراہ کرم بتایئے کہ ان حالات میں والدہ کو حج کے لیے بلانا درست ہے؟

جواب: ان دونوں قارئین کے پیش نظر ایک نہایت ارفع مقصد ہے کہ وہ اپنے والدین کو حج پر بلانا چاہتے ہیں تاکہ اس فرض کی ادائیگی کے بعد، وہ (والدین) اپنے سابقہ گناہوں کی معافی کا موقع حاصل کر سکیں۔ ان دونوں معاملوں میں کئی پہلو ایسے ہیں جن پر غور کرنا چاہیے۔

پہلا مسئلہ اہلیت کا ہے۔ دونوں معاملوں میں والدین حج کے اخراجات خود برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے لہٰذا وہ فریضۂ حج ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ حج صرف ان پر فرض ہے جو اس کی ادائیگی کی اہلیت رکھتے ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کی اہلیت کی وضاحت جس طرح کی ہے اس کے مطابق عازم حج کے پاس کھانے اور سفر کے لیے ذاتی طور پر معقول رقم ہونی چاہیے۔ اگر کوئی دوسرا اس رقم کو بطور تحفہ پیش کرے تو اسے یہ پیشکش قبول کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم اگر وہ قبول کرتا ہے اور حج ادا کرتا ہے تو اس کا حج ادا ہو جائے گا۔ چونکہ ان دونوں معاملوں میں حج کے اخراجات کی پیشکش بیٹے کی جانب سے ہے اس لیے یہ ایک استثنائی

صورت ہے۔ شافعی فقہ اور بعض دوسرے مکاتب فکر کے مطابق اگر ایک شخص کا بیٹا یا بیٹی اس کے حج کے اخراجات ادا کر سکتے ہیں تو مذکورہ شخص حج کا اہل تصور کیا جائے گا۔ دوسرے سوال میں جہاں بھائی کو حج کی دعوت دی گئی ہے تو یہ بھائی پر منحصر ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرے یا نہ کرے۔

اگر ایک شخص کے والد خرابی صحت کی بناء پر حج کے سفر کے قابل نہ ہوں تو ان کے لیے حج کی ادائیگی ضروری نہیں ہے کیونکہ اہلیت میں سفر کی دشواری برداشت کرنے کی صلاحیت بھی شامل ہے۔ اس صورت میں ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے کہ وہ فضائی سفر کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر ڈاکٹر انہیں سفر سے منع کرے تو اس صورت میں بیٹا، والد کی جانب سے حج اور عمرہ ادا کر سکتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب لگتی ہے کہ اگر ایک شخص بیماری کی وجہ سے حج ادا نہ کر سکے اور کوئی دوسرا اس کی جانب سے حج بدل ادا کرے، لیکن بعد میں وہ شخص صحت یاب ہو جائے اور حج ادا کرنے کی قوت رکھتا ہو تو اسے لازماً خود حج ادا کرنا چاہیے۔

والدہ کے حج کے اخراجات کی ادائیگی کے لیے پیشگی تنخواہ لینا میری رائے میں درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ ہدایت نہیں کی ہے کہ حج ادا کرنے کے لیے دوسروں سے رقم لی جائے۔ دونوں قارئین کے معاملوں میں، انہیں اپنی والدہ کی جانب سے حج بدل ادا نہیں کرنا چاہیے سوائے والد کی طرف سے حج بدل کے، کیونکہ وہ صحت کی خرابی کی وجہ سے خود اس کی اہلیت نہیں رکھتے لیکن چونکہ دونوں کی والدہ، اللہ کے فضل سے صحت مند ہیں اور صرف رقم کی کمی کی وجہ سے حج کی ادائیگی نہیں کر سکتیں اس لیے انہیں اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے جب خاصی رقم جمع ہو جائے۔

دونوں سوالوں میں، بہن کی شادی اور حج کی ادائیگی کے معاملے میں الجھاؤ پایا جاتا ہے، والدین اور خاندان کے بزرگ یہ سمجھتے ہیں کہ لڑکی کی شادی تک حج کو موخر کرنا چاہیے۔

میں یہ عرض کروں گا کہ یہ رویہ اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔ غالباً یہ محض تہذیبی اور سماجی اثرات کی وجہ سے ہے۔ ان سماجی روایات کا دباؤ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ایک شخص کے دینی فریضہ کی ادائیگی میں تاخیر کا سبب بن رہا ہے جب کہ اس فریضہ کی ادائیگی میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ بیٹی کی شادی کے مسئلے کو فریضہ حج کی ادائیگی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ حج کا فریضہ مسلمانوں پر اللہ نے عائد کیا اور قرآن مجید میں اس کا حکم دیا گیا ہے جبکہ شادی ایک سنت ہے، اگر شرائط پوری ہونے کے باوجود حج کا فریضہ ادا نہ کیا جائے تو یہ بات اللہ کے حکم سے روگردانی کے مترادف ہے۔ اگر ہم سماجی روایات کا پابند ہونا پسند کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک ''سنت'' کو ''فرض'' پر فوقیت دے رہے ہیں۔ یہ رویہ کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

شادی کرنا سنت ہے اور اسلام اس بات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا کہ مسلم معاشرے میں

جوان عورتیں اور مرد غیر شادی شدہ رہیں۔ لیکن بعض معاشروں میں غیر ضروری طور پر شادی کو ایک معاشی بوجھ بنادیا گیا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں اس انتظار میں رہتے ہیں کہ خاصی رقم جمع ہوجائے تو شادی کی جائے۔ اس طرزِ عمل سے معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق جوان لڑکیوں کے والدین یا بھائیوں کو مناسب جوڑے کے لیے دو باتیں دیکھنی چاہئیں، ایک ایمان کی پختگی دوسرے دیانت۔

دوسرے کے اخراجات پر حج کی ادائیگی

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عازم حج کو اپنے حج کے تمام اخراجات خود برداشت کرنے چاہئیں۔ کیا اس بات کی اجازت ہے کہ ایک لڑکی یا لڑکا اپنے والدین کے حج کے اخراجات برداشت کرے۔ قطع نظر اس کے کہ والدین کی مالی حیثیت کیسی ہے۔ کیا یہی بات کسی شخص کی بیوی کے لیے بھی ممکن ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے جو عبادتیں فرض کی ہیں ان کی ادائیگی میں جو بھی رقم خرچ کی جائے گی اس کا بہترین اجر عطا ہوگا۔ جب ہم زکوٰۃ ادا کرتے ہیں تو اس کا ثواب ہمیں کم سے کم دس گنا زیادہ ملتا ہے۔ جب ہم حج پر روانہ ہوتے ہیں تو اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے سفر کے اخراجات اور صعوبتیں برداشت کرتے ہیں، یہاں جو کچھ خرچ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے اس کا بہترین اجر ملنے کی توقع کی جاتی ہے۔ کسی بھی مذہبی فریضے کی ادائیگی میں ہونے والے اخراجات کے لیے یہ بات نہایت اہم ہے کہ جو رقم خرچ ہورہی ہے وہ حلال اور جائز ذریعہ سے حاصل کی گئی ہو۔ اللہ کے نزدیک کوئی ایسی عبادت قابل قبول نہیں ہے جس میں ناجائز ذریعے استعمال کیے گئے ہوں۔ حج ایک ایسی عبادت ہے جو انسان کے پچھلے تمام گناہوں کو دھو دیتی ہے۔ یہی حج کا اصل صلہ اور ثواب ہے جو عملی طور پر حج کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ حج کے سلسلہ میں جو اخراجات ہوتے ہیں ان کا ثواب علیحدہ ہے۔

کسی شخص، ادارے یا حکومت کی جانب سے حج کے سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی دعوت قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے والدین کو حج کرانے کی دعوت دیتا ہے تو یہ اس شخص کی جانب سے والدین کے لیے عقیدت اور تابعداری کا اظہار ہے جس کا صلہ اللہ کی جانب سے ملے گا، بشرطیکہ وہ شخص اس کام کو اپنے والدین پر احسان نہ تصور کرتا ہو۔ یہاں یہ بات اہمیت نہیں رکھتی کہ والدین مالی طور پر حج کے اخراجات خود برداشت کرنے کی حیثیت رکھتے ہیں یا نہیں۔ اسلام کسی شخص پر رقم خرچ کرنے کے بارے میں کوئی ناروا پابندی عائد نہیں کرتا

بشرطیکہ وہ رقم کسی ممنوع یا ناجائز کام میں صرف نہ کی جارہی ہو۔ جب رقم کسی مذہبی فریضے کی ادائیگی میں صرف ہورہی ہے تو یہ اللہ کی عطا کردہ نعمت کا بہترین استعمال ہے۔

بیوی کے تمام اخراجات ادا کرنا، شوہر کی ذمہ داری ہے۔ تاہم اس میں حج کے اخراجات شامل نہیں ہیں بشرطیکہ بیوی خود اپنی رقم میں سے حج کے اخراجات برداشت کرسکتی ہو۔ اگر شوہر، بیوی کو حج پر ساتھ لے جاتا ہے اور اس کے تمام اخراجات اٹھاتا ہے تو اس کا صلہ اسے اللہ کے یہاں ملے گا۔ جب ایک شخص، ایک مذہبی فریضے کی ادائیگی میں کسی دوسرے شخص کی مدد کرتا ہے تو یہ عمل انتہائی مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ شوہر اگر اپنی بیوی کے حج کے اخراجات برداشت نہیں کرتا تو اس سلسلہ میں اس پر کوئی ذمہ داری بھی عائد نہیں ہوتی۔

والدین پر بچوں کے حج کی ذمہ داری

سوال: میرے بچوں نے متعدد بار میرے ساتھ عمرہ ادا کیا ہے لیکن میں انہیں حج کے لیے نہیں لے جاسکا۔ اگر میں بچوں کو اپنے ساتھ حج پر لے جائے بغیر سعودی عرب سے چلا جاؤں تو کیا یہ میری طرف سے کوتاہی شمار ہوگی؟

جواب: اگر آپ کے بچے سن بلوغت تک نہیں پہنچے ہیں تو ان پر حج فرض نہیں ہے۔ اگر آپ انہیں اس عمر میں حج پر لے جاتے ہیں تو اس کا ثواب آپ کو ملے گا۔ تاہم ان کی جانب سے فریضہ حج کی ادائیگی اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک وہ بلوغت کے بعد حج ادا نہ کریں۔ اگر بچوں میں سے کسی ایک نے بھی بلوغت کی شرط پوری کرلی ہے تو حج کی ادائیگی اس پر فرض ہے تاہم یہ اس کی اپنی ذمے داری ہے آپ کی ذمے داری نہیں ہے۔ اگر آپ اس فرض کی ادائیگی میں بچوں کی معاونت کرتے ہیں تو یہ احسن ہے اور اگر آپ ایسا نہیں کرسکتے تو آپ کو اس سلسلہ میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب انہیں حج کرانے کے لیے آپ کو یا آپ کے اہل خانہ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔

کسی بھی فریضہ کی ذاتی طور پر ادائیگی، اسلام کا بنیادی تصور ہے۔ بچے جب چھوٹے ہوں تو آپ انہیں نماز کے لیے مسجد لے جاتے ہیں تاکہ وہ نماز پڑھنا سیکھ لیں، لیکن جب وہ اس عمر کو پہنچ جائیں جب نماز ان پر فرض ہوجائے، تب یہ فریضہ انہیں خود ہی ادا کرنا ہوگا۔ آپ بچوں کو عمرے کے لیے لے جاتے رہے ہیں، بچے حرم شریف دیکھ چکے ہیں یقیناً حرم میں طواف کی ادائیگی کے دوران انہوں نے ویسی ہی دلچسپی اور شوق ظاہر کیا ہوگا جیسا کہ دوسرے بچے کرتے ہیں۔ جب وہ

بڑے ہوں گے تو یقیناً وہ وہاں جانے کی آرزو کریں گے۔ اگر بچے بالغ ہو چکے ہیں اور آپ انہیں اپنے ساتھ حج پر لے جاتے ہیں تو یقیناً یہ آپ کی عنایت و مہربانی ہوگی اور اس کا اجر آپ کو اللہ تعالیٰ عطا کریں گے۔

حج کے موقع پر کاروبار کی اجازت؟

سوال: میں روزگار کے سلسلے میں مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر ہوں۔ اس سال جو حج ہوگا، وہ میرے لیے پہلا تجربہ ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر حج کی ادائیگی کے علاوہ ایک اسٹال لگا کر تھوڑا سا کاروبار بھی کرلوں۔ کیا یہ مناسب ہوگا؟

جواب: جی ہاں! حج کے موقع پر آپ کا یہ اقدام درست ہوگا۔ ہر عازم حج خواہ وہ مکہ میں رہتا ہو یا بیرون ملک سے آئے، حج کے دنوں کے دوران جائز کاروبار کرسکتا ہے، تاہم اسے دو شرائط کی پابندی کرنی ہوگی جن میں سے پہلی یہ کہ اس کی کاروباری سرگرمیاں اس کی عبادت پر حاوی نہ ہوں، یعنی اسے ارکان حج، اپنے مقررہ اوقات میں وقت کی پابندی کے ساتھ اس طرح ادا کرنے ہوں گے کہ کاروبار انہیں متاثر نہ کرے۔ مثلاً اگر ایک خاص وقت رمی کرنی ہے تو وہ اسے، اس وقت کاروبار زیادہ منافع بخش ہونے کی وجہ سے کم ترجیح کے وقت تک مؤخر نہ کرے۔ اسی طرح وہ ۹ ذی الحجہ کو غروب آفتاب سے پہلے عرفات سے اس لیے رخصت نہیں ہوسکتا تاکہ مزدلفہ یا منیٰ میں حجاج کی آمد سے قبل اپنا کاروبار منظم کرلے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جو بھی کاروبار کیا جائے اس میں یہ خیال رکھا جائے کہ مقامی قوانین کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔ مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ جب کسی دوسرے ملک میں ہوں تو اس ملک کے قوانین کی پابندی کریں، بشرطیکہ کوئی قانون اسلامی قوانین کے خلاف نہ ہو۔ مسلم ملک کے حکمران کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ مسلمانوں کے اجتماعی مفاد میں کسی جائز سرگرمی کو محدود کردے یا اس پر پابندی عائد کردے، بشرطیکہ یہ پابندی اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو۔

آپ کے لیے میری رائے یہ ہے کہ آپ سب سے پہلے یہ معلومات حاصل کریں کہ آپ جو کاروبار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس کی اجازت ہے یا نہیں۔ اگر اس کے لیے کسی اجازت نامے (لائسنس) کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ حاصل کیجیے تاکہ آپ کے کاروبار کو قانونی تحفظ حاصل رہے۔

مقروض حالت میں حج کی ادائیگی

سوال: میں سعودی عرب میں (بسلسلہ روزگار) مقروض حالت میں آیا، جس کمپنی میں، میں کام کر رہا ہوں وہ آج کل نہایت دشوار حالات سے گزر رہی ہے اور اس بات کا کوئی یقین نہیں کہ آئندہ سال میری ملازمت جاری رہے گی یا نہیں۔ میری انتہائی خواہش ہے کہ اس سال میں فریضہ حج ادا کروں۔ یہ بات صاف ہے کہ اگر مجھے واپس وطن جانا پڑا اور وہاں ملازمت اختیار کرنا پڑی تو پھر حج کے سفر کے لیے زادِراہ جمع کرنے میں کئی سال بیت جائیں گے۔ آپ سے سوال یہ ہے کہ اپنے اوپر بھاری قرض کے ہوتے ہوئے کیا میں اس سال حج ادا کرسکتا ہوں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حج کو ایک ایسا فرض قرار دیا ہے جو تمام مسلمانوں پر (بشرط استطاعت) واجب الادا ہے۔ اس فرض کی ادائیگی اس وقت لازمی ہوجاتی ہے جب ایک شخص خود کو یا اپنے خاندان کو غیر ضروری طور پر زیر بار کیے بغیر سفر حج کے اخراجات ادا کرنے کا اہل ہوجائے۔ ''اہلیت'' یہاں ایک مستقل نوعیت کی اہمیت رکھتی ہے۔ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ جو شخص اس ''اہلیت'' کا حامل نہ ہو اس پر حج فرض نہیں ہے لیکن جب وہ مالی اور جسمانی طور پر اس قابل ہو تو اس پر حج فرض ہوجاتا ہے۔ حج کی ادائیگی کے لیے اچھی صحت بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص زیادہ علیل ہے تو اسے حج کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی متعدی بیماری میں مبتلا ہے تو اسے بھی حج پر نہیں جانا چاہیے خواہ اس کا یہ متعدی مرض ایسا ہو کہ وہ سفر کرنے کے قابل ہو، کیونکہ متعدی مرض کی صورت میں ایک شخص کی بیماری، حج پر آئے ہوئے دوسرے لوگوں کے لیے خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔ حج کے لیے ایک اور چیز جو ضروری ہے وہ راستوں کا محفوظ ہونا ہے۔ اگر کسی شخص کو یہ خدشہ لاحق ہو کہ حج کے لیے سفر کے دوران اسے نقصان پہنچے گا تو اس پر بھی حج کی ادائیگی فرض نہیں ہے۔ حج کا سفر آج کل تو آسان اور محفوظ ہے لیکن مملکت سعودی عرب کے قیام سے پہلے مکہ مکرمہ کے راستے محفوظ نہیں ہوتے تھے اور مکہ کو سفر کرنے والے قافلے اور مسافر راہزنوں کے ہاتھوں لٹ جایا کرتے تھے۔

حج فرض ہونے کی دیگر شرائط عازم حج کی مالی حیثیت سے متعلق ہیں۔ اس کے پاس اتنی رقم ہونی چاہیے کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے اہل خانہ کی ضروریات زندگی پوری ہوسکیں اور وہ اپنے سفر کے اخراجات اور قیام کے اخراجات پورے کرسکے۔ حج کے سفر کے لیے رقم قرض لینے کی ضرورت نہیں ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ اگر حج کی روانگی سے پہلے اس پر کسی کا کوئی قرض ہے تو وہ

اسے ادا کردے۔ قرض کی موجودگی، حج کو ملتوی کرنے کا مناسب جواز مہیا کرتی ہے لیکن آپ کے معاملے میں صورتحال مختلف ہے۔ اس وقت فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے آپ کو صرف ایک ہفتے کی چھٹی کی ضرورت ہے۔ حج کے لیے دیگر اخراجات آپ کے اس وقت کے روز مرہ اخراجات سے قدرے زیادہ ہوںگے، جو بہرحال آپ بخوبی برداشت کرسکتے ہیں۔ سعودی عرب میں آپ کی موجودگی آپ کو یہ موقع فراہم کررہی ہے کہ آپ اس سے فائدہ اٹھائیں اور اس فرض کو ادا کردیں۔ یہ موقع گنوانا نہیں چاہیے۔ آپ کے ملک میں آپ پر جو قرض ہے اس وقت وہ آپ کے حج کی ادائیگی میں مانع نہیں ہے۔

حج کی رخصت کا بدل

سوال: میں جس ادارے میں ملازم ہوں، اس ادارے نے مطلع کیا کہ مجھے حج کے لیے چھٹی نہیں مل سکتی، اس پر میں نے تجویز پیش کی کہ میری غیر موجودگی میں میرا کوئی غیر مسلم ساتھی میری جگہ کام کرے گا۔ آپ سے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس صورت میں، میں اپنے ساتھی کو، اپنے بدلے کا کام کرنے کا معاوضہ کس طرح ادا کروں۔ نقد ادائیگی کروں یا کسی تحفہ کی صورت میں ادا کروں؟

جواب: یہ فیصلہ تو خود آپ ہی کو کرنا ہے کہ جو ساتھی حج کی ادائیگی کے سلسلہ میں آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے حصے کا کام کریں گے، آپ انہیں کس طرح ادائیگی کریں۔ اگر اس سلسلہ میں آپ خود کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے ہیں تو بہتر ہے کہ آپ اپنے ساتھی سے پوچھ لیں کہ اس کام کے بدلے نقد ادائیگی چاہیں گے یا کوئی تحفہ لینا پسند کریں گے یا یہ پسند کریں گے کہ جب انہیں رخصت کی ضرورت ہو تو آپ ان کی جگہ کمپنی میں کام کریں گے۔ میرے خیال میں آخری طریقہ آپ دونوں کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ اگر آپ کے ساتھی کوئی بھی معاوضہ قبول نہیں کرنا چاہیں اور وہ یہ کام صرف دوستی اور خیر سگالی کے طور پر کررہے ہوں تو آپ کو ان کی اس پیشکش کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اس طریقے سے حج کی ادائیگی میں آپ کے اجر پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

کمپنی کے مقروض ملازم پر حج کی فرضیت

سوال: میری کمپنی نے گاڑی خریدنے کے لیے مجھے قرضہ دیا ہے۔ اس سال میں حج پر جانا چاہتا ہوں اور کمپنی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ گاڑی کے لیے حاصل

کردہ قرضے کے باوجود میرا حج مؤثر ہوگا؟

جواب: گاڑی خریدنے کے لیے آپ کی کمپنی کا آپ کو قرضہ دینا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کمپنی آپ کی کارکردگی سے مطمئن ہے اور اس کی خواہش ہے کہ آپ تادیر اس کے ساتھ کام کرتے رہیں۔ گاڑی کے لیے حاصل کردہ قرضے کی ادائیگی آپ آسان ماہانہ اقساط میں کریں گے۔ اس دوران خدانخواستہ آپ کو کچھ ہوجاتا ہے تو کمپنی گاڑی واپس لے لے گی اور اسے فروخت کرکے اپنی رقم حاصل کرلے گی۔ کمپنی نے اس بات کا اندازہ پہلے سے کیا ہوا ہوگا کہ گاڑی کے عوض ان کے پاس ضرورت سے زیادہ ضمانت موجود ہے جو ان کی قرض کی رقم کی واپسی یقینی بناتی ہو۔ علاوہ ازیں، جب آپ سعودی عرب کے اندر ہی ہیں تو آپ کے حج کے اخراجات بھی کم ہوں گے۔ اس صورت میں آپ اس سال حج کرسکتے ہیں۔

یہ بہتر ہوگا کہ یہاں حج اور قرضے سے متعلق ایک نکتے کی وضاحت کردی جائے۔ جب ایک شخص مقروض ہوجاتا ہے تو اسے قرض کی واپسی کے لیے مناسب وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور جب تک قرضہ ادا نہیں ہوجاتا وہ حج کے لیے اہل ہونے کی شرط پر پورا نہیں اترتا۔ بالالفاظ دیگر مقروض حالت میں اس کو حج ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حج صرف ان لوگوں پر فرض ہے جو اسے ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ علماء کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ اہلیت کا مطلب جسمانی صحت اور سفر کے لیے موزونیت اور اخراجات ادا کرنے کے لیے مالی وسائل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کوئی ایسی رکاوٹ نہ ہو جو سفرِ حج میں مانع ہوتی ہو (راستوں کا محفوظ ہونا وغیرہ۔) چونکہ سفر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ''مالی اہلیت'' کی شرط پر ایک مقروض پورا نہیں اترتا اس لیے اس پر حج اس وقت تک فرض نہیں ہوتا جب تک وہ قرضہ ادا نہ کردے۔ تاہم اگر وہ اس حالت میں حج کرتا ہے تو اس کا حج ادا ہوجائے گا۔ آپ نے جو صورتحال بیان کی ہے اس کے مطابق آپ حج کے لیے ضروری تمام شرائط پر پورے اترتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کی کمپنی کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لہٰذا آپ کو حج کرلینا چاہیے۔

زکواۃ کی رقم سے حج کی ادائیگی

سوال: کیا زکواۃ کی رقم سے حج ادا کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں بعض افراد فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے زکواۃ فنڈ سے رقم طلب کرتے ہیں یہ کہاں تک درست ہے؟

جواب: زکواۃ کی رقم کے آٹھ استعمالات میں سے ایک استعمال یہ ہے کہ اسے ''فی سبیل اللہ

مصارف'' میں خرچ کیا جائے۔ علماء ''فی سبیل اللہ مصارف'' کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ اس مد میں زکواۃ کی رقم جہاد اور حج کے خواہشمند افراد پر خرچ کی جاسکتی ہے۔ اس رائے کی روشنی میں یہ مناسب ہے کہ بعض افراد اپنے سفر حج کے کچھ اخراجات پورے کرنے کے لیے زکواۃ فنڈ سے رقم حاصل کریں۔

اس کے ساتھ ہی یہ وضاحت ضروری ہے کہ حج صرف اس صورت میں فرض ہوتا ہے جب ایک شخص اپنے سفر کے اخراجات پورے کرسکتا ہو اور اپنے گھر والوں کو اتنی رقم مہیا کرسکے کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں ضروریات زندگی فراہم کرسکیں۔ اگر کوئی شخص یہ شرط پوری نہیں کرتا تو اس پر حج فرض نہیں ہے۔

عمرہ

عمرے کے بعد حج کی لازمی ادائیگی

سوال: اگر کسی شخص نے عمرہ کیا ہو تو کیا اس کے لیے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ حج بھی ادا کرے۔ کیا یہ بات درست ہے کہ اگر عمرہ کرنے والا حج ادا نہ کرے تو اس کا عمرہ قبول نہیں ہوتا؟

سوال۲: حج اور عمرہ دونوں عبادتیں ہیں۔ اگر عمرہ ادا کرلیا گیا ہے تو حج کی ادائیگی میں تاخیر سے ایک ایسی عبادت پر کیوں اثر پڑنا چاہیے جو ادا کی جاچکی ہے؟

جواب: حج ایسی عبادت ہے جو تمام مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے۔ صرف وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو اسے ادا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ جو مسلمان اہلیت کی شرائط پر پورا اترتے ہیں انہیں کوشش کرنا چاہیے کہ جس قدر جلد ممکن ہو یہ فرض ادا کرلیں۔ اگر کوئی شخص اس کی ادائیگی میں دیر کرے گا تو وہ اس بات سے آگاہ نہیں ہے کہ آئندہ اسے ن کو ادا کرنے کا موقع بھی ملے گا یا نہیں۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''حج ادا کرلو اس وقت سے پہلے جب تم اس قابل نہ رہو۔''

بعض لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ حج آخر عمر میں کرنا بہتر ہے تاکہ تمام گناہوں سے نجات مل جائے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ کوئی بھی شخص یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جب اس کی عمر اب سے زیادہ ہوگی تو اس وقت وہ حج کے قابل ہوگا یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ نوجوانی میں حج ادا کرنے کے ثواب لامحدود ہیں۔

عمرہ بھی جتنی جلد کرلیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ اس لیے جب آپ مکہ جانے کے قابل ہوں

تو لازماً عمرہ ادا کرلیں۔ حج کے ساتھ اس کی ادائیگی لازمی نہیں ہے۔ حج کے دنوں کے علاوہ اگر آپ کو مکہ جانے کا موقع ملتا ہے تو عمرہ ضرور کرلینا چاہیے۔ جب آپ نے عمرہ کرلیا تو اس کے ادا ہونے میں کوئی بات مانع نہیں ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے کہ عمرہ کا ثواب حج کی ادائیگی سے مشروط ہے۔

رمضان المبارک میں عمرۂ بدل کی ادائیگی

سوال: میں رمضان المبارک میں عمرہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور یہ بھی خواہش ہے کہ کئی عمرے کروں جن میں ایک عمرہ اپنے ایک مرحوم عزیز کی جانب سے اور ایک عمرہ اپنے ایک بیمار عزیز کی طرف سے کرنا چاہتا ہوں۔ ازراہ کرم یہ بتایئے کہ یہ تمام عمرے ایک ہی احرام سے ادا کیے جاسکتے ہیں یا مجھے ہر عمرے کے لیے نیا احرام باندھنا ہوگا۔ اگر ہر بار نیا احرام ضروری ہے تو یہ کس مقام سے باندھا جائے۔

جواب: چونکہ آپ کا سفر عمرے کے ارادے سے ہے اس لیے میقات کے مقام پر احرام باندھنا ہوگا۔ اگر آپ فضائی سفر کر رہے ہیں، تو بہتر ہوگا کہ سفر پر روانہ ہونے سے قبل گھر پر احرام باندھ لیں۔ لیکن تلبیہ اس وقت تک نہ کہیں جب تک آپ کا طیارہ میقات کے مقام پر نہ پہنچ جائے۔ تلبیہ ایک طرح طواف کی نیت ہے بالکل اسی طرح جس طرح ہر عبادت سے قبل اس کی نیت کی جاتی ہے۔ حج اور عمرے کی صورت میں اس نیت کا زبان سے ادا کرنا ضروری ہے اور اس کی ادائیگی کا صحیح طریقہ یہ ہے ''لبیک اللھم بعمرۃ'' فضائی سفر میں یہ اس وقت ادا کی جائے جب طیارہ میقات پر پہنچے کیونکہ جب زبان سے تلبیہ ادا کردی جائے تو پھر احرام اس وقت تک نہیں کھولا جاسکتا جب تک عمرہ مکمل نہ ہوجائے۔ اگر احرام باندھتے وقت تلبیہ ادا کرلی گئی اور اس کے بعد کسی وجہ سے سفر مؤخر ہوگیا یا کسی مجبوری کی وجہ سے سفر جاری رکھنا ممکن نہ ہوا تو آپ کو احرام باندھے ہوئے ہر جگہ آنے جانے میں دشواری کا سامنا ہوگا۔

عمرہ مکمل ہونے کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے اور عام لباس پہن لیا جاتا ہے۔ جب آپ اپنے کسی عزیز کی جانب سے عمرہ ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے آپ کو حرم کی حدود سے باہر جانا ہوگا اور احرام باندھ کر دوبارہ حدود حرم میں داخل ہونا ہوگا۔ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لیے جس مقام تک جاتے ہیں اسے تنعیم کہا جاتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور اس جگہ سے واقف ہیں کیونکہ لوگ اکثر اس طرف جاتے ہیں۔ وہاں آپ دوبارہ احرام باندھ کر اور تلبیہ کہہ کر عمرہ کا آغاز کرسکتے ہیں اور دیگر

فرائض کے لیے مکہ واپس آسکتے ہیں۔ جب آپ عمرہ مکمل کرلیں گے تو احرام کھول دیا جائے گا۔

آپ جتنی بار بھی عمرہ کریں گے، یہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا، تاہم یہ وضاحت ضروری ہے کہ جب آپ اپنا عمرہ اور اپنے عزیزوں کی جانب سے عمرے ادا کرلیں تو پھر اپنی جانب سے دوسرا عمرہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہاں، اگر آپ چاہیں تو طواف کرسکتے ہیں اور جس قدر چاہیں کرسکتے ہیں۔ اللہ کی جانب سے آپ کو اس کا بہترین اجر ملے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اگر آپ دوسرا عمرہ کریں گے تو وہ صحیح نہیں ہوگا۔ میں صرف اس بات کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے عمل سے ثابت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کرامؓ کا طریقہ یہی رہا کہ آپ حضرات جب بھی مکہ آئے تو ہر بار ایک عمرہ ادا کیا۔ سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع بہترین طریقہ ہے۔ آپ جب دوبارہ مکہ آئیں تو حج یا عمرہ ادا کرسکتے ہیں۔ اس بار عمرے کے بعد آپ طواف کیجیے جس قدر آپ کے لیے ممکن ہو۔

فجر کے بعد عمرہ کی ادائیگی

سوال: کیا اس بات کی اجازت ہے کہ فجر کی نماز کے بعد، عمرہ کے لیے مکہ روانگی سے پہلے، احرام باندھنے کے بعد دو رکعت سنت نماز ادا کرلی جائے یا اس کے لیے طلوع آفتاب تک انتظار کرنا ہوگا؟

جواب: جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد سورج طلوع ہونے تک نماز ادا کرنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ بعض علماء کی رائے میں یہ پابندی عام حالات کے لیے ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی خاص وجہ سے کوئی مخصوص نماز ادا کرنی ہو تو یہ پابندی اس صورت میں عائد نہیں ہوگی۔ بہ الفاظ دیگر اگر معقول وجوہ موجود ہوں تو اس پابندی سے استثنا مل سکتا ہے۔ اس رائے کے پیش نظر اگر آپ نماز فجر کے فوراً بعد عمرے کے لیے روانہ ہونا چاہتے ہیں تو احرام باندھنے کے بعد دو رکعت نماز ادا کرسکتے ہیں۔

لیکن میرے خیال میں یہ اس کام کو کرنے کا صحیح طریقہ نہیں ہوگا۔ جب آپ نے عمرہ کا ارادہ کرلیا ہے اور آپ کی نیت یہ ہے کہ فجر کی نماز کے بعد آپ کو سفر پر روانہ ہوجانا ہے تو آپ کو چاہیے کہ آپ فجر کی نماز سے قبل احرام باندھیں۔ احرام باندھنے کی نماز ادا کریں اور اس کے بعد فجر کی نماز پڑھیں۔ اگر آپ نے فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد عمرہ کا ارادہ کیا ہے تو غسل کرنے اور احرام باندھنے اور سفر کی دوسری تیاریوں میں اتنا وقت ہوجائے گا کہ طلوع آفتاب بہت نزدیک ہوگا۔ اس صورت میں آپ چند لمحے انتظار کرسکتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے آپ احرام باندھنے کے بعد

دو رکعت نماز ادا نہ بھی کر سکیں، تب بھی آپ کا عمرہ ادا ہو جائے گا۔

سال میں کتنے عمرے ادا کیے جائیں؟

سوال: جب بھی مکہ جاتا ہوں، تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اپنے ایسے عزیزوں کی جانب سے عمرہ ادا کرنا چاہیے جو اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح عمرہ کرنے سے مجھے بھی ثواب ملے گا۔ بالعموم میں سال میں چھ یا سات مرتبہ عمرہ کرتا ہوں۔ کیا مجھے اس سے زیادہ بار عمرہ کرنا چاہیے؟

جواب: سال میں ایک بار عمرہ کرنا کافی ہوتا ہے۔ دراصل عمرے کی ادائیگی زندگی میں ایک بار فرض ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ حج۔ لیکن اگر کسی شخص کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ بار بار مکہ جا سکے (جیسا کہ جدہ کے لوگ) تو سال میں ایک مرتبہ عمرہ ادا کرنا چاہیے۔ کوئی بھی شخص جتنی بار چاہے مکہ جا سکتا ہے لیکن ہر بار عمرہ ادا کرنا لازمی نہیں ہے، لیکن وہ طواف کر سکتا ہے کیونکہ ایک حدیث شریف کے مطابق طواف، نماز کی طرح کی عبادت ہے، سوائے اس کے کہ طواف میں بات چیت کی اجازت ہوتی ہے اور نماز میں گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ جب آپ عمرہ کرنے جائیں، تو ایک سے زائد بار طواف کر سکتے ہیں۔ درحقیقت زیادہ سے زیادہ طواف کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

اگر آپ اکثر و بیشتر مکہ مکرمہ جاتے ہیں تو آپ اپنے مرحوم اعزہ کی جانب سے عمرہ ادا کر سکتے ہیں۔ جب آپ میقات پر پہنچیں گے اور احرام پہننے کے ساتھ عمرہ کی نیت کریں گے تو آپ کو یہ نیت کرنا ہوگی کہ میں اپنے فلاں عزیز کی جانب سے عمرہ کی نیت کرتا ہوں اس کے بعد معمول کے مطابق عمرہ کے ارکان ادا کیجیے۔ اس عمرے کا ثواب آپ کے متعلقہ عزیز کو پہنچے گا اور آپ کو اس نیکی کا اجر ملے گا جو آپ نے اپنے مرحوم عزیز کے لیے کی۔

علاوہ ازیں اگر آپ عمرے سے پہلے یا بعد میں، حرم میں نماز ادا کریں گے یا قرآن مجید کی تلاوت کریں گے تو آپ کو ان عبادات کا ثواب ایک لاکھ گنا ملے گا۔ جب تک آپ مکہ میں قیام کریں آپ نفلی طواف کر سکتے ہیں۔ ان نفلی طواف کا ثواب آپ کو ملے گا۔

حج سے پہلے عمرہ، مناسک حج کا حصہ ہوگا؟

سوال: میں حج سے دو ہفتہ پہلے عمرہ کرنا چاہتا ہوں۔ عمرہ کے بعد حج کے موقع پر یہ مقدس فریضہ ادا کروں گا۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ عمرہ ادا کر کے ریاض جاؤں اور پھر واپس آ کر حج ادا کروں۔ سوال یہ

ہے کہ ریاض واپسی سے پہلے ادا کیا گیا عمرہ، حج کے لیے کافی ہوگا یا حج کے لیے واپس آنے پر دوبارہ عمرہ کرنا ہوگا؟

جواب: علماء کا یہ کہنا ہے کہ اگر ایک شخص موسم حج (شوال سے ۸ ذی الحجہ تک) کے دوران عمرہ کرتا ہے اور پھر مکہ سے باہر میقات تک چلا جاتا ہے تو اس صورت میں وہ تمتع کو ختم کرتا ہے۔

آپ کو علم ہوگا کہ ''تمتع'' حج کا وہ طریقہ ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مستحسن قرار دیا ہے۔ اس طریقہ میں مکہ مکرمہ پہنچنے کے فوراً بعد سب سے پہلے عمرہ ادا کیا جاتا ہے اور عمرہ کے اختتام پر احرام کھول دیا جاتا ہے۔ پھر ۸ ذی الحجہ تک مکہ میں قیام کیا جاتا ہے اور حج کا وقت آنے پر دوبارہ احرام باندھ کر ارکان حج ادا کیے جاتے ہیں۔ اس طریقہ سے حج ادا کرنے والے کو اس بات کے شکرانے کے طور پر ایک جانور کی قربانی کرنی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ہی موسم حج میں عمرہ اور حج ادا کرنے کی سعادت بخشی۔

اگر کوئی شخص میقات کی حدود سے باہر چلا جائے یا اس قدر فاصلے پر چلا جائے جہاں اسے سفر کی وجہ سے نماز قصر کرکے پڑھنے کی اجازت ہو تو تمتع کا طریقہ قائم نہیں رہتا۔ اس صورت میں اس کا عمرہ برقرار رہے گا۔ لیکن حج کے لیے واپس آنے کے بعد اسے حج کے تین طریقوں یعنی افراد، قران یا تمتع میں سے کسی ایک طریقہ کا انتخاب کرنا ہوگا۔

ماضی میں سفر کی جو دشواریاں تھیں اور جتنا وقت صرف ہوتا تھا، اس کے مقابلے میں آج بہت سہولتیں حاصل ہیں۔ علماء کی رائے اس بارے میں مختلف ہے، ان کے خیال میں حج کے لیے جب آپ دوبارہ آئیں گے تو آپ کا سفر، حج کے لیے بالکل نیا سفر سمجھا جائے گا۔ لیکن میری رائے میں مکہ مکرمہ کے لیے آپ کے دونوں سفروں کو آپ کی نیت کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ اگر عمرہ کے وقت آپ نے حج کی نیت کر رکھی تھی تو اس صورت میں تمتع کے طریقہ سے آپ کا یہ عمرے، حج کے لیے بھی مؤثر ہے، لیکن اگر آپ نے اس وقت صرف عمرے کی نیت کی تھی اور حج ادا کرنے کا محض خیال تھا، تو اس صورت میں آپ کے دونوں سفر علیحدہ علیحدہ شمار ہوں گے اور حج کے لیے دوبارہ آنے پر آپ کو حج کے تین طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اگر آپ صرف حج کے ارکان ادا کریں گے تو یہ افراد کا طریقہ ہوگا۔ ایک مرتبہ احرام باندھ کر عمرہ اور حج ادا کریں گے تو یہ قران کا طریقہ ہوگا اور عمرہ ادا کرکے احرام کھول کر حج کے لیے دوبارہ احرام باندھیں گے اور حج کے ارکان ادا کریں گے تو یہ تمتع کا طریقہ ہوگا۔ اگر آپ حج سے ۱۰ دن پہلے بھی مکہ مکرمہ پہنچتے ہیں تو اس صورت میں بھی تمتع کے طریقہ سے حج کر سکتے ہیں، جو زیادہ مستحسن قرار دیا گیا ہے۔

موسم حج میں عمرے کی ادائیگی

سوال: جدہ میں رہنے والے غیر سعودی مسلمان اگر موسم حج کے دوران عمرہ ادا کریں تو کیا اسی سال ان پر حج کی ادائیگی بھی لازمی ہوجاتی ہے۔ کیا ایسے حضرات کو موسم حج میں عمرہ ادا کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر وہ حج کے لیے جائیں تو کیا وہ طواف قدوم کے بغیر براہ راست منیٰ جاسکتے ہیں؟

جواب: جدہ میں رہنے والے سعودی اور غیر سعودی باشندوں میں حج اور عمرہ کی ادائیگی کے لیے کوئی فرق نہیں ہے۔ تمام لوگوں کے لیے اسلام کے احکامات یکساں ہیں۔ وضاحت کے لیے میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ عمرہ، حج سے علیحدہ ایک فریضہ ہے تاہم دونوں کو ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر ایک فریضہ ادا کرلیا گیا ہے تو دوسرے کی ادائیگی مشروط ہوجاتی ہے۔

اگر کوئی شخص، خواہ وہ جدہ میں رہتا ہو یا کسی اور ملک سے آئے، اگر موسم حج میں عمرہ ادا کرتا ہے تو اس کے لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ وہ اسی برس حج بھی ادا کرے، موسم حج شوال کے آغاز سے شروع ہوتا ہے اور ۹ ذی الحجہ تک رہتا ہے۔

اگر ایک شخص موسم حج کے دوران عمرہ ادا کرچکا ہے اور اسی برس وہ حج بھی ادا کرتا ہے تو طریقہ کے اعتبار سے اس کا حج، حج تمتع ہوگا لہٰذا وہ احرام کے دیگر دو طریقوں (افراد، قران) میں سے کسی کو اختیار نہیں کرسکتا۔ اس بات کے شکرانے کے طور پر کہ اللہ نے اسے ایک ہی سال عمرہ اور حج ادا کرنے کی سعادت بخشی، اس شخص کو ایک بھیڑ ذبح کرنا ہوگی جس کا گوشت وہ اور اس کے اہل خانہ استعمال کرسکتے ہیں لیکن اس قربانی کا بڑا حصہ غریبوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔

ایک شخص کے لیے سال میں ایک بار عمرے کی ادائیگی کافی ہے اگر جدہ میں رہنے والے رمضان المبارک میں یا اس سے پہلے (اسی سال کے دوران) عمرہ ادا کرچکے ہیں تو وہ مکہ مکرمہ اور خانہ کعبہ میں بغیر عمرہ ادا کیے حاضری دے سکتے ہیں انہیں صرف طواف کرنا چاہیے۔

جب آپ تمتع کے طریقے سے حج ادا کرتے ہیں تو دراصل مکہ میں آمد کے وقت عمرے کی ادائیگی کے ساتھ مناسک حج کی ادائیگی کا آغاز ہوجاتا ہے۔ اس عمرے کے دوران ادا کیا جانے والا طواف، طواف قدوم شمار ہوتا ہے۔ عمرے کی ادائیگی کے بعد آپ احرام کھول سکتے ہیں اور پھر ۸ ذی الحجہ تک انتظار کرتے ہیں، جب دوبارہ آپ کو احرام باندھنا ہوتا ہے اور منیٰ جانا ہوتا ہے۔ اگر آپ عمرہ ادا کرچکے ہیں اور عمرے کے بعد واپس جدہ چلے گئے ہیں تو حج کے لیے آپ پہلے بطور سنت

طواف کر سکتے ہیں یا براہ راست منٰی جا سکتے ہیں، دونوں طریقے قابل قبول ہیں۔

رمضان کے بعد عمرہ کی ادائیگی حج سے مشروط ہے؟

سوال: بعض حضرات کا کہنا ہے کہ رمضان المبارک کے بعد عمرہ ادا کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک حج کی نیت بھی نہ کی جائے، کیا یہ بات درست ہے؟

جواب: رمضان کے بعد عمرے کی ادائیگی کو حج سے مشروط کرنا ایک ایسی غلط فہمی ہے جو بعض مسلم ممالک میں پائی جاتی ہے۔ یہ خیال قطعی غلط ہے۔ عمرہ سال میں کسی بھی وقت ادا کیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مبارک زندگی میں چار مرتبہ عمرہ ادا کیا اور یہ چاروں ذیقعدہ کے مہینے میں ادا کیے گئے جو حج کے مہینوں میں سے ایک اور اسلامی کیلنڈر میں رمضان کے بعد دوسرا مہینہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک بار حج ادا کیا اور یہ ان چار عمروں میں سے ایک عمرہ کے بعد کیا گیا، لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ رمضان کے بعد عمرہ اس وقت تک ادا نہیں کیا جا سکتا جب تک حج کی نیت نہ ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہ بات ثابت ہے کہ رمضان کے بعد بغیر حج کی نیت کے عمرہ کیا جا سکتا ہے اور سنت رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی ہمارے لیے رہنمائی کا بہترین ذریعہ ہے۔

یہ غلط فہمی حج کی ادائیگی کے ایک طریقہ ''تمتع'' کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے جس میں حج ادا کرنے والے کو اس بات کے شکرانے کے طور پر قربانی کرنی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حج اور عمرہ ایک ہی موسم حج میں ادا کرنے کی توفیق دی۔ تمتع کے طریقہ میں عازم حج یکم شوال سے ۸ ذی الحجہ کے دوران جب مکہ مکرمہ پہنچتا ہے تو وہ عمرے سے آغاز کرتا ہے اور عمرے کے فوراً بعد احرام اتار دیتا ہے۔ اب وہ ۸ ذی الحجہ تک ان تمام پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے جو حالت احرام میں ضروری ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص شوال یا ذیقعدہ یا ذی الحجہ کے ابتدائی دنوں میں حج کے ارادے کے بغیر عمرہ ادا کرتا ہے تو یہ درست ہوگا۔ اس عمرے کا اجر ملے گا اور اس شخص کو ''دم'' نہیں دینا ہوگا، کیونکہ اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔

اب اگر یہ شخص حج کے موقع پر حج بھی ادا کر لیتا ہے تو اسے تمتع کا طریقہ اختیار کرنا ہوگا اور اس صورت میں اسے ایک جانور کی قربانی دینی ہوگی گویا حج کرنے والے کو حج کے ساتھ الگ سے عمرہ ادا نہیں کرنا ہوگا۔

زیارت مسجد نبویؐ

سوال: ازراہ کرم یہ بتائیے کہ ایک مسلمان کے لیے زیارت مدینہ کا اصل مقصد کیا ہے۔ کیا یہ سفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت کے لیے ہوتا ہے یا مسجد نبویؐ میں نماز کی ادائیگی کے لیے؟

جواب: مدینہ جانے کا اصل مقصد مسجد نبویؐ کی زیارت اور وہاں نماز کی ادائیگی ہے۔ مسجد نبویؐ ان تین مساجد میں سے ایک ہے جن کے لیے خاص طور پر سفر کیا جا سکتا ہے۔ دوسری دو مساجد مکہ مکرمہ کی مسجد الحرام اور بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق ان تین مساجد کے علاوہ کسی دوسری مسجد کے لیے خاص طور پر سفر نہیں کیا جا سکتا۔

یہ تین مساجد یعنی مسجد الحرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبویؐ، انبیاء علیہم السلام کی تعمیر کردہ ہیں۔ مکہ مکرمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے خانہ کعبہ تعمیر کیا۔ مدینے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبویؐ کی بنیاد رکھی اور اس کی تعمیر میں حصہ لیا جب کہ مسجد اقصیٰ پہلے پہل حضرت یعقوب علیہ السلام نے تعمیر کی تھی۔ کعبہ مشرف، دنیا کی پہلی مسجد اور انسانیت کا مرکز ہے جب کہ دیگر دونوں مساجد کی آسمانی مذاہب میں نہایت اہمیت ہے۔

جب مدینے کا سفر کیا جائے تو ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ اللہ کے نبی کو سلام پیش کرے۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مسجد نبویؐ میں جا کر روضۃ الجنہ کے علاقے میں دو رکعت نفل ادا کیے جائیں۔ روضۃ الجنہ مسجد نبویؐ کا وہ حصہ ہے جو روضۂ نبویؐ اور منبر رسولؐ کے درمیان واقع ہے۔ اللہ کے نبیؐ نے اس علاقہ کو جنت کے ایک باغ جیسا قرار دیا ہے۔ اگر اس علاقے میں ہجوم ہو تو مسجد نبویؐ میں کسی بھی جگہ نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ دو رکعت نفل ادا کرنے کے بعد روضہ نبیؐ پر جا کر، اس سے دو گز کے فاصلے پر کھڑے ہو کر سلام پیش کرنا چاہیے ''السلام علیک ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ'' یہاں اس حقیقت کی شہادت بھی دی جا سکتی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا پیغام ہم تک مکمل طریقے سے پہنچایا اور اللہ کے احکامات پر عمل کرنے کی ہدایت کی۔ اس موقع پر اللہ سے کسی خاص مقصد کے لیے دعا بھی مانگی جا سکتی ہے۔ صرف یہ امور ہیں جو مدینہ میں انجام دینے چاہئیں اور جن کی ہمیں تعلیم دی گئی ہے۔ تاہم ان میں سے کوئی بھی عمل، فرض نہیں ہے۔ جب کوئی مسجد نبویؐ جاتا ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام پیش کرتا ہے تو اسے اس کا بہتر اجر ملتا ہے۔

مسجد نبویؐ میں نماز کی ادائیگی

سوال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے 'جس نے میری مسجد (مسجد نبویؐ) میں چالیس نمازیں ادا کیں اور درمیان میں کوئی نماز نہ چھوڑی، اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ وہ ریاکاری اور نقصان سے بچا رہے گا۔'' مسجد نبویؐ میں چالیس نمازیں ادا کرنے والا شخص کیا لازماً جنت میں جائے گا؟

جواب: احادیث مبارکہ میں جہاں کہیں بھی تعداد بیان کی گئی ہے عام طور پر اس کا مقصد کسی بات کی قلت یا کثرت کا احساس دلانا ہے۔ اس تعداد کو سختی کے ساتھ وہی نہیں سمجھنا چاہیے جو ہندسے میں ظاہر کی گئی ہے۔ قرآن میں ریاکاری اور منافقت کا جہاں بیان ہے وہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر رسول بھی منافقوں کی مغفرت کے لیے دعا کریں تو اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا۔ قرآن کی اس آیت کا ترجمہ یہ ہے ''تم ان کی مغفرت کے لیے دعائیں مانگو یا نہ مانگو۔ اگر تم ستر مرتبہ بھی اللہ سے ان کی (منافقوں کی) مغفرت کی دعا کرو گے تو اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا۔''

اس آیت میں ستر کے ہندسے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ستر مرتبہ سے زیادہ دعا کریں تو اللہ ان کی دعاؤں کی وجہ سے منافقوں کو معاف کردے گا۔ یہاں مقصد، دعاؤں کی کثرت سے ہے۔ اسی موضوع سے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بھی ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

> ''اگر مجھے یہ پتہ ہو کہ ستر مرتبہ سے زیادہ دعا کرنے سے اللہ ان کو معاف کردے گا تو میں یقیناً ان کے لیے ستر مرتبہ سے زیادہ دعا کرتا۔''

قرآن کی آیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد، دونوں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان منافقوں کو کسی بھی صورت میں معاف نہیں کرے گا جو بظاہر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ رسولؐ یا کوئی بھی، منافقین کی مغفرت کے لیے خواہ کتنی ہی دعائیں کیوں نہ کریں، انہیں کسی صورت بخشا نہیں جائے گا۔ قرآن کی آیت اور حدیث مبارک میں ستر کا عدد دعاؤں کی کثرت ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی فضیلت یہ ہے کہ اس مقدس مقام پر ایک نماز ادا کی جائے تو اس کا اجر کسی دوسری جگہ ادا کی گئی نماز کے مقابلے میں ایک ہزار گنا زیادہ ملے گا۔ (خانہ کعبہ کے استثنیٰ کے ساتھ۔) اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسجد نبوی میں آپ جتنی زیادہ نمازیں ادا کریں گے ان کا

ثواب اسی تناسب سے زیادہ ہوتا جائے گا۔ اگر آپ وہاں ۴۱ نمازیں پڑھیں تو یقیناً آپ کا ثواب، چالیس مرتبہ نماز ادا کرنے والے سے زیادہ ہوگا۔ آپ وہاں جس قدر زیادہ جائیں گے اسی قدر آپ، اللہ اور اس کے رسولؐ سے اپنی محبت اور خلوص کا اظہار کریں گے۔ مسجد نبویؐ میں یا کسی بھی جگہ عبادت کرنے سے پہلے ضروری یہ ہے کہ آپ اسلام پر غیر متزلزل یقین رکھتے ہوں۔ آپ نے جو حدیث مبارک تحریر کی ہے اس میں چالیس مسلسل نمازوں کی ادائیگی کا ذکر محض ایک ترغیب ہے۔ بیشتر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ صرف مسجد نبوی میں چالیس نمازیں تسلسل کے ساتھ ادا کرنے سے انہیں جنت میں جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ یہ اعتقاد درست نہیں ہے۔ آپ مسجد نبویؐ میں چالیس نمازیں ادا کریں اور اس کے ساتھ ہی گناہ بھی کرتے رہیں۔ درحقیقت کوئی بھی عمل ایسا نہیں ہے جس کے لیے یہ کہا جاسکے کہ اگر آدمی فلاں نیکی کرلے تو یقیناً جنت میں چلا جائے گا۔ مسجد نبوی میں چالیس نمازیں تواتر کے ساتھ ادا کرنے کی ترغیب کا مقصد یہ ہے کہ آدمی میں تقویٰ پیدا ہو اور وہ گناہوں سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ ظاہر ہے کہ جب آدمی گناہوں سے بچے گا، تقویٰ اختیار کرے گا، اللہ کے احکامات پر چلنے کی کوشش کرے گا اور یہ تمام کوششیں اخلاص کے ساتھ ہوں گی تو یہی سمجھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کے نیک اعمال کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائیں گے۔

نویں ذی الحجہ کا روزہ

سوال: دنیا بھر میں مسلمان نویں ذی الحجہ کا روزہ رکھتے ہیں، جس کو سنت کی حیثیت حاصل ہے۔ سوائے عرفات میں موجود حجاج کرام کے جو کہ ان کے فریضہ حج کا ایک جزو ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں مسلمانوں کے دینی ایام مختلف ملکوں میں مختلف دنوں میں منائے جاتے ہیں کیونکہ یہاں جغرافیائی حدود کا فرق ہے۔ آپ یہ بتایئے کہ نویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنے کی کون سی صورت بہتر ہے۔ آیا ایسا شخص جو اس دن عرفات میں موجود ہو، وہ اپنے ملک میں نظر آنے والے چاند کے مطابق آنے والے دن روزہ رکھے یا سعودی عرب میں رویت ہلال کے مطابق عرفات میں قیام کے دوران آنے والے دن رکھے؟

سوال۲: گزشتہ سال میرا آسٹریلیا جانے اور وہاں نماز عید الاضحیٰ ادا کرنے کا اتفاق ہوا۔ میرے دیکھنے میں یہ آیا کہ وہاں مقیم مسلمانوں نے مختلف ایام میں نماز عید ادا کی۔ ایک گروہ نے سعودی عرب کے مطابق ۵ ستمبر ۱۹۸۵ء کو اس پس منظر میں کہ جس روز عرفات میں حجاج قیام کریں گے، اس کے اگلے دن نماز عید ادا کی جائے گی، نہ کہ جس دن آسٹریلیا میں چاند دیکھا جائے گا اس کی

تاریخ کے حوالے سے۔ جبکہ دوسرے گروہ نے چھ ستمبر کو اپنے اپنے ملک میں چاند نظر آنے کے حوالے سے۔ ان میں بہت کم ایسے تھے جنہوں نے چاند دیکھنے کا اہتمام کیا۔ جبکہ تیسرے گروہ نے ۷ ستمبر کو نماز ادا کی، اس گروہ نے ۲۸ اگست کو چاند دیکھنے کے بعد یہ تاریخ طے کی تھی، جو سنت کے مطابق تھی، انہوں نے دوسرے ممالک کی تاریخ کے حوالے سے اندھا دھند تقلید نہیں کی مگر اس سے آسٹریلیا کی مقامی غیر مسلم آبادی بھی اس شک و شبہ میں مبتلا ہوگئی ہے کہ توحید و اتحاد و اتفاق کے دعوے دار مسلمان اپنے دینی ایام کے بارے میں بھی ایسے شدید اختلافات کا شکار ہیں جس کی وجہ سے ہمیں بھی شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارا دین جس بات کی سب سے زیادہ اور سب سے پہلے تلقین کرتا ہے وہ مسلمانوں میں باہمی اتفاق، اتحاد اور اخوت ہے، اور آج کے جدید دور اور جدید سہولیات نے تو ساری دنیا کو ایک نقطے پر مرکوز کر دیا ہے۔ اسی طرح دینی مسائل کے حل کے لیے بھی اسی جذبۂ خوت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ دینی ایام کے مسئلے کے حل کے لیے ایک سادہ اور عام اصول ہے کہ چاند دیکھنے کا اہتمام کیا جائے۔ یہ ایک ایسا سادہ اور سہل طریقہ ہے، جس کے لیے جدید ذرائع کے استعمال یا مقامی آبادی کے بہت زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ قاعدہ صدیوں سے درست ثابت ہوتا آیا ہے کہ اگر چاند کسی خاص رات کسی مخصوص علاقے میں دیکھا جا رہا ہو تو اسی رات چاند کسی دوسرے علاقے میں نظر نہیں آئے گا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک علاقے میں چاند کا نظر آنا، اس علاقے میں نئے مہینے کے آغاز کا اعلان ہے تو دوسری جگہ نظر نہ آنے سے تاریخ کا فرق پڑ سکتا ہے، یوں خصوصی ایام کے درمیان بھی فرق پڑ سکتا ہے۔ یہ قدیم زمانے کی بات ہے لیکن آج ہمارے پاس جدید ذرائع ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلیفون وغیرہ موجود ہیں، مگر اکثر لوگ ان کے استعمال کے بارے میں مختلف آراء رکھتے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ جب ان ذرائع سے بالکل صحیح دن معلوم ہو سکتا ہے تو پھر تاریخ کا تعین کرنے میں کیا قباحت ہے۔ لیکن دوسرے گروہ کے نزدیک ان ذرائع کا استعمال اس قدر اہمیت نہیں رکھتا جتنا کہ ان کے مقابلے میں سنت کے مطابق خود چاند دیکھنے کا اہتمام کرنا۔ جیسا کہ رمضان کا چاند دیکھ کر روزوں کا آغاز، اور شوال کے چاند کے ساتھ ان کے اختتام کی سنت کو کلیہ بنایا گیا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم ان دونوں نظریات پر مزید بحث کریں، یہ بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا ایک ہی تاریخ کو اسلامی تہوار منانا زیادہ اہم ہے یا مقامی سطح پر ہی سہی لیکن مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق ہونا ہے۔ اب آیئے دیکھیے، مسئلہ کا حل کیا ہے۔ ایک شخص جو نویں ذی

الحجہ کو روزہ رکھنا چاہتا ہے، وہ یا تو اس دن روزہ رکھے جو اس کے وطن سے مطابقت رکھتا ہو، اس صورت میں یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ وہ مقامی آبادی سے علیحدہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ سعودی عرب کی تاریخ کے مطابق بھی روزہ رکھ سکتا ہے۔ یہاں اس سے کوئی واسطہ نہ ہوگا کہ اسی دن اس کے اپنے وطن میں عید کا دن پڑ رہا ہو۔ دوسرے الفاظ میں، اگر اس کے ملک میں سعودی عرب میں منائی جانے والی عید کے بعد عید ہو رہی ہے تو یہ اس کی پسند پر ہے کہ وہ دونوں ملکوں میں آنے والی نویں ذی الحجہ میں سے کسی ایک دن کو منتخب کرلے۔ اور اگر وہ ایک تاریخ منتخب کرلیتا ہے تو بہتر ہوگا کہ اپنے ملک کی تاریخ کے مطابق انتخاب کرے۔ یہاں پر سوال ۲ میں بیان کی گئی الجھن دور کرنا بھی مناسب ہوگا۔

آسٹریلیا ان علاقوں میں سے ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور زیادہ تر اپنے آبائی وطن کے حوالے سے، اپنی روایات کے کسی حد تک پابند ہو کر قیام پذیر ہیں۔ ماضی میں مسلم اقلیت غلط روایات اور دینی علم و شعور کی کمی کی وجہ سے، اور کچھ نوآبادیاتی استعمار کے سبب بھی، باہمی اختلافات کا شکار رہی ہے اور اسی وجہ سے اس میں دینی شعور کی کمی اور دینی معیارات میں فرق واقع ہوگیا ہے، جو ناپسندیدہ سہی، لیکن افسوسناک حقیقت ہے۔ اب اس کا حل یہ ہے کہ جو لوگ اپنے آبائی وطن کے حوالے سے عید مناتے ہیں، ان کا موقف کچھ وزن دار نہیں ہے، کیونکہ وہ اس وقت اپنے وطن سے بہت دور ہوتے ہیں لہٰذا اپنی موجودگی کی جگہ کی تاریخ کو نظر انداز کرکے وطن کے حوالے سے عید منانا کوئی مضبوط بنیاد نہیں رکھتا۔

باقی رہے وہ دو گروہ، یعنی وہ گروہ جو عید الضحیٰ کو سعودی عرب کے قاعدے کے مطابق مناتا ہے، دوسرا وہ گروہ جو مقامی طور پر چاند دیکھ کر عید کا اہتمام کرتا ہے، یہی دونوں صورتیں درست ہیں۔ علماء کی اکثریت نے کہا ہے کہ دونوں میں کسی بھی طریقے کو حسب ضرورت اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے مناسب اجتہاد کی ضرورت ہے۔ اب اگر کسی کو اس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑے تو بہتر یہ ہوگا کہ مقامی آبادی میں اکثریت جس طریقے پر عمل کر رہی ہے اس کی تقلید کی جائے۔ مگر بدقسمتی سے عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ الگ الگ گروہ بندی کی بنیاد پر فیصلے ہوتے ہیں، جو کہ نہیں ہونے چاہئیں۔ اس کا حل یہی ہے کہ ایک مرکزی بااختیار ادارہ ہو جو مشترکہ طور پر سب کے لیے فیصلے کرے۔

اس سلسلے میں برطانیہ میں مقیم مسلم آبادی بھی مثبت رخ پر کام کر رہی ہے۔ باقی دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں میں اس قسم کے کسی ادارے کے قیام میں ابھی وقت لگے گا۔ اس وقت تک ان کو چاہیے کہ اپنے دینی شعور سے کام لے کر مناسب فیصلہ کریں اور اللہ سے رہنمائی اور امداد کی دعا بھی مانگیں۔

معاملات

- طہارت و پاکیزگی
- فقہی اختلافات
- معاشرتی آداب وتعلقات
- اقتصادی مسائل
- وراثت
- ازدواجی تعلقات
- خواتین کے مسائل
- غیر مسلم معاشروں میں رہنے والوں کے مسائل
- جدید دور کے مسائل
- متفرق سوالات

طہارت و پاکیزگی

پانی کی قلت میں غسل

سوال: ایک شخص کے پاس پانی کی تھوڑی سی مقدار ہے جو پیاس بجھانے کے کام آسکتی ہے، اس کے ساتھ اس شخص کو عبادات کی ادائیگی کے لیے غسل کرنا بھی فرض ہے۔ اس صورت میں اسے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: جو حالت بیان کی گئی ہے، اس میں تیمم کرنے کی اجازت ہے۔ تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو ہتھیلیوں کی جانب سے کسی خاک زدہ فرش، یا دیوار پر تھپتھپائیں۔ دونوں ہتھیلیوں سے مٹی جھٹک دیں یا پھونک مار کر دور کریں اس کے بعد یہ ہاتھ اپنے چہرے اور بازوؤں پر پھیریں۔ تیمم کرنے کے بعد ایک شخص کو وہی پاکیزگی حاصل ہوجاتی ہے جو غسل اور وضو کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ وہ قرآن پاک کی تلاوت کرسکتا ہے اور نماز ادا کرسکتا ہے تاہم جیسے ہی پانی میسر آئے، اسے مکمل طور پر لازماً غسل کرنا ہوگا۔

غسل، تیمّم اور عبادات

سوال: جنابت کی حالت میں بغیر غسل کیے کھانا، پینا، قرآن پاک کو ہاتھ لگانا یا اس کا پڑھنا جائز ہے یانہیں؟

جواب: جنابت کی حالت میں نماز ادا کرنے یا قرآن شریف کو ہاتھ لگانے اور پڑھنے کی ممانعت

ہے۔صرف ان قرآنی آیات کو دہرانے کی اجازت ہے جو خاص مواقع پر پڑھی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر سفر کے لیے کسی بھی قسم کی سواری پر سوار ہوتے وقت آپ دعا پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ دعائیں اور قرآنی آیات دل میں دہرانی چاہئیں۔ اس حالت میں زبان سے باآواز بلند ان کی ادائیگی کی اجازت نہیں ہے۔ حالت جنابت میں طواف کعبہ کی بھی اجازت نہیں۔ اسی طرح مسجد میں قیام بھی منع ہے۔ ان باتوں کے علاوہ باقی تمام کام کرنے کی اجازت ہے جن میں کھانا پینا، پڑھنا لکھنا اور خرید وفروخت وغیرہ شامل ہیں۔ یہ بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، پاکی حاصل کرنے کے لیے غسل کرلیا جائے۔ مسلمان کے لیے پاکیزگی اور طہارت کا اہتمام کرنا نہایت ضروری امور میں سے ایک ہے۔

وضو کے بعد کریم کا استعمال

سوال: وضو کے بعد کیا چہرے کی کریم یا پاؤڈر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان چیزوں کے استعمال سے وضو نہیں ٹوٹتا تو مزید کن اشیاء کے استعمال کی اجازت ہے؟

جواب: کئی چیزیں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، ان کی مختصر وضاحت ذیل میں کی جارہی ہے:

۱۔ جسم کے مخصوص حصوں سے گیس، رقیق یا ٹھوس شے خارج ہو تو وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

۲۔ کسی بھی حالت میں لیٹ کر سونے سے وضو قائم نہیں رہتا۔

۳۔ بے ہوش ہوجانے سے وضو جاتا رہتا ہے۔

۴۔ اسی طرح جسم کے مخصوص اعضاء کو چھونے سے وضو ساقط ہوجاتا ہے۔ (حنفیہ کے نزدیک اس صورت میں وضو ساقط نہیں ہوتا)۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اوپر وضو ٹوٹنے کے لیے جن امور کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں جسم کے ایسے حصوں پر جو وضو کے دوران دھوئے جاتے ہیں، کسی چیز مثلاً چہرے کی کریم یا پاؤڈر وغیرہ کا لگانا شامل نہیں ہے۔ تاہم اگر جسم کے کسی حصے پر کوئی ناپاک چیز لگ جائے تو نماز کی ادائیگی سے قبل اس چیز کو صاف کرنا ضروری ہوگا۔ کسی ناپاک چیز کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، لیکن ناپاک چیز کو دھو کر صاف کرنا اور کپڑے یا جسم کے اس حصے کو بھی اچھی طرح دھونا جہاں وہ چیز لگی تھی، ضروری ہوتا ہے۔

یہاں میں ناخن پالش کے استعمال اور وضو پر اس کے اثر کے بارے میں متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ ناخن پالش کے استعمال سے تو وضو نہیں ٹوٹتا، لیکن ناخن پالش میں ایسے اجزاء شامل ہوتے

ہیں جو وضو کے دوران پانی کو ناخنوں تک نہیں پہنچنے دیتے۔ اس لیے ناخن پالش لگا کر وضو کیا جائے تو وضو نہیں ہوگا لیکن وضو کر کے ناخن پالش لگائی جائے تو وضو پر اثر نہیں پڑے گا۔

خضاب کی وجہ سے وضو ہوتا ہے یا نہیں؟

سوال: کیا یہ درست ہے کہ خضاب لگانے والے شخص کی نماز ادا نہیں ہوتی کیونکہ وضو کے دوران خضاب کی وجہ سے پانی اس کے بالوں تک نہیں پہنچتا؟

جواب: بالوں کو رنگنے کے لیے کوئی چیز استعمال کرنے سے وضو پر اثر نہیں پڑتا۔ فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے والد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور ان کے قبول اسلام کا اعلان کیا۔ ان کے والد خاصے ضعیف العمر تھے اور ضعیفی کی وجہ سے ان کے تمام بال سفید ہوگئے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو مشورہ دیا کہ والد کے بالوں کو رنگنے کے لیے کوئی چیز استعمال کی جائے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بالوں کو رنگنے کے لیے ''حنا'' یا ''کتم'' کو بہترین قرار دیا۔ کتم، حنا (مہندی) کی طرح کی نبات ہے۔ کتم سے رنگنے سے بال کالے ہوجاتے ہیں جبکہ حنا لگانے سے بال سرخی مائل ہوتے ہیں۔

وضو کرتے وقت سر کا مسح کیا جاتا ہے۔ یعنی گیلے ہاتھ سر پر پھیر لیے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ اس فرد کے لیے بھی ہے جس کے سر پر گھنے بال ہوں اور ایسے شخص کے لیے بھی جس کے سر پر بال نہ ہوں (یعنی وہ گنجا ہو۔) بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ سر کے صرف ایک حصے کا مسح کرنا چاہیے لیکن بہترین یہی ہے کہ دونوں گیلے ہاتھوں سے پورے سر کا مسح کر لیا جائے۔

سامان آرائش اور وضو

سوال: بعض خواتین آرائش کے لیے لپ اسٹک اور ناخن پالش استعمال کرتی ہیں۔ ان چیزوں کے استعمال سے وضو پر کیا اثر پڑتا ہے؟

جواب: اگر آرائش کی یہ اشیاء دھل کر صاف ہوجاتی ہیں تو اس صورت میں یہ وضو کے دوران پانی کو جسم کے ان حصوں تک پہنچنے سے نہیں روکتیں جو وضو میں دھلنے چاہئیں۔ یہ وضو درست ہوگا۔ اگر وضو کے دوران ناخن پالش یا لپ اسٹک کی وجہ سے پانی جسم کے ان حصوں تک نہیں پہنچتا جہاں

اسے پہنچنا چاہیے تو اس صورت میں وضو مکمل نہیں ہوگا۔ عام طور پر ناخن پالش اور لپ اسٹک مزاحم آب ہوتی ہیں اور ان کی وجہ سے پانی جسم کے ان حصوں تک نہیں پہنچ پاتا۔ خواتین کو چاہیے کہ وضو کرنے سے پہلے ایسی اشیاء کو صاف کرلیں تاکہ یہ ان کے وضو کی درستگی میں رکاوٹ نہ بنیں۔ وضو کے درست ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ وضو کے دوران جسم کے جن حصوں کو دھویا جاتا ہے، پانی ان حصوں تک پہنچنا چاہیے۔

خواتین اور بچیاں ہاتھوں اور بالوں میں مہندی استعمال کرتی ہیں، مہندی ہاتھ اور بالوں کو رنگ دار بنا دیتی ہے چونکہ اس کی تہ نہیں ہوتی اس لیے یہ وضو کو متاثر نہیں کرتی۔ اس کے برخلاف ناخن پالش یا لپ اسٹک ایک تہ کی شکل میں ہوتی ہے جس کی وجہ سے وضو کے دوران پانی نہیں پہنچ پاتا اور وضو مکمل نہیں ہوتا۔

غسل خانے اور بیت الخلاء میں وضو

سوال: آج کل فلیٹوں یا جدید طرز کے مکانوں میں غسل خانہ اور بیت الخلاء ایک ہی کمرے میں ہوتا ہے۔ ایسے مشترکہ غسل خانے میں وضو کرتے وقت یا نہاتے وقت پاکیزگی کے لیے قرآنی آیات یا مقدس کلمات ادا کرنا جائز ہے۔ اس سوال کا جائزہ اس بات کو پیش نظر رکھ کر کرلیا جائے کہ بیت الخلاء میں اللہ کا نام لینے یا قرآن مجید کی آیات تلاوت کرنے کی ممانعت ہے۔

جواب: بیت الخلاء کے حوالے سے آپ نے جس پابندی کا ذکر کیا ہے وہ درست ہے۔ ہمیں اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ بیت الخلاء میں اللہ کا نام لیں یا کوئی ایسی چیز وہاں لے کر جائیں جس پر اللہ کا نام یا قرآنی آیات تحریر ہوں، الا یہ کہ یہ چیز حفاظتی غلاف میں اچھی طرح لپٹی ہوئی ہو اور اس کے گرنے کا اندیشہ نہ ہو۔ بیت الخلاء کی طرف جاتے وقت جو دعا پڑھنے کی ہدایت کی گئی ہے وہ بیت الخلاء کی طرف جانے کے دوران پڑھی جاتی ہے بیت الخلاء کے اندر نہیں پڑھی جاتی۔ جب حاجت ضروری سے فارغ ہولیا جائے اور بیت الخلاء سے باہر نکلا جائے تو صرف ''میں تیری پناہ مانگتا ہوں'' کے الفاظ کہے جاسکتے ہیں۔ آپ اگر توجہ دیں تو محسوس ہوگا کہ ان الفاظ میں اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

وضو کے وقت جسم کے اجزاء دھوتے وقت دعا پڑھنے کا طریقہ مصدقہ نہیں ہے۔ وضو کرتے وقت صرف وضو کی نیت کرنا کافی ہے لہٰذا وضو کے وقت مشترکہ غسل خانہ میں دعا پڑھنے کا مسئلہ باقی نہیں رہتا۔

طہارت اور کپڑوں کی دھلائی

سوال: ایک شخص دوسروں کے کپڑے دھونے کا کام کرتا ہے۔ بعض کپڑے نہایت گندے ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کو کام کے دوران اپنی نمازیں کس طرح ادا کرنا چاہئیں، کیا اسے ہر نماز سے پہلے غسل کرنا ہوگا؟

جواب: نماز کی ادائیگی سے پہلے مکمل غسل صرف اسی صورت میں لازمی ہے جب آدمی جنابت کی حالت میں ہو۔ جنسی عمل کے نتیجے میں حالت جنابت پیدا ہوتی ہے جسے دور کرنے کے لیے غسل ضروری ہے۔ جو شخص دوسروں کے کپڑے دھوتا ہے وہ کپڑے دو طرح کے ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ محض میلے ہوں، اور دوسری صورت یہ کہ وہ نجس ہوں۔

پہلی صورت میں کپڑے دھونے والے کو نماز کی ادائیگی کے لیے صرف یہ کرنا ہوگا کہ کام مکمل کرکے یا روک کر، خود کو صاف کرلے۔ نجس کپڑے دھوتے وقت یا اس صورت میں کہ نجاست، دھونے والے کے جسم یا کپڑوں پر لگ جائے، اسے یہ کرنا چاہیے کہ پہلے نجاست کو دور کرے اور اس کے بعد اپنے کپڑے یا جسم کے اس حصے کو پانی سے دھولے جہاں نجاست لگی تھی۔ صفائی کا یہ کام عام صابن سے کیا جاسکتا ہے۔

کپڑے دھونے والے ایسے شخص کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ اسے کام کرتے وقت اپنے عام لباس کے اوپر حفاظتی لباس پہننا چاہیے۔ دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کام کرتے وقت وہ اپنا عام استعمال کا لباس تبدیل کرکے ڈانگری وغیرہ پہن لے اور کام ختم کرکے اپنا عام لباس پہنے۔ ظاہر ہے اپنا عام لباس پہننے سے پہلے اسے خود کو صاف کرنا ہوگا۔

لباس پہن کر غسل کرنا کب ضروری ہے؟

سوال: بعض حضرات اصرار کرتے ہیں کہ غسل کرتے وقت پاجامہ یا پتلون پہنے رہنا چاہیے۔ کیا یہ طریقہ درست ہے؟

جواب: جب ہم مذہبی تقاضے کے تحت غسل کرتے ہیں تو یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ جسم کا ہر حصہ اچھی طرح دھل جائے اس کے ساتھ ہی یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ غسل کرتے وقت شرم گاہ یا اس کے قریب کے حصوں کو کوئی دیکھ نہ سکے۔ اگر غسل کسی بند جگہ کیا جارہا ہے جیسا کہ آج کل عموماً گھروں میں غسل خانے ہوتے ہیں، تو غسل کرتے وقت جسم پر لباس پہنے رکھنا ضروری نہیں ہے۔

بہتر یہ ہوگا کہ پورا لباس اتار کر غسل کیا جائے تاکہ جسم کے تمام حصے اچھی طرح دھوئے جاسکیں۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی کھلی جگہ مثلاً سمندر، دریا یا نہانے کے تالاب (سوئمنگ پول) میں یا کسی کھلے مقام (عوامی نلکے، کنوئیں) پر غسل کر رہا ہے تو اسے یہ احتیاط کرنا ہوگی کہ پردے کا اہتمام کرے یا کم سے کم ایسا لباس پہنے رہے جس سے اس کی ستر پوشی ہوسکے۔

کپڑے پہن کر غسل کرنا

سوال: غسل کرتے وقت کیا تمام کپڑے اتار دینے چاہئیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ غسل کے وقت کمر سے گھٹنوں تک کا حصہ ڈھنپا رہنا چاہیے۔ براہ کرم وضاحت کیجیے؟

جواب: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زندگی کے ہر معاملے میں ہماری رہنمائی کی ہے اور جو ہدایات دی ہیں ان پر خود عمل کر کے بتایا ہے۔ ایک انسان کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت باحیا تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شرم و حیا کے سلسلے میں انتہائی اعلیٰ اقدار پر عمل کیا ہے۔ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کسی میدان یا کھلے علاقے میں خود کو کھولنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو آپؐ نے ایسا مقام منتخب کیا، جہاں آپ کو دیکھا نہ جاسکے۔ ایک بار آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے ساتھ سفر میں تھے کہ آپ کو غسل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آپؐ نے غسل کے لیے ایسا مقام منتخب کیا جہاں سے آپؐ کو پشت سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ اس کے بعد آپؐ نے ایک صحابیؓ سے کہا کہ وہ ایک بڑی چادر سے پردہ تان لیں تاکہ آپ غسل کرسکیں۔ اس حدیث سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کرتے وقت خود کو کمر سے گھٹنوں تک نہیں ڈھانپا تھا، کیونکہ اس صورت میں آپؐ ان صحابیؓ کو یہ ہدایت نہیں فرماتے کہ وہ بڑی چادر سے پردہ تان لیں۔

اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اگر آپ اپنے گھر کے اندر غسل خانے میں نہا رہے ہیں تو غسل کے وقت کوئی کپڑا پہننے کی ضرورت نہیں ہے۔ غسل کے لیے پورے جسم کو دھونا اور اس پر پانی ڈالنا ضروری ہے۔ اگر آدمی لباس پہنے رہے تو یہ شرط پوری نہیں ہوتی۔ اسلام دین فطرت ہے اور زندگی کے ہر معاملے میں ایسے سہل طریقے بتاتا ہے جو زیادہ عملی اور ہماری فطرت سے قریب ہیں۔ میرے رائے میں تو بند غسل خانے میں کپڑا پہن کر غسل کرنا غیر فطری طریقہ ہے۔ کپڑا پہن کر آدمی اپنے جسم کی صحیح طریقہ سے صفائی نہیں کرسکتا اور نہ ہی غسل کے تقاضے پورے کرسکتا ہے۔

وضو میں پاؤں پر مسح کرنا

سوال: جنوبی بھارت سے شائع ہونے والے تامل زبان کے ایک مذہبی رسالے میں، میں نے پڑھا ہے کہ ایک مسلمان وضو کرتے وقت (پاؤں دھونے کی بجائے) اپنے پاپوش پر گیلے ہاتھ پھیر سکتا ہے، بشرطیکہ یہ چمڑے کے ہوں۔ کپڑے کے بنے ہوئی کسی پاپوش پر مسح کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ لکھنے والے نے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے دلیل یہ دی ہے کہ جراب، عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ''چرمی موزے'' ہیں۔ کیا یہ بات درست ہے؟

جواب: جراب'' کے جو معنی رسالے میں لکھنے والے صاحب نے دیئے ہیں وہ میرے لیے حیرانی کا باعث ہوئے۔ یہ بات درست نہیں ہے کہ جراب کے معنی صرف ''چرمی موزے'' ہیں۔ عربی کی ایک بہترین لغت کے مطابق جراب کے معنی ''پاپوش'' ہیں۔ لغت میں یہ درج نہیں ہے کہ یہ لازماً کسی خاص چیز کے بنے ہوئے ہوں۔

میرے خیال میں مصنف کو جو ابہام ہوا اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ کا ذکر ''خف'' کے استعمال کے ذیل میں ہے جو عام طور پر چمڑے کا بنا ہوتا ہے۔ شکل میں یہ جوتے کی طرح ہوتا ہے لیکن اس میں ایڑی نہیں ہوتی۔ علماء کی متفقہ رائے یہ ہے کہ موزوں کے اوپر مسح کرنے کی جو رعایت دی گئی ہے، وہ پاؤں ڈھانپنے والے ہر لباس کے لیے ہے خواہ وہ موزے ہوں یا جوتے۔ اس رعایت کو استعمال کرنے کا ذکر ایک حدیث میں ہے، جس کے مطابق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وضو کر رہے تھے اور ایک صحابی (رضی اللہ عنہ) پانی ڈال کر وضو میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کر رہے تھے۔ جب صحابیؓ آپؐ کے قدم مبارک پر پانی ڈالنے کے لیے تیار ہوئے تو آپؐ نے اشارے سے بتایا کہ پاؤں دھونے کی ضرورت نہیں ہے، موزوں پر گیلا ہاتھ پھیرنا کافی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب میں نے موزے پہنے تو یہ (پاؤں) پاک تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کے بعد موزے پہنے تھے۔

غالباً یہاں اس حکم کی وضاحت مفید ہوگی کہ اگر آپ نے صبح وضو کیا ہے یا دن کے کسی بھی وقت وضو کیا ہے اور اس کے بعد موزے یا جوتے پہنے ہیں تو موزے یا جوتے پہنتے وقت محض دل میں ارادہ کر لینا کافی ہوگا۔ آپ یہ نیت کر سکتے ہیں کہ اس رعایت (وضو کے دوران موزوں یا جوتوں پر مسح کرنا) سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس نیت کے لیے زبان سے الفاظ کی ادائیگی ضروری نہیں ہے۔

پاؤں پر مسح کرنے کے لیے گیلے ہاتھ کا، پاؤں (موزے یا جوتے) کے تھوڑے سے حصہ پر پھیرنا کافی ہے۔ آپ ایک بار نیت کر کے ۲۴ گھنٹے تک اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں بشرطیکہ اس دوران آپ موزے یا جوتے نہ اتاریں۔ اگر آپ نے موزے یا جوتے اتار دیئے تو اگلا وضو کرتے وقت آپ کو پاؤں پانی سے دھونے ہوں گے۔ ملازمت پیشہ افراد کو فرائض کی ادائیگی کے دوران اس رعایت سے بہت سہولت ہوتی ہے۔ یہ رعایت خاص طور پر غیر مسلم معاشروں (ممالک) میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے بہت مفید ہے۔

اگر موزوں پر مسح کرنے سے وضو ہو جاتا ہے تو ناخن پالش کے ساتھ وضو کیوں نہیں ہو سکتا؟

سوال: یہ کہا جاتا ہے کہ اگر ایک خاتون ناخن پالش کے ساتھ وضو کرے تو اس کا وضو نہیں ہوگا جبکہ دوسرے طرف پیر دھونے کے بجائے موزوں کے اوپر گیلا ہاتھ پھیرنے سے وضو ہو جاتا ہے۔ اگر ایک خاتون مخصوص ایام کے بعد غسل کر کے ناخن پالش استعمال کرے تو اگلے وضو سے پہلے اسے اتارنا کیوں ضروری ہے جبکہ دوسری جانب وہ موزے پہن کر وضو کر سکتی ہے۔ براہ کرم وضاحت فرمایئے؟

جواب: آپ نے جو صورتحال پیش کی ہے منطقی طور پر وہ درست ہے۔ بظاہر یہ موازنہ صحیح لگتا ہے لیکن عبادات کے معاملات کا فیصلہ منطق اور دلیل کی بنیاد پر نہیں کیا جاتا۔ عبادات میں ہم ان ہدایات اور اس سنت کو سامنے رکھتے ہیں جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خالق کائنات نے اپنا پیغامبر بنا کر انسانوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث فرمایا اور ایمان و عبادات کے معاملات میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایات قطعی ہیں۔ ایک یا دو مواقع پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو ہدایات دیں وہ متعلقہ صورتحال میں بظاہر بہترین طریقہ نہیں تھیں، لیکن وہ معاملات ایسے تھے جن کا دین سے تعلق نہیں تھا۔ جہاں تک اللہ کے پیغام کا تعلق ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیغام مکمل طور پر اور اپنی اصل حالت میں ہم تک پہنچا دیا ہے۔ دین کے معاملات میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو کچھ بھی فرمایا ہے وہ حتمی اور درست ہے۔ علاوہ ازیں عبادات کے معاملے میں جو ہدایات ہمیں دی گئیں وہ اللہ کی جانب سے ہیں کہ وہ ہم سے کیا تقاضا کرتا ہے کہ اللہ کی عبادات کس طرح کی جائیں۔ عبادات کے سلسلے میں اللہ کے رسول صلی اللہ وآلہ وسلم کی واضح ہدایت ہے کہ ”عبادات اس طرح

کرو جس طرح مجھے کرتے ہوئے دیکھتے ہو۔'' جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) حج کے لیے تشریف لے گئے تو فرمایا ''اپنے ارکان حج مجھ سے سیکھو'' ان واضح احکامات کی موجودگی میں ہم عبادات سے متعلق معاملوں کا فیصلہ دلیل اور منطق کی بنیاد پر نہیں کر سکتے بلکہ ان کے لیے وہ ہدایات پیش نظر رکھنا ہوں گی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہیں۔

وضو کرتے وقت اگر جسم کا وہ حصہ جسے دھویا جانا ضروری ہے، ڈھنپا ہوا ہو تو پانی اس حصے تک نہیں پہنچے گا لہٰذا وضو نامکمل رہے گا۔ ناخن پالش کی وجہ سے پانی ناخن کی سطح تک نہیں پہنچتا اس لیے وضو نہیں ہوتا۔ موزوں کے اوپر مسح کرنے کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایسا کیا ہے، چنانچہ اس کی اجازت ہے۔ لیکن یہ اجازت صرف موزوں اور جوتوں کے لیے ہے جسم کے کسی اور حصے کے لباس کے لیے یہ اجازت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم دستانوں کے اوپر مسح کرنا چاہیں تو وضو نہیں ہوگا۔

برہنہ دیکھنے سے وضو متاثر ہوتا ہے؟

سوال: کیا کسی دوسرے شخص کو برہنہ دیکھنے سے وضو ختم ہو جاتا ہے۔ اگر مرد کسی عورت کو برہنہ دیکھ لے تو کیا اس کا وضو قائم رہے گا؟

جواب: کسی شخص کو برہنگی کی حالت میں اتفاقیہ دیکھنے سے وضو نہیں ٹوٹتا لیکن اگر اس طرح دیکھنے سے جنسی جذبات انگیز ہوتے ہوں تو بہتر ہوگا کہ نماز ادا کرنے سے پہلے دوبارہ وضو کر لیا جائے۔ اگر ایک مرد کسی خاتون کو برہنہ سر دیکھ لے تو اس سے وضو ساقط نہیں ہوگا۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مسلمان مردوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ عورتوں کے سامنے آنے پر وہ اپنی نگاہ نیچی رکھیں، اسی طرح عورتوں کے لیے بھی یہ حکم ہے کسی مرد کے سامنے آنے پر وہ نگاہیں جھکائے رکھیں۔

بوسہ لینے سے وضو ساقط ہو جاتا ہے؟

سوال: اگر شوہر وضو کے بعد بیوی کو چھو لے یا بوسہ کرے تو کیا وضو ساقط ہو جائے گا۔

جواب: شافعی مسلک کے مطابق اگر ایک مرد کسی ایسی عورت کو چھو لے جس سے شرعاً اس کا نکاح ہو سکتا ہے، تو وضو ساقط ہو جاتا ہے، ان میں بیوی بھی شامل ہے اور یہ شرط بھی ہے کہ یہ چھونا ارادی ہو یا اتفاقاً سرزد ہو جائے۔ اس اصول کے حق میں شافعی مسلک کے علماء قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ کا حوالے دیتے ہیں جس کے مطابق عورت کو چھونے سے وضو قائم نہیں رہتا۔ دوسرے

مسالک کے علماء قرآن حکیم کی اس آیت کی تشریح دوسرے طریقے سے کرتے ہیں۔ بعض کی رائے ہے کہ یہاں لفظ ''چھونے'' کا مطلب اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت ہے۔ بعض احادیث مبارکہ اور سنت (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ محض چھونے یا عمومی بوسے سے وضو متاثر نہیں ہوتا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روزے سے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بوسہ لیا اور فرمایا ''بوسہ نہ تو وضو کو ساقط کرتا ہے اور نہ روزے کو ختم کرتا ہے۔'' اس حدیث کی روشنی میں یہ بات کہنا درست ہوگا کہ ایک عمومی بوسے یا چھونے سے وضو متاثر نہیں ہوتا۔

بیوی یا کسی خاتون کا ہاتھ چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال: اگر کوئی شخص اپنی بیوی یا کسی اور خاتون کا ہاتھ چھولے تو کیا اس کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ اگر ہاں، تو کیوں؟

جواب: قرآن مجید کی جس آیت میں نماز سے پہلے وضو کے طریقے کی وضاحت کی گئی ہے، اسی آیت میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے ''عورتوں کو چھونے'' سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ تمام علماء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ اس حکم کا اطلاق ان خواتین کو چھونے پر نہیں ہوتا جن سے شادی کی اجازت نہیں ہے، یا جو محرم شمار ہوتی ہیں۔ یعنی ماں، بیٹی، بہن، بھانجی، بھتیجی وغیرہ۔ اس حکم کا اطلاق بیوی یا ہر ایسی نامحرم خاتون پر ہوتا ہے جو بلوغت کی عمر کو پہنچ چکی ہو اور عام حالات میں جس سے شادی کی جاسکتی ہو۔ اس حکم کا اطلاق مرد اور عورت، دونوں پر یکساں ہے۔ اگر ایک مرد نے وضو کرلیا ہے اور اس کے بعد وہ کسی ایسی خاتون کو چھوتا ہے تو مرد اور عورت دونوں کو دوبارہ وضو کرنا ہوگا۔

بعض علماء اس آیت کی تشریح مختلف انداز سے کرتے ہیں شافعی مکتب فکر کے مطابق اگر مرد اور عورت کے درمیان تعلق اس طرح ہو کہ درمیان میں کوئی کپڑا نہ ہو تو وضو ساقط ہو جائے گا۔ حنفی مکتب فکر کے مطابق اگر عورت اور مرد کے درمیان جنسی تعلق ہو تب وضو ساقط ہوگا۔ ان کی رائے میں بیوی اور شوہر کے درمیان صحبت کے نتیجے میں دونوں کا وضو ساقط ہو جائے گا۔ بعض دیگر علماء اسی آیت کی تشریح کسی اور طریقے سے کرتے ہیں۔ وہ حادثاتی اتصال یا ملاپ میں اور بالارادہ ایسے اتصال میں جس میں ذہن میں جنسی خیال شامل ہو، فرق کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں حادثاتی اتصال سے وضو نہیں ٹوٹتا، جبکہ دوسری صورت میں وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ میری رائے میں آخری رائے، اس آیت کے اصل مفہوم کے زیادہ قریب ہے۔

غسل اور پاکیزگی

سوال: کیا ایک خاتون کے لیے یہ لازمی ہے کہ جسم کے مخصوص حصے سے مادہ خارج ہونے کے بعد مکمل غسل کرے۔ خواہ ایسا کسی خاص وجہ کے بغیر اور دن میں کسی بھی وقت ہوا ہو؟

جواب: پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے مکمل غسل کرنا ایک عورت کے لیے اس وقت لازمی ہے جب اس کے مخصوص ایام ختم ہوگئے ہوں یا زچگی کے بعد خون بند ہوگیا ہو۔ مرد اور عورت دونوں کے لیے جنسی اختلاط کے بعد غسل فرض ہو جاتا ہے خواہ اس عمل میں جزوی رسائی ہوئی ہو۔ مرد کے لیے غسل انزال کے بعد بھی فرض ہوتا ہے خواہ یہ ارادی ہو یا غیر ارادی۔

درج بالا وضاحت کے بعد آپ کے سوال کا جواب آسان ہوجاتا ہے کہ اخراج کی جو صورت آپ نے بیان کی ہے اس میں غسل فرض نہیں ہوتا، اسے پیشاب کے طور پر ہی سمجھا جائے گا اور اس صورت میں صرف وضو واجب ہوگا۔ اگر یہ قطرے جسم یا لباس کے کسی حصے پر گر جائیں تو جسم یا لباس کے متاثرہ حصے کو دھونا ہوگا۔ متاثرہ حصے یا لباس کو دھو لینے کے بعد اگلی نماز کی ادائیگی کے لیے آپ کو حسب معمول وضو کرنا ہوگا۔

اگر شبہ ہو کہ یہ اخراج حیض کا آغاز یا اختتام ہے تو اس شبہ کو دور کرنا ضروری ہے کیونکہ دونوں صورتوں میں احکامات علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اگر اخراج شدہ مادہ سفید ہے تو یہ بات یقینی ہے کہ اس صورت میں غسل کی ضرورت نہیں ہوگی۔

نفاس کی حالت میں قرآن مجید پڑھنا

سوال ۱: کیا خواتین کو اس بات کی اجازت ہے کہ جب وہ ایام سے ہوں یا نفاس کی حالت میں ہوں تو قرآن پاک کے نسخے یا حدیث کی کسی کتاب کو ہاتھ لگائیں۔ کیا وہ اس حالت میں اپنی یادداشت سے قرآنی آیات کی تلاوت کرسکتی ہیں یا تسبیح پر ذکر کرسکتی ہیں؟

سوال ۲: کیا بغیر وضو کے قرآن مجید کو چھوا جاسکتا ہے۔ اس بارے میں میں نے مختلف علماء کی مختلف رائیں پڑھی ہیں، براہ کرم آپ اپنی رائے کی وضاحت کیجیے؟

جواب: اوپر جو دو سوال پیش کیے گئے ہیں وہ ان بہت سے سوالات کی نمائندگی کرتے ہیں جو ان موضوعات پر اکثر پوچھے جاتے ہیں۔ اس میں حیرانی کی بات بھی نہیں ہے کیونکہ یہ ایسے معاملات

ہیں جن سے ہمارا واسطہ روز مرہ زندگی میں پڑتا رہتا ہے۔ اس لیے ان موضوعات سے متعلق شکوک وشبہات کی وضاحت وقتاً فوقتاً ہوتی رہنی چاہیے۔

تمام مکاتب فکر کے علماء اس پر متفق ہیں کہ قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے وضو کرنا بہتر ہے، خواہ یہ تلاوت کسی کتاب سے کی جارہی ہو یا حافظہ سے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء یا تسبیح پر ذکر کرنے سے پہلے بھی وضو کر لینا بہتر ہے۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جب کوئی شخص قرآن مجید کے نسخے کو ہاتھ میں لینا چاہے یا پڑھنا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے وضو کرے، لیکن اپنے موقف کی حمایت میں وہ جو شہادت پیش کرتے ہیں اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن مجید کی تلاوت یا اسے ہاتھ لگانے کے لیے وضو کرنا لازمی شرط ہے۔ لہذا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ قرآن مجید کو پڑھنے یا اسے ہاتھ میں لینے سے پہلے وضو کرنا لازمی شرط تو نہیں ہے لیکن وضو کر لینا زیادہ بہتر ہے۔

کوئی خاتون اپنے ایام کے دنوں میں یا جب وہ نفاس کی حالت میں ہو یا کوئی مرد جب وہ جنابت کی حالت میں ہو، قرآن مجید کی تلاوت کسی کتاب سے یا حافظہ سے اس وقت تک نہیں کرسکتی یا کرسکتا، جب تک اس (خاتون) کی ناپاکی کی حالت دور نہ ہوجائے یا مرد غسل کرکے پاکیزگی حاصل نہ کرلے۔ اگر کسی کتاب یا کاغذ پر دوسرے تحریری مواد کے ساتھ قرآن مجید کی کوئی آیت بھی تحریر ہو، تو اس کتاب یا کاغذ کو نفاس یا جنابت کی حالت میں ہاتھ میں لیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے غسل ضروری نہیں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بازنطینی بادشاہ کو ایک خط لکھوایا جس میں قرآن مجید کی آیات بھی درج تھیں۔ بازنطینی بادشاہ غیر مسلم تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے باخبر تھے کہ جب اسے یہ خط پہنچے گا تو وہ اسے ہاتھ میں لے گا اور یہ بات بھی واضح ہے کہ غیر مسلم، جنابت کو دور کرنے کے لیے وہ احتیاطیں نہیں کرتے جو مسلمان ضروری سمجھتے ہیں۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیگر مواد کے ساتھ قرآنی آیات تحریر ہوں تو اس کاغذ کے لیے طہارت ضروری نہیں ہے۔ اللہ کی حمد وثناء یا ذکر کے لیے ''سبحان اللہ'' ''الحمدللہ'' یا ان جیسی تراکیب شامل کرنا درست ہے۔ ذکر کے لیے تسبیح کا استعمال ضروری نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ہدایت کی گئی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی تسبیح استعمال نہیں کی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جب اللہ کا ذکر فرماتے تو انگلیوں پر شمار فرماتے تھے۔

فقہی اختلافات

چار فقہی مکاتب فکر کے نہ ماننے والے دوزخی ہیں!

سوال: بعض حضرات جو نہایت اصرار کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ وہ چار معروف مکاتب فکر میں سے کسی کا بھی اتباع نہیں کرتے، یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان چاروں مکاتب فکر کے ماننے والے دوزخ میں جائیں گے۔ براہ کرم واضح کیجیے کہ ان کے اس دعویٰ میں کتنی صداقت ہے۔ اگر ان کی یہ بات صحیح نہیں تو پھر ایسے لوگوں کا انجام کیا ہوگا جو کسی بھی مکتب فکر کو نہیں مانتے؟

جواب: مسلمان معاشرہ آج جن حالات کا شکار ہے، آپ کا سوال اس کا ایک عکس ہے۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ آج کے مسلمان روز محشر، دوسروں کے انجام کے بارے میں فیصلے دینے لگے ہیں۔ یہ صورتحال مسلمانوں کے بعض گروہوں کی تنگ نظری اور محدود انداز فکر کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔ گو ان میں سے بعض دوسروں کے انجام کے بارے میں فیصلے صادر نہیں کرتے، لیکن ان کا یہ اصرار ضرور ہوتا ہے کہ صرف ان کا طریقہ، یا نقطہ نظر اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل قبول ہے۔ ان لوگوں کی تنگ نظری کا دوسرا اظہار یہ ہے کہ یہ حضرات چند مخصوص سوالات اور بعض امور کی غیر اہم تفصیلات اور جزئیات پر شدت کے ساتھ اصرار کرتے ہیں اور انہیں نمایاں کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ اگر نماز کے دوران آپ کے پائنچے گھٹنوں اور ٹخنوں تک کے درمیانی حصہ رہوں تو آپ کی نماز نہیں ہوگی۔

اس قسم کی محدود فکر اور تنگ نظری، اس دور میں کہیں نظر نہیں آتی، جب مسلمان ایک غالب قوت کے طور پر دنیا میں سرخرو تھے، آپ کو جب بھی ایسی مستحکم مسلم مملکت نظر آئے گی، جہاں اسلام کو دوراندیشی اور حکمت کے ساتھ نافذ کیا گیا ہو، وہاں رواداری اور کشادہ نظری کا ماحول ملے گا۔ صرف کمزوری اور پسماندگی کے زمانے میں، جیسا کہ ہمارا آج کا دور ہے، اس قسم کے تنگ نظر افراد

ملیں گے، جو صرف خود کو اسلام کا سچا پرچارک سمجھتے ہیں۔ یہ صورتحال نہایت افسوسناک ہے۔

بعض ایسے حضرات سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے، جو مسلمانوں کو یہ ترغیب دیتے ہیں کہ ایسے حالات سے بچنے کی کوشش کی جائے جہاں چار مکاتب فکر میں سے کسی کے اتباع کی ضرورت پیش آئے۔ ان کا انداز فکر یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس دور کی طرف پلٹ جانا چاہیے جو چاروں ائمہ (حضرت امام ابو حنیفہؒ، حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ) سے پہلے کا دور تھا۔ ان حضرات سے تبادلۂ خیال میں مجھے ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف رہا، لیکن ان میں کسی نے بھی کبھی یہ نہیں کہا کہ چاروں مکاتب فکر کا اتباع کرنے والے جہنم میں جائیں گے، مجھے یقین ہے کہ یہ نقطۂ نظر بہت محدود لوگوں کا ہے اور امید ہے کہ آئندہ بھی صرف چند لوگوں تک محدود رہے گا۔

یہ تصور کرنا کہ ایک مسلمان اتنا بے باک ہو جائے کہ دوسرے مسلمانوں کے لیے دوزخ (یا جنت) کے انجام کا فیصلہ دے، انسان کو دہشت زدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ تسلیم کرنا ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک مسلمان خود کو دوسرے مسلمانوں کے انجام کے بارے میں اس قسم کے فیصلے صادر کرنے کا اہل سمجھ لے۔ یہ اختیار تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ نہ تو کوئی شخص ایسا اختیار غصب کرسکتا ہے، جو صرف اللہ تعالیٰ کو زیبا ہو اور نہ ہی کوئی خود کو اس مرتبہ پر فائز کرسکتا ہے، جو (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کا ہم رتبہ ہو اور جہاں بیٹھ کر وہ دوسروں کے مقدر اور انجام کے بارے میں فیصلے دینے کی کوشش کرے۔ جو شخص دوسروں کے بارے میں فیصلہ کن باتیں کرتا ہو، اسے نہایت احتیاط کرنی چاہیے۔ ایسے شخص کو ہمیشہ اپنے سے یہ سوال کرتے رہنا چاہیے کہ وہ کہیں ایسا کردار تو انجام دینے کی کوشش نہیں کر رہا جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔

اس کم نظری کی بنیاد کسی ایسے صحیح اصول پر بھی ہوتی ہے جس کی غلط توضیح کی گئی ہو۔ مثلاً اصول یہ ہے کہ ایک مسلمان تمام معاملات اور ہر قسم کے حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے گا۔ اس اصول کی غلط توضیح اس طرح کی گئی کہ ہر مسلمان کو اس بات کا اہل تصور کرلیا گیا کہ کسی خاص معاملے اور حالات میں وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے واقف ہے۔

میں ایک مثال کے ذریعہ اس بات کی وضاحت کرتا ہوں:

ایک شخص جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ امام صاحب خطبہ پڑھ رہے ہیں۔ وہ شخص بیٹھ گیا اور خطبہ سننے لگا، امام صاحب نے اس شخص کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ کھڑا ہو جائے اور دو رکعت نماز تحیۃ المسجد ادا کرے۔ اس شخص نے جواب دیا کہ میں مالکی مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہوں، جس کے مطابق امام کے خطبہ دیتے وقت تحیۃ المسجد ادا کرنا مناسب

نہیں ہے۔ امام صاحب یہ جواب سن کر مشتعل ہوگئے۔ انہوں نے اس شخص سے جارحانہ انداز میں پوچھا ''کیا تم نے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع چھوڑ دیا ہے اور امام مالکؒ کا اتباع شروع کردیا ہے۔'' یہ سن کر وہ شخص پریشان ہوگیا، اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے سوال کا کیا جواب دے۔ امام صاحب نے اس موضوع پر اچھی خاصی تقریر کی کہ لوگ ایسے مواقع پر کس طرح یہ غلط فیصلہ کر لیتے ہیں۔

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کا یہ فیصلہ انتہائی غلط ہے، اگر کوئی شخص اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور کسی دوسرے شخص کے عمل میں سے کسی ایک کے انتخاب کی جسارت کرتا ہے تو وہ خود کو اسلام کے دائرے سے خارج کرلیتا ہے۔ مسلمانوں کو ہر قسم کے حالات میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کوشش میں وہ چار مکاتب فکر میں سے کسی ایک مکتب فکر کی ہدایت یا طریقہ کو اختیار کرسکتا ہے یا ان مکاتب فکر سے پہلے کے دور کے کسی ممتاز عالم دین کے طریقے کو اپنا سکتا ہے یا اپنی صوابدید پر کسی امام کے طریقے کی پیروی کرسکتا ہے۔

ماضی کے ان ائمہ کرام نے جو کام کیا ہے اور حال اور مستقبل کے ائمہ جو کام کریں گے وہ یہ ہے کہ اپنے علم کو انتہائی امکانی حد تک استعمال کرتے ہوئے عوام الناس کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا وہ راستہ دکھائیں اور بتائیں جو کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہو۔ اس کوشش میں ان کا رویہ تو یکساں ہوتا ہے لیکن وہ مختلف معاملات میں مختلف نتائج اخذ کرسکتے ہیں کیونکہ نتائج اخذ کرنے کے لیے ان کے طریقے مختلف ہوسکتے ہیں یا ان کا احادیث کا علم ایک دوسرے سے مختلف ہوسکتا ہے۔

اجتہاد کی اہمیت

قرآن وحدیث کی روشنی میں زندگی کے نئے تقاضوں سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل تلاش کرنے کی علمائے دین کی اس کوشش کو ''اجتہاد'' کہتے ہیں۔ مختلف معاملات یا مسائل کے بارے میں اسلام کا فیصلہ تلاش کرنے کی ہر موزوں طریقے کی کوشش کو 'اجتہاد' کہا جاسکتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر ''اجتہاد' کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے کہ جو شخص بہتر سے بہتر علم کی بنیاد پر یہ کوشش کرے اور کسی غلط نتیجے پر پہنچے اسے ایک اجر ملے گا، لیکن اگر وہ صحیح نتیجے پر پہنچے تو اسے دوگنا اجر ملے گا۔ یہ حدیث مبارکہ نہایت رواداری اور وسیع النظری کے رویہ کی مظہر ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اجتہاد' کے نتیجے میں جو شخص غلط فیصلہ کرے

اسے ایک اجر ملے گا، لیکن تنگ نظر لوگ ترقی اور علم کے اس پورے دور میں مسلمان علماء کی ''اجتہاد'' کی تمام کوششوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے پورے دور میں، مسلمان علماء بشمول چاروں ائمہ، اسلام میں وسیع النظری کے عنصر کو تسلیم کرتے آئے ہیں اور انہوں نے کبھی بھی اپنے لیے حکم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

مثال کے طور پر حضرت امام مالکؒ کا یہ قول ہمارے لیے نہایت اہم ہے جس میں انہوں نے کہا کہ فیصلہ کرنے والا عالم خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اس کے فیصلہ میں کوئی ایسی بات ہوسکتی ہے، جس پر ہمیں عمل نہیں کرنا چاہیے۔ امام مالکؒ نے کہا کہ ''ہر شخص کی بعض معاملوں میں پیروی کی جاسکتی ہے، اس کی بعض باتوں کو چھوڑا جاسکتا ہے۔ سوائے ان صاحب قبر کے'' اور یہ بات کہتے ہوئے امام مالکؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرقد کی جانب اشارہ کیا۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے نہایت جامع طور پر فرمایا ''جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ ہمارے نزدیک صحیح ہوسکتا ہے، لیکن اس میں غلطی کا احتمال ہوسکتا ہے۔ دوسرے علماء جو کہیں اور وہ ہمارے نقطۂ نظر سے مختلف ہو وہ ہمارے نزدیک غلط ہوسکتا ہے لیکن اس بات کا امکان ہے کہ وہ صحیح ہو'' گویا امام ابوحنیفہؒ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کی رائے ہر معاملے میں قطعی اور درست ہے۔ انہوں نے دوسرے علماء کی کوشش کو یہ کہہ کر برابر کی تکریم دی کہ وہ صحیح ہوسکتے ہیں اور میں غلط ہوسکتا ہوں۔

تاریخ میں ہمیں امام مالکؒ کا ایک اور واقعہ ملتا ہے۔ امام مالکؒ نے خلیفہ ابوجعفر منصور کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ اپنے اختیار کردہ فقہ کو پوری مسلم ریاست کا فقہ قرار نہ دیں۔ امام مالکؒ نے کہا کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی مملکت کے مختلف حصوں میں آباد ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے علم حدیث کا درجہ ایک دوسرے سے مختلف ہے، جبکہ منصور ایک طے شدہ فقہ سب کے لیے نافذ کرنا چاہتا ہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں زبردست ابہام اور انتشار پیدا ہوگا۔

تاریخ کے ان تمام واقعات کے باوجود، تنگ نظر افراد یہ کہتے ہیں کہ سچائی کا صرف ایک رخ ہوسکتا ہے! چنانچہ یہ بات صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی کو یہ ہدایت کی کہ جب امام خطبہ دے رہا ہو تو دو رکعت نماز تحیۃ المسجد ادا کرلی جائے، تو اس حدیث کی روشنی میں یہ مالکیؒ نقطۂ نظر غلط ہوگا، جس میں اس طریقہ کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس سوال کا ایک آسان جواب ہے جو (سعودی عرب کے ممتاز عالم دین) شیخ علی الطنطاوی اکثر اپنی تقاریر اور تحریروں میں دیتے ہیں۔ ''سچ'' تو یقیناً ایک ہی ہوتا ہے لیکن صحیح بات کے مختلف پہلو ہوسکتے ہیں، جو تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل قبول ہوں۔ دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ اس بات کو بھی قبول کرتا ہے کہ جب امام خطبہ دے رہا ہو تو دو رکعت نماز ادا کرلی جائے اور اس کے ساتھ ہی امام مالکؒ کا نقطۂ نظر

بھی قابل قبول ہے۔ دونوں طریقوں پر عمل کرنے والوں کو اجر ملے گا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اس عمل کو قبول کرتے ہیں جو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق کیا جائے اور ایسے اعمال کا اجر دیتے ہیں۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس بیان سے ابہام کا شکار ہو جائیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک عمل کا ایسا ہی اجر دیا جائے جو اس کے خلاف عمل کا دیا جائے اور دونوں کو صحیح تسلیم کیا جائے۔ اس اعتراض کے جواب میں میں ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے دوران پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں طریقوں کو صحیح قرار دیا۔

غزوہ موتہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودی قبیلہ بنو قریظہ کے خلاف تیاری کا حکم دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے مدینے میں یہ اعلان کرنے کی ہدایت کی کہ ہر وہ شخص جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر یقین رکھتا ہے، وہ عصر کی نماز بنو قریظہ کی بستی کے علاوہ کہیں اور ادا نہ کرے۔ یہ اعلان سنتے ہی صحابہ کرام اپنے ہتھیاروں کے ساتھ انفرادی طور پر اور گروہوں کی شکل میں بنو قریظہ کی سمت چل پڑے۔ عصر کی نماز میں تھوڑا ہی وقت تھا، بعض صحابہ کرام نے محسوس کیا کہ یہ اعلان معاملہ کی ہنگامی صورت کا احساس دلانے کے لیے تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ نہیں تھا کہ کوئی شخص عصر کی نماز قضا کرے۔ چنانچہ بعض صحابہ نے راستے میں رک کر عصر کی نماز ادا کی۔

بعض صحابہ نے اس اعلان کو اس کے لفظی معنیٰ میں لیا اور اس وقت تک عصر کی نماز ادا نہیں کی جب تک وہ بنو قریظہ نہیں پہنچ سکے۔ اس دوران عصر کی نماز کا وقت نکل چکا تھا، اس لیے ان حضرات نے عصر کی نماز سورج غروب ہونے کے بعد ادا کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں طریقوں پر عمل کرنے والے صحابہ کے اقدامات کو قبول کیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ دونوں کی نمازوں کو قبول کیا جائے اور جنگ میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہو۔

آج ہم میں سے کون یہ کہہ سکتا ہے کہ دونوں میں ایک گروہ غلط تھا، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو صحیح قرار دیا۔ اس معاملہ میں بھی سچائی تو ایک ہی تھی لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے جس عمل کو قبول کیا وہ مختلف نقطۂ نظر کے باوجود صحیح تھا۔

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کو وسیع النظر اور کشادہ ذہن ہونا چاہیے اور دوسروں کے اعمال کو محدود اور تنگ زاویہ سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ جو کوئی خود کو فیصلے صادر کرنے کی حیثیت دیتا ہے، وہ غلط کرتا ہے۔ لوگوں کے اعمال کو جانچنے اور فیصلے دینے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ وہ ان کے اعمال کا فیصلہ ان کی نیتوں کی روشنی میں کرتا ہے۔

قرآن مجید میں بعض معاملات کیوں نہیں ہیں؟

سوال: قرآن مجید میں بعض اہم معاملات کا ذکر کیوں نہیں ہے۔ مثلاً شادی کا طریقہ، نماز کیسے ادا کی جائے، اسلامی حکومت کا آئین، مغرب کے برف پوش ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کے مسائل، سنگسار کی سزا، حجر اسود اور ختنہ وغیرہ۔

جواب: آپ کے سوال کے جواب میں سب سے پہلے میں آپ کی توجہ بعض اہم حقائق کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص اسلام قبول کرتا ہے تو اسے نہایت واضح طور پر اپنے اس عقیدے کا اعلان کرنا ہوتا ہے کہ ''میں اقرار کرتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسولؐ ہیں۔'' مسلمان ہونے والا بنیادی طور پر ایمان ہی اس بات پر لاتا ہے کہ اس پوری کائنات کا واحد و یکتا مالک اور خالق اللہ تعالیٰ ہے، جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پوری انسانیت کے لیے بھیجے گئے، اللہ کے رسولؐ ہیں جنہوں نے اللہ کا آخری پیغام اس کے بندوں تک پہنچادیا ہے اور یہ پیغام انسانوں کے لیے ایسی زندگی گزارنے کا ضابطہ ہے جو اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دائمی خوشی اور فلاح کا ذریعہ ہے۔ کلمہ طیبہ کے دو حصے ہیں اور دونوں برابر کی اہمیت رکھتے ہیں۔ پہلے حصے میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعلان ہے اور دوسرے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا۔

دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا اور مسلمان کی حیثیت سے یہ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن میں جو کچھ نازل کیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ ہیں۔ قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے ''اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو۔'' یہ حکم کلام پاک میں متعدد مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک عام ہدایت یہ دی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ تمہیں دیں اس پر عمل کرو۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

سو جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو۔

(سورۃ ۵۹، آیت ۷)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنی یا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی سے منع کیا ہے اور تنبیہ کی ہے۔ ۳۳ ویں سورۃ میں ارشاد ہے:

اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو حق نہیں ہے کہ جب خدا اور اس کا رسول

(صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی امر مقرر کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں اور جو کوئی خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہ ہوگا۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عمل پیروی کے لیے بہترین نمونہ ہے:

اور جو تم میں سے خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فرمانبردار رہے گا اور نیک عمل کرے گا اس کو ہم دوگنا ثواب دیں گے اور اس کے لیے ہم نے عزت کی روزی تیار کر رکھی ہے۔ (سورۃ ۳۳ آیت ۳۱)

قرآن مجید کی ان تمام آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عالم انسانیت کے لیے تمام احکام ربانی، اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھیجے گئے ہیں۔ یہ بات ایک تیسری حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے جسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے اور یہ حقیقت، وہ ضمانت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغام کی ہمیشہ ہمیشہ حفاظت کی بارے میں دی ہے:

بیشک یہ نصیحت ہمیں نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔ (سورۃ ۱۰، آیت ۹)

بعض حضرات اس آیت کا مفہوم یوں لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے تحفظ کی ضمانت دی ہے لیکن غور کیجئے تو پتا چلے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں لفظ ''قرآن'' استعمال نہیں کیا بلکہ لفظ ''ذکر'' استعمال کیا ہے جو ایک عام لفظ ہے اور اس میں قرآن اور حدیث دونوں شامل ہیں۔

چوتھی حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر جو کچھ آسمانوں سے نازل ہوا وہ قرآن مجید تک محدود نہیں ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث قدسی کا ذکر کیا ہے وہ بھی اللہ کا کلام ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ احادیث مبارکہ ہیں جو مختلف معاملات کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت کردہ باتیں ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جن کا ذکر قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کے ذریعے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم درحقیقت قرآن مجید کی توضیح و تشریح ہے۔ اس لیے اس چیز کو اختیار کرنا جس کا حکم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے اور ہر اس چیز سے دور رہنا جس سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منع کیا ہے، ہر مسلمان پر لازم ہے۔

درحقیقت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا مطلب اللہ کی اطاعت ہے۔قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

جو شخص رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فرمانبرداری کرے گا تو بیشک اس نے خدا کی فرمانبرداری کی اور جو نافرمانی کرے تو اے پیغمبر تمہیں ہم نے ان کا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔ (سورۃ ۴، آیت ۸۰)

اس آیت سے یہ بات نہایت واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ تشریح کی اور حکم دیا وہ ہمارے ایمان کا جزو ہے اور ہمیں ان کی لازما اطاعت کرنی ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن مکمل ضابطہ حیات ہے، تو ہمارا مطلب اور ایمان یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے یہ ایک مکمل طریقہ کار ہے۔ اسلام میں قرآن وسنت دونوں شامل ہیں۔

اگر حدیث یا سنت کو ایک طرف رکھ دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اسلام کے صرف ایک جزو کو اختیار کررہے ہیں اور اپنے اس عمل سے اپنے ہی عمل کی تردید کررہے ہیں کیونکہ اس صورت میں ہم قرآن مجید کی ان آیات سے انکار کریں گے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے بارے میں ہیں۔

علاوہ ازیں یہ شرط عائد کرنا کہ ہر بات قرآن مجید میں شامل ہونی چاہیے، اس بات کی کوشش ہوگی کہ ہم اللہ تعالیٰ پر کوئی بات عائد کررہے ہیں (نعوذ باللہ۔) اس طرح کی کوئی بھی بات انسان کو اپنے خیال میں بھی نہیں لانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ مالک ومختار ہیں اور وہ جو مناسب سمجھتے ہیں، کرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ مناسب سمجھا ہے کہ دین کی بعض باتوں کی وضاحت پیغمبر اسلام کریں تو انسانوں کے لیے یہی بہترین راستہ ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دین کی بعض اہم باتوں کی وضاحت اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے یہ تو فرمایا ہے کہ حج کے ارکان کیا ہیں، لیکن ان ارکان کو کس طریقہ سے ادا کرنا چاہیے، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنفس نفیس حج ادا کرکے ہمیں بتایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پابندی کے ساتھ نماز کی ادائیگی کا حکم دیا ہے لیکن نماز میں کیا پڑھا جائے، نماز کس وقت ادا کی جائے، نماز کے وقت کا دورانیہ کتنا ہو اور نماز کی ادائیگی کا طریقہ کیا ہو، ان سب باتوں کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے، یہ تمام باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتائی ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید میں زکواۃ کی ادائیگی کا حکم متعدد بار دیا گیا ہے لیکن یہ وضاحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے کہ کتنی زکواۃ ادا کی جائے، زکواۃ کب ادا کی جائے اور

مختلف اقسام کے مال پر زکوٰۃ کیسے نکالی جائے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی بات کی وضاحت وتشریح، اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کرائی ہے تو وہ بات کم اہمیت کی نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ بات بھی اہم ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا ہے کہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی وضاحت بھی فرمائیں اور خود عمل کر کے صحیح طریقہ بھی نمونہ کے طور پر پیش کریں۔

آپ نے اپنے سوال میں بعض مثالیں پیش کی ہیں لیکن میرے نزدیک ان میں سے جو باتیں اہم ہیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے احکامات موجود ہیں اور دوسری باتیں اس قدر اہم نہیں ہیں جس قدر آپ نے انہیں سمجھا ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے اسلامی مملکت کے دستور کا ذکر کیا ہے۔ اسلامی مملکت کا دستور قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں موجود ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اسلامی حکومت شوریٰ کے نظام پر قائم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ ہم پر چھوڑ دیا ہے کہ یہ شورائی نظام کس طرح نافذ کیا جائے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کوئی ایسا سخت نظام اختیار نہ کرلیں جس پر عمل کرنا مختلف طبقوں کے لیے ناممکن ہو جائے۔

شمال کے برفانی ممالک میں رہنے والوں کے لیے بھی اسلام کے ضابطے موجود ہیں، البتہ اس علاقے کے مخصوص موسم اور حالات کی وجہ سے انہیں کچھ رعایتیں دی گئی ہیں۔ آپ نے حجر اسود اور ختنہ کا بھی ذکر کیا ہے لیکن یہ دونوں چیزیں کم اہمیت کی ہیں۔ ہر مسلمان بچے (مرد) کے لیے ختنہ کرانا سنت ہے۔

حجر اسود، خانہ کعبہ میں نصب ایک پتھر ہے جو کعبہ کے گرد ایک طواف مکمل ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ طواف کے دوران اسے بوسہ دینے، ہاتھ سے چھونے یا دور سے اس کی سمت اشارہ کرنے کے لیے کہا گیا ہے اور یہ بات ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ معلوم ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ حجر اسود کی کوئی اور اہمیت نہیں ہے۔ اس بات کو مزید وضاحت سے یوں سمجھیے کہ اگر ایک شخص نے زندگی میں ۲۰ مرتبہ یا ۳۰ مرتبہ حج ادا کیا اور ۵۰ یا ۶۰ یا اس سے بھی زیادہ عمرے کیے لیکن کسی ایک مرتبہ بھی وہ حجر اسود کو بوسہ نہ دے سکا اور اس نے ہمیشہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر عمل کیا، ہر طواف کے دوران حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے دوسروں کو دھکا نہ دیا تو اس شخص کا حج یا عمرے کا ثواب کم نہیں ہوگا بلکہ شاید اسے زیادہ ثواب ملے کہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر عمل کیا۔

نکاح اور نماز کے طریقوں کا معاملہ اہم ہے اور ان کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت بھی فرمائی ہے اور خود عمل کر کے بھی دکھایا ہے۔ سنگسار کرنے کی سزا کا اطلاق

صرف اس شخص پر ہوتا ہے جس پر زنا کا جرم ثابت ہو چکا ہو۔ اس سزا کے بارے میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے علم ہوا ہے اور یہ بات ہمارے اطمینان کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔

میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب ہم اسلام کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کریں تو ہمیں ایسے شخص کا سا رویہ اختیار کرنا چاہیے جو سیکھنا اور جاننا چاہتا ہے۔ بغیر سوچے سمجھے ایسے نتائج اخذ نہیں کرنے چاہئیں جن کی کوئی بنیاد نہ ہو۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسے غیر محتاط انداز سے بات نہیں کرنا چاہیے جس طرح آپ نے کی ہے۔ کسی مسلمان سے ایسے رویہ کی توقع نہیں کی جاسکتی جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتا ہو۔

قلب ماہیت، یہ کس طرح ہوتی ہے؟

سوال: ماضی میں، میں ایک ایسا شخص تھا جو مذہب کی بہت کم پروا کرتا تھا، بلکہ بیشتر اوقات مذہبی باتوں کا اور مذہب پر عمل کرنے والے لوگوں کا مضحکہ اڑایا کرتا تھا۔ انتہا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے وجود سے انکار کرتا تھا (نعوذ باللہ۔) گزشتہ برس نومبر کی ایک صبح سب کچھ بدل کر رہ گیا۔ اس صبح نیند سے بیدار ہوا تو میں رو رہا تھا اور پکار پکار کر کہہ رہا تھا، ''اے اللہ مجھے معاف کردے۔'' اس دن کے بعد سے پابندی سے نماز ادا کرتا ہوں سگریٹ اور شراب نوشی ترک کردی ہے اور دیگر ممنوعہ باتوں سے بھی اجتناب کرتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟

جواب: ہر وہ چیز جو کسی کے ہاتھوں بنی ہو، اپنے بنانے والے کی مہارت و صناعی کا منہ بولتا ثبوت ہوتی ہے۔ اگر وہ چیز بہت عمدہ معیار کی ہے تو اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ بنانے والا اپنے ہنر کا ماہر ہے۔ یہ کائنات، جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے، اپنے خالق کی مہارت و دسترس اور قوت کا واضح ثبوت ہے۔ کتنی نشانیاں اور کتنی علامتیں ہیں جو اس پوری کائنات میں، ہماری زندگی میں اور خود ہمارے وجود میں بھی نظر آتی ہیں، جو اللہ کے وجود اور اس کے احکم الحاکمین اور قادر مطلق ہونے کا ثبوت ہیں۔ یہ تمام نشانیاں واضح کرکے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دعوت دی ہے کہ وہ ان پر غور وفکر کرے اور کسی نتیجے پر پہنچے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ علم ہے کہ جب انسان مدلل انداز سے تخلیق کائنات اور کائنات کے نظام پر غور کرے گا تو سچائی ایک اٹل حقیقت کی طرح سامنے آئے گی۔ اب یہ ہمارے اوپر منحصر ہے کہ ہم اس حقیقت کو قبول کریں یا اس سے منہ موڑ لیں۔

جب کوئی شخص سچائی کو جھٹلانے کی جارحانہ کوشش کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ

غیر شعوری طور پر آواز حق کی سمت بے بہرہ ہونے کے اپنے عمل کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسا شخص اپنے اندر کی اس آواز کو دبانا چاہتا ہے جو اسے متنبہ کر رہی ہوتی ہے کہ تم غلط راہ پر جا رہے ہو۔ ایسے شخص کا گستاخانہ یہ اس کی فطرت ثانیہ بن جاتا ہے۔

انسان کی حیثیت سے ہم سب کے لیے ایمان کی قبولیت کا درجہ یکساں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اسلام قبول کریں اور اس کی وحدانیت پر ایمان لائیں۔ قبول ایمان کی اس شرط کا اطلاق ہر ایک کے لیے یکساں ہے خواہ وہ ایک عام سا آدمی ہو یا بہت لائق و فائق عالم۔ ایمان لانے کے بعد جب ہم یہ بات اپنے ذہن میں رکھیں گے کہ اللہ ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے اور وہ عادل مطلق ہے، تو پھر ہم اپنی زندگی کو اس کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق گزارنے کی کوشش کریں گے۔ اگر انسان اپنی فطرت کے ساتھ مخلص رہے تو وہ اپنے خالق کو جاننا چاہے گا اور اپنی فطرت کے تقاضے کے مطابق کسی عظیم و برتر طاقت پر ایمان لاکر بندگی کا خواہاں ہوگا۔ انسان کی اس فطرت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغام میں تمام بندوں سے ایک ہی زبان میں خطاب کیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اعلیٰ تعلیمیافتہ انسانوں کے لیے کوئی علیحدہ کتاب ہدایت ہو اور ایسے لوگوں کے لیے کوئی دوسری کتاب ہو جنہوں نے زندگی میں کبھی اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ ایک تعلیمیافتہ انسان، اللہ کے پیغام ہدایت کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی حقیقت ہے کہ اللہ کا پیغام ایسی سچائیاں لیے ہوئے ہے جو انسان کے اندر اس کے قلب و روح میں اتر جاتی ہیں اور بندے کو اپنے خالق کے آگے سجدہ ریز ہونے پر اکساتی ہیں۔

ان تمام حقائق کا جائزہ لیں تو انکشاف ہوگا کہ ہمارا خالق ہم پر کس قدر مہربان ہے، اس کی رحمت و شفقت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے ہمارے درمیان سے کچھ لوگوں کو منتخب کیا اور انہیں نبوت و رسالت کے منصب پر فائز کر کے ہماری رہنمائی کا سامان بہم کیا۔ ان انبیاء نے انسانوں کو ایسے راستے کی نشاندہی کی جو اس دنیا میں اس کی فلاح اور مسرت و شادمانی کا ذریعہ ہوسکتا ہے اور آخرت کی زندگی میں کامیابی کا ضامن ہے۔ اور وہ بھی اللہ ہی ہے جس نے سلسلہ انبیاء کی تکمیل کرتے ہوئے اپنے آخری نبی محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ان کے ذریعہ آخری کتاب ہدایت قرآن مجید اپنے بندوں تک پہنچائی۔ اسی نے اپنے کلام کی حفاظت کا ذمہ لیا تاکہ قیامت تک آنے والی انسانی نسلیں کلام ربانی سے بلا کسی شک وشبہ کے ہدایت حاصل کریں اور وہ بھی اللہ ہی ہے جس نے ہمیں یہ توفیق بخشی کہ اسلام کو نظام حیات کے طور پر قبول کریں۔ اس دنیا کی تمام نعمتوں مسرتوں اور شادمانیوں کو بھی حاصل کریں اور آخرت میں بھی فلاح پائیں۔

اگر اللہ تعالیٰ نے اشیاء اور معاملات کو ایسے ہی چھوڑ دیا ہوتا اور ہم پر یہ ذمہ داری عائد کر دی ہوتی کہ اس پر ایمان لائیں اور اس ایمان کے ساتھ زندگی گزاریں تو یہ بھی اس کی رحمت بے پایاں ہوتی اور پھر ہمارے لیے کوئی عذر نہ ہوتا کہ اس پیغام کو قبول نہ کریں اور اللہ کے بھیجے ہوئے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نہ کریں۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنی تمام رحمتوں کے سوا نظر کرم کی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کی زندگی میں کبھی نہ کبھی کوئی ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب وہ خود کو ایمان اور کفر کے دوراہے پر کھڑا پاتا ہے۔ ایسے لمحات، ہم میں سے ہر ایک کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ ہم اپنے لیے سیدھے راستے کا انتخاب کریں۔ کچھ لوگ اس موقع سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور کچھ اس کو اس طرح ضائع کر دیتے ہیں جیسے یہ موقع ان کے لیے نہیں، کسی اور کے لیے ہے۔

ان لمحات کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس موقع پر ہم تمام معاملات کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھ سکتے ہیں۔ ہر چیز واضح اور صاف نظر آ رہی ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ سچائی کی آواز ہوتی ہے، جو ہمیں صراط مستقیم کی جانب بلا رہی ہوتی ہے۔ لیکن بدنصیب لوگ ایسے موقع کو ضائع کرتے ہوئے اپنے لیے اس راہ کا انتخاب کرتے ہیں جو صحیح نہیں ہے۔

میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جس نے مثالی طور پر اپنے لیے اپنے ارادے سے اسلام کا راستہ اختیار کیا جبکہ اس کی پرورش اور تربیت اس انداز پر ہوئی تھی جس سے اسے اس قسم کا فیصلہ کرنے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی اور نہ ہی اس کے والدین نے اس کے لیے مذہبی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام کیا تھا۔ والدین نے اسے تعلیم کے لیے ایک ایسی درسگاہ میں بھیجا جہاں مذہبی تعلیم کو اسراف بے جا سمجھا جاتا تھا۔ ان صاحب نے مجھے اپنی زندگی کے ایک ایسے لمحے کے بارے میں بتایا جب انہیں یوں محسوس ہوا جیسے صحیح اور غلط میں سے کسی ایک کا انتخاب ان کے سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ اس لمحے میں تمام معاملات ان کی نگاہوں کے سامنے بالکل واضح تھے۔

انسان کی زندگی میں ایسے لمحات کب اور کس طرح آ جاتے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہر انسان کی زندگی میں ایک ہی انداز سے اور ایک ہی طرح کے حالات میں نہیں آتے اور نہ ہی دہرائے جاتے ہیں۔ یہ ایسے لمحے ہوتے ہیں جب ہماری روحانی بصیرت اپنی انتہا پر ہوتی ہے اور غفلت کے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ یہ لمحات اس رہنمائی کا نتیجہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو فراہم کرتا ہے۔ ہم میں سے کسی کو بھی بھلایا نہیں جاتا اور ہر شخص کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ وہ اپنے لیے صحیح راستے کا انتخاب کرے۔

شاید آپ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ کسی ایسے ہی لمحے کا نتیجہ ہو لیکن یہ ایک ایسی بات ہے

جس کے بارے میں آپ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ موقع فراہم کیا کہ آپ اشیاء کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھ سکیں اور پھر صحیح راہ کا انتخاب کر سکیں۔ اس کرم نوازی کے لیے آپ کو زندگی بھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے کیونکہ بلاشک وشبہ آپ رحمت خداوندی سے سرفراز ہوئے ہیں۔ یہ ایسی رحمت ہے جو کسی بھی صاحب ایمان کے لیے مسرتوں کے ایسے خزانے ظاہر کر دیتی ہے جو کبھی نہ ختم ہونے والے ہیں۔

ایک مسئلے پر مختلف فتاویٰ حاصل کرنے والے

سوال: ایک شخص اپنے ایک مسئلے کے بارے میں کسی صاحب علم سے رجوع کرتا ہے جو اسے متعلقہ مسئلے پر فتویٰ دیتا ہے کیا یہ شخص اس فتویٰ پر عمل کر کے گناہ کا مرتکب ہوگا اگر اسے یقینی طور پر یہ معلوم ہو کہ ایک اور عالم کی اسی مسئلے کے بارے میں مختلف رائے ہے جو وہ فتویٰ کی صورت دے چکے ہیں؟

جواب: بعض حضرات ایک مسئلے کے بارے میں مختلف علماء سے فتاویٰ حاصل کر کے اپنے لیے مشکلات پیدا کر لیتے ہیں۔ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مختلف علماء مختلف طبقات فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور اس بات کا امکان ہے کہ وہ کسی وقت غلطی کر بیٹھیں۔ ممکن ہے کہ وہ اس مسئلے کے بارے میں ایسی حدیث سے ناواقف ہوں یا اس حدیث کے ان معنی ومفہوم اور تفسیر سے لاعلم ہوں جو اس مسئلے کا صحیح حل پیش کرتی ہے۔ ہر عالم دین کسی مسئلے کے بارے میں جو بھی رائے دیتا ہے اس کی بنیاد وہ علم ہے جو وہ حاصل کر چکا ہے۔ اس سلسلے میں دوسرا معیار وہ سوال اور اسے پیش کرنے کا انداز ہے جو اس عالم کے سامنے رکھا گیا ہو۔ جب تک ایک شخص اپنے مسئلے کو تحریری صورت میں نہ پیش کرے اس وقت تک یہ ممکن نہیں کہ وہ، وہی ایک سوال ایک ہی طریقہ سے ہر بار دہرا سکے۔ اس ضمن میں دوسری اہم بات وقت کا وہ دورانیہ ہے جو دو مختلف علماء کی رائیں حاصل کرنے کے درمیان ہو۔ ایک عالم دین نے پہلے جو فتویٰ دیا تھا اس کے بعد ماحول، حالات، واقعات میں تبدیلی کی وجہ سے اس مسئلے کی تناظری کیفیت بالکل بدل سکتی ہے اس لیے دوسرا عالم جب اسی سوال کا جواب دے گا تو ممکن ہے کہ وہ پہلے عالم کے جواب سے مختلف ہو۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی صورتحال میں کون سا طریقہ درست ہے۔

اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی مسئلے کے بارے میں رائے حاصل کرنے کے لیے متعلقہ شخص کو ایسے عالم کا انتخاب کرنا چاہیے جس کے علم وتقویٰ پر اسے پوری طرح اعتماد ہو۔ دوسرے مرحلے میں اس عالم کے پاس جا کر اپنے مسائل کے تمام پہلو اچھی طرح پیش کرنے چاہئیں، اس

کے بعد عالم دین جو بھی فتویٰ دیں اسے قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔ ایک عالم سے فتویٰ حاصل کرنے کے بعد وہی سوال لے کر کسی دوسرے عالم دین کے پاس جانا اچھا عمل نہیں۔ البتہ متعلقہ شخص چاہے تو اس عالم دین سے جس سے اس نے فتویٰ حاصل کیا ہے، فتویٰ کی بنیاد ضرور معلوم کرسکتا ہے۔ ایک عالم دین سے فتویٰ حاصل کرنے کے بعد جب اس پر عمل کیا جائے گا تو عمل کرنے والا اس مخصوص عمل کے بارے میں کسی بھی طرح گناہ گار نہیں ہوگا، خواہ فتویٰ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ عالم دین کو اس فتویٰ کے صلہ میں اللہ کی جانب سے اجر ملے گا۔ ایک حدیث کے مطابق ہر عالم کو اس کے دیے ہوئے فتویٰ کے صلہ میں دوگنا اجر ملتا ہے اور اگر فتویٰ غلط دے دیا گیا ہو تو اسے ایک نیکی کا اجر ملے گا۔

اب اگر ایک شخص ایک ہی مسئلہ کے بارے میں دو علماء کے مختلف فتاویٰ سے واقف ہے تو اسے دونوں فتاویٰ کی اساس کو جانچنا چاہیے۔ لیکن یہ کام وہ اسی وقت کرسکتا ہے جب دونوں فتاویٰ کا تقابلی جائزہ لینے کے لیے کافی علم اور اہلیت رکھتا ہو اور دلائل وشواہد کا موازنہ کرکے خود فیصلہ کرنے کے قابل ہو۔ اگر اس میں یہ اہلیت نہیں ہے تو پھر اسے چاہیے کہ اس عالم کے فیصلے پر عمل کرے جس کے علم وتقویٰ پر اسے زیادہ اعتماد ہو۔

معاشرتی آداب و تعلقات

بیرون ملک ملازمت کرنے والوں کے معاشرتی مسائل

سوال: گزشتہ کئی برسوں سے میں سعودی عرب میں ملازمت کر رہا ہوں۔ اس ملازمت سے مجھے اچھی آمدنی ہوتی ہے جس کی وجہ سے میں نہ صرف یہاں سہولت کی زندگی بسر کر رہا ہوں بلکہ وطن میں اپنے اہل خانہ کو بھی آرام دہ زندگی کی سہولتیں مہیا کر سکا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے بچوں کی مستقبل کی ضروریات کے لیے کچھ رقم پس انداز بھی کر لی ہے۔ اس معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بیرون وطن ملازمت کی بنا پر میں سال کے گیارہ مہینے گھر سے دور رہتا ہوں۔ بعض وجوہات کی بناء پر میں اپنے بیوی بچوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ بیشتر وقت میں وطن واپسی کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں، جہاں میری آمدنی بمشکل روزمرہ ضروریات پوری کرنے کے قابل ہوگی۔ یہاں ملازمت جاری رکھنے اور وطن مستقل واپسی، دونوں معاملوں کے مثبت اور منفی پہلو اس قدر ہیں کہ فیصلہ کرنا میرے لیے دشوار ہوگیا ہے۔ اس صورتحال میں اسلام کس طرح رہنمائی کرتا ہے؟

جواب: آپ نے جو مسئلہ بیان کیا ہے وہ یہاں (سعودی عرب اور دیگر بیرونی ممالک) کام کرنے والے بیشتر غیر ملکی کارکنوں کا ایک عام مسئلہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہر شخص کا انفرادی معاملہ اور مسائل مختلف ہوتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی مستقل اصول نہیں بنایا جاسکتا نہ میں اس قسم کے حل کے لیے کوئی جادوئی حل پیش کر سکتا ہوں۔ اس معاملے میں یہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کے سامنے اس مسئلے کے متعدد پہلو اور اصول پیش کر دیے جائیں اور آپ ان کی روشنی میں اپنے حالات سے مطابقت رکھتے ہوئے مناسب طریقے اختیار کر لیں۔

یقینی طور پر ایک شوہر اور باپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کی گزر بسر کے

لیے کوئی کام کرے۔ یہ فرض اسے اس وقت تک ادا کرنا ہوتا ہے جب تک اس کے بچے بڑے ہو کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور خود کمانے لگیں۔ ہر شخص کو اپنی صلاحیتوں اور طاقت کے مطابق یہ فرض بہتر سے بہتر طور پر انجام دینا ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص تمام دن گھر پر پڑا رہے اور صرف دو تین گھنٹوں کے لیے کام کرے تو ظاہر ہے کہ اس کا خاندان سہولت کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکے گا اور وہ یہ شکایت کرنے میں حق بجانب نہیں ہوگا کہ اس نے تو محنت کی لیکن اللہ نے اس کا صلہ بہت کم دیا۔ اگر کوئی شخص زیادہ محنت کرے گا تو یقیناً اسے معاوضہ بھی زیادہ ملے گا۔ اسی طرح اگر ایک شخص بیرون ملک سفر کرتا ہے اور روزگار کے بہتر مواقع سے فائدہ اٹھاتا ہے تاکہ اسے زیادہ معاوضہ ملے اور وہ اپنے خاندان کو باآسائش زندگی گزارنے کے قابل بنا سکے تو اس شخص کے لیے یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ گھر چھوڑے بغیر اسے اتنی رقم ہر ماہ گھر بیٹھے مل جائے۔ دنیا میں بے شمار شہر اور قصبے اور گاؤں ایسے ہیں جہاں روزگار کے اتنے زیادہ مواقع نہیں ہیں کہ وہاں رہنے والے ہر شخص کو ملازمت مل جائے۔ روزگار کے حصول کے لیے بیشتر لوگوں کو سفر کرنا پڑتا ہے اور صرف اسی طرح وہ اپنا معاشرتی فرض ادا کر سکتے ہیں۔ اس امر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اپنے شہر سے باہر جا کر ملازمت کرنے والا، اپنے شہر میں ایک دوسرے شخص کو اپنی جگہ روزگار کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اپنے شہر یا اپنے ملک سے باہر جا کر کام کرنا ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کی وجہ سے غیر ضروری طور پر پریشان ہوا جائے۔

لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ ایک شخص کے لیے روزگار سے زیادہ اہم ذمہ داریاں اپنے خاندان کی عائد ہوتی ہیں۔ خاندان کے سربراہ کا فرض ہے کہ وہ افراد خانہ کی ذہنی، جذباتی، روحانی بہبود کا خیال رکھے۔ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ اس کے بچوں کی پرورش صحت مند ماحول میں ہو اور وہ معاشرے کے ذمہ دار فرد بن سکیں۔ اگر کسی شخص کے بچے صحیح تربیت نہ ہونے کی وجہ سے بگڑ جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اولاد کی جانب سے اس شخص پر جو ذمہ داری عائد ہوتی تھی وہ اس نے پوری نہیں کی۔ اس بات سے ہر کوئی واقف ہے کہ بچوں کی بہتر تربیت کے لیے پیار اور شفقت کے برتاؤ کے ساتھ نظم و ضبط بھی لازمی ہے۔ علاوہ ازیں ماں اور باپ کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ عصمت و پاکیزگی کو برقرار رکھنے میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں۔ یہ نکاح کے معاہدے کی غیر تحریر شدہ شرط ہوتی ہے اور اس کی بنیاد پر اسلام شوہر کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ چار ماہ سے زائد عرصہ کے لیے اپنے گھر سے دور رہے۔ اگر اس مدت سے زیادہ رہنا ضروری ہو تو اس کے لیے لازمی ہے کہ بیوی نے اپنی آزادانہ رضا سے اس بات کی اجازت دی ہو۔ اگر شوہر اور بیوی دونوں اس بات پر متفق ہوں کہ بیرون وطن شوہر کی ملازمت، خاندان کی بہبود کے

لیے ضروری ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے طویل عرصے کی دوری کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کو بطور ایثار قبول کرنے کو تیار ہوں تو وہ دونوں اس فیصلے کے لیے آزاد ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ صورتحال کتنے عرصے تک قابل برداشت ہو سکتی ہے۔ اس سوال کا جواب بھی یہی ہے کہ اس معاملے میں کوئی کلیہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ہر خاندان اپنے حالات کے مطابق فیصلہ کرنے کا مجاز ہے۔

ایک شخص بیرون ملک ملازمت کے لیے جاتے وقت اپنے بچوں اور بیوی کو اپنے والدین کے پاس چھوڑ جاتا ہے جہاں اس کی بیوی پر کوئی غیر ضروری دباؤ نہیں ہے۔ اس کے بچوں کے لیے اچھی تعلیم اور تربیت کا بندوبست ہے اور مجموعی طور پر اس کی غیر موجودگی میں اس کا خاندان بہتر ماحول میں اچھی زندگی گزار رہا ہے۔ اس شخص کا معاملہ ایک دوسرے شخص سے بالکل مختلف ہوگا جو اپنی بیوی اور (مثلاً) تین چھوٹے بچوں کو ایسی حالت میں چھوڑ کر جائے کہ ضرورت کے وقت ان کی دیکھ بھال اور مدد کے لیے اس کے پاس کوئی قریبی عزیز بھی نہ ہو۔ دوسری مثال میں بیوی کے کاندھوں پر شوہر کی غیر موجودگی میں نہایت بھاری بوجھ پڑ جائے گا۔ لہٰذا ہر شخص کو طویل مدت کے لیے گھر سے باہر جانے سے پہلے اپنے خاندان کے حالات کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہیے۔ یہ اہم فیصلہ کبھی تن تنہا نہیں کرنا چاہیے آخری فیصلے میں بیوی کی رائے لازماً شامل ہونا چاہیے۔

مشرقی خواتین شرم و حیا کی وجہ سے بعض اوقات اپنی رائے کا کھل کر اظہار نہیں کر پاتیں لہٰذا فیصلہ کرتے وقت ہر اس پہلو کا اچھی طرح جائزہ لینا ضروری ہے جس کی طرف بیوی نے اشارتاً بھی توجہ دلائی ہو، مثلاً ایک شخص چھٹیوں کے دوران گھر واپس جاتا ہے اور وہ یہ بات نوٹ کرتا ہے کہ اس کی بیوی گفتگو کے دوران کئی بار واضح طور پر یا اشارتاً اس حقیقت کی جانب توجہ دلا رہی ہے کہ ہم لوگ اپنی ازدواجی زندگی کا بہترین وقت کھو رہے ہیں تو شوہر کو فوراً یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ بیوی کا اصل مقصد کیا ہے جو ظاہر ہے کہ الفاظ میں واضح طور پر بیان نہیں کیا جا رہا۔ ایسے میں اپنی شریک حیات کا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شوہر طویل عرصہ تک گھر سے باہر رہ کر بیوی کی عفت برقرار رکھنے میں اس کے ساتھ تعاون نہیں کر رہا۔ یہ نہایت نازک مسئلہ ہے جس کی اہمیت محسوس کرنی چاہیے اور شوہر کو یا تو گھر پر رہنا چاہیے یا بیوی کو اپنے ساتھ بیرون ملک لے جانا چاہیے۔

جو لوگ بیرون ملک کام کرتے ہیں ان میں سے اکثر بعض اوقات یہ سوچتے ہیں کہ جو کچھ ایثار اور جتنی محنت وہ کر رہے ہیں کیا اس کی اتنی اہمیت بھی ہے؟ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اسے اپنے بچوں کی شادی کے لیے رقم درکار ہے لیکن اس کے ساتھ اس کے ذہن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے

کہ اس کی دولت بچوں کی شادی پر کوئی اثر ڈالے گی۔ کیا بالآخر ان بچوں کی شادی ان جوڑوں کے بطور نہیں ہو جاتی ہے جن کا فیصلہ آسمانوں پر کیا جا چکا ہے۔ یہ تو مقدر کا معاملہ ہے۔ ہماری زندگی کی ہر بات کا فیصلہ پہلے سے نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہم سے تقدیر پر تکیہ کر کے بیٹھنے کو کہا گیا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ قانون اسباب وعمل اس زندگی میں پوری طرح لاگو ہے۔ مجھے ایک مثال بیان کرنے کی اجازت دیجیے۔

فرض کیجیے کہ آپ کی ایک بیٹی ہے جس کی عمر شادی کے قابل ہو چکی ہے اور وہ وطن میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ آپ کا ایک غیر شادی شدہ ساتھی جو آپ کے ساتھ کام کرتا ہے ایک دن آپ کے کمرے میں آتا ہے اور آپ کی بیٹی کی تصویر پر اس کی نظر پڑتی ہے جو آپ نے دیوار پر لگا کر رکھی ہے۔ تصویر دیکھ کر وہ آپ کے اہل خانہ کے بارے میں گفتگو کرنے لگتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ آپ کی صاحبزادی سے شادی کی خواہش ظاہر کر دیتا ہے۔ اگر آپ روزگار کے سلسلے میں سعودی عرب نہیں آتے تو اس شخص سے آپ کی ملاقات ہی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس شخص کو آپ کے یا آپ کی صاحبزادی کے بارے میں کچھ علم ہوتا جو آپ کا داماد بن گیا۔ اس شخص کی شادی کہیں اور ہو جاتی آپ کی صاحبزادی کسی اور شخص کے ساتھ بیاہ دی جاتیں۔ دوسری جانب یہ بھی ممکن تھا کہ کسی اور طریقے سے آپ کے اور اس شخص کے خاندان میں رسم و راہ پیدا ہوتی اور ان دونوں کی شادی ہو جاتی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ جو علیم وخبیر ہیں ان دونوں کی پیدائش سے پہلے یہ جانتے ہیں کہ ان دونوں کی شادی ہونی ہے۔ وہ اس بات سے بھی باخبر ہیں کہ ان دونوں کے درمیان ایک دوسرے سے کس طرح تعلق پیدا ہوگا اور وہ کیا سبیل ہوگی جس کا نتیجہ ان دونوں کی شادی کی صورت میں نکلے گا۔

مجھے امید ہے کہ اس گفتگو سے یہ بات آپ پر واضح ہو گئی ہوگی کہ اگر آپ روزگار کے سلسلے میں سعودی عرب نہیں آتے تو آپ کی زندگی ایسی ہرگز نہیں ہوتی جیسی آج ہے۔ آپ کو اس بارے میں تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سب کا ماحصل کیا ہے اور کیا اس کی ضرورت تھی۔ اگر آپ اپنے شہر میں رہتے تو وہاں آپ کوئی اور کام کر رہے ہوتے اور آپ کے اہل خانہ بالکل مختلف زندگی گزار رہے ہوتے۔ وہ زندگی موجودہ زندگی سے بہتر ہوتی یا بدتر اس کا فیصلہ آپ اور آپ کے اہل خانہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔

آپ کے مسئلے کا مجھے پوری طرح احساس ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنے حالات کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور اپنے فرائض اور موجودہ ملازمت سے حاصل سہولتوں کے درمیان

توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اغلب امکان یہی ہے کہ آپ بھی اس نتیجہ پر پہنچیں گے جس پر بیشتر تارکین وطن پہنچتے ہیں کہ خاندان سے آپ کی یہ جدائی عارضی ہے اور اسے عارضی ہی رہنا چاہیے۔ اسے مستقل بنانے یا طول دینے کی کوشش کسی کے لیے بھی فائدہ مند نہیں ہوسکتی۔

بیرون ملک ملازمت اور نافرمان اولاد سے سلوک

سوال: میں ۱۹۸۰ء سے سعودی عرب میں ملازمت کر رہا ہوں۔ بیوی اور بچے وطن میں ہیں۔ میرے چار بیٹے ہیں اور اب ماشاء اللہ یہ چاروں جوان ہوگئے ہیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں ہمیشہ اس بارے میں ان کی حوصلہ افزائی کرتا رہا ہوں کہ انہیں بہتر سے بہتر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی چاہیے تاکہ جب وہ اپنی عملی زندگی شروع کریں تو کامیابی کے زیادہ مواقع ہوں۔ سعودی عرب میں رہتے ہوئے میں انہیں قرآن مجید کے اقتباسات، دینی موضوعات پر شائع ہونے والی تحریریں اور آپ کے سوال وجواب کے تراشے ارسال کرتا رہتا ہوں۔ میں یہ امید رکھتا ہوں کہ ان سب کی مدد سے وہ مذہب کے بارے میں اپنے علم میں اضافہ کریں گے۔ میں نے انہیں اسلام کے بارے میں کتابیں بھی مہیا کی ہیں اور سختی سے تاکید کی ہے کہ وہ انہیں پڑھیں، لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ اپنے اسلامی فرائض کی ادائیگی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی والدہ کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کرتے۔ درحقیقت وہ اپنی والدہ سے چلا کر بات کرتے ہیں اور برا بھلا کہتے ہیں۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جانا چاہیے۔ کیا میں انہیں گھر سے نکال باہر کروں۔ اگر میں انہیں گھر میں رکھتا ہوں تو کیا میں اللہ کی نافرمانی میں ان کا شریک تو نہیں بنتا۔ کیا مجھے یہ ملازمت چھوڑ کر گھر واپس چلا جانا چاہیے یا پھر ان پر دباؤ رکھا جائے کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل کریں؟

جواب: یقیناً یہ ہر باپ کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اسلام کے بارے میں معلومات فراہم کرکے انہیں اسلامی فرائض سے آگاہ کرے اور مذہب کے بارے میں ایسی تعلیم بہم پہنچائے کہ بچے اسلام کے بنیادی اصولوں کو اور اس بات کو اچھی طرح جان لیں کہ اسلام ان سے کیا تقاضا کرتا ہے اور انہیں یہ فرائض کس طرح ادا کرنے چاہئیں۔ اگر باپ یہ نہیں کرے گا، تو اس غفلت کے بارے میں وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان ہے کہ جب تمہارے بچے سات سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو انہیں نماز کی ہدایت کرنی چاہیے۔ جب ان کی عمر دس سال ہوجائے اور نماز نہ پڑھیں تو انہیں ہلکی جسمانی سزا دی جائے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ

مسلمان بچے کو نوعمری میں عبادات کی طرف راغب کیا جائے اور عبادات کے طریقے اسے سکھائے جائیں۔ اس طرح عبادت کرنا اس کے لیے ایک فطری عمل بن جاتا ہے۔ نماز کی طرح رمضان میں روزہ رکھنے کے لیے بچوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ دن کے کسی ایک حصہ میں روزہ رکھ لیں یا ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھیں، اس طرح بلوغت کو پہنچنے تک، جب روزہ ان کے لیے فرض ہو جاتا ہے، ان کے لیے یہ مشکل کام نہیں رہتا۔

جب بچے بڑے ہو جائیں تب والد کی ذمہ داری کیا ہوگی؟ اگر اس وقت وہ اسلامی تعلیمات سے روگردانی کردیں تو کیا انہیں سزا دینی چاہیے۔ فرض کیجیے کہ بیٹے کی عمر ۱۴ سال ہے اور باپ کی مسلسل یاد دہانی کے باوجود وہ نماز ادا نہیں کرتا ہے، تو کیا اسے جسمانی سزا دینی چاہیے؟ اسلام میں اس امکان کی گنجائش ہے، لیکن والدین کو کسی ایسی بات پر مجبور نہیں کیا گیا جس میں ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ اسلام میں جو بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے وہ ہر شخص کی انفرادی ذمہ داری ہے۔ اگر ایک شخص کے ذمے چند فرائض رکھے گئے ہیں تو ان فرائض کی ادائیگی اس شخص کو کرنا ہوگی۔ کسی دوسرے شخص سے اس کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی وہ فرض ادا کرنا کسی دوسرے کی ذمہ داری ہوگی۔ کسی شخص کو اس بات پر فکر مند نہیں ہونا چاہیے اور نہ غصہ کرنا چاہیے کہ اس کی اولاد اپنے اسلامی فرائض ادا نہیں کر رہی ہے۔ والدین کا فرض یہ ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اولاد کو بہتر طریقے سے ان فرائض کی یاد دہانی کراتے رہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنے خاندان کے لوگوں کو نماز کی ادائیگی کی یاد دہانی کراتے رہو۔ اگر اولاد یاد دہانی کے باوجود نماز ادا نہیں کرتی تو اس بارے میں اس کے والد سے جواب طلبی نہیں ہوگی۔

اب میں آپ کے سوال کے دوسرے حصے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ معاملہ والدین کے ساتھ اولاد کے سلوک کا ہے۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام ہر بیٹے اور ہر بیٹی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ فرمانبرداری سے پیش آئیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کریں۔ اگر ایک بیٹا اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا تو وہ والدین کی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب ہوگا۔ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی گئی ہے اور اسے اسلام کا ایک اہم فریضہ بتایا گیا ہے۔ درحقیقت والدین کی نافرمانی کرنے والی اولاد کے بارے میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ وہ جنت سے محروم رہے گی۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں کئی جگہوں پر والدین کی اطاعت کو، اللہ تعالیٰ کے واحد اور لاشریک ماننے کے بعد سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ کسی مسلمان کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ والدین سے درشت لہجے میں بات کرے۔ اگر ایک بیٹا اپنی ماں یا باپ کو ضرب پہنچاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص

کو کبھی معاف نہیں کریں گے، سوائے اس کے کہ اس کے والدین اسے معاف کر دیں۔

اب میں آپ کے سوال کے خاص حصے کی طرف آتا ہوں۔ اس بارے میں سب سے پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ایسی حیثیت میں نہیں ہوں کہ آپ کو کوئی حتمی مشورہ دے سکوں کہ آپ کو یہ کرنا چاہیے اور یہ نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ کے خاندانی حالات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا جن کی بنیاد پر کوئی عملی اقدام تجویز کیا جا سکے۔

اگر آپ اپنے بیٹوں کو، ان کی اپنی والدہ سے گستاخی اور بدسلوکی کی وجہ سے گھر سے نکال باہر کریں تو نظری طور پر آپ کو اس کا بالکل حق ہے اور آپ یہ کر سکتے ہیں۔ بچوں کی تربیت اور پرورش کے بارے میں آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اور اب وہ اس قابل ہیں کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ اگر آپ انہیں گھر میں رکھتے ہیں تو اس صورت میں آپ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے مرتکب نہیں ہوں گے لہٰذا فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ کون سا طریقہ بہتر رہے گا۔

مجھے یہ کہنے دیجیے کہ آپ کے گھر کے حالات مثالی نوعیت کے نہیں ہیں۔ آپ گزشتہ کئی برسوں سے گھر سے باہر رہ رہے ہیں اور اس عرصہ میں بچوں کی تربیت کا سارا بوجھ آپ کی بیوی پر ہے جو اس اہم کام کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہیں، کیونکہ یہ کام میاں اور بیوی دونوں مل کر ہی بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں۔

بچے جب بڑے ہو جائیں، تو والد کا گھر سے دور رہتے ہوئے، اسلامی کتابیں اور دیگر مواد اولاد کو بھیجنا اور یہ توقع کرنا کہ والد کی ہدایت کے نتیجہ میں انہیں پڑھیں گے، آج کل کے ماحول کے اعتبار سے حقیقت پسندانہ سوچ نہیں ہے۔ آپ کو خود اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ طے کرنا چاہیے کہ اس بارے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔

بیرون ملک ملازمت اور شادی کا مسئلہ

سوال: جب سے میں ملازمت کے سلسلہ میں سعودی عرب آیا ہوں، میرے والدین اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ میں شادی کر لوں، لیکن دو وجوہات سے میں اب تک والدین کے اس دباؤ کی مزاحمت کرتا رہا ہوں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ موجودہ ملازمت میں مستقبل کا تحفظ نہیں ہے اور تنخواہ بھی اتنی نہیں ہے کہ میں ایک پورے خاندان کی کفالت کر سکوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میرا اپنا مکان نہیں ہے، ہمارا خاندانی گھر بڑے بھائی کے تصرف میں ہے اور میرا اندازہ ہے کہ اگر میں نے بھی شادی کے بعد وہاں رہنا شروع کر دیا تو مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ میرا خیال یہ ہے کہ پہلے مجھے اپنے مکان کا بندوبست کرنا چاہیے جہاں میں شادی کے بعد اپنے والدین کے ساتھ منتقل ہو جاؤں۔ میری

عمر ۲۸ سال ہو چکی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد شادی کر لوں لیکن مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر شادی میں تاخیر پر مجبور ہوں۔ ازراہ کرم مشورہ دیجیے کہ میں کیا کروں؟

جواب: آپ کے والدین کا رویہ اور اصرار قابل فہم ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ۲۸ برس کی عمر میں آپ کی شادی ہو جانی چاہیے اور اس میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ تاہم آپ نے جن وجوہات کی نشاندہی کی ہے ان کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ کے والدین آپ کے اس اندیشے کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے ہوں کہ اگر شادی کے بعد آپ نے بھی اپنے خاندانی گھر میں بڑے بھائی کے ساتھ رہنا شروع کر دیا تو مسائل پیدا ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس بات کو آسان جانتے ہوں کہ اگر ایک گھر میں دونوں کے رہنے سے کسی قسم کے مسائل پیدا ہوئے تو وہ انہیں آسانی سے حل کر لیں گے۔ آپ کو چاہیے کہ حالات کا بغور جائزہ لیں اور اس کے مطابق فیصلہ کریں۔

میری رائے ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ انسان کو شادی میں تاخیر نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام بھی اسی بات کی ہدایت کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اوائل عمر میں شادی کرنا انسانی جذبات وضروریات کے بھی عین مطابق ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ کی عمر ۲۸ برس ہو چکی ہے میرے خیال میں یہ وہ زیادہ سے زیادہ عمر ہے جس میں شادی ہو جانا چاہیے لیکن اگر حالات اس قسم کے ہوں کہ شادی مؤخر کرنا ضروری ہوتا ہو تو ایسی صورتحال میں سوچے سمجھے بغیر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

اگر آپ شادی کے بعد اپنی شریک حیات کو سعودی عرب لانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور یہ امکان بھی ہے کہ موجودہ ملازمت چند برس اور جاری رہے گی تو آپ کو معمولی تنخواہ کے باوجود شادی کر لینی چاہیے۔ اپنے بندوں کو رزق کی فراہمی کا وعدہ اللہ نے کیا ہے، اس کے برخلاف اگر آپ شادی کے بعد بیوی کو وطن میں رکھنا چاہتے ہیں تو اس صورت میں آپ کو شادی مؤخر کر دینا چاہیے اس دوران آپ کو کوشش کرنی چاہیے کہ آپ اپنے مکان کے حصول کے لیے ابتدائی کام شروع کر دیں اور اس کوشش میں والدین کو شامل رکھیں۔ تنخواہ کا معمولی ہونا شادی میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ ممکن ہے کہ آپ شادی کے بعد فاضل وقت میں خود کو اضافی کام کے لیے آمادہ پائیں۔

ممکن ہے کہ آپ اپنے والدین کی خواہش کی تکمیل نہ کرنے کی وجہ سے پریشان ہوں لیکن اس قسم کے حالات میں اسلام یہ پابندی عائد نہیں کرتا کہ کوئی شخص لازماً وہی کرے جو اس کے والدین کہیں۔ آپ کا مقصد اپنے والدین کی حکم عدولی نہیں ہے بلکہ حالات کے پیش نظر موزوں وقت پر صحیح فیصلہ کرنا ہے۔ شادی میں تاخیر کر کے آپ اپنے والدین کی حکم عدولی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔

جب جھوٹ بولنا فرائض کا حصہ ہو

سوال: میرے کام کی نوعیت ایسی ہے جس میں ٹیلی فون کا جواب دینا ہوتا ہے۔ اکثر اوقات میرے آجر یہ ہدایت کرتے ہیں کہ اگر فلاں شخص کا ٹیلی فون آئے تو میں ان سے یہ کہوں کہ مطلوبہ شخص دفتر میں موجود نہیں ہے (صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔) مجھے جو ہدایت دی جاتی ہے اس کے مطابق کام کرتا ہوں لیکن دن بھر کام ختم کرنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں جھوٹ بولتا رہا ہوں۔ یہ احساس مجھے بے چین رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے رہتی ہے کہ اگر میں نے اپنے آجر کی ہدایت کی خلاف ورزی کی تو میری ملازمت جاتی رہے گی۔ ایسی صورتحال میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: آپ نے جو مسئلہ پیش کیا ہے وہ نہایت حقیقی ہے۔ آپ پر اس کا بوجھ خاص ہوتا ہے کیونکہ آپ کو خاص طور پر ہدایت کی جاتی ہے کہ جھوٹ بولیں۔ لیکن یہ مسئلہ صرف آپ کو درپیش نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک خود کو بعض اوقات ایسے حالات میں پاتا ہے جب بے تکلفی کے ساتھ سچ بولنا انتہائی غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب اس کے نتیجے میں کسی کو شرمندگی یا پریشانی کا سامنا کرنا پڑے یا کوئی راز کسی ایسے شخص پر افشا ہوتا ہو، جس پر نہیں ہونا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایسے مواقع پر بھی ہمیں واضح جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ آپ (صلی اللہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ ایسے مواقع پر کوئی ایسی مبہم سی بات کہہ دینی چاہیے جس میں کسی حد تک سچ بیان ہو جائے لیکن متعلقہ شخص اس کے کوئی اور معنی اخذ کرے۔ بعض اوقات اس طرح کے مبہم بیان سے یا بیان کے کسی حصے پر زور دینے سے دوسرے شخص کو وہ تاثر یا جواب ملتا ہے جو ہم کو مطلوب ہوتا ہے۔ دوسری جانب ہم جھوٹ بولنے سے بچے رہتے ہیں۔ زیادہ تفصیل میں جائے بغیر میں یہ کہوں گا کہ اگر آپ کے آجر آپ کو یہ ہدایت کریں کہ کسی کے فون کے جواب میں یہ کہا جائے کہ وہ (آجر) موجود نہیں ہیں تو فون پر یہ جواب دے سکتے ہیں کہ ''وہ اس وقت دستیاب نہیں ہیں'' ''موجود ہونے'' اور ''دستیاب ہونے'' میں واضح طور پر فرق ہے۔ اگر ٹیلی فون کرنے والا واضح جواب چاہے کہ ''وہ موجود ہیں یا نہیں'' تو آپ جواباً کہہ سکتے ہیں کہ ''یہ کال میں انہیں ٹرانسفر نہیں کرسکتا''۔ یہاں بھی آپ سیدھا سادا بیان نہیں دے رہے بلکہ یہ حقیقت ظاہر کر رہے ہیں کہ آپ یہ ٹیلی فون کال انہیں نہیں دے سکتے۔ اگر آپ کے علم میں ہو کہ مطلوبہ شخص اپنی میز پر موجود نہیں ہے تو آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''اس وقت وہ ٹیلی فون تک نہیں پہنچ سکتے'' یا وہ

اپنی سیٹ پر موجود نہیں ہیں) اس بیان کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ دفتر میں تو ہے لیکن فون کی رسائی سے دور ہے۔ اگر آپ ان خطوط پر غور کریں تو آپ کو بہت سے ایسے بیانات مل جائیں گے جو متعلقہ صورتحال میں گفتگو کے لیے ضروری ہوں اور آپ کو جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ پڑے۔ آپ کو جو بات یاد رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس قسم کی گفتگو میں نہ تو بہت زیادہ ابہام کی ضرورت ہے اور نہ کوئی ایسی بات کہنے کی جو سچ کے خلاف ہو۔

جھوٹ سے کیسے بچا جائے؟

سوال: میں جو کام کرتا ہوں اس کی نوعیت ایسی ہے کہ بعض اوقات میں دوسرے لوگوں کے سوال کے جواب میں براہ راست جواب نہیں دے سکتا۔ میرا پہلا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ سوال کرنے والے کو یہ احساس دلاؤں کہ اس قسم کے سوال نہ پوچھے جائیں لیکن ہر بار ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ اس سے میرے بارے میں تاثر قائم ہوتا ہے کہ میں شائستگی اختیار نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ جھوٹ بولنے کے گناہ سے اجتناب کروں۔ مجھے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ ازراہ کرم اپنی رائے سے نوازیے؟

جواب: جھوٹ بولنا منع ہے۔ ایک بار اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بنیادی گناہوں کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا ایک مسلمان ان میں سے کسی کا ارتکاب کرسکتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مسلمان سے اس قسم کا گناہ ایک آدھ مرتبہ سرزد ہوسکتا ہے۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا گیا کہ کیا ایک مسلمان جھوٹ بول سکتا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جواب سے ظاہر ہوا کہ جھوٹ ایمان کے ساتھ شامل نہیں ہوسکتا۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جھوٹ کے بارے میں اسلام کا رویہ کیسا ہے، تاہم کسی شخص کے ساتھ یہ صورت حال پیش آسکتی ہے کہ اس سے کوئی ایسا سوال پوچھا جائے جس کا سیدھا سچا جواب دینا اس کے لیے ممکن نہ ہو۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جھوٹ، صرف بعض ناگزیر صورتوں میں بولا جاسکتا ہے۔ مثلاً اسلامی مملکت کے دشمنوں کو دھوکہ دینے کے لیے یا دو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے کہ دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کو یہ یقین دلایا جائے کہ دوسرا اس کے بارے میں بہترین جذبات و خیالات رکھتا ہے، جب کہ کسی نے بھی یہ بات نہیں کہی ہو۔ جھوٹ بولنے کی اس محدود اجازت کے ساتھ شرط یہ ہے کہ اس جھوٹ سے کسی شخص کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔

آپ نے جو صورتحال بتائی ہے وہ ان معاملات سے مختلف ہے جھوٹ ناقابل قبول ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ اس قسم کی دشوار صورتحال میں آدمی کو ایسا مبہم جواب دینا چاہیے جس سے سوال کرنے والا اپنے حسب خواہش مفہوم اخذ کر سکے۔ تاہم ہمارا جواب سچ ہونا چاہیے۔ خواہ وہ واضح نہ ہو لیکن زیر بحث موضوع کے کسی ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہو۔ اس مسئلے کو ایک مثال سے سمجھیے۔ فرض کیجیے کہ آپ ایک دن اپنے گھر آتے ہیں اور اپنے بھائی کو دیکھتے ہیں جو آپ کو گھر کے باہر کھڑے ہوئے نظر آئے۔ بعد میں آپ کے والد نے پوچھا کہ کیا تم نے بھائی کو دیکھا تھا۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے صحیح جواب سے آپ کے بھائی کی پوزیشن خراب ہوگی تو آپ یہ جواب دے سکتے ہیں کہ جب میں گھر میں آیا تو وہ موجود نہیں تھے۔ آپ کے والد اس جواب سے یہی سمجھیں گے کہ آپ نے اسے نہیں دیکھا جبکہ آپ نے ان سے یہ بات نہیں کہی ہے۔ دوسری طرف آپ کا جواب بھی غلط نہیں ہوگا کیونکہ جب آپ گھر میں داخل ہوئے تو آپ کا بھائی موجود نہیں تھا۔

یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ جھوٹ بولنا بہرحال ممنوع ہے اور اس قسم کی مبہم گفتگو کی شرط یہ ہے کہ اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔

دوست کا سماجی مقاطعہ (بائیکاٹ)

سوال: میرے ایک دوست کا رویہ عام لوگوں کے ساتھ خاصا ناشائستہ ہے۔ وہ دوسرے لوگوں میں خامیاں ڈھونڈتے ہیں، لوگوں سے سخت لہجے میں بات کرتے ہیں اور ان کے بارے میں دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے میں نے اور میرے ایک دوست نے ان کا سماجی مقاطعہ کر رکھا ہے۔ لیکن حال ہی میں مجھے ایک حدیث پڑھنے کا موقع ملا جس میں کہا گیا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان کے ساتھ تین دن سے زیادہ بات چیت بند رکھنا جائز نہیں ہے۔ براہ کرم بتایئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

جواب: آپ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان بھائی کا تین دن سے زیادہ مقاطعہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس حدیث میں مزید فرمایا گیا ہے کہ جب وہ آپس میں ملتے ہیں تو ان میں ہر ایک اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔ ان میں بہتر وہ ہے جو دوسرے کو سلام کرے۔ اس حدیث کا اطلاق عام حالات میں ہوتا ہے جب وہ افراد طویل دوستی کے بعد مقاطعہ کر لیں۔ اس حدیث میں مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تین دن سے زیادہ مدت تک بول چال بند نہ رکھیں۔ آپ نے جس معاملے کی نشاندہی کی ہے اس

میں سماجی مقاطعہ کسی تنازعہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ اس شخص کے غیر اسلامی رویہ کی وجہ سے ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ایک ایسے شخص کے ساتھ قریبی دوستی سے بچنے کی کوشش ہے جو دوسرے لوگوں کے ساتھ بدتمیزی اختیار کرتا ہے اور کھلے عام اسلام کے شائستہ اخلاق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اس صورت حال میں آپ کا سماجی مقاطعہ جائز ہے۔ ایسے شخص کے ساتھ اس وقت تک تعلقات بحال نہیں کرنے چاہئیں جب تک وہ لوگوں کے ساتھ اپنا رویہ تبدیل نہ کرلے اور ان کے بارے میں جھوٹ بولنا ترک نہ کردے۔

مشکوک آمدنی والے کے ہاں کھانا

سوال: کیا ایک ایسے مسلمان کے یہاں کھانا جائز ہے جس کی آمدنی کے ذرائع حرام یا مشکوک ہوں۔ کیا بینکوں اور بیمہ زندگی کی کمپنیوں میں کام کرنے والے افراد درج بالا زمرہ میں آتے ہیں؟

جواب: اگر آپ کو کسی شخص کے بارے میں یقین ہو کہ اس کی آمدنی کا بڑا حصہ حرام پر مبنی ہے تو اس شخص کے ہاں، نہ تو کھانا چاہیے اور نہ ہی اس سے کوئی تحفہ قبول کرنا چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کس شخص کی آمدنی کے حرام یا حلال ہونے کا تعین کس طرح کریں گے؟ کسی مسلمان کو یہ اجازت نہیں دی گئی کہ وہ تمام حقائق کو پیش نظر رکھے بغیر دوسرے لوگوں کے بارے میں فیصلے صادر کرے۔ اس کے ساتھ ہی ایک مسلمان کو صرف سنی سنائی باتوں پر توجہ نہیں دینی چاہیے بلکہ اپنی رائے صرف ایسی اطلاعات پر قائم کرنا چاہیے جن کے بارے میں اسے یقین ہو کہ وہ درست ہیں۔ لوگوں کی آمدنی جائز یا ناجائز قرار دینا اتنا آسان نہیں ہے۔

یہ بات درست ہے کہ بعض لوگ اپنی آمدنی کے بارے میں غیر محتاط ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی شخص کی آمدنی کا معمولی حصہ جائز آمدنی، مثلاً اس کی تنخواہ یا کاروبار سے ہونے والے منافع پر مبنی ہو۔ اگر آپ کو ایسے شخص کی جانب سے کھانے کی دعوت ملتی ہے اور آپ کو یہ توقع ہو کہ اسے زیادہ بہتر اسلامی زندگی گزارنے پر مائل کیا جاسکے۔ ایسی صورت میں آپ یہ دعوت قبول کرسکتے ہیں۔ آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مسلمان، عیسائی یا یہودی کی دعوت قبول کرسکتے ہیں، بشرطیکہ ان کی آمدنی کا کچھ حصہ ایسے ذرائع سے حاصل ہوتا ہو، جس کی اسلام نے اجازت دی ہے۔

دھوکا دہی کے ذریعے اسمگلنگ اور اسمگلنگ کے سامان کا استعمال

سوال: گزشتہ دنوں میں چھٹیوں پر وطن جارہا تھا تو ایک پڑوسی نے ایک پیکٹ مجھے یہ کہہ کر دیا کہ

میں اسے اس کے گھر والوں تک پہنچادوں۔ وطن پہنچنے کے بعد میرے ایک اور دوست نے مجھ سے پوچھا کہ "فلاں صاحب نے تمہارے ہاتھ کوئی چیز تو نہیں بھجوائی۔" میں نے بتایا کہ "بھجوائی تو ہے" اس پر میرے دوست نے بتایا کہ "اس پیکٹ میں سونا ہے، کیونکہ وہ صاحب ماضی میں بھی اپنے واقف کاروں کے ہاتھ سونا بھیجتے رہے ہیں۔" اس طرح ان صاحب نے مجھے سونے کی اسمگلنگ کے لیے استعمال کیا۔ میرے دوست نے بتایا کہ میں ان کے دعوے کی تصدیق اس پیکٹ کے وزن کا اندازہ لگا کر کرسکتا ہوں۔ میں نے اس پیکٹ کو اٹھایا تو وہ اپنے حجم کے برخلاف خاصا وزنی تھا۔ میں اس بات پر شدید برہم ہوا، اس لیے کہ اگر یہ سونا پکڑا جاتا تو مجھے لازماً تین یا چار سال کے لیے جیل بھیج دیا جاتا۔ چنانچہ میں نے ان صاحب کے اہل خانہ سے کہہ دیا کہ آپ کا پیکٹ کسٹم والوں نے روک کر ضبط کرلیا ہے۔

بعد میں، اس پیکٹ کو میں نے کھولا تو واقعی اس میں بڑی مقدار میں سونا موجود تھا۔ میں نے اسے فروخت کردیا اور اپنے دوست کے مشورے پر اس رقم کو مستحق افراد اور رفاہی اداروں میں تقسیم کردیا۔ میں نے اس رقم کا ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہیں رکھا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں گا اگر آپ مجھے یہ بتادیں کہ آیا میرا فعل درست تھا یا نہیں۔

جواب: اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے پڑوسی نے آپ کے ساتھ فریب سے کام لیا۔ انہوں نے آپ کے اعتماد کا غلط فائدہ اٹھایا اور آپ کو ایسا سامان دیا جسے کسٹم کے حکام کے سامنے ظاہر کئے بغیر آپ کے ملک میں لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ان کے اس فعل کی بدولت اس بات کا خطرہ پیدا ہوا کہ آپ کو جیل بھیج دیا جاتا۔ آپ کے کردار پر ایک دھبہ لگ جاتا اور یہ آپ کے اہل خانہ کے لیے بڑی بدقسمتی کی بات ہوتی۔ ان کا یہ عمل یقیناً ناقابل معافی ہے۔ انہوں نے آپ کو اصل صورتحال سے بے خبر رکھا۔

یہ تمام باتیں اپنی جگہ، جو کچھ آپ نے کیا وہ بھی مساوی طور پر ناجائز ہے۔ ایک چیز آپ کی تحویل میں دی گئی جسے آپ کو اپنے پڑوسی کے اہل خانہ تک پہنچانا تھا۔ آپ جب وطن پہنچے تو وہ چیز آپ کے قبضہ میں تھی لیکن آپ نے اسے اپنے پاس رکھا اور اپنے پڑوسی کے اہل خانہ سے کہہ دیا کہ وہ چیز کسٹم افسران نے روک لی ہے، دوسرے الفاظ میں آپ نے ایک ایسی چیز اپنے قبضہ میں رکھی جس کا آپ سے کوئی تعلق نہیں تھا اور آپ نے جان بوجھ کر اس شے کے مالکان سے جھوٹ بولا۔ آپ یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ چونکہ میرے پڑوسی نے مجھے دھوکا دیا تھا اس لیے میں نے بھی یہ طرز عمل اختیار کیا، لیکن آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آپ کا عمل اور آپ کے پڑوسی کا عمل بالکل الگ

الگ ہیں۔ آپ کے پڑوسی نے آپ کے ساتھ غلط سلوک کیا تو آپ کو بھی جواب میں اپنے پڑوسی کے ساتھ غلط سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ دو غلط کام مل کر ایک صحیح کام نہیں بنا سکتے۔ نہ ہی ایک غلط فعل دوسرے غلط فعل کا جواز پیدا کر دیتا ہے۔

جس وقت آپ یہ دیکھنے کے لیے پیکٹ کھول رہے تھے کہ اس میں واقعی سونا ہے یا نہیں، تو آپ یہ کام محض گمان اور شبہ کی بنیاد پر کر رہے تھے۔ آپ کے پاس اس سلسلے میں کوئی یقینی علم نہ تھا۔ اس طرح کے فعل کی اجازت کس طرح دی جا سکتی ہے؟

جب آپ نے پیکٹ کھول ہی لیا تو اس کے بعد آپ نے جو کچھ کیا وہ بھی حق بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ آپ نے اس پیکٹ سے برآمد ہونیوالے سونے کو نہایت عمدہ انداز میں صرف کر دیا لیکن آپ کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمیں صرف اسی رقم میں سے اللہ کی راہ میں صدقہ دینا چاہیے جو ہماری اپنی ہو۔ ہم ایسی چیز کا صدقہ نہیں دے سکتے جو ہماری ملکیت نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو ہماری ناجائز رقم کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے فعل کی یہ توجیہہ کر سکتے ہیں کہ آپ اپنے پڑوسی کو سبق سکھانا چاہتے تھے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ سبق کیسے سکھایا جا سکتا ہے۔ اگر آپ اپنے پڑوسی کو بتا دیں کہ آپ نے اس کے پیکٹ کے ساتھ کیا کیا ہے تو یقیناً دونوں جانب ناخوشی اور ناراضگی کے احساسات جنم لیں گے۔ آپ کا پڑوسی اپنی چیز کی واپسی کا مطالبہ کرے گا اور وہ ایسا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوگا۔

اگر آپ اس کے دعوے کو اس بنیاد پر مسترد کر دیں کہ اس کے پاس اس کے حق میں کوئی ثبوت نہیں ہے تب بھی وہ آپ کے خلاف دعوے میں سچا ہے۔ دوسری جانب اگر آپ اسے صحیح صورتحال سے باخبر نہ کریں تو آپ اسے کوئی سبق سکھا نہیں سکتے جیسا کہ آپ کی خواہش تھی۔ وہ محض آپ کے بیان پر اعتبار کر لے گا کہ اس کا پیکٹ کسٹم افسران نے ضبط کر لیا۔ اس سے اسے کیا سبق ملا۔ یہ درست ہے کہ اسے نقصان سے دوچار ہونا پڑا، لیکن اس نے پیکٹ آپ کے حوالے کرتے ہوئے یہ خطرہ مول لیا تھا۔ آپ اپنے پڑوسی کو کسی اور انداز میں نصیحت کر سکتے تھے۔ آپ اپنے پڑوسی کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے کہ اس کا فعل بہت خطرناک تھا اور وہ آئندہ ایسا کام ہرگز نہ کرے۔

آپ اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کو متنبہ کر سکتے ہیں کہ وہ وطن جاتے ہوئے ان صاحب کا سامان اپنے ساتھ نہ لے جائیں، لیکن اگر آپ اپنے پڑوسی کی چیز پر ہی قبضہ کر لیں اور اسے کسی بھی طرح صرف کر دیں چاہے وہ اس چیز کی، مستحق افراد میں تقسیم ہی کیوں نہ ہو، تو یہ فعل بھی ممنوع ہے۔ آپ کے پڑوسی کو اپنی چیز کی واپسی کا مطالبہ کرنے کا پورا حق ہے اور یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ وہ پوری رقم اپنے پڑوسی کو واپس کر دیں جو آپ کو اس کی چیز فروخت کر کے حاصل ہوئی تھی۔ جب آپ

اپنے پڑوسی کی یہ رقم اسے ادا کردیں گے تب ہی آپ کو اس رقم کا ثواب ملے گا، جو آپ نے غریبوں اور مستحق افراد میں تقسیم کی تھی۔

میرا مشورہ تو یہی ہے کہ آپ اپنے پڑوسی کو پوری صورتحال سے آگاہ کریں۔ اپنی نیت اور مقصد کی وضاحت کریں۔ اپنے فعل کی اس سے معذرت طلب کریں اور بات چیت کے ذریعے کسی تصفیہ پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ یہی صورت فریقین کے لیے اطمینان بخش ہوگی۔ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو آپ کے پڑوسی نے آپ کو جو چیز اپنے اہل خانہ تک پہنچانے کے لیے دی تھی وہ آپ پر قرض رہے گی اور آپ کو اس کی ادائیگی کرنا ہوگی۔ اگر آپ ادائیگی نہ کرنے کی راہ اختیار کریں گے تو اس کے لیے آپ کو اللہ کے حضور جوابدہ ہونا پڑے گا۔

غیر مسلم عزیزوں کی مذہبی تقریب میں شرکت

سوال: کیا ایک مسلمان اپنے غیر مسلم رشتہ داروں کی مذہبی تقریبات میں شریک ہوسکتا ہے؟

جواب: ایک مسلمان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ غیر مسلم رشتہ داروں سے اپنے تعلقات رکھے، بشرطیکہ وہ غیر مسلم رشتہ دار اسلام کے معاملے میں جارحانہ عزائم نہ رکھتے ہوں اور نہ ہی اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بھی طرح توہین کے مرتکب ہوتے ہوں۔ تاہم مسلمانوں کو غیر مسلموں کی مذہبی عبادات ورسوم میں شرکت نہیں کرنی چاہیے خواہ یہ عبادات ورسوم کسی مذہبی موقع پر ادا کی جارہی ہوں یا کسی اور وقت۔ اگر کوئی مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ، ان کے گرجے، مندر یا عبادت گاہ میں عبادت کرتا ہے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ اچھے تعلقات اور رواداری کا سلوک رکھنے کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ ان کے مذہبی تہواروں یا تقریبات میں شرکت کی جائے۔

بائیں ہاتھ سے کھانا

سوال: میں بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہوں، چند لوگوں نے مجھے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ سے کھانا کھانے اور ہر اہم کام دائیں ہاتھ سے کرنے کا حکم دیا ہے۔ میں پیدائشی طور پر بایاں ہاتھ استعمال کرنے کا عادی ہوں، ازراہ کرم بتائیے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا کھانے، اہم کام انجام دینے اور لوگوں سے مصافحہ کرنے

کے لیے دایاں ہاتھ استعمال کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ یہ ہدایت ایک طرح کی ترغیب ہے کہ روزمرہ زندگی میں تمام ایسے کام جن میں ہاتھ کے استعمال کی ضرورت پیش آئے دائیں یا سیدھے ہاتھ سے انجام دینے چاہئیں۔ یوں کہیے کہ دائیں ہاتھ کا استعمال، اسلام کے معاشرتی آداب کا حصہ ہے، یہ فرض نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے جو شخص دایاں ہاتھ استعمال نہیں کرتا وہ کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا کہ آخرت میں سزا کا حقدار ہو۔ جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے موجب دایاں ہاتھ استعمال کرتا ہے، وہ اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اجر پائے گا۔ اگر کسی شخص کو بایاں ہاتھ استعمال کرنے کی عادت ہے اور وہ دایں ہاتھ استعمال نہیں کرتا تو اسے کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنی اس عادت پر قابو پائے اور دایاں ہاتھ استعمال کرنے کی کوشش کرے، خاص طور پر کھانے کے دوران شعوری طور پر بائیں ہاتھ کی جگہ دایاں ہاتھ استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جو فعل عادت بن جائے اس پر قابو پانے میں دشواری پیش آتی ہے اس لیے ہوسکتا ہے کہ آپ بھی کھانے کے دوران ہمیشہ یہ بات یاد نہ رکھ سکیں، لیکن ہر بار خود کو یاد دلاتے رہنا چاہیے۔ بائیں ہاتھ سے کام کے عادی افراد کو دایاں ہاتھ استعمال کرنے کے لیے خاص طور پر کوشش کرنی ہوگی اور اگر یہ کوشش شعوری طور پر اس احساس اور جذبہ کے ساتھ کی جائے کہ یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے تو یقیناً اللہ کی جانب سے اس کوشش کا بہتر سے بہتر اجر ملنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

مرد کی ستر پوشی

سوال: جسم انسانی کے کون سے حصے ہمیشہ ڈھکے رہنے چاہئیں۔ کیا غسل کرتے ہوئے تمام کپڑے اتارے جاسکتے ہیں۔ ازراہ مہربانی ان کھلاڑیوں کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت فرمائیں جو مختصر لباس پہنتے ہیں؟

جواب: مسلمان علماء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ ایک شخص کو اپنے جسم کے قابل شرم حصوں کو ہمیشہ ڈھانپ کر رکھنا چاہیے۔ وہ ان کو صرف اپنی بیوی کے سامنے، ضرورت پڑنے پر ڈاکٹر یا قانونی کارروائی کی صورت میں کسی گواہ کے سامنے کھول سکتا ہے۔ امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے دیگر جید علمائے کرام کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ دوسروں کی موجودگی میں ایک شخص کو اپنی ران کو بھی ڈھانپ کر رکھنا چاہیے۔ علمائے کرام اس بات پر متفق ہیں کہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا جسم ڈھانپ کر رکھنا ہر مرد پر لازمی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی کھلاڑی ایسا لباس پہنتا ہے جو اس کے گھٹنوں سے اوپر تک کے حصہ کو ڈھانپ دیتا ہے تو اس کا لباس شرعی اعتبار سے

درست ہے۔

غیر مسلم ممالک میں فٹ بال یا دیگر کھیلوں کے میچوں یا تربیت کے بعد کھلاڑیوں کے جس قسم کے اجتماعی غسل کا رواج ہے اسلام اس قسم کے غسل کی اجازت نہیں دیتا، البتہ اگر کوئی شخص اپنے غسل خانے میں غسل کر رہا ہے جہاں اسے کوئی نہ دیکھ سکتا ہو تو وہ اپنے تمام کپڑے اتار کر غسل کر سکتا ہے۔

مہذب اور خوش وضع مسلمان

سوال: میرے ایک دوست نے خاصی لمبی مونچھیں رکھی ہوئی ہیں۔ کھانے کے وقت ان کی عادت ہے کہ روٹی کے ٹکڑے سے مونچھیں صاف کرلیا کرتے ہیں۔ جب ان سے کہا جائے کہ ایسا نہ کیا کریں کیونکہ یہ بہت برا اور بدنما محسوس ہوتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اس طرح کرنے کی اسلام میں ممانعت نہیں ہے۔ آپ اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں۔

جواب: یہ بات سب جانتے ہیں کہ اسلام اچھی وضع قطع اپنانے اور تہذیب سے رہنے پر بہت زور دیتا ہے تاکہ ایک مسلمان جن لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہ رہا ہے ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔ چنانچہ اگر ایک خاص عمل دیکھنے میں برا محسوس ہوتا ہے اور اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے تو ایک مسلمان کے لیے اسے ترک کر دینا بہتر ہے تاکہ دوسرے لوگ راحت محسوس کریں۔ یہ اصول ایسی جگہ منطبق ہوتا ہے جب مذکورہ عمل کی کسی حدیث یا سنت میں حوصلہ شکنی نہ کی گئی ہو۔ لیکن جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کے خلاف ہدایت کی گئی ہو تب تو اس معیوب فعل سے رک جانے کے لیے یہی سبب کافی ہے۔ آپ کے دوست کی عادت کے ضمن میں پہلی بات یہ کہنی ہے کہ انہوں نے اپنے چہرے کی ایسی وضع قطع کا انتخاب کیا ہے جس کی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حوصلہ شکنی فرمائی ہے۔ حدیث ہے کہ بت پرستوں سے مختلف راستہ اختیار کرو۔ اپنی مونچھیں تراشو اور داڑھی بڑھاؤ۔ علماء کرام کا کہنا ہے کہ مونچھیں تراشنے کا ایک مقصد یہ ہے کہ کھانے کے دوران غذائی اشیاء کے ٹکڑے مونچھوں میں اٹک نہ جائیں۔ یہ بات یقیناً بڑی بدنما محسوس ہوتی ہے کہ ایک شخص کسی گلاس سے پانی یا کوئی اور مشروب پی رہا ہے اور اس کی مونچھیں بھی بھیگی جا رہی ہیں۔

اگر آپ کے دوست کھانے کے دوران روٹی کے ٹکڑے سے اپنی مونچھیں صاف کر کے اس ٹکڑے کو پھینک دیتے ہیں تو ان کا یہ عمل قابل اعتراض ہے، لیکن اگر وہ اس ٹکڑے کو کھا لیتے ہیں تو وہ ایک بدنما فعل انجام دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ کھانے کے لیے جو بھی بیٹھا ہوگا، ان کا فعل اس

شخص کو تکلیف پہنچائے گا۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو خوش اخلاقی اپنانے کی تلقین کرتا ہے، دوسروں کو دکھ دینے کی نہیں۔

سفید بالوں کو رنگنے کی اجازت

سوال: کیا اس بات کی اجازت ہے کہ کوئی مسلمان شخص اپنے سفید ہونے والے بالوں کو رنگ لے۔ کہا جاتا ہے کہ گنج پن کے علاج کے لیے بعض دوائیں آتی ہیں جو بال اگنے میں مدد دیتی ہیں۔ کیا ایسی دوائیں استعمال کرنا درست ہے؟

جواب: جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ تشریف لائے اور اسلام کی حکمرانی ہوگئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے والد محترم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر آئے۔ وہ ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ بہت ضعیف تھے اور ان کے سارے بال سفید ہوگئے تھے۔ پھر وہ اسلام لائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی کہ ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے اور ان کے سارے بال رنگ دیے جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ بالوں کو رنگنے کے لیے سب سے بہتر شے حنا (مہندی) اور کسم (سیاہ مہندی) ہے۔ اس سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ بالوں کو رنگنے کی اجازت ہے۔ لیکن اس کا مقصد کسی کو دھوکا دینا نہیں ہونا چاہیے۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک شخص نے کسی گھرانے میں شادی کا پیغام دیا جو منظور کرلیا گیا۔ شادی کے بعد یہ بات کھلی کہ اس شخص نے اپنے بال رنگ لیے تھے جو سفید ہو رہے تھے۔ لڑکی کے گھر والوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو دیکھا اور لڑکی کے گھر والوں کو دھوکا دینے پر اسے سخت سرزنش کی۔ انہوں نے یہ بھی فیصلہ دیا کہ یہ شادی جائز نہیں ہے اور انہوں نے زوجین میں علیحدگی کا حکم دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی عمر کا غلط تاثر دینے کے لیے بال رنگ لینے کی اجازت نہیں ہے۔ دراصل یہ نیت ہے جو معاملہ کی نوعیت تبدیل کردیتی ہے۔ جب دھوکا دہی مقصد ہے تو اس تک لے جانے والی ہر چیز کی ممانعت ہے۔

جہاں تک بال اگانے والی دواؤں کے استعمال کا تعلق ہے، ان کی اجازت ہے۔ آپ اپنے بدن کو کسی خاص صورت حال کے مقابلے میں ردعمل ظاہر کرنے پر آمادہ کر رہے ہیں۔ یہ صورت حال وگ لگانے سے بالکل مختلف ہے۔ اگر آپ کوئی دوا استعمال کرتے ہیں اور وہ مؤثر ثابت ہوتی ہے (گو کہ اس کے امکانات بہت کم ہیں) تو اس کے نتیجے میں اگنے والے بال آپ کے اپنے ہوں گے

اور اس عمل میں دھوکے والی کوئی بات نہ ہوگی۔

اسلامی اور غیر اسلامی نام

سوال: کیا نام اسلامی اور غیر اسلامی ہوتے ہیں۔ کیا نام علاقائی یا زبان کی بنیاد پر رکھے جاتے ہیں؟ آج کل مسلمان جو نام رکھتے ہیں ان میں ایسے نام بھی ہیں جو اسلام آنے سے قبل رکھے جاتے تھے۔ مثلاً داؤد، یعقوب، ابراہیم وغیرہ۔ یہی نام عیسائی اور یہودی بھی رکھتے ہیں۔ بعض ممالک میں عیسائی حضرات خالد اور خدیجہ جیسے نام رکھتے ہیں جو بالکل مسلمانوں کے نام لگتے ہیں۔ براہ کرم آپ اپنی رائے ظاہر فرمائیں۔

جواب: اسلام کے نزدیک یہ ہر بچے کا حق ہے کہ اس کا اچھا نام رکھا جائے۔ اگر بچے کا باپ اس کا اچھا نام نہیں رکھتا تو بچہ روز حشر اپنے والد کے خلاف دعویٰ دائر کرسکتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں ناموں کا انتخاب ان کے معانی یا ان کے تاریخی پس منظر کی بنیاد پر رکھا جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے بچے کا نام کسی ایسی شخصیت کے نام پر رکھتے ہیں جس نے اسلام کے لیے عظیم خدمات انجام دی ہوں، تو آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ اس شخصیت کو یاد رکھے اور عمل کے لیے اس شخصیت کو مثال بنائے۔ اگر آپ اس شخصیت کو پسند کرتے ہیں اور اس کی تاریخ سے واقف ہیں تو جوں ہی آپ کا بچہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو جائے، آپ اسے اس شخصیت کے بارے میں بتانا شروع کر دیجیے۔

اسی طرح ہم انبیاء کرام علیہم السلام کے نام استعمال کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے اللہ کی رضا کے آگے خود کو پیش کر دینے اور اپنے تمام اعمال و افعال کو اسلام کے نصب العین کی خاطر وقف کر دینے کے سلسلے میں ہمارے سامنے بہترین مثالیں پیش کیں۔ یہ درست ہے کہ مسیحی اور یہودی حضرات اپنے بچوں کے نام ان انبیاء کرام علیہم السلام کے ناموں پر رکھ لیتے ہیں لیکن ان انبیاء کرام نے اسلام کا پیغام پہنچایا تھا یعنی اللہ کے آگے جھک جاؤ۔ یہ بھی درست ہے کہ مسلمان ممالک میں مسیحی اور دیگر اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایسے نام رکھ لیتے ہیں جو مسلمان رکھا کرتے ہیں۔ دراصل یہ بات کسی ملک کی صورتحال کی فطری انداز میں عکاسی کرتی ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ نام اسلامی ہے تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ یا تو اس کی اسلام کی تاریخی وابستگی ہے یا اس کے معنی اسلام کے نزدیک قابل قبول ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام وسیع پیمانے پر استعمال ہوئے اور نسل در نسل منتقل ہوئے چنانچہ وہ واضح طور پر مسلمانوں کے نام بن گئے۔ اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کے نام بھی اسلامی ہیں۔

ناخن اور بال گھر میں تراشنا

سوال: کیا اپنے گھر کے اندر ناخن اور بال تراشنے کی اجازت ہے اور کیا یہ عمل کرنے کے لیے کوئی خاص دن مقرر ہیں؟

جواب: اپنے گھر کے اندر ناخن یا بال تراشنا بالکل درست ہے تاہم اس بات کو بہتر کہا گیا ہے کہ کسی کے جسم کا کوئی بھی حصہ اگر اس سے الگ کیا جائے خواہ وہ صفائی ستھرائی کی غرض سے الگ کیا گیا ہو یا کسی اور مقصد کے تحت ایسا کیا گیا ہو، اس حصہ جسم کو زمین میں دفن کر دینا چاہیے۔ ناخن اور بال کسی بھی دن تراشے جاسکتے ہیں۔

وقت گزارنے کے لیے ویڈیو کا استعمال

سوال ا: مشرق وسطی میں مقیم غیر ملکی باشندوں، خصوصاً برصغیر سے تعلق رکھنے والے گھرانوں میں یہ ایک عام بات ہے کہ بیگمات گھروں میں ویڈیو فلمیں دیکھتی ہیں تاکہ ان کا وقت کٹ جائے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ وی سی آر پر فلمیں دیکھنا عادت بنتا جارہا ہے اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے یہ سلسلہ بند کرادیا۔ میری بعض سہیلیوں کا کہنا ہے کہ ویڈیو فلمیں دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ براہ کرم آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیے۔

سوال ۲: کیا مسلمانوں کو اداکاری کی اجازت ہے۔ اداکاری میں ایک اداکار کو شوہر، بیوی، والدین، بھائی، بہن کسی بھی قسم کا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ کہاں تک درست ہوگا؟

جواب ۱، ۲: ویڈیو فلمیں دیکھنے اور اداکاری کرنے کے بارے میں کوئی سخت قانون نہیں ہے۔ ہر طرح کے اعمال اور حالات کے لیے پانچ بنیادی اصول ہیں جن کا اطلاق کیا جانا چاہیے۔ ہم جو کچھ بھی کریں گے وہ درج ذیل پانچ میں سے کسی ایک کی تعریف میں آئے گا:

۱۔ فرض، ۲۔ واجب، ۳۔ جائز یا مباح، ۴۔ مکروہ، ۵۔ حرام۔

ہر چیز مختلف حالات اور مختلف واقعات کے پیش نظر ان پانچ میں سے کسی ایک کے زمرے میں آئے گی۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک آسان مثال لیجیے۔

رمضان میں روزہ رکھنا ہر اس مسلمان عورت اور مرد پر فرض ہے جو روزہ نہ رکھنے کا کوئی

معقول عذر نہ رکھتا ہو۔ لیکن بیمار یا مسافر کے لیے روزہ نہ رکھنا واجب ہے، بشرطیکہ وہ بعد میں اتنے ہی روزے رکھ کر رمضان کے روزوں کی تعداد پوری کردے جو اس نے علالت یا مسافرت کی وجہ سے رمضان میں نہیں رکھے۔ روزہ رکھنا اور روزہ نہ رکھنا ایسے شخص کے لیے جائز یا مباح ہے جس کے مرض پر غذا یا مشروبات کی دیر تک عدم فراہمی سے کوئی اثر نہ پڑتا ہو۔ ایسے شخص کے لیے روزہ رکھنا مکروہ ہے جو علالت کی وجہ سے روزہ نہ رکھنے کی سہولت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور روزہ رکھنے سے یہ اندیشہ ہو کہ اس کی حالت خراب تر ہو جائے گی۔ اس معاملے میں دودھ پلانے والی ماں کی مثال دی جاسکتی ہے جو سہ پہر کے وقت کمزوری محسوس کرنے لگتی ہے اور جس کے بچے کو دن کے آخر پہر میں پینے کے لیے دودھ کی معقول مقدار نہیں ملتی اور یہی روزہ جو عام حالات میں فرض ہے، ایک مسلمان مجاہد کے لیے حرام ہو جاتا ہے جب وہ کسی جنگی مہم پر ہو اور روزہ رکھنے سے اس کی جسمانی قوت متاثر ہوتی ہو۔

اگر ان پانچ بنیادی باتوں کا حالات و واقعات کے پیش نظر اسلام کے ایک بنیادی رکن پر اطلاق ہوسکتا ہے تو زندگی کے دوسرے ایسے معاملات میں بھی جہاں بہت واضح قوانین نہیں ہیں، ان کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ ویڈیو فلمیں دیکھنا اور اداکاری کرنا ایسے ہی دو معاملات ہیں۔ اگر گھروں میں رہنے والی خواتین، شوہر کے دفتر جانے کے بعد تنہائی کا شکار ہوتی ہیں تو ان کے لیے ویڈیو فلمیں دیکھنا جائز ہے بشرطیکہ یہ فلمیں اسلام کی عام اخلاقی تعلیمات اور شائستگی کے خلاف نہ ہوں، لیکن اگر ویڈیو پر ایسی فلمیں دیکھی جائیں جو اسلامی تہذیب و شائستگی کی خلاف ورزی پر مبنی ہوں اور ان کو دیکھنے سے اللہ کی نافرمانی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو تو ایسی فلموں کا دیکھنا حرام ہوگا۔

اسی طرح اداکاری اس وقت جائز ہوسکتی ہے جب وہ کسی اچھے مقصد کے لیے کی جارہی ہو۔ اگر اداکاری سے نامہذب اور نامعقول رویہ پیدا ہوتا ہو تو وہ حرام ہوگی۔

چاند گرہن کے وقت کام کرنا

سوال: ہمارے ہاں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ جب کبھی چاند گرہن یا سورج گرہن ہو تو حاملہ خواتین کو کوئی کام نہیں کرنا چاہیے۔ خاص طور پر قینچی یا چاقو سے کسی چیز کو کاٹنے سے اس وقت تک گریز کرنا چاہیے جب تک چاند گرہن یا سورج گرہن جاری ہے۔ براہ کرم اس سلسلے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب: اس قسم کے خیال میں یقیناً کوئی صداقت نہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کے علاقے میں یہ عقیدہ

اسلام آنے سے پہلے کے دور سے چلا آ رہا ہو یا دیگر علاقوں کی تہذیب و ثقافت سے منتقل ہوا ہو۔ اسلام میں اس خیال کے حق میں کوئی بنیاد نہیں ہے اور یہ بات اسلامی طرز فکر سے مطابقت نہیں رکھتی۔

اس ضمن میں اسلام کے انداز فکر کو اس وقت زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے جب اس کے تاریخی پس منظر پر نگاہ ڈالی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک کے آخری چند برسوں میں آپ کے حرم میں شامل حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا قبطیہ کے بطن سے ایک لڑکا ہوا۔ حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کو مصر کے حاکم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تھا۔ لڑکے کا نام ابراہیم رکھا گیا۔ یہ لڑکا چند ماہ بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس کی وفات کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت صدمہ تھا۔ جب اس بچے کی تدفین کا وقت آیا تو بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ سورج گرہن ہو چکا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے کی وفات کے لیے سورج گرہن ہوا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سنی تو انہوں نے ان خیالات کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے فرمایا کہ "چاند اور سورج اللہ کی دو نشانیاں ہیں۔ یہ کسی کے مرنے یا کسی کے پیدا ہونے کی وجہ سے نہیں گہناتے۔" چنانچہ سورج گرہن اس لیے نہیں ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چھوٹا بچہ فوت ہو گیا تھا۔ سورج اور چاند کو گرہن لگنا قدرتی عمل ہے۔ لہٰذا آپ نے جس خیال کا اظہار کیا ہے وہ محض اوہام پرستی ہے جس کو اسلام تسلیم نہیں کرتا۔

نمک گرانے کی سزا

سوال: کیا یہ درست ہے کہ اگر کسی شخص سے نمک گر جائے تو اسے قیامت کے روز اس نمک کو اپنی پلکوں سے اٹھانا پڑے گا؟

جواب: یہ خیال محض اوہام پرستی پر مبنی ہے جس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں، تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کھانے پینے کی اشیا گرانا یا پھینک دینا جائز قرار دے دیا گیا ہے۔

قبر پر جا کر تلاوت کرنا

سوال: میری والدہ نے انتقال سے پہلے مجھے یہ ہدایت کی تھی کہ ان کی وفات کے بعد قرآن مجید کی بعض خاص آیات ان کی قبر پر جا کر تلاوت کیا کروں۔ اب میں جب بھی وطن جاتا ہوں والدہ کی اس ہدایت پر عمل کرتا ہوں۔ براہ کرم وضاحت فرمایئے کہ اس بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے؟

جواب: جب آپ قرآن مجید کی کوئی آیت سورہ یا پورے قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں اور یہ نیت رکھتے ہیں کہ اس کا ثواب آپ کے متوفی والد یا والدہ یا کسی اور عزیز کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ ثواب متعلقہ مرحوم کو پہنچ جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے قبر پر جانا ضروری نہیں ہے۔ آپ چونکہ الخبر میں مقیم ہیں اس لیے آپ اپنی والدہ کے ایصال ثواب کے لیے یہیں رہتے ہوئے قرآن مجید کی تلاوت کر سکتے ہیں۔ آپ کو صرف یہ کرنا ہوگا کہ تلاوت سے پہلے یا فوراً بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی ہوگی کہ اس کا ثواب میری والدہ کو پہنچے۔ اس عمل سے والدین کی قبر پر حاضری دینے اور اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کی دعا کرنے کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

کیا عربی نام ضروری ہیں؟

سوال: کیا ہر مسلمان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عربی نام رکھے؟

جواب: مسلمان کے لیے عربی نام رکھنا قطعی ضروری نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ (رضی اللہ عنہم) میں سے صرف ان کے نام تبدیل کرائے جن کے نام یا تو غیر اسلامی تھے یا ان کے معنی اچھے نہیں تھے۔ اس لیے کسی شخص کا نام ایسا ہوتا جس سے اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی ظاہر ہوتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے نام تبدیل کر دیئے (کیونکہ یہ غیر اسلامی تھے) مثال کے طور پر حضرت عبدالرحمن (رضی اللہ عنہ) بن عوف قبول اسلام سے پہلے عبدامر کے نام سے معروف تھے جس کے معنی ہیں امر کا بندہ۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام عبدالرحمن رکھا۔ اسی طرح بعض عربوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اپنے بچوں کے نام اس جانور کے نام پر رکھتے، بچے کی پیدائش کے بعد پہلی مرتبہ جس سے ان کا مقابلہ ہوا۔ جب یہ لوگ اسلام لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سابقہ عامیانہ نام تبدیل کر دیے۔ آج اگر ایک شخص اسلام قبول کرتا ہے اور اس کے نام میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اسلام کے لیے ناقابل قبول ہے تو اس شخص کو اپنا نام تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیشتر معاشروں میں ناموں کا انتخاب ان کے صوتی آہنگ پر رکھا جاتا ہے جب ایک شخص اپنا ایمان تبدیل کر چکا ہے تو اس کا نام تبدیل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

کس نام سے پکارا جائے؟

سوال: میرے تمام دوست احباب مجھے ''علیم'' کے نام سے پکارتے ہیں میرا نام عبدالعلیم ہے۔ بعض

علماء کی رائے ہے کہ میں اپنے دوستوں کو تاکید کروں کہ وہ پورے نام سے پکارا کریں لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگ اس مشورے پر توجہ نہیں دیتے۔ براہ کرم آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیے۔

جواب: ''علیم''، ''عالم'' کا اسم تفصیل (سپرلیٹو فارم) ہے جس کے معنی ہیں ایسا شخص جو علم رکھتا ہو۔ لیکن جب اس لفظ سے پہلے ''ال'' کا اضافہ ہو جاتا ہے تو یہ ایسا اسم بن جاتا ہے جو صرف اللہ کی ذات سے مخصوص ہے اور اس کی ایک صفت ہے۔ ''العلیم'' کے معنی ہیں ایسا خالق جو ہر چیز کے بارے میں مکمل علم رکھتا ہے۔ ''عبدالعلیم'' ایک خاص اسلامی نام ہے۔ اگر صرف علیم کہا جائے تو یہ ایک ایسا اسم ہے جو اللہ کی ذات سے مخصوص نہیں ہے لہٰذا اس لفظ کو کسی شخص کے نام کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کے دوست احباب آپ کو پورے نام ''عبدالعلیم'' سے مخاطب کریں تو بہتر ہوگا تاہم اگر وہ صرف ''علیم'' کہہ کر پکاریں، تب بھی وہ کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوں گے۔

خوشبو لگا کر عبادت کرنا صحیح ہے؟

سوال: میں ہمیشہ سے یہی سمجھتا رہا ہوں کہ کپڑوں پر خوشبو لگا کر عبادت کرنا غلط ہے، لیکن میں نے عام طور پر یہ دیکھا ہے کہ لوگ عبادت سے پہلے اپنے جسم اور کپڑوں پر خوشبو لگاتے ہیں۔

جواب: ایسے لوگ جنہیں آپ نے عبادت سے پہلے خوشبو لگاتے دیکھا ہے، دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی خوشبو لگاتے تھے اور اپنے صحابیوں کو بھی ہدایت کرتے تھے کہ وہ خوشبو لگا کر مسجد آئیں تاکہ مسجد کا ماحول خوشگوار رہے۔ اکثر لوگ جو اس سنت کی پیروی کرتے ہیں ایسی خوشبوئیں استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں الکحل استعمال نہ کیا گیا ہو۔ مختلف مہک والی ایسی بہت سے خوشبوئیں دستیاب ہیں۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسی خوشبوئیں استعمال کرنا مناسب ہے، جن میں الکحل استعمال کیا گیا ہو۔ علماء اس بارے میں متضاد آراء رکھتے ہیں۔ قابل غور نکتہ یہ ہے کہ الکحل کا خوشبو میں استعمال جائز ہے یا نہیں۔ بیشتر علماء کا خیال ہے کہ خوشبو میں الکحل کا استعمال جائز ہے۔ یہ سچ ہے کہ انہیں پینے کی ممانعت ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انہیں دوسرے کاموں میں بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص ان علماء کی مختلف آراء کا بغور جائزہ لے تو اسے ہر فریق کے دلائل میں وزن محسوس ہوگا۔ ہمیں انفرادی طور پر یہ کرنا چاہیے کہ ہم دونوں طرح کے دلائل کا جائزہ لیں اور جو استدلال وزنی محسوس ہو اس کے مطابق اپنے طور پر فیصلہ کریں۔ جو لوگ کوئی رائے قائم

نہ کر سکیں وہ ایسے علماء سے رہنمائی لے سکتے ہیں جن پر وہ اعتماد کرتے ہوں۔ لیکن محتاط طریقہ یہ ہے کہ ایسی خوشبوئیں استعمال کی جائیں جن میں الکحل استعمال نہ کیا گیا ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص دوسرے مسلمان کو عبادت سے پہلے خوشبو استعمال کرتا دیکھے تو اسے اس بارے میں معترض نہیں ہونا چاہیے۔

غلام اور کنیزیں رکھنے کا مسئلہ

سوال: میں نے پڑھا ہے کہ اسلام میں کنیزوں کے ساتھ جنسی اختلاط کی اجازت ہے۔ کنیز کس کو کہیں گے؟ کیا آج کل گھروں میں کام کرنے والی عورتیں اس زمرے میں آتی ہیں؟ بعض صورتوں میں انہیں کھانا اور رہائش مہیا کی جاتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنے مالک کے ہر اس حکم کو بجا لائیں جو ان کے لیے ممکن ہو۔

جواب: کنیزوں کا دور اب ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں یہ طریقہ تھا کہ اگر کافروں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے مسلمان فوج دشمن کی عورتوں کو گرفتار کرتی تھی اور مسلم حکمران جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا فیصلہ کرتے تھے، جس کی اسلام میں برابری کے سلوک کی ہدایت کے ساتھ اجازت دی گئی ہے، تو ایسی عورت کنیز قرار پاتی تھی اور اسے اپنے آقا کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ آقا اگر چاہے تو اپنے غلام یا کنیز کو بازار میں فروخت کر سکتا تھا۔

لیکن اب انسانوں کی خرید و فروخت ختم ہو چکی ہے۔ آپ کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ آج کل گھروں میں کام کرنے والی ملازم عورتوں پر ''کنیز'' کی اصطلاح کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ خواتین آزاد ہیں اور اپنی مرضی سے کسی بھی وقت ملازمت چھوڑ سکتی ہیں۔ ایسی گھریلو ملازمت پیشہ خواتین جو نہایت سخت شرائط کے ساتھ کام کر رہی ہوں، انہیں بھی کنیز تصور نہیں کیا جا سکتا۔ گھروں میں کام کرنے والی عورتوں کی کمزور حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں اپنی تفریح کے لیے استعمال کرنا جرم ہے، جس کی سخت سزا دنیا میں بھی ملے گی اور آخرت کی زندگی میں بھی اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ اسلام کے نزدیک گھروں میں کام کرنے والی عورتیں آزاد ہیں۔ ان کے ساتھ نہایت ہمدردانہ سلوک کرنا چاہیے۔

معاملات، اقتصادی مسائل

''سود'' کیا ہے؟

سوال: ازراہ کرم یہ وضاحت فرمایے کہ اسلام میں ''سود'' کا تصور کیا ہے اور بینک میں جمع کرائی گئی رقم پر اس کا اطلاق کس طرح ہوتا ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ بینک، اپنے کھاتے داروں کو جو اضافی رقم ادا کرتے ہیں، وہ اس منافع کا حصہ ہوتی ہے جو وہ مختلف کھاتے داروں کے سرمائے سے کی گئی سرمایہ کاری پر حاصل کرتے ہیں۔ اگر یہ دلیل درست ہے تو کیا میں اپنی بچت کسی یورپی یا امریکی بینک میں جمع کرا سکتا ہوں اور اس رقم پر ملنے والا منافع لے سکتا ہوں۔؟

جواب: سود کے بارے میں مختصراً یوں سمجھیے کہ کسی قرض یا جمع شدہ رقم پر اصل سے زائد ملنے والی رقم ''سود'' ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص سے کچھ رقم قرض لیتا ہے اور یہ معاہدہ کرتا ہے کہ مقررہ مدت کے بعد وہ اصل رقم سے زیادہ رقم واپس کرے گا تو یہ لین دین سود کا کاروبار قرار پائے گا۔ سودی کاروبار میں سب سے زیادہ قابل اعتراض بات یہ ہے کہ اس میں دوسرے شخص کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے، جو استحصال کی ایک شکل ہے۔ جب کوئی شخص قرض حاصل کرتے وقت یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ اصل رقم سے زائد واپس کرے گا تو اس وعدے کی بنیاد اس کی وہ فوری ضرورت ہوتی ہے جس نے اسے قرض لینے پر مجبور کیا ہے۔ بعض اوقات، قرض لینے والا، مقررہ مدت کے بعد قرض واپس کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا اور وہ رقم کی واپسی کی مدت میں اضافہ کے لیے کہتا ہے۔ اس صورت میں اصل سے زائد رقم مزید بڑھ جاتی ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آج کل کے رواج اور طریقے کے مطابق بینکوں میں جمع کرائی گئی رقوم، سود کے زمرے میں نہیں آتیں، ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ بینک کسی کے پاس پیسے

مانگنے کے لیے نہیں جاتے بلکہ لوگ رضاکارانہ طور پر خود بینک آتے ہیں اور اپنی رقوم بینک کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس طرح بینک کسی کا استحصال نہیں کرتے۔ یہ دلیل، قابل قبول نہیں ہے۔ جب بینک ان جمع شدہ رقومات سے کسی فریق کو قرض دیتے ہیں تو اس پر اضافی رقوم وصول کرتے ہیں جسے ''سروس چارجز'' کا نام دیا جاتا ہے یا کاروبار کی صورت میں ''منافع'' یا ''منافع منقسمہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ تمام نام ''سود'' کے لفظ اور کاروبار پر ''ملمع سازی'' کی کوششیں ہیں۔

اسلام میں تجارت اور سرمایہ کاری اس قسم کے اشتراک سے کی جاتی ہے کہ ایک شخص کا سرمایہ ہو اور دوسرا اپنے تجربے، مہارت اور کاروباری سوجھ بوجھ استعمال کر کے اس سرمائے کو استعمال کرے۔ اس قسم کی پارٹنرشپ یا مشارکہ، صاف ستھرے اصولوں پر قائم ہونا چاہیے، جس کے نفع اور نقصان میں دونوں فریق برابر کے شریک ہوں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس قسم کی پارٹنر شپ میں نفع کا تعین پہلے سے نہیں ہونا چاہیے۔ نفع کی بنیاد کاروبار کی کارکردگی پر ہے، اگر کارکردگی اچھی رہی ہے تو نفع زیادہ ہو سکتا ہے، بصورت دیگر کم ہوگا یا نقصان کا سامنا کرنا ہوگا۔

تجارت اور مشارکہ کے اس اسلامی تصور کے برخلاف، بینک پہلے ہی سے منافع کا تعین کر دیتے ہیں اور نقصان کی صورت میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتے ان دو وجوہ کی بناء پر بینکوں میں جمع کرائی گئی رقوم پر ملنے والی اضافی رقم ''سود'' ہے اور اس قسم کے کاروبار کی اسلام میں ممانعت ہے۔

پیشے جن کی آمدنی مشکوک ہوتی ہے

سوال: بعض لوگ ایسے پیشے اختیار کرتے ہیں جو جائز نہیں ہیں۔ مثلاً شراب کی فروخت یا فلموں اور ڈیو کیسٹ کا کاروبار یا بیمہ کی فروخت۔ علاوہ ازیں بعض حضرات سود لیتے ہیں اور رشوت بھی قبول کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسے پیشوں سے متعلق افراد کی دعوت قبول کرنا چاہیے یا ان کے دیئے ہوئے تحفے وصول کر لینے چاہئیں یا ان کی تقریبات میں شرکت کی جاسکتی ہے؟

جواب: آپ نے اپنے سوال میں جن پیشوں سے متعلق افراد کی آمدنیوں کو ناجائز قرار دیا ہے، پہلے میں ان کے بارے میں وضاحت کرنا چاہوں گا۔ یہ بات تو واضح ہے کہ شراب اور دیگر منشیات کی فروخت سے ہونے والی آمدنی ناجائز ہے۔ درحقیقت، شراب یا نشہ آور اشیاء سے کسی بھی قسم کے تعلق سے جو آمدنی ہو، وہ ناجائز ہے خواہ وہ شراب کشید کرنے کے مقصد سے انگور کی کاشت سے لے کر شراب پینے تک کوئی بھی عمل ہو۔ انگور کی کاشت تو بیشک جائز ہے لیکن اگر نیت یہ ہو کہ کاشت

شدہ انگور سے شراب کشید کی جائے گی اور اگر انگور کے باغات کسی شراب کی کمپنی کی ملکیت ہوں، تو اس صورت میں انگور کی کاشت اور اس کی خرید وفروخت کے کاروبار سے متعلق آمدنی ناجائز ہوگی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دس افراد پر لعنت بھیجی ہے جن میں نشہ آور مشروبات کی خرید وفروخت، کشید میں ملوث افراد، شراب پیش کرنے والا، شراب لے جانے والا، وہ شخص جس تک شراب لے جائی جائے، وہ شخص جس کے لیے شراب کشید کی جائے اور وہ شخص جو شراب پیے، شامل ہیں۔ لہٰذا اگر ایک شخص اپنی دکان میں شراب فروخت کرتا ہے تو اس کی تمام آمدنی ناجائز ہوگی سوائے اس کے کہ وہ دکان میں دیگر اشیاء بھی فروخت کرتا ہو۔ اس صورت میں صرف جائز اشیاء کی فروخت سے ہونے والی آمدنی جائز ہوگی۔

سود لینے اور رشوت قبول کرنے والے افراد کے بارے میں یہ تصور کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ ان کی تمام آمدنی ان دو ذریعوں سے ہوئی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص نے اچھی خاصی رقم بینک کے سودی کھاتے میں جمع کرا رکھی ہو لیکن یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ اس کے پاس اس رقم یا آمدنی کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ اسی طرح جو شخص رشوت قبول کرتا ہے، وہ اپنے کام کی تنخواہ بھی پاتا ہوگا یا اس کا کوئی جائز ذریعہ آمدنی بھی ہوگا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی گزر بسر کا کلی انحصار رشوت کی آمدنی پر ہے۔

وڈیو کیسٹ اور فلموں کی فروخت ضروری نہیں کہ ناجائز ہی ہو۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ وڈیو کیسٹ یا فلم پر کیا ریکارڈ کیا گیا ہے اور انہیں کس مقصد کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ یقیناً ایسی فلمیں بھی ہوتی ہیں جن کا دیکھنا فائدہ مند ہوتا ہے مثلاً دستاویزی فلمیں اور طبی یا سائنس کے دیگر علوم پر معلوماتی فلمیں وغیرہ۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی معلوماتی فلمیں فروخت کرتا ہے تو اس کی آمدنی جائز ہے۔

وڈیو کیسٹ اور فلموں میں ایسی فلمیں بھی ہوتی ہیں جن کو دیکھنے سے گناہ کی ترغیب ہوتی ہے۔ وہ تشدد اور غیر صحتمندانہ سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ ایسی فلمیں ممنوع ہیں اور ان کو دیکھنے کی سختی سے حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔ ایسی فلموں سے ہونے والی آمدنی ناجائز ہوسکتی ہے خصوصاً اس صورت میں جب فلم فروخت کرنے والے کی نیت یہ ہو کہ ایسے رویے کی حوصلہ افزائی کی جائے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

ایک نقطۂ نظر کے مطابق بیمے کی ہر قسم کی پالیسیاں فروخت کرنا یا جاری کرنا ممنوع نہیں ہے ہر نوعیت کی بیمہ پالیسی کا جائزہ لے کر اس کے مطابق فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے بیمہ ایجنٹ کی تمام آمدنی کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔

جب کوئی شخص اپنے کاروبار میں ایسے معاملات میں ملوث ہوجاتا ہے جو جائز بھی ہیں اور ناجائز بھی تو اس صورت میں اس کی صرف اتنی ہی آمدنی ناجائز ہوگی جو اس کے کاروبار کے ناجائز حصے سے حاصل ہورہی ہے، تمام آمدنی کو ناجائز قرار نہیں دیا جائے گا۔

جب آپ کو یقین ہو کہ ایک شخص کی تمام آمدنی یا آمدنی کا بڑا حصہ ایسے کاروبار سے حاصل ہورہا ہے جو جائز نہیں ہے۔ (مثلاً قمار خانے شراب خانے، یا سود پر رقم کا لین دین) تو اس شخص کی دعوت طعام قبول نہیں کرنی چاہیے نہ ہی اس کے گھر کسی سماجی تقریب میں شرکت کرنا چاہیے اور نہ ایسے شخص کا تحفہ قبول کرنا چاہیے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کسی نے کوئی چیز کھانے کی دعوت دی اور جب لقمہ کھانے کے بعد آپ کو یہ علم ہوا کہ یہ غذا کسی ناجائز ذریعے سے حاصل کی گئی تھی تو آپ نے اس کو اگلنے کی کوشش کی۔

گو لاعلمی میں کوئی ایسی چیز کھانے پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ عمل ناجائز اشیاء کے خلاف ان کے شدید احساس کو ظاہر کرتا ہے۔ اس موقع پر آپؓ نے فرمایا کہ اگر اس ناجائز لقمے کو اگلنے کے دوران میری روح بھی جسم سے باہر آجائے تو میں اس کو اگل دوں گا۔

جب کوئی شخص مختلف ذرائع سے آمدنی حاصل کرتا ہے جن میں سے بعض کی اجازت ہے اور آپ یہ تعین نہیں کر سکتے کہ اس آمدنی کا کوئی حصہ ناجائز ہے، تو ایسے شخص کی دعوت یا اس کا تحفہ قبول کرلینا منع نہیں ہے۔ اس کا اطلاق، مثال کے طور پر بینکوں کے ملازمین پر ہوتا ہے۔ بینکوں کے کاروبار کا کچھ حصہ ناجائز ہے جبکہ کچھ نہیں ہے۔ اگر ایک شخص کو یہ علم ہی نہ ہو کہ اس نے جو تحفہ وصول کیا ہے وہ مشکوک یا ناجائز آمدنی سے حاصل کیا گیا ہے تو اسے کسی بھی صورت ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا۔

کاروبار میں شرکت

سوال: میں اپنے ایک دوست کے چھوٹے سے کاروبار میں ایک چوتھائی سرمائے کے ساتھ شریک ہوں اور ہمارے درمیان یہ طے ہوا ہے کہ منافع کا ایک چوتھائی حصہ مجھے ملے گا۔ روزانہ کے حساب کتاب کی لکھت پڑھت میں کافی وقت لگتا ہے اس لیے اس کام سے بچنے کے لیے میرے دوست نے تجویز پیش کی ہے کہ وہ ایک چوتھائی منافع کی اوسط رقم کے برابر رقم مثلاً دو ہزار ریال ماہانہ مجھے ادا کردیا کرے گا۔ میں اس تجویز سے متفق ہوں بشرطیکہ یہ اسلامی اصول کے مطابق ہو۔ ازراہ کرم رہنمائی فرمایئے۔

جواب: مجھے یہ اندازہ ہوا ہے کہ آپ کے دوست روزانہ کے حساب کتاب کا ریکارڈ رکھنے میں متامّل ہیں اور چونکہ کاروبار چھوٹا ہے اور حساب کے لکھنے پڑھنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے اس لیے آپ کے دوست نے اوسط منافع کی تجویز پیش کی ہے اور بظاہر یہ تجویز معقول اور پرکشش لگتی ہے، لیکن دونوں شراکت داروں کو یہ بات اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس قسم کی شراکت داری میں گڑبڑ کا امکان ہمیشہ رہے گا۔ پچھلے حساب کی بنیاد پر منافع کی رقم کا وہ اوسط جو اس وقت آپ کے حصے میں آرہا ہے وہ ابھی تو آپ کو اور آپ کے دوست کو قابل قبول ہے لیکن اگر چند ماہ بعد منافع کم ہوگیا اور کاروبار کا منافع آدھا رہ گیا تب کیا ہوگا؟ اسی طرح کیا آپ اس وقت عدم اطمینان محسوس نہیں کریں گے جب کاروبار کو مزید فروغ حاصل ہوجائے اور منافع بڑھ جائے اور آپ کو وہی رقم ملتی رہے جو ابھی طے ہورہی ہے جب کہ یہ رقم اس وقت اصل منافع کا آٹھواں حصہ ہو؟ ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ اس وقت آپ جو رقم قبول کررہے ہیں وہ آپ کی اس رقم کے تناسب کے اعتبار سے ہے جو آپ نے کاروبار میں لگا رکھی ہے۔ بغیر حساب کتاب کے اس مسئلے کا حل مشکل نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے کاروباری شریک آپ کے بھائی یا بہترین دوست ہوں، آپ دونوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور مفاہمت ہو اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ درگزر سے کام لیتے ہوں اس کے باوجود یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ عام صورتحال میں لوگ ''اوسط منافع'' لینا پسند نہیں کرتے کیونکہ منافع ہمیشہ کم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ اوسط منافع سے ہمیشہ ایک شریک کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے، کیونکہ اسلام انصاف کے تقاضوں کی تکمیل کو خصوصی اہمیت دیتا ہے اس لیے یہ طریقہ کار قبول نہیں کیا جاسکتا۔

میری رائے یہ ہے کہ آپ کو اوسط منافع کی بجائے اپنے منافع کی اصل رقم پر اصرار کرنا چاہیے۔ تاہم اس سلسلے میں یہ ہوسکتا ہے کہ حساب کتاب کو آسان بنالیا جائے۔ یہ فیصلہ آپ دونوں کریں گے کہ کم سے کم اور آسان حساب رکھنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔ اس ضمن میں آپ یہ بھی کرسکتے ہیں کہ ماہانہ حساب کے بجائے سہ ماہی بنیاد پر حساب کریں۔ لیکن یہاں میں آپ کو اس بات پر پھر متوجہ کروں گا کہ حساب رکھنے کی جو بھی صورت آپ طے کریں وہ لازماً ایسی ہونی چاہیے جس سے آسانی کے ساتھ اور یقین کے ساتھ منافع کی رقم اور اس کے حصہ کا تعین ہوسکے۔

اجارہ داری اور جائز منافع کا فرق

سوال: فصل کی کوئی چیز اپنے وقت پر بازار میں بافراط دستیاب ہوتی ہے اور اس کی قیمت بھی کم ہوتی ہے۔ بعد میں جب اس خاص چیز کا موسم گزر جاتا ہے تو اس کی فراہمی کم ہوجاتی ہے اور قیمت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ بالعموم رسد اور قیمت میں یہ کمی بیشی بتدریج ہوتی ہے۔ بعض تاجر زرعی اشیاء

کو فصل کے موسم میں بڑی مقدار میں خرید کر جمع کر لیتے ہیں تاکہ جب اس کی قلت ہو تو اسے فروخت کر سکیں۔ اس طرح انہیں زیادہ منافع ملتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طریقہ کار کی اجازت ہے اور کیا یہ عمل ذخیرہ اندوزی کے ضمن میں نہیں آتا؟

جواب: آپ کے سوال کے جواب کے سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں ''اجارہ داری'' اور ''تجارت کی بہتر سمجھ بوجھ'' میں فرق کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ جو تاجر فصل کے وقت بازار میں دستیاب کسی چیز کو کم قیمت پر خرید لیتا ہے وہ سمجھ داری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اگر وہ اس شے کو احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے اور فصل گزرنے کے بعد جب بازار میں اس خاص شے کی قلت پیدا ہوتی ہے اس وقت اپنے ذخیرے کو بازار میں فروخت کے لیے لاتا ہے تو اس طرح وہ طلب و رسد کے اصول سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اگر یہ تاجر ایمانداری کے ساتھ کام کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس طریقے سے اس نے جو منافع حاصل کیا ہے وہ جائز سمجھا جائے گا۔

لیکن طلب و رسد کے اصول کو معقولیت کے ساتھ استعمال کرنا بنیادی شرط ہے اور یہی اس طریقے کا سب سے اہم پہلو ہے۔ متعلقہ تاجر، دوسرے تاجروں اور عام صارفین کے ساتھ منصفانہ طریقے سے کاروبار کر رہا ہے تو یہ درست ہے۔ غالباً اس معاملے میں 'منصفانہ طریقے' کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے یہ جاننا اچھا ہوگا کہ ''غیر منصفانہ طریقہ'' کیا ہے۔ اس معاملے میں غیر منصفانہ طریقہ کو ''ذخیرہ اندوزی'' یا ''اجارہ داری'' کہتے ہیں۔ بعض اوقات کوئی کاروباری یا چند کاروباری حضرات کوئی چیز بھاری مقدار میں خرید لیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں بازار میں اس شے کی رسد، طلب کے مقابلے میں کم ہوجاتی ہے اور قیمتیں چڑھ جاتی ہیں۔ لیکن رسد میں کمی اور قیمتوں میں اضافے کا یہ عمل فطری نہیں ہے۔ رسد میں کمی اور قیمت میں اضافہ ذخیرہ اندوزوں نے مصنوعی طریقے سے پیدا کیا اور قیمت میں اضافے کی وجہ یہ تھی کہ کسی ایک فرد یا کئی افراد نے بازار سے وہ چیز غائب کر دی۔ اس کارروائی کا مقصد صرف یہ تھا کہ مصنوعی قلت پیدا کر کے زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جائے۔ یہ طریقہ کار یقیناً غیر منصفانہ ہے اور اس کی اجازت نہیں ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دونوں معاملوں میں کاروباری حضرات نے کسی بھی چیز کی بھاری مقدار خرید لی، تو پہلی صورت جائز کیوں ہے اور دوسری صورت کو ناجائز کیوں قرار دیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دوسری صورت میں کاروباری حضرات کا پورا رویہ اور عمل مصنوعی تھا جبکہ پہلا طریقہ فطری تھا۔ ان دونوں طریقوں میں تمیز پیدا کرنے کے لیے ایک بنیادی شرط ضروری ہے اور وہ یہ کہ متعلقہ شے بازار میں خاصی مقدار میں موجود رہنی چاہیے۔ یعنی فصل کے دوران کم

قیمت پر دستیابی سے فصل ختم ہونے کے بعد اس وقت تک جب متعلقہ کاروباری اپنی خرید کردہ شے بازار میں فروخت کے لیے لائے، وہ چیز بازار میں عام صارفین کو دستیاب ہوتی رہے۔ جب کبھی ایسا لمحہ آئے کہ وہ مخصوص چیز بازار میں دستیاب نہ ہو تو اس وقت اس کاروباری کو جس نے فصل کے وقت وہ چیز سستے داموں خریدی تھی اپنا مال بازار میں لے آنا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو یہ عمل ذخیرہ اندوزی کے ذیل میں آئے گا اور ناجائز قرار پائے گا۔

ان دونوں صورتوں میں فرق بہت سادہ سا ہے اور ہر کاروباری شخص اس فرق کو سمجھتا ہے، لہٰذا ناجائز طریقے سے بچنا چاہیے۔

طے شدہ رقم کا منافع جائز ہے؟

سوال: اگر ایک شخص ایک منافع بخش کمپنی کے تمسکات میں سرمایہ کاری کرے اور اسے سالانہ یا ششماہی بنیاد پر ایک طے شدہ رقم مل رہی ہو تو اس صورت میں سرمایہ کاری پر ملنے والا منافع جائز ہوگا یا ناجائز ہوگا؟

جواب: اگر آپ کو اس بات کا پیشگی علم ہے کہ آپ جو سرمایہ کاری کر رہے ہیں، سال کے خاتمے پر، اصل رقم کا ایک مقررہ فیصد آپ کو بطور منافع مل جائے گا؟ یعنی کسی کمپنی یا ادارے کے تمسکات کی صورت میں ان پر ایک مقررہ رقم بطور منافع ملے گی تو یہ رقم یقیناً سود ہوگی اور اسلام میں اس کی ممانعت ہے۔ اس کے برخلاف سرمایہ کاری کے وقت آپ کو یہ علم نہ ہو کہ سال کے آخر میں آپ کو تین فیصد رقم ملے گی یا تیس فیصد۔ یا سرے سے کوئی منافع ہی نہیں ہوگا بلکہ نقصان اٹھانا پڑے گا تو اس صورت میں یہ سرمایہ کاری جائز ہوگی۔ اس دوسری صورت میں سرمایہ کاری کا مطلب یہ ہے کہ نفع یا نقصان کا تعلق کمپنی کی سال بھر کی کارکردگی پر منحصر ہے۔ جب کبھی بھی کسی سرمایہ کاری پر ایک مقررہ رقم کے منافع کی ضمانت دی جائے یا وعدہ کیا جائے تو یہ تمام کار بار سود کے زمرے میں شمار ہوگا۔ جائز کاروبار کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں پہلی یہ کہ اس سرمایہ کاری میں نقصان کا عنصر موجود ہو اور دوسرے یہ کہ منافع کی رقم کا پہلے سے تعین نہ کیا گیا ہو، نفع یا نقصان اور منافع کی شرح کا انحصار متعلقہ کمپنی کی کارکردگی پر ہونا چاہیے۔

کاروبار کی جگہ کو دوبارہ کرائے (پگڑی) پر دینا

سوال: جائیداد اور خاص طور پر کسی کاروباری جگہ کی پگڑی کی رقم کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر

کیا ہے؟ یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ رقم کرائے کی اس رقم کے علاوہ ادا کی جاتی ہے، جس کا دونوں فریقوں کے درمیان معاہدہ ہوتا ہے۔ جب پرانا کرائے دار اپنی جگہ چھوڑتا ہے اور کسی نئے کرائے دار کو وہ جگہ دیتا ہے تو عام طور پر یہ رقم نئے کرائے دار سے یا مالک جائیداد سے وصول کرلی جاتی ہے۔ اس تمام لین دین میں مالک جائیداد کو کچھ نہیں ملتا۔ سوائے مقررہ کرائے کی رقم کے۔ ''گڈول'' یا ''پگڑی'' کی یہ رقم جو ایک کرائے دار سے دوسرے کرائے دار کو منتقل ہوتی ہے، جائز ہے؟

جواب: اس معاملے پر غور کرنے کے لیے چند رہنما خطوط سامنے رکھنا ہوں گے۔ پہلی بات یہ کہ کسی بھی قانونی معاہدے کی ایک مدت طے کی جاتی ہے جو فریقین کے نزدیک قابل قبول ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی شخص کی کسی کمزوری، لاپرواہی یا کسی اور وجہ سے اس سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ کسی جگہ (جائیداد) کے مالک کو اس جگہ کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے کا حق ہے کہ اسے کون استعمال کرے، الا یہ کہ وہ اپنی رضامندی سے کسی دوسرے شخص کو اس بات کا اختیار دے۔

ان بنیادی اصولوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک کرائے دار اپنے زیر استعمال جگہ کسی دوسرے شخص کو کرائے پر دے سکتا ہے، بشرطیکہ کرائے داری کے معاہدے میں یہ شرط موجود ہو۔ اگر معاہدے کے وقت مالک جائیداد نے یہ واضح کردیا ہے کہ کرائے دار کسی تیسرے شخص کو جگہ کرائے پر دیتے وقت مالک جائیداد کی اجازت لے گا، یا کسی تیسرے فریق کو جگہ کرائے پر دینے کی اجازت نہیں ہوگی تو اس صورت میں معاہدے کی پابندی فرض ہوتی ہے۔ اگر کرائے داری کے معاہدے میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ اس جگہ کو کسی تیسرے فریق کو کرائے پر دیا جاسکے گا یا نہیں تو اس صورت میں فیصلہ کا اختیار صاحب جائیداد کو ہوگا۔

ان رہنما اصولوں کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر معاہدے کے تمام فریق اس بات پر رضا مند ہیں تو جائیداد کو کسی نئے کرائے دار کو بھی دیا جاسکتا ہے اور پگڑی بھی لی جاسکتی ہے، تاہم مالک جائیداد پر اس سلسلے میں کسی بھی قسم کا اخلاقی یا مادی دباؤ ڈالنے کی اجازت نہیں ہے۔ کرائے پر دیتے وقت اضافی رقم (پگڑی) عام طور پر اس شہرت یا گڈول کی قیمت کے بطور وصول کی جاتی ہے جو اس جگہ کی بن چکی ہوتی ہے۔ معاشرے میں یہ ایک عام معمول بن چکا ہے اور اس پر کسی قسم کی پابندی بھی نہیں ہے اس لیے یہ جائز ہے۔

نجی سرمایہ کاری اور شکوک وشبہات

سوال: میں نے اور میرے کئی دوستوں نے اپنی بچت کی رقمیں ایک ایسے ادارے کے کاروبار میں لگا رکھی ہیں جو کرنسی کی خرید وفروخت کا کام کرتا ہے۔ یہ ادارہ نفع ونقصان میں ہمیں شریک کرتا ہے۔ منافع کی صورت میں کوئی رقم مقرر نہیں ہے جبکہ اس کاروبار میں نقصان کے امکانات بھی واضح ہیں۔ مزید معلومات حاصل کرنے پر یہ ظاہر ہوا کہ یہ ادارہ سودی کاروبار میں بھی ملوث ہے اور اس سودی کاروبار کا منافع اپنے شراکت داروں میں تقسیم کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمیں اس ادارے کے کاروبار کے بارے میں کس حد تک معلومات کرنی چاہئیں۔ کیا ہمارے لیے یہ کافی ہے کہ یہ ادارہ جو کچھ ہم سے بیان کرتا ہے اس پر یقین کریں اور یہ سمجھیں کہ وہ اپنے بیان کے مطابق اسلامی اصولوں کے تحت کاروبار کر رہا ہے۔ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس وعدے کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی جاتی ہے؟

جواب: قطع نظر اس بات کے کہ مذکورہ ادارہ سودی کاروبار میں ملوث ہے یا نہیں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ نے جو سرمایہ کاری کر رکھی ہے وہ اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے کیونکہ اس معاملے میں کرنسی، دوسری تجارتی اشیاء کی طرح ایک شے ہے۔ جب یہ ادارہ کرنسی خریدتا اور بیچتا ہے تو اس کاروبار میں نفع یا نقصان کچھ بھی ہوسکتا ہے، دونوں کے امکانات برابر کے ہیں۔ جب تک نقصان کے امکانات موجود ہیں اور آپ پر منافع کا کوئی مقررہ حصہ، جو کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے، آپ کو ملتا ہے اس سرمایہ کاری میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

جب کسی ادارے کے بارے میں یہ شکوک وشبہات ہوں کہ وہ ایسے کاروبار میں ملوث ہے جس کی اسلام میں اجازت نہیں ہے اور وہ سود کے لین دین کا کام کرتا ہے تو اس صورت میں سرمایہ کار کو اپنے اطمینان کے لیے معقول حد تک معلومات کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جس کاروبار میں اس کا سرمایہ لگے گا اس کی نوعیت کس قسم کی ہے۔

''معقول حد تک کوشش کرنے'' کا پیمانہ مختلف افراد کے معاملوں میں مختلف ہوسکتا ہے۔ کسی کمپنی کے کاروباری معاملات تک ہر شخص کی رسائی ممکن نہیں ہوسکتی۔ دوسری صورت میں اگر آپ براہ راست اس ادارے کے ذمہ داروں سے ان کے ادارے کی سرگرمیوں اور کاروبار کے معاملے میں سوال کریں تو ممکن ہے کہ وہ آپ کو مطلوبہ اطلاعات فراہم نہ کرنا چاہیں۔ لیکن اگر آپ نے براہ راست سوال کیا اور اس کا جواب آپ کی اطلاع کی تردید کرتا ہے تو آپ نے اپنے طور پر ''معقول

حد تک کوشش'' کرنے کی شرط پوری کر دی، بشرطیکہ آپ کے پاس مطلوبہ اطلاعات حاصل کرنے کے دیگر ذرائع نہ ہوں۔

علاوہ ازیں یہ سوال بھی قابل غور ہے کہ اس ادارے کا سودی کاروبار کتنا بڑا ہے یا کل کاروبار کا کتنے فیصد ہے۔ اگر یہ محض ایک مختصر سا حصہ ہے تو اس صورت میں آپ کی سرمایہ کاری جائز ہے۔ اگر اس ادارے کے کاروبار کا ایک بڑا حصہ غیر سودی ہے تو آپ کو اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ دوسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ ادارہ دو علیحدہ علیحدہ کاروبار کرتا ہو اور سرمایہ کاری کا خواہشمند یہ واضح کر دیتا ہو کہ وہ کون سے کاروبار میں سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے۔ اس صورت میں معاملہ بالکل صاف ہے۔ ایسے معاملات میں بالعموم کسی ادارے یا فرد کا وہ بیان ہی قابل قبول ہوتا ہے جو وہ اپنے کاروبار کے بارے میں دے رہا ہو، بشرطیکہ ادارہ یا فرد نیک نام ہو۔

بینکوں کے غیر سودی نظام کی حقیقت؟

سوال: ہمارے ملک میں بینکوں نے سودی نظام کو ختم کرتے ہوئے، نفع نقصان میں شرکت پر مبنی کھاتے داروں کے بچت اکاؤنٹ متعارف کرائے ہیں۔ بینکوں کا دعویٰ ہے کہ یہ نظام اسلامی شریعت کے مطابق ہے کیونکہ بچت پر منافع کی شرح متعین نہیں ہے اور نفع یا نقصان کے امکانات برابر کے ہیں۔ اس سلسلے میں میرے شکوک وشبہات یہ ہیں کہ بینک کھاتے داروں کی جمع کرائی ہوئی رقم سے کس طرح سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ وہ خود کاروبار کرتے ہیں اور نفع نقصان کے ذمہ دار ہوتے ہیں یا پرانے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے یہ رقم لوگوں کو قرضہ پر دیتے ہیں اور اس پر ان سے سود حاصل کرتے ہیں۔ کیا ایک شخص صرف اس پر اعتماد کرتے ہوئے (کہ یہ بلا سودی نظام ہے) سرمایہ کاری کر سکتا ہے؟

جواب: جب دو فریق آپس میں کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو اس سے پہلے معاہدے کی شرائط پر غور کر لیتے ہیں اور وہ معاہدہ انہی شرائط پر طے پاتا ہے اور دونوں فریق ان شرائط کے پابند ہوتے ہیں۔ جب بینک اپنے کھاتے داروں کو نفع نقصان میں شراکت کی بنیاد پر سرمایہ کاری کی دعوت دیتے ہیں تو یہ بینکوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس شرط کو پورا کریں اور ان کی بچتوں کی سرمایہ کاری پر نفع یا نقصان کا حساب کر کے ہر کھاتے دار کو اس کا حصہ ادا کریں۔ اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو یہ ان کی (بینکوں کی) ذمہ داری ہے کہ وہ معاہدے کی شرط پر عمل نہیں کر رہے۔

اس مسئلے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا بینکوں کے اس دعویٰ پر یقین کیا جانا چاہیے۔ اس سوال کا

جواب یہ ہے کہ جو شخص بینک کے دعویٰ پر یقین کرتے ہوئے عمل کرے، وہ ان شرائط کی خلاف ورزی کا ذمہ دار نہیں ہے جو بینک کی جانب سے کی جائے، بشرطیکہ اسے، ان باتوں کا علم نہ ہو، یا وہ انہیں قبول نہ کرتا ہو۔ ایک فریق کی جانب سے پیش کیے گئے دعویٰ کو اس کی ظاہری حیثیت میں قبول کرنے اور ماننے میں نہ تو کوئی حرج ہے اور نہ ایسا کرنا غلط ہوگا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ایسا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ لہٰذا اگر ایک شخص یا فریق کی اس بات پر اعتماد کیا جائے جو وہ کہہ رہا ہے، تو یہ محفوظ طریقہ ہوگا۔

اگر بینکوں کے اس دعوئی کے بارے میں ہمیں شبہ ہے تو اس شبہ کی بنیاد شہادتوں پر ہونی چاہیے۔ جب یہ ثبوت مل جائے کہ بینک صرف سودی کاروبار کو چھپانے کے لیے ایک غلط دعویٰ کر رہے ہیں تو اس صورت میں اپنے علم وصوابدید کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہوئے عمل کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں اگر بینک سودی طریقہ کار کے مطابق اپنا لین دین دوسرے افراد یا اداروں کے ساتھ کریں تو ہمیں ان سرگرمیوں میں شریک نہیں ہونا چاہیے خواہ وہ یہ دعویٰ ہی کیوں نہ کرے کہ اس کا یہ لین دین اسلامی طریقۂ کار کے مطابق ہے۔ اگر بینک دوسروں کو قرضے دیتا ہے اور ان پر سود وصول کرتا ہے اور ہمیں یہ یقین ہو کہ ہم جو رقم جمع کراتے ہیں وہ اس سودی لین دین میں استعمال ہوتی ہے تو اس صورت میں بینکوں میں سرمایہ کاری نہیں کرنا چاہیے۔

گمشدہ سامان کا معاوضہ

سوال: سعودی عرب آتے ہوئے میرے ایک دوست کے اہل خانہ نے کچھ سامان میرے حوالے کیا کہ میں یہاں پہنچ کر انہیں دے دوں۔ سفر کے دوران میرا سوٹ کیس کہیں کھو گیا جو آج تک بازیاب نہیں ہوسکا۔ ایک ماہ بعد فضائی کمپنی نے میرے گمشدہ سوٹ کیس کے بدلے مجھے معاوضہ کی ادائیگی کی جو سوٹ کیس کے وزن کے حساب سے تھی۔ سوال یہ ہے کہ میں اپنے دوست کو اس کے گمشدہ سامان کے معاوضے کی ادائیگی کس طرح کروں۔ کیا مجھے اس کے سامان کی مالیت کے برابر رقم ادا کرنا ہوگی یا اس شرح سے ادائیگی مناسب ہوگی جس شرح سے فضائی کمپنی نے مجھے معاوضہ دیا ہے!

جواب: فرض کیجیے کہ آپ کو گمشدہ سامان کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا تو اس صورت میں آپ کو اپنے دوست کو کچھ بھی ادا نہیں کرنا پڑتا کیونکہ ان کا سامان، آپ کے سامان کے ساتھ گم ہوا۔ ایسی صورت میں معاوضہ ادا نہ کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ نقصان آپ کی غلطی سے نہیں ہوا۔ آپ نے اپنے دوست کا سامان اپنے سامان کے ساتھ سوٹ کیس میں رکھا اور سفر کے دوران معمول کے طریقے

کے مطابق فضائی کمپنی کے عملے کے حوالے کر دیا۔

فرض کیجیے کہ کوئی شخص اپنی رقم یا قیمتی اشیاء مثلاً زیورات وغیرہ تحفظ کے مقصد سے آپ کے پاس رکھواتا ہے۔ آپ اس رقم یا قیمتی اشیاء کو اپنی رقم یا سامان کے ساتھ محفوظ جگہ رکھ دیتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ آپ کے گھر میں چوری ہو جاتی ہے اور چور آپ کی رقم اور قیمتی اشیاء کے ساتھ دوسرے شخص کی رکھوائی ہوئی رقم یا سامان بھی لے جاتے ہیں، اس صورت میں آپ اس شخص کو کسی قسم کا جرمانہ یا معاوضہ ادا کرنے کے ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جملہ نقصان آپ کی کسی غلطی کی وجہ سے نہیں ہوا ہے۔

آپ نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس میں چونکہ فضائی کمپنی نے آپ کو معاوضہ کی ادائیگی کی ہے اس لیے یہ نہایت بہتر ہوگا کہ آپ اپنے دوست کو اس کے گمشدہ سامان کے بدلے اسی شرح سے معاوضہ کی پیش کش کریں جس شرح سے فضائی کمپنی نے ادائیگی کی ہے۔ اگر آپ ادائیگی نہیں کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اپنے دوست کے گمشدہ سامان کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ فرض کیجیے کہ آپ کے سوٹ کیس کا وزن ۲۰ کلوگرام تھا اور فضائی کمپنی نے آپ کو دس ڈالر فی کلوگرام کی شرح سے ادائیگی کی ہے تو آپ کو ۲۰۰ ڈالر معاوضہ ملا۔ فرض کر لیتے ہیں کہ آپ کے دوست کے سامان کا وزن ۲ کلوگرام تھا، اس صورت میں آپ اپنے دوست کو ۲۰ ڈالر ادا کرنے کے پابند ہوں گے۔ اگر سوٹ کیس میں یہ دو کلو وزن نہیں ہوتا تو آپ کو فضائی کمپنی سے ۱۸۰ ڈالر ہی موصول ہوتے۔ اگر آپ کے دوست کا سامان اس رقم سے زیادہ قیمتی تھا تو اس صورت میں بھی انہیں وہی معاوضہ دیا جائے گا جس شرح سے فضائی کمپنی نے ادا کیا ہے۔

قرض کی رقم کی ادائیگی

سوال: میرے قرض خواہ کا مطالبہ ہے کہ میں اسے رقم کی ادائیگی غیر سرکاری طریقے سے ڈاک خانے کے ذریعے کروں۔ اگر قرض کی رقم اس طریقے سے رقم گم ہو جائے تو کیا مجھے دوبارہ ادا کرنی ہوگی۔

جواب: اگر آپ کا قرض خواہ آپ سے رقم کی واپسی کسی خاص طریقے سے چاہتا ہے اور اس طریقے میں نقصان کا اندیشہ ہے تو آپ کو ان پر یہ بات واضح کر دینا چاہیے کہ اس طریقے میں یہ نقصان ہو سکتا ہے اور ان سے یہ یقین دہانی حاصل کر لی جائے کہ نقصان کی صورت میں وہ ذمہ دار ہوں گے۔ جب وہ یہ ذمے داری قبول کر لیں تو آپ ان کی رقم کی ادائیگی ڈاک خانے یا ان کے

بتائے ہوئے کسی خاص طریقے کے مطابق کردیں۔ اگر وہ ذمے داری قبول نہ کریں تو اس صورت میں آپ ان کی رقم کی ادائیگی ایسے طریقے سے کریں جس کے تحت قرض خواہ کو لازمی وصولی کی ضمانت دی جاتی ہو۔

رقم ہوتے ہوئے مکان کی تعمیر کے لیے قرض لینا

سوال: فرض کیجیے ایک شخص کے پاس مکان خریدنے یا تعمیر کرنے کے لیے کافی رقم موجود ہے لیکن وہ یہ رقم کسی کاروبار میں لگا دیتا ہے جہاں اسے اچھا منافع حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مکان خریدنے کے لیے بینک سے قرضہ حاصل کرتا ہے۔ اس قرض پر اسے سود بھی ادا کرنا ہوگا۔ اس صورتحال میں دین کی ہدایت کیا ہے؟

جواب: آپ نے جو مثال بیان کی ہے اسے مغربی اصطلاح میں خالص کاروباری ذہنیت کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ ایک شخص اپنے آجر سے تنخواہ وصول کر رہا ہے، اس آمدنی میں سے وہ کچھ رقم بچا لیتا ہے لیکن اس بچت کو مکان خریدنے کے لیے استعمال کرنے کے بجائے کسی کاروبار میں لگا دیتا ہے، جہاں سے اسے اس رقم کے مقابلے میں زیادہ منافع ملنے کی امید ہے، جو وہ مکان خریدنے کے لیے بینک سے حاصل کئے گئے قرض پر بطور سود ادا کرے گا۔ اس صورتحال میں سود پر قرض لینے کا کوئی جواز نہیں ہے، خواہ اس کے لیے کوئی بھی تاویل پیش کی جائے۔ اگر اس کے باوجود وہ ایسا کرتا ہے تو ''سود'' کے گناہ کا مرتکب ہوگا۔ علاوہ ازیں اس بات کی کون ضمانت دے سکتا ہے کہ جو رقم اس نے کاروبار میں لگائی ہے اس پر ہمیشہ اچھا منافع ملتا رہے گا۔ کاروبار میں تو نقصان کا اندیشہ بھی ہوتا ہے اور جس کاروباری ذہنیت کے تحت اس نے یہ فیصلہ اور عمل کیا ہے، وہ اسے بڑے مالی خطرات سے دوچار کر سکتی ہے۔ لہٰذا میرا مشورہ یہی ہے کہ اس شخص کو اس قسم کا کام نہیں کرنا چاہیے اور اسلام کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے سود کے گناہ سے بچنا چاہیے اس نیت و عمل کا صلہ جو اللہ سے ملے گا، وہ ان معمولی دنیاوی فوائد سے کہیں زیادہ اور مستقل نوعیت کا ہوگا۔

اگر ایک شخص کا اپنا کاروبار ہے تو اس کے لیے صورتحال مختلف ہوگی۔ وہ شخص اپنے سرمائے سے کاروبار کر رہا ہے جس کے ذریعہ اسے اور اس کے گھر والوں کو رزق حاصل ہوتا ہے۔ اگر وہ شخص کاروبار میں سے رقم نکال کر مکان خرید لیتا ہے تو اس کا کاروبار تباہ ہو جائے گا اور وہ ایک طرح سے بے روزگار ہو جائے گا۔ اس شخص کے لیے مکان بھی ایک بنیادی ضرورت ہے جس کے لیے وہ قرض حاصل کر سکتا ہے تاہم اس صورت میں بھی اسے فیصلہ ترجیح سامنے رکھ کر کرنا چاہیے۔

قسطوں پر خریداری اور سود کا فرق

سوال: میں ایک کار خریدنا چاہتا ہوں، لیکن نقد ادائیگی اور اقساط پر ادائیگی کی صورتوں میں کار کی قیمت میں نمایاں فرق ہے۔ براہ کرم اس بات کی وضاحت فرمائیں کہ اقساط پر اگر کوئی چیز خریدی جائے تو کیا اس میں سود بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص بینک سے قرضہ لے اور اس پر سود ادا کرے تو کیا وہ گناہ گار ہوگا؟

جواب: آپ نے جو مسئلہ دریافت فرمایا ہے اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ نے کار ڈیلر سے کیا معاہدہ کیا ہے۔ آپ کسی کار ڈیلر کے پاس جاتے ہیں اور کوئی کار خریدنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ آپ اسے بتاتے ہیں کہ آپ کار کی قیمت اقساط پر ادا کریں گے۔ کار ڈیلر آپ کو آگاہ کرتا ہے کہ اگر آپ کار کی قیمت نقد ادا کریں گے تو یہ (مثال کے طور پر) آپ کو ۲۰ ہزار روپے میں ملے گی اور اگر آپ اسے ایک سال کے اندر اقساط میں ادا کر دیں گے تو اس کی قیمت (فرض کیجئے) ۲۲ ہزار روپے ہوگی۔ آپ دونوں صورتوں پر غور کرتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں کہ دوسری صورت آپ کے لیے زیادہ سہولت بخش ہے۔ آپ اپنی دلچسپی ظاہر کرتے ہیں اور سمجھوتہ پر دستخط کر دیتے ہیں۔ یہ کسی چیز کو خریدنے کا بالکل جائز طریقہ ہے۔ آپ جو زائد رقم ادا کر رہے ہیں وہ سود نہیں ہے۔ آپ نے کار ڈیلر سے کوئی قرضہ نہیں لیا جسے آپ سود کے ساتھ واپس کر رہے ہوں۔

اقساط پر معاوضے کی ادائیگی کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ جب آپ کسی کار ڈیلر سے اقساط پر کار خریدنے میں دلچسپی ظاہر کریں تو وہ کسی بینک یا مالیاتی ادارے سے آپ کو معاہدہ کرنے کا مشورہ دے۔ ممکن ہے اس بینک یا مالیاتی ادارے سے اس کار ڈیلر کا لین دین بھی ہو۔ آپ اس بینک یا مالیاتی ادارے میں جا کر اپنی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ بینک یا ادارے کے ذمہ داران آپ کو بتاتے ہیں کہ وہ کار ڈیلر کو کار کی قیمت نقد ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اب آپ کو ایک مخصوص رقم اتنے عرصہ کے لیے ہر ماہ، بینک یا اس ادارے میں جمع کروانی ہوگی۔ جب آپ اس عرصہ میں جمع کروائی جانے والی تمام رقوم کو جمع کریں گے تو وہ ۲۲ ہزار روپے ہوگی۔ اس قسم کا معاہدہ اسلام میں ممنوع ہے کیونکہ اس میں سود کی آمیزش ہے۔ اس پابندی کی اصل وجہ یہ ہے کہ بینک یا مالیاتی ادارہ کار ڈیلر کو کار کی قیمت نقد ادا کر دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ادارے نے آپ کو کار خریدنے کے لیے ۲۰ ہزار روپے کا قرضہ دے دیا ہے، اب آپ کو یہ رقم بینک کو اقساط پر ادا کرنی ہے جس میں سود بھی شامل ہوگا۔ کار ڈیلر نے صرف کار کی قیمت وصول کی ہے، چنانچہ یہ دوٹوک طور پر سودی معاہدہ ہوگا،

جس کی اسلام میں ممانعت ہے۔

مجھے امید ہے کہ آپ دونوں معاملات کے درمیان فرق کو محسوس کر رہے ہوں گے۔ پہلی صورت بالکل ایسی ہی ہے کہ آپ کسی دکان پر کوئی شے خریدنے جائیں اور اس سے کہیں کہ میں رقم تین یا چار ماہ بعد ادا کروں گا۔ یہ سن کر دکاندار چیز کی جو قیمت آپ کو بتائے گا وہ اس قیمت سے زیادہ ہوگی جو نقد ادائیگی کی صورت میں وصول کی جاتی ہے۔ یہ صورت قابل قبول ہے لیکن اگر آپ کسی بینک میں جائیں اور رقم قرض لے کر بازار سے کوئی شے خرید لیں اور پھر بینک کو آسان اقساط میں اس رقم سے زیادہ ادا کریں جو آپ نے بینک سے بطور قرض لی تھی تو آپ سود ادا کریں گے جو ممنوع ہے۔ یقیناً سود کی ادائیگی بہت بڑا گناہ ہے۔

مقروض شخص کی خیرات؟

سوال: اگر کوئی مقروض شخص قرضوں کی ادائیگی کیے بغیر اپنی دولت خیرات کر دے تو کیا اس کا یہ عمل قابل قبول اور لائق ثواب ہوگا؟

جواب: جو شخص مقروض ہے اس کو زکواۃ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ درحقیقت وہ تو خود زکواۃ وصول کرنے کا مستحق ہے۔ جو بھی شخص مقروض ہو اسے پہلے اپنے قرض ادا کرنے چاہئیں اور پھر حساب کرنا چاہیے کہ اس کے پاس کتنی رقم باقی بچی ہے۔ اگر یہ بچی ہوئی رقم زکواۃ کے لیے مقرر کردہ نصاب کے برابر ہو تو اسے بچی ہوئی رقم پر زکواۃ ادا کرنی ہوگی۔ قرضوں کی ادائیگی کے لیے جو رقم اس کے پاس تھی اس پر زکواۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس اصول سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے قرضے کی ادائیگی کس قدر ضروری ہے۔ اسی طرح جو شخص زکواۃ کے علاوہ کسی اور خیراتی مقصد کے لیے چندہ دینا چاہتا ہے، اس کے لیے لازمی ہے کہ اگر وہ مقروض ہے تو پہلے قرضے ادا کرے۔ مقروض شخص کو خیرات کرنے سے پہلے اپنے قرضے چکانے کی فکر کرنی چاہیے۔ تاہم اگر کسی شخص کو قرضوں کی ادائیگی ایک مقررہ مدت کے اندر کرنا ہے اور اس کا مستقل ذریعہ آمدنی ہے جس سے وہ قرضے بھی ادا کرتا ہے اور اپنے اخراجات بھی پورے کرتا ہے تو ایسا شخص اپنی بچت میں سے خیرات کر سکتا ہے اس عمل کا ثواب اسے ملے گا۔

امانت کس کے حوالے کی جائے؟

سوال: ''الف'' نے میرے ذریعہ ''ب'' سے ایک چھوٹا سا معاہدہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد ''ب'' نے مجھے

کچھ رقم دی کہ میں ''الف'' کو پہنچادوں۔ لیکن اس سے قبل کہ میری ''الف'' سے ملاقات ہوتی ''الف'' کا انتقال ہوگیا۔ میں نے ''الف'' کے وارثوں کا پتہ چلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اب اس معاملے کو بارہ برس گزر چکے ہیں اور میں اس رقم کو اپنے پاس رکھتے ہوئے خلش محسوس کرتا ہوں۔ ازراہ کرم مجھے بتایئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: آپ کے مسئلے کا حل بے حد آسان ہے آپ اس رقم کو کسی طرح خیرات کردیں۔ اس طرح رقم کے مالک کو اس صدقے کا ثواب مل جائے گا اور آپ کو اس رقم کو بطور امانت اب تک رکھنے اور اسے نیک مقصد کی خاطر صرف کرنے کا اجر ملے گا۔ بعد میں اگر آپ کی ملاقات ''الف'' کے کسی وارث سے ہو تو آپ انہیں بتائیں کہ آپ نے یہ رقم نیک کام میں خیرات کردی ہے۔ آپ اس کے سامنے دو صورتیں رکھیں۔ پہلی یہ کہ ''الف'' کی جو رقم خیرات کی گئی ہے، آپ وہ رقم ''الف'' کے وارث کو ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ دوسری صورت یہ کہ ''الف'' کا وارث رقم کے خیرات کیے جانے سے متفق ہو جائے۔ اگر ''الف'' کا وارث رقم کو بطور صدقہ دیئے جانے پر راضی ہے تو اسے بھی اس بات کا اجر ملے گا لیکن اگر وہ آپ سے رقم کا مطالبہ کرتا ہے اور آپ اسے یہ رقم اپنے پاس سے ادا کردیتے ہیں تو آپ کو رقم صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔

کیا سوشل سیکورٹی اسکیم اسلامی ہے؟

سوال: کیا اسلام میں سماجی تحفظ کے لیے بیمے کی اجازت ہے؟ ہمارے ساتھ جو کچھ بھی پیش آتا ہے وہ منجانب اللہ ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے کیا تلافی کا تصور مہمل نہیں ہے؟ سعودی عرب میں کام کرنے والے غیر ملکی ملازمین سے پنشن اسکیم اور دیگر اسکیموں کے لیے چندہ وصول کیا جاتا ہے اور یہ جمع شدہ رقم ایک طویل عرصہ تک محفوظ رکھی جاتی ہے، اسلامی شریعت میں ان امور کی گنجائش ہے؟

جواب: مسلمان علماء کی ایک کونسل نے حال ہی میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ بیمہ خواہ کسی بھی قسم کا ہو، اسلام میں اس کی گنجائش نہیں ہے، سوائے امداد باہمی کے بیمہ کے۔ بیمہ کی ممانعت کی متعدد وجوہات ہیں۔ تاہم بنیادی امر یہ ہے کہ بیمہ کے معاہدے کی شرائط اسلامی نقطۂ نظر سے ناقابل قبول ہیں۔ یہاں مختصر سی جگہ میں تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کی جاسکتی، صرف یہ بات سمجھ لینا کافی ہوگا کہ انتہائی پڑھے لکھے علماء نے اس مسئلہ کا تفصیلی اور بغور مطالعہ کیا اور اس کے بعد بیمہ کو غیر اسلامی قرار دیا ہے۔

اس کے برخلاف امداد باہمی کے بیمہ (کوآپریٹو انشورنس) کی اسلام اجازت دیتا ہے کیونکہ کسی تباہی اور حادثہ کی صورت میں یہ باہمی امداد و تعاون کے ذریعہ ایک دوسرے کی مدد کرنے کی سادہ سی شکل ہے۔ اس کا مجوزہ طریقہ کار یہ ہے کہ چند افراد کا ایک گروہ باہم مل جائے اور کسی ایک رکن پر کسی آفت یا مصیبت کے وقت یا کسی ہنگامی صورتحال میں اس کی مدد کرے، اس مقصد کے لیے باہمی رضامندی سے فنڈ بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ رقم استعمال نہ ہو یا اس کی ضرورت پیش نہ آئے تو گروہ کے ارکان اپنے اپنے حصہ کی رقم کی واپسی کا مطالبہ بھی کرسکتے ہیں۔ یہ طریقہ اس طریقہ کار سے بالکل مختلف ہے، جو بیمہ کمپنیاں اختیار کرتی ہیں۔

سماجی تحفظ کے نظام بالعموم سرکاری انتظام کے تحت ہوتے ہیں اور یہ اس صورت میں جائز ہیں کہ جمع شدہ رقم کی سرمایہ کاری اس طریقے سے ہو جس کی اسلام اجازت دیتا ہے۔ اس سرمایہ کاری میں سود کا عنصر شامل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہوا تو پورا نظام ناقابل قبول بن کر رہ جائے گا۔ آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اسلام کسی سرمائے کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کسی طریقے کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اصول کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر معاملات میں یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کی اجازت ہے لیکن کسی بھی خاص طریقے سے اس کا استعمال ممنوع ہے۔ یہ استثنیات اس بنیادی اصول کے علاوہ ہوتی ہیں، جس کی اجازت دی گئی ہے۔

سماجی تحفظ کی اسکیم میں جو لوگ اپنے حصہ کی رقم جمع کراتے ہیں وہ انہیں اس وقت واپس ادا کرنی چاہیے جب ان کی ملازمت کی مدت یا معاہدہ ختم ہورہا ہو۔ عام معاملوں میں رقم کی یہ واپسی ممکن ہوتی ہے، تاہم اس طریقہ کار میں حکومتیں پابند ہوجاتی ہیں کہ وہ ایک ہی درجہ اور حیثیت کے ملازمین کے لیے ایک طریقہ کار اختیار کریں اور چند شرائط کے ساتھ اسے چلائیں۔ جب کوئی شخص کسی حکومت یا ادارے کی ملازمت اختیار کرتا ہے تو وہ واضح طور پر یا بغیر اظہار کیے اس ادارے کی شرائط ملازمت قبول کرلیتا ہے۔ ان شرائط میں پراویڈنٹ فنڈ اور سماجی تحفظ وغیرہ جیسی اسکیموں کی شرائط بھی شامل ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض جگہوں پر اس فنڈ کی واپسی کے بارے میں پابندی ہو، لیکن شرائط ایک باہمی معاہدے کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ معاہدہ اس وقت تک مؤثر رہتا ہے جب تک دونوں میں سے کوئی ایک اس کی خلاف ورزی نہ کرے۔

ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری

سوال: کیا یہ بات قابل قبول ہے کہ جب بازار میں اشیاء کی طلب بڑھ جائے تو ان کی قیمت میں اضافہ کردیا جائے یا مسافروں کی تعداد زیادہ ہو تو کرائے بڑھا دیے جائیں؟

جواب: اسلام اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں قانون طلب و رسد سے متاثر ہوتی ہیں۔ جب کسی چیز کی طلب بڑھتی ہے تو اس کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور جب کوئی شے بازار میں بالافراط دستیاب ہو تو اس کی قیمت گر جاتی ہے۔ اسلام اس بات کو بھی قبول کرتا ہے کہ جب بازار میں کوئی شے بالافراط دستیاب ہوتی ہے تو کاروبار کرنے والا اسے خرید کر اس وقت تک کے لیے ذخیرہ کر لیتا ہے جب رسد میں کمی کی وجہ سے اس کی قیمت میں اضافہ ہو۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس پورے عرصے کے دوران میں، بازار میں وہ شے موجود رہے۔ اگر مذکورہ شے بازار اور دکانوں سے غائب ہو جائے تو اس کو روک کے رکھنا (ذخیرہ کرنا) کسی بھی طور قابل قبول نہیں ہے۔ اس طرح کی ذخیرہ اندوزی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بازار میں چیز کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت حد سے زیادہ ہو جائے اور کاروباری شخص من مانے دام وصول کرے۔ (یہ طریقہ چور بازاری یا بلیک مارکیٹنگ کہلاتا ہے) اس لیے مصنوعی قلت پیدا کر کے کسی چیز کے دام بڑھانا قطعاً جائز نہیں ہے۔

کسی چیز کی قیمت میں قدرتی اضافے اور مصنوعی اضافے میں فرق یہ ہے کہ جب کسی چیز کی پیداوار موسم کی وجہ سے یا فصل کی وجہ سے کم ہوگئی ہو تو اس کی قیمت قدرتی طور پر زیادہ ہو جاتی ہے اور جب کسی چیز کا ذخیرہ کر لیا جاتا ہے اور بازار میں اس کی فراہمی روک دی جاتی ہے تو اس کی قیمت میں مصنوعی اضافہ ہو جاتا ہے۔ دوسری صورت ناجائز ہے۔ اسلام میں اجارہ داری کی بھی اجازت اسی لیے نہیں ہے کیونکہ اس کی وجہ سے اشیاء کی قیمتیں مصنوعی طور پر بڑھ جاتی ہیں۔

منافع میں حصہ دار

سوال: حکومت نے قرعہ اندازی کے ذریعہ لوگوں کو پلاٹ دینے کا اعلان کیا۔ قرعہ اندازی میں اپنے امکانات کو بڑھانے کے لیے میں نے اپنے علاوہ اپنے ایک عزیز کے نام سے بھی درخواست داخل کر دی اور متعلقہ عزیز کو اعتماد میں لیا۔ قرعہ اندازی میں عزیز کا نام نکل آیا اس پلاٹ کی رقم کی ادائیگی میں نے کی۔ میرے عزیز خواہشمند تھے کہ میں جلد از جلد پلاٹ اپنے نام منتقل کرا لوں لیکن میں بعض مسائل کی وجہ سے یہ کام جلد نہ کر سکا۔ اب میں اس پلاٹ کو فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ میرے عزیز کا کہنا ہے کہ اس فروخت سے جو منافع حاصل ہوگا اس میں ان کا حصہ بھی ہوگا۔ براہ کرم مجھے مشورہ دیجیے۔

جواب: یہ ایک مشکل سوال ہے کیونکہ اس پورے معاملے کا انحصار نیک نیتی پر ہے۔ یہ پلاٹ جو

آپ کے عزیز کے نام سے آپ کی ملکیت ہے اور اس میں کسی کو شبہ نہیں ہے کیونکہ تمام ادائیگی آپ نے کی ہے، لیکن فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ آپ کے عزیز کا ہے کیونکہ یہ انہیں الاٹ ہوا ہے۔ اس بنیاد پر مسئلے کا جائزہ لیا جائے تو آپ کے عزیز کا یہ دعویٰ زیادہ جاندار نظر نہیں آتا کہ اس کی فروخت سے حاصل ہونے والے منافع میں ان کا حصہ بھی ہونا چاہیے۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ آپ کے عزیز معقول آدمی ہیں۔ اگر آپ اس پلاٹ پر اپنا مکان بنانا چاہیں تو اس صورت میں وہ محض آپ کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں اور کسی فائدے کی توقع نہیں کرتے۔ لیکن اب یہ پورا معاملہ ایک کاروباری حیثیت اختیار کر گیا ہے کیونکہ آپ اسے فروخت کر کے منافع حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ محسوس کرتے ہیں اس پورے عمل میں شریک ہونے کی وجہ سے انہیں کچھ ملنا چاہیے۔ اگر وہ آپ کے ساتھ تعاون نہیں کرتے تو آپ متوقع منافع حاصل نہیں کر سکتے تھے لہذا ان کے احساسات بھی غیر معقول نہیں ہیں۔

اگر آپ اس مسئلے کو کاروباری معاملے کے طور پر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جو شخص معاملات طے کراتا ہے وہ فروخت کنندہ یا خریدار دونوں سے یا دونوں میں سے کسی ایک سے کمیشن وصول کرتا ہے، لہذا یہ مناسب ہوگا کہ آپ اپنے عزیز کو بطور کمیشن منافع کا کوئی حصہ ادا کریں کیونکہ بہرحال اس معاملے میں وہ معاون ہوئے ہیں گو کہ انہوں نے زمین حاصل کرنے کے عمل میں کوئی رقم نہیں لگائی۔ آپ انہیں کتنا منافع دیں گے؟ اس کا انحصار آپ کے علاقے میں کمیشن کی شرح پر ہے۔ اس رقم کی ادائیگی سے آپ دونوں کے درمیان خاندانی تعلقات مستحکم ہوں گے اور درپیش حالات میں یہ درست بھی ہوگا کیونکہ ان کا نام استعمال کرنے کی وجہ سے بھی آپ یہ منافع حاصل کرنے کے اہل ہو سکے۔

قرعہ اندازی اور ریفل ٹکٹ

سوال: ازارہ کرم مندرجہ ذیل امور کے بارے میں آگاہ فرمائیے کہ کیا یہ جوئے کی تعریف میں آتے ہیں۔

۱۔ دوکانوں اور سپر مارکیٹوں کی جانب سے قرعہ اندازی یا ریفل کی صورت میں تحائف کی پیشکش۔

۲۔ کسی شخص کی جانب سے چند ذاتی اشیاء ریفل کے ذریعہ فروخت کرنا۔

جب کوئی شخص ملک چھوڑ کر جارہا ہوتا ہے تو اس کے لیے اپنا سامان ریفل کے ذریعہ فروخت کرنا آسان بھی ہوتا ہے اور جلد فروخت بھی ہوتا ہے۔ متعلقہ سامان کی قیمت واجبی مالیت کے ٹکٹوں میں تقسیم کر کے یہ ٹکٹ فروخت کر دیئے جاتے ہیں اور پھر ٹکٹ خریدنے والوں میں سے کسی

ایک کو قرعہ اندازی کے ذریعہ سامان فروخت کر دیا جاتا ہے۔

جواب: اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ جوا کسی بھی صورت میں ہو وہ ناجائز ہے۔ تاہم میرے نزدیک آپ کے سوال کا پہلا حصہ یعنی دوکانوں کی جانب سے خریداروں کو قرعہ اندازی کے ذریعہ تحائف پیش کرنا، محض فروخت بڑھانے کا ایک طریقہ ہے۔ آپ ایک دوکان پر جاتے ہیں اور فرض کیجیے کہ ۸۰ ریال کی خریداری کرتے ہیں، تو دوکاندار آپ سے کہتا ہے کہ اگر آپ ایک سو ریال یا اس سے زیادہ مالیت کی خریداری کرلیں تو آپ قرعہ کے ذریعہ کوئی تحفہ حاصل کرسکیں گے۔ اس صورت میں فیصلہ آپ کے اپنے اختیار پر ہے کہ آپ ۸۰ ریال سے زیادہ کی خریداری کریں یا نہیں۔ اگر آپ مزید ۲۰ ریال ادا کرتے ہیں تو یہ ۲۰ ریال قرعہ اندازی کی قیمت نہیں ہے بلکہ اس کے عوض آپ اصل قیمت پر کوئی اور چیز خرید رہے ہیں۔ یہ بات تو درست ہے کہ اس اضافی خریداری کی ترغیب آپ کو دوکاندار نے دی لیکن اس ترغیب کے باوجود فیصلہ آپ کا اپنا تھا۔ جو سامان آپ نے خریدا اس کی قیمت ادا کی گئی۔ آپ نے قرعہ اندازی میں شامل ہونے کا حق نہیں خریدا، محض آپ کو اضافی خریداری کی ترغیب دی گئی اور آپ نے ایک ایسی چیز خرید لی جس کی ضرورت شاید آپ کو فوری طور پر نہیں تھی لیکن مستقبل قریب میں پیش آسکتی تھی۔

میرے خیال میں یہ محض ایک ترغیب ہے فروخت بڑھانے کی اور اس قرعہ اندازی کے نتیجے میں آپ کوئی چھوٹا سا تحفہ حاصل کرلیتے ہیں۔ اس اسکیم میں بعض تحفے بہت زیادہ قیمتی بھی ہوتے ہیں لیکن اس کی حیثیت تحفہ کی ہی ہوتی ہے اور آپ ہر وقت اپنی پسند کا تحفہ حاصل نہیں کرسکتے۔

آپ کے سوال کے دوسرے حصے کے بارے میں عرض ہے کہ یہ جوئے کی ایک شکل ہے۔ بہت سارے لوگ سامان کی قیمت کے ریفل ٹکٹ خریدتے ہیں اور صرف ایک کو وہ سامان ملتا ہے دوسرے لوگوں کی رقم ضائع ہو جاتی ہے۔ بے شک اس طریقہ سے فروخت کرنے والے کو سامان کی صحیح قیمت ہی ملتی ہے لیکن جو لوگ رقم کا نقصان برداشت کرتے ہیں وہ کس لیے؟ یہ بہر حال جوا ہے یا کم سے کم ایسا عمل ہے جس کی اجازت نہیں ہے۔

سود کی رقم کا مصرف کیا ہو؟

سوال: کئی ملکوں میں قانون کی رو سے ایسے شہریوں کو جو دوسرے ممالک میں نوکری کر رہے ہیں، اپنی رقوم بینکوں کے ذریعہ منتقل کروانا پڑتی ہیں۔ بینک جمع شدہ رقوم پر سود دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ سود خود نہ لے تو ممکن ہے یہ سودی رقم غیر اسلامی مقاصد کے لیے استعمال ہو جائے۔ ایسی صورت

میں اس رقم کا مصرف کیا ہونا چاہیے؟

جواب : اسلام کے نقطہ نظر سے سودی رقم ناجائز ہے، چنانچہ اسے کوئی شخص استعمال نہیں کرسکتا۔ اگر کسی کو بینک میں اس کی جمع شدہ رقم پر سود ملتا ہے تو اسے اس سودی رقم کو ایسے انداز میں صرف کردینا چاہیے جو مسلمانوں کے لیے عمومی طور پر مفید ہو۔ میرے خیال میں اس رقم کو کسی اسلامی ادارے کے حوالے کردینا چاہیے۔ دیتے وقت ادارے کو رقم کی نوعیت سے آگاہ کردیا جائے تاکہ ادارہ اس رقم کو عام بیت الخلاء یا اسی طرح کے مصرف میں لے آئے۔ کوئی شخص چاہے وہ نادار ہو، انفرادی طور پر سودی رقم کو اپنے کام میں نہیں لاسکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب ہم کسی غریب کی رقم کے ذریعہ مدد کررہے ہوتے ہیں تو دراصل ہم یہ رقم اللہ تعالیٰ کو پیش کررہے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ہم ناجائز رقم اللہ رب العالمین کی خدمت میں پیش نہیں کرسکتے۔

حال ہی میں بعض علماء کرام نے سودی رقم کے بارے میں ایک فیصلہ دیا ہے کہ افریقہ کے کئی مسلم ممالک میں قحط اور خشک سالی کے باعث مسلمان سخت پریشانی سے دوچار ہیں۔ اشیائے خوراک کی کمی کا یہ عالم ہے کہ مقامی آبادی کو ایسی اشیاء کھالینے کی اجازت دے دی گئی ہے جنہیں عام حالات میں کھانا منع ہے۔ مثلاً مردہ جانور۔ چنانچہ سودی رقم کو ان قحط زدہ مسلمانوں پر صرف کیا جاسکتا ہے۔ ایسے کئی فلاحی ادارے موجود ہیں جو چندہ اکٹھا کرکے افریقہ کے قحط زدہ عوام کی مدد کر رہے ہیں، تاہم سودی رقم کسی ایسے فلاحی ادارے کو دیتے ہوئے ادارے کے بارے میں اطمینان کرلینا چاہیے کیونکہ بعض ادارے امدادی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات وعقائد کی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔

سود کی رقم سے خیرات کی جاسکتی ہے؟

سوال: کیا مذہب میں اس بات کی اجازت ہے کہ سود کی رقم ضرورتمند لوگوں میں خیرات کردی جائے، مثلاً کسی بیوہ کو دے دی جائے کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش کرسکے، یا اس رقم سے یتیم لڑکی کی شادی کردی جائے۔ کیا میں یہ رقم اپنی سوتیلی بہن کی لڑکی کی شادی کے اخراجات میں صرف کرسکتا ہوں۔ از راہ کرم ان تمام صورتوں میں ترجیحات سے آگاہ فرمائیں۔ یہ بھی فرمایئے کہ کیا ایک مسلمان کے لیے حصص کا منافع لینا، اسٹاک اور بانڈ جائز ہیں؟

جواب: سود لینے اور دینے کی اسلام میں قطعی ممانعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیتے ہوئے

اسے ناجائز اور برا مال کہا ہے۔ ان احکامات کی روشنی میں سود کو کسی بھی مقصد کے لیے استعمال کرنا درست نہیں ہے۔ اللہ کے بنائے ہوئے قانون کو، کوئی بھی انسان نہ تو تبدیل کرسکتا ہے اور نہ اس میں ترمیم کرسکتا ہے۔ جب کوئی چیز اللہ کی جانب سے حرام قرار دیدی گئی تو وہ ہمیشہ کے لیے، ہر مقصد کے لیے اور ہر صورت میں حرام ہے۔ جب سود کی رقم خیرات کے مقصد سے استعمال کرنے کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہم اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں ترمیم یا تبدیلی کی کوشش کر رہے ہیں جس کی ہمیں قطعی اجازت نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس قانون میں تبدیلی کی ضرورت کیا ہے۔

صدقہ اور خیرات کا مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایک ارفع و اعلیٰ مقصد ہے اور اس کار خیر کے لیے وہ رقم یا اشیاء استعمال کرنی چاہئیں جو محنت سے حاصل کی گئی ہوں اور ہمیں عزیز ہوں۔ اللہ کی طرف سے صرف اسی خیرات کے اجر کی توقع کی جاسکتی ہے جو ہم نے اپنی ضروریات اور حلال کمائی سے بچا کر فی سبیل اللہ خرچ کی ہو۔ کم تنخواہ پانے والا ایک غریب شخص، جس کی آمدنی اس کی اپنی ضروریات کے لیے بھی ناکافی ہو، جب اس رزق حلال میں سے بچا کر اللہ کی راہ میں صرف کرے گا تو یقیناً اللہ کی جانب سے اسے اس امیر اور دولتمند شخص کی ادا کردہ زکواۃ سے زیادہ اجر ملے گا جس نے صرف ڈھائی فیصد کی شرح سے مستحق افراد کی مدد کی ہے، خواہ یہ ڈھائی فیصد کی رقم اس غریب آدمی کی خیرات کردہ رقم سے سوگنا، یا ہزار گنا زیادہ ہی کیوں نہ ہوں۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے کہ اپنی بہترین کمائی میں سے خرچ کرو، یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ برا مال، خیرات کے لیے استعمال نہ کرو۔ ان واضح احکامات کے پیش نظر سود کی رقم خیرات کے مقصد سے استعمال نہیں کی جاسکتی۔

آپ نے جن صورتوں کا ذکر کیا ہے وہ یقیناً مستحسن ہیں اور اللہ کو یہ بات پسند نہیں کہ ان نیک کاموں کے لیے ناجائز اور حرام مال خرچ کیا جائے۔ اس قسم کے نیک کاموں کے اجر کی توقع اسی وقت کی جاسکتی ہے جب یہ کام رزق حلال کی رقم سے کیے گئے ہوں۔

یہ تو اللہ کے حضور بندے کی نذر ہے اور اپنے آقا کے سامنے کوئی آلودہ نذر پیش کرنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ اس مسئلے کو ایک مثال سے سمجھیے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ سود کی رقم سے حج کرنا پسند کریں گے۔ اگر آپ کا جواب ہاں ہے، تو مجھے یہ کہنے دیجیے کہ آپ کا حج قبول نہیں ہوگا۔

بیواؤں کی امداد، یتیم بچیوں کی شادی اور اس قسم کے تمام کام ایک اسلامی ریاست میں حکومت کی ذمہ داری ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاست کی عدم موجودگی میں مسلمانوں کو اجتماعی طور پر ان امور کا

خیال رکھنا چاہیے۔ ان کاموں کا اجر، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی ملے گا۔

حصص اور اسٹاکس پر منافع لینا جائز ہے، بشرطیکہ متعلقہ کمپنی ایسے امور کا کاروبار نہ کرتی ہو جن کی ممانعت ہے۔ مثلاً مالیاتی کمپنی کی صورت میں، سود کا کاروبار، یا شراب کی فروخت وغیرہ۔

میرے نزدیک بانڈز پر سود دیا جاتا ہے ان پر منافع تقسیم نہیں کیا جاتا، اس لیے یہ جائز نہیں ہیں۔

سوال ۲: میرے شوہر سعودی عرب میں ملازمت کے دوران جتنا کچھ کماتے ہیں وہ ہماری ضرورت سے زیادہ ہے اس زائد رقم کو ہمیں مستقبل کے لیے محفوظ کرنا چاہیے یا تمام زائد رقم ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیں؟

جواب ۲: اپنے خاندان کے مستقبل کے لیے اپنی آمدنی میں سے بچت کرنے اور محفوظ کر کے رکھنے میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ مسلمانوں کے لیے زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہے اس کے علاوہ غرباء اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا احسن ہے۔ آپ اللہ کی راہ میں جتنا زیادہ دیں گے اتنا ہی زیادہ اجر ملے گا۔ تاہم اپنے بچوں کے مستقبل اور ضرورت کے لیے بچت کرنے کی اسلام نے ترغیب دی ہے۔ اس کا اندازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ایک صحابی سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کے درمیان مکالمے سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک بار حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیمار ہو گئے اور اللہ کے رسولؐ ان کی عیادت کے لیے گئے۔ اس موقع پر حضرت سعدؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہے اور میری ایک ہی بیٹی ہے۔ کیا میں اپنی ساری رقم خیرات کر دوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو اپنی رقم کا ایک تہائی حصہ خیرات کر دو، ایک تہائی کافی ہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ سے فرمایا کہ اپنے ورثاء کے لیے مال چھوڑ کر جانا بہتر ہے تاکہ تمہارے بعد انہیں دوسروں کا محتاج اور دست نگر نہ ہونا پڑے۔

وراثت

بیرون ملک ملازم بیٹا ورثہ سے محروم

سوال: میرے والدین کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں، میں سب سے بڑا ہوں۔ حال ہی میں جب چھٹیوں کے دوران گھر گیا تو پتا چلا کہ والد نے اپنی تمام جائیداد دونوں چھوٹے بھائیوں کے درمیان تقسیم کردی ہے۔ جب میں نے اپنے حصے کے بارے میں دریافت کیا تو بتایا گیا کہ چونکہ میں سعودی عرب میں اچھی خاصی تنخواہ پارہا ہوں اس لیے والد نے مجھے جائیداد میں حصہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ انہوں نے کہا کہ تمہیں جائیداد میں سے کسی حصے کی ضرورت نہیں ہے۔ والد کے اس فیصلے سے مجھے دکھ ہوا کیونکہ میں ایک بڑے خاندان کا کفیل ہوں، میرے چھ بچے ہیں۔ والد نے تجویز کیا کہ اگر میں انہیں ایک بڑی رقم دے دوں تو وہ اپنے فیصلے میں ضروری تبدیلی کردیں گے۔ ان کا یہ مطالبہ تسلیم کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ یہاں یہ نشان دہی مناسب ہوگی کہ میرے والد کو میرے دادا سے کچھ جائیداد ورثہ میں ملی تھی اور کچھ جائیداد انہوں نے بعد میں خریدی۔ مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ والد کا یہ فیصلہ، جسے والدہ کی تائید حاصل ہے، کس حد تک صحیح ہے۔ کیا اس بات کا امکان ہے کہ میرے والد کو میرے دادا کے ورثہ میں جو جائیداد ملی ہے، میں اس میں سے اپنا حصہ حاصل کرسکوں۔ والد نے بعد میں جو زمین خریدی ہے کیا میرا اس پر بھی کوئی حق ہوگا؟ کیا والدین کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ اپنے ورثے میں سے ایک بیٹے کو محروم کردیں۔ اس بارے میں اسلامی قانون کیا ہدایت کرتا ہے۔ براہ کرم ان مسائل پر روشنی ڈالیے؟

جواب: میرے خیال میں پہلے ہمیں اس معاملے کے قانونی پہلو واضح طور پر سمجھ لینے چاہئیں، کیونکہ

آپ کے والد نے اپنی زندگی میں بہ قائمی ہوش وحواس اپنی جائیداد، دو بیٹوں میں تقسیم کر دی ہے اور وہ قانونی طور پر دو بیٹوں کے نام ہو چکی ہے، جس کا اندراج سرکاری ریکارڈ میں بھی ہو گیا ہے، اس لیے آپ کو یہ حق حاصل نہیں رہا کہ آپ ان کے اس فیصلے کو چیلنج کر سکیں۔ اگر آپ اس معاملے کو عدالت میں لے جائیں گے تو آپ کے حق میں فیصلہ ہونے کے امکانات بالکل نہیں ہوں گے۔ اس کے نتیجے میں تلخی بھی بڑھے گی اور خاندان کے درمیان تفاوت بھی پیدا ہوگا۔ چونکہ جائیداد کی یہ منتقلی رجسٹرار کے یہاں رجسٹرڈ ہو چکی ہے اس لیے والد کی وفات کے بعد بھی آپ اس پر کوئی حق ثابت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اس معاملے کے قانونی پہلو کو تو آپ بھول جایئے۔

غالباً آپ کے والد نے یہ فیصلہ کرتے وقت یہ سوچا ہوگا کہ چونکہ آپ سعودی عرب میں خاصے عرصے سے کام کر رہے ہیں، اس لیے مالی طور پر اپنے بھائیوں کے مقابلے میں خاصے خوشحال ہیں اور انہوں نے یہ مناسب خیال کیا کہ وہ اپنی زمین دونوں بیٹوں کو دے دیں۔ آپ کے خط کے مطابق، وہ لوگ کاشت کرتے ہیں۔ غالباً والد نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ ان کی بیٹیاں شادی کے بعد اپنے اپنے گھر چلی جائیں گی اس لیے زمین ان کے استعمال کے قابل نہیں ہوگی۔ لہٰذا انہوں نے اپنی دانست میں مناسب فیصلہ کیا۔ ان کا فیصلہ کس حد تک منصفانہ ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان کا فیصلہ قطعی غلط ہے۔ اولاد کے ساتھ برابری کے برتاؤ سے متعلق مسائل آتے رہتے ہیں اور میں نے ان کے جواب دیتے وقت ایک مستند حدیث کا حوالہ دیا ہے، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو ایک عام حکم دیا ہے ''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے ساتھ برابری کا سلوک کرو'' بالفاظ دیگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کے ساتھ مساوی سلوک کرنے کو ان فرائض میں شامل کیا ہے جو انسان پر اللہ کی طرف سے عائد ہیں اور جو تقویٰ میں شامل ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور مستند حدیث کا حوالہ بھی دیتا ہوں، جو احادیث کے بیشتر مجموعوں میں شامل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نوجوان صحابی حضرت نعمان سے حدیث مروی ہے کہ ان کے والد انہیں (حضرت نعمان کو) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے اور عرض کیا کہ ''میں نے ایک غلام، اپنے اس بیٹے کو بطور تحفہ دیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پر گواہ ہوں۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ کیا تم نے اپنی تمام اولاد کو یہی تحفہ دیا ہے۔ جب حضرت نعمانؓ کے والد نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے اس فیصلے کے لیے کوئی اور گواہ تلاش کرو کیونکہ میں کسی غیر منصفانہ عمل کی گواہی نہیں دیتا۔

یہ حدیث بعض اضافوں کے ساتھ کئی جگہ بیان کی گئی ہے، جس کے مطابق جب حضرت نعمانؓ کے والد نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوال کا جواب انکار میں دیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا کہ یہ تحفہ واپس لے لو، بعض جگہ یہ بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے (حضرت نعمانؓ کے والد سے) کہا کہ یہ صحیح نہیں ہوسکتا اور میں کسی ایسی بات کا گواہ نہیں بنتا جو صحیح نہیں ہو۔

یہ حدیث نہایت واضح ہے۔ اس کی بناء پر بیشتر علماء نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ باپ کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنی اولاد میں سے کسی کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہوئے کوئی تحفہ دے۔ اگر وہ ایک بچے کو کوئی تحفہ دیتا ہے تو اسے دیگر بچوں کو بھی ویسا ہی تحفہ دینا چاہیے۔ تحفہ کا معاملہ بیٹے اور بیٹی کے لیے ورثے کی تقسیم کے اصول سے مختلف ہے، جس میں ہر لڑکے کو والد کے ترکے میں سے، ہر لڑکی کے مقابلے میں دوگنا حصہ ملتا ہے۔ جو حدیث بیان کی گئی ہے، اس میں حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کے والد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح فیصلے کے بعد حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کو تحفہ میں دیا گیا غلام واپس لے لیا تھا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن عبیدہ انصار کی نمایاں شخصیت تھے اور خاصے مالدار آدمی تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنی تمام دولت اپنے بیٹوں میں تقسیم کردی۔ ان کی وفات کے بعد، ان کی بیوی نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ یہ واقعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں پیش آیا۔ ایک صبح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ میں رات بھر سعد کے نومولود بچے کے بارے میں سوچتا رہا اور اس وجہ سے سو نہ سکا، کیونکہ اس نومولود کے لیے اس کے باپ نے کوئی ترکہ نہیں چھوڑا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ میرا بھی یہی حال ہے۔ بہتر ہے کہ ہم سعدؓ کے بیٹے قیسؓ کے پاس چلیں اور اس سے اس کے سب سے چھوٹے بھائی کے بارے میں بات کریں۔ دونوں بزرگ حضرت قیسؓ بن سعدؓ کے پاس گئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک تھے اور نہایت ذی وقار شخص تھے۔ جب یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ''والد نے جو کچھ کیا ہے میں اسے غلط قرار نہیں دے سکتا لیکن میں یہ چاہوں گا کہ آپ دونوں اس بات پر گواہ رہیں کہ میں اپنا حصہ، اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو دے رہا ہوں۔''

یہ واقعہ اس افہام وتفہیم کی عکاسی کرتا ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات سے حاصل کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باپ کی وفات کے بعد ایک نومولود بچے کے لیے اس قدر

فکر مندر ہے کہ رات کو سو نہ سکے۔ یہ دونوں بزرگ یہ چاہتے تھے کہ نہ صرف ایک نومولود بچے کے ساتھ انصاف ہو بلکہ اس کے باپ کے ساتھ بھی انصاف ہو، جسے شاید اپنی دولت کی تقسیم کے وقت یہ علم نہ ہو کہ اس کی بیوی حاملہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دولت کی تقسیم حمل ٹھہرنے سے پہلے عمل میں آئی ہو۔ لیکن یہ بات اس امر میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے کہ باپ کا سلوک ہر بچے کے ساتھ یکساں ہو۔ اس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں۔ اس واقعے میں حضرت قیسؓ کا عمل بھی نہایت اہم ہے۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی بات پر اعتراض نہیں کیا، نہ ہی انہوں نے یہ دلیل دی کہ دولت کی یہ تقسیم بچے کی ولادت سے بہت پہلے عمل میں آئی تھی اس لیے انہیں اور ان کے بھائیوں کو جو کچھ ملا، وہ درست ہے۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی بات کو تسلیم کیا، ایک فرمانبردار بیٹے کا طرز عمل اختیار کرتے ہوئے انہوں نے اپنے باپ کے عمل کو درست قرار دیا۔ لیکن اپنے نومولود بھائی کے ساتھ انصاف کا تقاضا پورا کرتے ہوئے اپنا تمام حصہ اس کے نام کر دیا۔ یہ رویہ، اس سے کہیں زیادہ تھا جس کی ان سے توقع کی جا سکتی تھی۔

درج بالا واقعات اور احادیث سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وراثت اور اولاد کے ساتھ یکساں سلوک کے معاملے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کس نظر سے دیکھتے تھے اور کس طرح اس پر عمل کرتے تھے۔ ان واقعات کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی بھی مسلمان کو اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکامات اور ہدایات سے روگردانی نہیں کرنی چاہیے اور اپنی اولاد میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دینی چاہیے۔

اس تفصیلی بحث کے بعد میں آپ کے سوالات کے مختصراً جواب دوں گا۔ سب سے پہلے میں یہ بتانا چاہوں گا کہ آپ کا، آپ کے والد کی جائیداد پر یا اس کے کسی حصے پر کوئی حق نہیں ہے۔ یہ آپ کے والد کا حسن عمل ہوگا کہ آپ کو بھی دوسرے بہن بھائیوں کی طرح برابر کا حصہ ملے۔ اگر آپ کے والد نے اپنی زمین تقسیم نہیں کی ہوتی تو کسی بھی بچے کا اس زمین پر اس وقت تک کوئی حق نہیں ہے، جب تک والد حیات ہیں۔ والد کی وفات کی صورت میں بیٹوں اور بیٹیوں کو ورثے میں ان کا حصہ ملے گا۔

اپنے دادا کے ورثے پر بھی آپ کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ کے دادا کا جب انتقال ہوا ہوگا تو ان کا ترکہ دادا کی اولاد میں قانونی وراثت کے مطابق تقسیم ہو گیا ہوگا۔ پوتے کی حیثیت سے آپ کا اپنے دادا کے ترکے پر کوئی حق نہیں ہے۔

جہاں تک یہ معاملہ ہے کہ والدین جائیداد کی تقسیم میں اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کا حق تسلیم نہیں کرتے، تو یہ رویہ اسلام کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی باپ اپنے ترکے میں سے اپنے

کسی بچے یا وارث کو محروم کر سکتا ہے۔ وراثت کا قانون اور اس کا نظام اللہ تعالیٰ کا طے کردہ ہے جس نے ہر وارث کا حصہ مقرر کر دیا ہے۔ کسی کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اس کے خلاف عمل کرے۔

میں اس بات کی بھی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ آپ نے اس مسئلہ پر اپنے والدین سے سخت لہجے میں گفتگو کی ہو۔ ممکن ہے وہ آپ سے تعاون کے رویے کی توقع کر رہے ہوں اور آپ نے اس کے برخلاف ان کے فیصلے پر شدید نکتہ چینی کی ہو۔ میں بطور مشورہ آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اوپر بیان کیے گئے واقعات میں سے، آپ کو حضرت قیسؓ بن سعدؓ کی مثال کو پیش نظر رکھ کر عمل کرنا چاہیے۔ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ آپ کو اپنے والدین کے حق میں زیادہ فرمانبرداری کا ثبوت دینا چاہیے۔ اگر آپ اپنے والدین کی رضا کے لیے اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں اور آپ کے اس رویے سے وہ خوش ہوں، تو آپ اللہ سے اس کے بہتر اجر کی توقع کر سکتے ہیں اور یہ یقین کر سکتے ہیں کہ آخرت کی زندگی میں آپ کا یہ حسن عمل اجر کا مستحق ہوگا۔

مجھے جس بات نے فکر مند کیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس طویل خط میں آپ نے اپنی پانچ بہنوں کے حق کا ذکر نہیں کیا۔ میں پہلے یہ بتا چکا ہوں کہ والدین، خواہ باپ خواہ ماں، جب اپنے بچے کو کوئی تحفہ دیں تو انہیں اپنے دوسرے تمام بچوں کو بھی ویسا ہی تحفہ دینا چاہیے۔ پھر اس معاملے میں آپ کی پانچ بہنوں کے حق کی فکر کسی نے کیوں نہیں کی؟ شاید اس لیے کہ ان کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ یا شاید اس لیے کہ عورتوں کو زمین میں حصہ نہیں ملنا چاہیے۔ کیا آپ کے معاشرے میں یہی رواج ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں واضح طور پر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ روایت اسلام کے لیے ناقابل قبول ہے۔ اگر آپ کے والدین صحیح طریقے پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کے گناہ سے بچنا چاہتے ہیں تو آپ کے والد کو چاہیے کہ وہ اپنے بیٹوں سے زمین واپس لیں اور اسے دوبارہ اپنی آٹھ اولادوں میں برابر تقسیم کریں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ زمین واپس لے لیں لیکن اسے دوبارہ تقسیم نہ کریں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے آٹھوں بچوں کو شریعت کے مطابق زمین سمیت، وراثت میں سے حصہ مل جائے گا، جو ہر لڑکی کو ایک اور ہر لڑکے کو لڑکی کے مقابلے میں دو حصے کے مساوی ہوگا۔

اب جبکہ آپ کو اس مسئلے کے اسلامی حل کا علم ہو گیا ہے تو شاید آپ اس کی روشنی میں اپنے والد سے دوبارہ بات کریں۔ آپ کو اپنی بہنوں کے حق کی وکالت کرنا چاہیے اور انہیں بتانا چاہیے کہ ان کا موجودہ طرز عمل اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ آپ انہیں کہیں کہ آپ نہیں چاہتے کہ روز قیامت اللہ کی نافرمانی کے گناہ میں حشر کے میدان میں وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں۔

ترکہ کی تقسیم کا ایک پیچیدہ مسئلہ

سوال: جب میرے برادر نسبتی کا انتقال ہوا تو پس ماندگان میں ان کی بیوی اور ایک بچی کے علاوہ ان کی والدہ، تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ متوفی کے ورثے میں ایک مکان تھا، جو دراصل ان کے والد کی ملکیت تھا۔ جب متوفی کے والد کا انتقال ہوا تھا اس وقت برادر نسبتی نے والد کے چھوڑے ہوئے مکان میں بہنوں اور بھائیوں کے حصے خرید لیے تھے اور مکان اپنے نام منتقل کرالیا تھا۔ اب برادر نسبتی کی وفات کے بعد ان کی بہن اور بھائی، مکان میں اپنا حصہ دوبارہ مانگ رہے ہیں۔ کیا ان کا یہ مطالبہ جائز ہے۔ ازراہ کرم بتایئے کہ متوفی کی جائیداد کی تقسیم کس طرح ہوگی؟

جواب: آپ کے برادر نسبتی کے والد کے انتقال کے بعد مکان کی ان کے نام منتقلی سے مکان کی ملکیت برادر نسبتی کو چلی گئی۔ اگر مرحوم والد کے انتقال کے بعد، انہوں نے اپنی بھائیوں اور بہنوں کے مکان میں متعلقہ حصوں کے عوض انہیں ادائیگی کردی تھی اور اس کے بعد مکان اپنے نام منتقل کرایا تھا، تو اس صورت میں یہ مکان آپ کے برادر نسبتی کی ملکیت ہے اور اب اس میں ان کی بہنوں اور بھائیوں کا اصل ملکیت کے طور پر کوئی حصہ نہیں ہے۔ تاہم متوفی چونکہ ان کا بھائی ہے اور اس کے ورثاء میں وہ بھی شامل ہیں اس لیے اب اس رشتے سے اس مکان میں ان کا حصہ ہے لیکن اس کا نصاب بالکل مختلف ہے۔

یہ فرض کرتے ہوئے کہ جب آپ کے برادر نسبتی کے والد کا انتقال ہوا اس وقت مرحوم کے ورثاء میں بیوی اور بچوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا، مذکورہ جائیداد کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیے تھی:

جائیداد کی کل مالیت کا آٹھواں حصہ ماں کو اور اس کے بعد جو مالیت باقی بچے اس کے برابر کے حصے اس طرح کئے جائیں کہ ہر لڑکی کو ایک حصہ اور ہر لڑکے کو دو حصے ملیں۔ یعنی ماں کا حصہ نکالنے کے بعد باقی جو کچھ بھی بچے اس کے گیارہ حصے ہونے چاہیے تھے، اور ان گیارہ میں سے ہر لڑکی کو ایک حصہ اور ہر لڑکے کو دو حصے ملنے چاہیے تھے (جس میں آپ کے برادر نسبتی بھی شامل ہوتے)۔

اگر والد کے انتقال کے بعد آپ کے برادر نسبتی نے درج بالا طریقے کے مطابق ماں اور بہن بھائیوں کو ان کے حصوں کی ادائیگی کردی تھی تو اس صورت میں اب یہ بہن بھائی صرف مرحوم کے ورثاء کی حیثیت سے جائیداد میں حصہ رکھتے ہیں، اور چونکہ مرحوم کی بیوی اور بچی اصل ورثاء کی حیثیت سے موجود ہیں اس لیے بہن بھائیوں کا حصہ بہت کم ہوگا۔ موجودہ صورت میں آپ کے

برادر نسبتی کے ترکہ کی تقسیم اس طرح ہوگی:

کل ملکیت کا آٹھواں حصہ مرحوم کی بیوی کو دیا جائے گا اور باقی ملکیت کا نصف حصہ مرحوم کی بیٹی کو دیا جائے گا۔ مرحوم کی ماں کو باقی حصے کا چھٹا حصہ دیا جائے گا اور باقی حصے کے نو برابر حصے کیے جائیں گے جس میں سے ہر بہن کو ایک اور ہر بھائی کو دو حصے دیئے جائیں گے۔

غیر مسلم معاشروں میں رہنے والوں کے لیے لازمی وصیت کا مشورہ

سوال: میرے بھائی برطانوی شہری ہیں اور ان کی تمام جائیداد برطانیہ میں ہے۔ براہ کرم یہ بتایئے کہ ان کی وفات کی صورت میں ان کے ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی جبکہ ان کے عزیزوں میں ایک بھائی، ایک بہن، ایک سوتیلی ماں اور ایک سوتیلی بہن شامل ہیں۔

جواب: جو مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں رہ رہے ہیں، جہاں وراثت کے قوانین، اسلامی شریعت سے مختلف ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ اسلام کے قانونِ وراثت کے مطابق وصیت تحریر کردیا کریں۔ صرف یہی وہ طریقہ ہے جس سے وارث کو اس کے حصہ کا ترکہ ملنا یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ اگر آپ کے بھائی نے وصیت نہیں لکھی اور ان کا انتقال ہوگیا تو اس صورت میں ان کے وارثوں کو کچھ بھی نہیں ملے گا کیونکہ وہ بے وصیت وفات پاجائیں گے اور وہاں کی حکومت ان کے ترکہ کا بڑا حصہ جائیداد ٹیکس کی مد میں وصول کرلے گی۔

غیر مسلم معاشروں میں رہنے والے مسلمانوں کو نہ صرف تحریری وصیت کردینی چاہیے بلکہ جیسے جیسے ان کے وارثوں کی صورتحال تبدیل ہو، اس کے مطابق اپنی وصیت میں تبدیلی بھی کرتے رہنا چاہیے۔

فرض کیجیے ایک شخص نے جب وصیت تحریر کی تو ان کے دو بچے تھے، بعد میں ایک بچہ اور ہوگیا یا فرض کیجیے کہ ان کی ماں یا بیوی کا انتقال ہوگیا، تو اس صورت میں وارثوں کے حصے میں تبدیلی ناگزیر ہوجائے گی، اور ایسے حالات میں انہیں اپنی وصیت میں نئی صورتحال کے مطابق تبدیلی کرنی ہوگی۔

آپ نے اپنے بھائی کے جو حالات بیان کیے ہیں ان کے مطابق یوں لگتا ہے کہ ان کی بیوی نہیں ہے اور نہ ہی ان کے والدین حیات ہیں۔ آپ نے ان کے پانچ اعزا کے بارے میں لکھا ہے لیکن ان میں سے صرف دو ان کے ترکے کے حقدار ہیں۔ ان کی وفات کی صورت میں، ان کی سوتیلی ماں کو کسی بھی صورت میں، ان کے ترکے میں سے حصہ نہیں ملے گا کیونکہ اسلامی قانون

وراثت کے مطابق مرنے والے کے ترکے پر سوتیلی ماں کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اگر ایک بچے کی پرورش سوتیلی ماں نے کی ہے اور بچہ بڑا ہونے کے بعد اپنی سوتیلی ماں کی دیکھ بھال کرنا چاہتا ہے تو وہ وصیت کے ذریعے سوتیلی ماں کو اپنے ورثہ میں سے حصہ دے سکتا ہے لیکن یہ کسی بھی صورت میں کل ترکہ کا ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

سوتیلے بہن بھائیوں کا بھی ترکہ میں کوئی حصہ نہیں ہوگا کیونکہ ان کے اپنے والدین سے بھائی موجود ہے۔ اگر ان کا سگا بھائی نہیں ہوتا بلکہ ان کے اپنے والدین سے دو بہنیں ہوتیں تو اس صورت میں ان کے سوتیلے بھائی بہنوں کو ترکہ میں سے حصہ ملتا۔ لیکن چونکہ پیش نظر معاملہ میں ان کا سگا بھائی موجود ہے اس لیے سوتیلے بھائی بہن حقدار نہیں رہے۔

اگر موجودہ صورتحال تبدیل نہیں ہوتی ہے، تو آپ کے بھائی کی وفات کی صورت میں ان کے ورثے کے حقدار ان کے سگے بھائی اور بہن ہوں گے۔ ان کے ترکے کا ایک تہائی حصہ بہن کو اور دو تہائی حصہ بھائی کو ملے گا۔

بیٹے کا سب کچھ باپ کا ہے؟

سوال: میں گزشتہ آٹھ برس سے سعودی عرب میں ملازمت کر رہا ہوں۔ اللہ کے فضل سے اس عرصے میں میں نے خاصی بچت کی۔ اپنی تمام بچت میں اپنے والد کو بھیجتا رہا ہوں جنہوں نے اس رقم سے جائیداد خریدی، جو ان کے نام رجسٹرڈ ہے۔ میرے سعودی عرب میں آنے اور یہاں ملازمت کرنے سے پہلے ہمارے خاندان کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس صورت حال میں کیا میرے لیے یہ ممکن ہے کہ والد کے انتقال کے بعد میں تمام جائیداد اپنے نام کرانے کا مطالبہ کروں یا یہ جائیداد مجھ سمیت تمام بھائیوں، بہنوں اور والد کے دیگر قانونی ورثاء میں تقسیم ہوگی۔ یہاں ایک حدیث کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس میں کہا گیا ہے کہ ایک بیٹا جو کچھ کمائے وہ اس کے باپ کا ہے۔

جواب: آپ کے بیان کے مطابق وہ تمام رقم آپ کی تھی جس سے جائیداد خریدی گئی، اس صورت میں آپ کو اپنے والد کے انتقال سے پہلے تمام جائیداد اپنے نام منتقل کرانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ میرے خیال میں صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے آپ اپنے حق کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اگر جائیداد آپ کے والد کے نام رہی اور ان کا انتقال ہوگیا تو اس صورت میں آپ کو اس جائیداد میں اپنے دیگر بہن بھائیوں اور والد کے دوسرے قانونی ورثاء کے ساتھ شرعی حصہ ملے گا، جس کی وضاحت قرآن مجید میں کر دی گئی ہے۔ اگر آپ نے اپنے والد کے انتقال کے بعد اس

جائیداد کا مطالبہ کیا تو اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے دیگر بھائی بہن اس بات سے متفق ہوں، لیکن اگر وہ آپ کے مطالبہ سے متفق نہیں ہوئے تو پھر آپ کے لیے اپنی بچت سے خریدی گئی جائیداد کا حصول ناممکن ہو جائے گا۔

یہ عین ممکن ہے کہ اس موضوع پر اپنے والد سے بات کرتے ہوئے آپ جھجک محسوس کرتے ہوں، لیکن اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ ایسا نہیں ہے جس سے آپ اپنا حق حاصل کرسکیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ اس معاملے کو نہایت احتیاط اور چابک دستی کے ساتھ اپنے والد کے سامنے اس طرح پیش کریں کہ انہیں محسوس نہ ہو۔ آپ انہیں یقین دلا سکتے ہیں کہ جب جائیداد آپ کے نام منتقل ہو جائے گی، تب بھی اس جائیداد سے وہ (والد) اور خاندان کے دوسرے لوگ اسی طرح استفادہ کرتے رہیں گے جیسا کہ اب کر رہے ہیں۔ آپ یہ یقین دہانی بھی کرا سکتے ہیں کہ والد کے انتقال کے بعد بہنوں کی کفالت اور دیکھ بھال آپ کریں گے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے آپ چاہیں تو اپنے خاندان کے کسی معتبر شخص کی مدد حاصل کرسکتے ہیں جو اس پورے معاملے سے واقف ہو۔ خاندان کے یہ بزرگ، آپ کے والد کو سمجھا سکتے ہیں کہ جائیداد کی ملکیت کی منتقلی محض اپنے حق کی حفاظت کے لیے ہے جو کسی اور طریقے سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

آپ نے اپنے سوال کے ضمن میں جس حدیث کا حوالہ دیا ہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے گفتگو کے دوران ارشاد فرمائی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا، ''تم اور تمہارا مال تمہارے والد کا ہے۔'' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ملکیت کے حق کے بارے میں نہیں کہی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد صرف اس لیے ہے کہ اولاد اپنے والدین کے ساتھ فرمانبرداری سے پیش آئے۔ اولاد کے رویے سے باپ کو یہ محسوس ہونا چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کے مال میں سے جس قدر چاہے اسی طرح طلب کرسکتا ہے جیسے اپنے مال سے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی ملکیت میں شراکت دار بننا چاہتا ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہیے۔

اس حدیث کی تشریح کے ضمن میں، آپ کی توجہ ایک اور بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ فرض کیجیے کہ ایک باپ کی زندگی میں اس کے بیٹے کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس صورت میں، باپ کو اپنے بیٹے کے ترکے میں سے کچھ حصہ ملتا ہے۔ باقی ترکہ مرحوم کے دیگر قانونی ورثاء میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ان میں اس کی والدہ، بیوی، بچے یا بھائی اور بہن شامل ہیں۔ اگر باپ اپنے بیٹے کے مال و دولت کا حق دار ہوتا تو بیٹے کے انتقال پر اسے ترکے میں حصہ نہیں ملتا اور نہ ہی کوئی دوسرا اس کے ترکہ میں حقدار ہوتا۔

امانت رکھوائے گئے ترکے کی چوری کا ذمہ دار کون؟

سوال: ایک خاتون کا انتقال ہوا تو ان کا ترکہ ان کے وارثوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان میں سے ایک وارث نے جو بیرون ملک مقیم تھا، اپنے بھائی اور بہن سے کہا کہ وہ اس کا حصہ محفوظ رکھیں۔ اس کے بھائی اور بہن نے کسی اور سے کہا کہ وہ اس امانت کو ایک ہفتہ کے لیے اپنے پاس رکھ لے، اس وقت تک ہم اسے حفاظت سے رکھنے کا انتظام کرتے ہیں۔ ایک ہفتہ کے دوران یہ انتظام نہیں ہو سکا۔ اس شخص نے تین چار بار اس امانت کو واپس لینے کے لیے کہا، لیکن اسے یہی کہا گیا کہ ابھی آپ اس امانت کو اپنے پاس رکھیں تاکہ ہم اسے محفوظ رکھنے کا انتظام کر لیں۔ چار یا پانچ ہفتے بعد اس شخص کے گھر میں چوری ہوئی اور اس کے ہاں جو امانت رکھوائی گئی تھی اسے چور لے گئے۔ اب اس کے واپس ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ جس شخص کے ہاں چوری ہوئی ہے وہ قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ بیرون ملک مقیم وارث کے بھائی اور بہن کو بھی یقین ہے کہ چوری فی الواقع ہوئی ہے، لیکن اس ترکے کا مالک، یعنی بیرون ملک مقیم وارث، اپنے بھائی اور بہن سے ہرجانہ طلب کر رہا ہے۔ وہ اپنا مکمل حصہ واپس چاہتا ہے۔ کیا آپ براہ کرم یہ بتائیں گے کہ وہ اپنا دعویٰ کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہے؟

جواب: عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے پاس کوئی چیز بطور امانت رکھوائے اور چوری، کسی قدرتی آفت یا کسی حادثہ میں وہ امانت ضائع ہو جائے تو جس کے پاس امانت رکھوائی گئی تھی اس پر اس نقصان کی تلافی کی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن اس اصول پر عمل کرنے کے لیے ایک اہم شرط یہ ہے کہ جس شخص پر امانت کے سلسلہ میں اعتماد کیا گیا ہے، اس کی جانب سے امانت کی حفاظت میں کوئی لاپروائی نہیں کی گئی ہو۔

فرض کیجیے آپ کچھ رقم بطور امانت میرے پاس رکھواتے ہیں، میں اسے اپنے پرس میں، اپنی رقم کے ساتھ رکھ لیتا ہوں اور جب میں اس رقم کو حفاظت کے ساتھ رکھنے کے لیے گھر روانہ ہوتا ہوں تو کوئی شخص راستے میں میرا پرس اڑا لیتا ہے، جس میں میری اور آپ کی دونوں کی رقم موجود ہے۔ اس سارے واقعہ میں میری جانب سے کوئی لاپروائی نہیں ہوئی ہے، چنانچہ آپ کو جو نقصان پہنچا ہے، مجھے اس کی تلافی نہیں کرنی ہوگی۔ اگر غفلت کا ثبوت دیا جاتا تو صورت حال بالکل مختلف ہوتی۔ فرض کیجیے، آپ کی رقم پرس میں رکھ کر گھر جاتے ہوئے راستے میں، نماز ادا کرنے کے لیے میں مسجد میں رک جاتا ہوں جہاں وضو کرنے کے لیے میں اپنی جیکٹ اتار کر مسجد میں رکھ دیتا ہوں

اور خود وضو کرنے کے لیے چلا جاتا ہوں۔ وضو کر کے جب میں اپنی جیکٹ اٹھانے کے لیے لوٹتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ اس میں سے پرس نکال لیا گیا ہے۔ یہ ہے وہ صورت حال جس میں غفلت کا ثبوت دیا گیا ہے۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں وضو کے لیے جاتے ہوئے اپنی جیکٹ اپنے ساتھ لے جاتا اور وضو کے دوران اسے ایسی جگہ رکھتا جہاں میں اس پر نظر رکھ سکوں۔ اس طرح کی لاپروائی کی صورت میں میری یہ ذمے داری ہے کہ میں آپ کے نقصان کی تلافی کروں۔

جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے، اگر بیرون ملک مقیم وارث کے بھائی اور بہن نے اس ترکے کی حفاظت خود کی ہوتی اور تمام معقول حفاظتی انتظامات کے باوجود وہ امانت چوری ہو جاتی تو پھر انہیں اس نقصان کی تلافی نہیں کرنی پڑتی۔ کیونکہ ترکہ کے مالک نے خود یہ امانت ان کے سپرد کی تھی اور انہوں نے امانت کی حفاظت میں غفلت سے کام نہیں لیا تھا۔ لیکن صورت یہ ہے کہ انہوں نے اس امانت کو کسی اور کے پاس رکھوا دیا اور اس سے کہا کہ یہ امانت اسے صرف ایک ہفتہ تک اپنی تحویل میں رکھنی ہوگی۔ یہ بات یقینی ہے کہ وہ شخص اس امانت کو زیادہ عرصہ تک اپنے پاس رکھتے ہوئے خوش نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے امانت کی واپسی کی بابت کئی بار استفسار کیا۔ ادھر امانت کی حفاظت کے انتظامات میں تاخیر ہوئی۔ غالباً یہی وہ نکتہ ہے جہاں غفلت ہوئی ہے۔

جس شخص کے پاس سے امانت چوری ہوئی ہے وہ ان لوگوں کو جوابدہ ہے جنہوں نے اس کے پاس امانت رکھوائی تھی، یعنی وہ امانت کے اصل مالک کو جوابدہ نہیں ہے کیونکہ اس نے اصل مالک سے کوئی چیز وصول نہیں کی۔ اگر اس شخص نے امانت کی اچھی طرح حفاظت کی ہے اور اس سلسلے میں کوئی غفلت نہیں دکھائی تو اسے اس نقصان کا کوئی ہرجانہ ادا نہیں کرنا ہوگا۔ بیرون ملک مقیم وارث کے بھائی بہن کا معاملہ مختلف ہے۔ اس نے اپنے بھائی اور بہن کو امانت حفاظت سے رکھنے کے لیے کہا تھا لیکن انہوں نے اس کی مرضی کے بغیر امانت کو کسی اور کے سپرد کر دیا۔ اس وجہ سے اور امانت کو حفاظت سے رکھنے کے انتظامات میں تاخیر کرنے کی بنیاد پر میرا یہ خیال ہے کہ بیرون ملک مقیم وارث کے بھائی اور بہن پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بھائی کے نقصان کی مکمل تلافی کریں۔

ورثہ کی تقسیم اور متبنیٰ اولاد

سوال: شادی کے بعد میں اولاد سے محروم رہا۔ گھر میں بچے کی کمی کو دور کرنے کے لیے میں نے اپنی زوجہ کے خاندان میں سے ایک یتیم بچی کو متبنیٰ کر لیا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا میں اپنی جائیداد میں سے اس بچی کو اپنی وصیت میں کچھ حصہ بطور ورثہ دے سکتا ہوں۔ یہ بات پیش نظر رہے

کہ میری والدہ حیات ہیں اور چھ بہنوں اور تین بھائیوں کے علاوہ میری زوجہ بھی موجود ہیں جو میرے ورثاء میں شامل ہیں۔ ازراہ کرم یہ بتایے کہ ان میں سے ہر ایک کا حصہ کتنا ہوگا؟

جواب: سب سے پہلے ایک اہم بات کی نشاندہی ضروری ہے اور وہ یہ کہ کسی کے بچے کو متبنیٰ کرنے کی اسلام میں اس طرح قطعی اجازت نہیں ہے کہ متبنیٰ کرنے والا دوسرے کے بچے کو اپنا بیٹا یا اپنی بیٹی قرار دینے لگے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ کوئی مسلمان اپنے خاندان میں ایک یا ایک سے زائد بچوں کو خواہ وہ لڑکی ہو یا لڑکا، پرورش کے لیے نہیں رکھ سکتا۔ اگر کوئی شخص دوسرے کے بچوں کو اپنے گھر میں رکھتا ہے اور ان کی تعلیم اور پرورش کا بندوبست کرتا ہے، خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ ضرورتمند ہوں تو اللہ تعالیٰ اس نیکی کا اجر دیں گے۔ تاہم کسی بھی صورت میں وہ ان بچوں یا بچے کو اپنی اولاد قرار نہیں دے سکتا، نہ اسے ایسا کہنا چاہیے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح طور پر اس بات کا حکم دیا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے زیر پرورش دوسروں کے بچوں کو ان کے والدین کے نام سے پکاریں۔ اگر بچے یا بچوں کے باپ کا نام معلوم نہیں ہے تو ایسے بچوں کو اپنے دینی بھائی بہنوں کی طرح سمجھنا چاہیے۔ اگر کوئی بچہ بالکل ہی لاوارث ہو، اس کے والدین کا کوئی اتا پتا نہ ہو، (فسادات اور جنگوں کے نتیجہ میں ایسے بچے پائے جاتے ہیں) اس صورت میں بھی ان بچوں کی پرورش کرنے والا شخص انہیں اپنی اولاد قرار نہیں دے سکتا۔ ایسے لاوارث بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم وتربیت جو بھی شخص کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے اس نیکی کا بہترین اجر عطا فرمائیں گے۔

آپ نے جس بچی کو اپنے خاندان میں شامل کیا ہے، چونکہ وہ آپ کی اولاد نہیں ہے اس لیے وہ آپ کے ورثے میں کسی حصہ کی حقدار نہیں ہے۔ تاہم ہر مسلمان کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنی جائیداد کا کچھ حصہ اپنی وصیت کے مطابق چھوڑ سکتا ہے، لیکن یہ حصہ کل ورثہ کے ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک تہائی حصہ وہ اپنی مرضی سے جس شخص یا اشخاص کو چاہے دے سکتا ہے۔ وہ چاہے تو یہ ایک تہائی حصہ خیرات کرسکتا ہے یا اپنے ان مستحق عزیزوں کی دیکھ بھال کے لیے وقف کرسکتا ہے جو قانونی ورثاء میں شامل نہیں ہوتے۔ اس حصہ کو کسی نیک اور فلاحی مقصد کے لیے بھی وقف کیا جاسکتا ہے یا کسی فرد واحد کو دیا جاسکتا ہے۔ تاہم اس مد میں زیادہ سے زیادہ حد ایک تہائی ہے۔ لہٰذا آپ اس بچی کو اپنی جائیداد میں جو حصہ دے سکتے ہیں وہ ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

جب کسی شخص کا انتقال ہوتا ہے تو اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد پر سب سے پہلا حق کسی

قرضے یا واجب الادا رقم کا ہوتا ہے جو اس شخص کے ذمے ہو۔ یہ قرضہ اور ادائیگی چکانے کے بعد جو جائیداد باقی بچتی ہے اس میں سے متوفی کی وصیت کے مطابق حصے دیے جاتے ہیں۔ وصیت پر عمل درآمد کے بعد جو جائیداد باقی رہ جاتی ہے اسے متوفی کے قانونی ورثاء میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

آپ کے معاملے میں آپ کی زوجہ اور والدہ آپ کی جائیداد کے ورثے میں اللہ کے بتائے ہوئے حصے کے مطابق حقدار ہیں۔ چونکہ آپ لاولد ہیں اس لیے قرضوں وغیرہ کی ادائیگی اور وصیت پر عملدرآمد کے بعد باقی جائیداد میں سے آپ کی زوجہ کو ایک چوتھائی حصہ ملے گا، آپ کی والدہ کو چھٹا حصہ ملے گا اور باقی جائیداد آپ کے بھائیوں اور بہنوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ یہ تقسیم اس طرح ہوگی کہ باقی جائیداد کے کل ۱۲ حصے ہوں گے ہر بہن کو ایک حصہ اور ہر بھائی کو دو حصے ملیں گے۔

یہ تقسیم اس مفروضے کی بنیاد پر ہے کہ آپ کے دیگر قانونی ورثاء مثلاً والد یا دادا حیات نہیں ہیں اور ورثے کی تقسیم کے وقت تمام بھائی، بہن، والدہ اور زوجہ حیات ہیں۔

ایک متنازعہ وصیت

سوال: بہت مدت ہوئی، جب میرے دادا کا انتقال ہوا تو ان کے ورثاء میں صرف میرے والد تھے، جو اس وقت بچے تھے۔ میرے پردادا کی اولاد میں میرے دادا کے علاوہ ایک لڑکی اور ایک لڑکا اور تھا، پردادا نے انتقال سے پہلے میرے والد کے حق میں وصیت لکھی جس کے مطابق انہوں نے اپنی نصف اراضی اور رہائشی مکان کا چوتھائی حصہ میرے والد کے نام کر دیا۔ پردادا نے اپنے دوسرے لڑکے کی بیوی، یعنی اپنی بہو کی ملکیت کے قطعہ اراضی کا ایک چوتھائی بھی میرے والد کے سپرد کیا۔ جب تک خاندان مشترکہ طور پر رہتا رہا اس وقت تک تو کوئی دشواری نہیں ہوئی اور جائیداد مشترکہ رہی لیکن جب جائیداد کی تقسیم کا مرحلہ آیا تو اس وقت میرے دادا کی بہو کی اس زمین کا تنازعہ پیدا ہوا جو پردادا نے وصیت میں میرے والد کے نام کر دی تھی۔ مذکورہ بہو کے صاحبزادے جو میرے والد کے عم زاد بھی ہیں، اس وقت خاصے عمر رسیدہ ہیں اور پردادا کی وصیت کے گواہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ وصیت غلط تھی۔

اس صورتحال میں سوال یہ ہے کہ کیا میرے والد کو متنازعہ زمین پر اپنے حق کے لیے کوشش کرنی چاہیے یا اس سے دستبردار ہو جانا چاہیے اور صرف اس جائیداد پر اکتفا کرنا چاہیے جو ان کے دادا نے اپنی وصیت میں انہیں دی۔ یہ خیال رہے کہ میرے پردادا، جنہوں نے مذکورہ وصیت لکھی تھی، مذہبی عالم تھے۔ علاوہ ازیں میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ اگر ایک شخص کا شادی شدہ بیٹا اس

کی زندگی میں انتقال کر جائے تو کس قسم کے ترکے میں اس کے پوتے کو دادا کے ورثے سے محروم رکھا جاتا ہے۔ یہ سوال بھی جواب طلب ہے کہ قدرتی موت اور خودکشی، حادثے یا قتل کے نتیجے میں موت کی صورت میں ترکے کی تقسیم متاثر ہوتی ہے؟

جواب: سب سے پہلے تو مجھے لفظ ''محروم'' پر اعتراض ہے جو آپ نے ترکے کی تقسیم کے سلسلے میں استعمال کیا ہے کہ اگر متوفی کا والد حیات ہو تو متوفی کے بچے، دادا کے ترکے سے ''محروم'' رہیں گے۔ جب ہم یہ لفظ ''محروم'' استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہ فرض کر رہے ہیں کہ ایک پڑپوتے یا پڑپوتی کا کوئی حق ہے اور ان کی حق تلفی کرتے ہوئے انہیں یہ حق نہیں دیا جا رہا جبکہ اس معاملے میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ وراثت کا حق اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے اور قرآن مجید میں نظام وراثت تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے لیے ورثے میں کوئی حق نہیں رکھا تو کوئی طاقت اسے یہ نہیں دے سکتی۔ لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسے حق سے ''محروم'' رکھا گیا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو کسی مخصوص رشتے کے حوالے سے ورثاء میں شامل نہیں کیا۔

آپ نے جس طریقے سے اپنا سوال پیش کیا ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے میں ایک اور بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ قانون وراثت، وفات پانے والے شخص کے پورے ترکہ پر لاگو ہوتا ہے۔ متوفی نے اپنے ترکے میں اراضی، رہائشی جائیداد، تجارتی جائیداد، گیراج، گاڑیاں، نقد رقم، فرنیچر اور کپڑے وغیرہ جو کچھ بھی چھوڑا ہے اس کے ورثاء میں سے ہر ایک، ہر قسم کی چیز میں اس شرح سے حصہ دار ہوگا، جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دی ہے۔ اگر ایک وارث کو جائیداد میں ایک چوتھائی حصہ ملتا ہے تو اس صورت میں اسے متوفی کے چھوڑے ہوئے ہر قسم کے سامان میں چوتھائی حصہ ملنا چاہیے۔ ورثاء باہمی تفہیم سے مختلف اقسام کی اشیاء کا تبادلہ کر سکتے ہیں تاکہ ہر ایک کو اس کا پورا حصہ مل سکے۔ اگر اس تبادلے میں کوئی ناانصافی نہیں ہے تو یہ قابل قبول ہوگا۔ ورثہ کی تقسیم کے سلسلے میں اس امر کا کوئی دخل نہیں ہے کہ متوفی کا انتقال کس طرح ہوا۔ یعنی کوئی خواہ فطری موت سے انتقال کرے یا خودکشی، حادثے یا قتل کے نتیجہ میں اس کی موت واقع ہو، یا وہ میدان جنگ میں مارا گیا ہو، اس کے ورثاء کے درمیان جائیداد اور دوسری اشیاء کی تقسیم اس نسبت سے ہوگی جو اسلام نے مقرر کی ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگر مرنے والے کی موت کا ذمہ دار اس کے ورثاء میں سے کوئی شخص ہو، خواہ موت حادثاتی ہو یا قتل عمد کے نتیجے میں واقع ہوئی ہو، تو قاتل یا حادثے کے ذمہ دار شخص کو متوفی یا مقتول کے ورثہ میں حصہ نہیں ملے گا۔ اس اصول کی وجہ یہ ہے کہ اس

طرح کی موت میں اس شبہ کا عنصر ہمیشہ موجود رہتا ہے کہ قاتل یا حادثے کے ذمہ دار شخص نے وراثت میں اپنا حصہ پانے کے لیے قتل کیا ہو۔

یہ بات نہایت اہم ہے کہ کسی شخص کے انتقال کے بعد اس کی وراثت کی تقسیم ورثاء کے درمیان جلد از جلد کر دینی چاہیے۔ اسلامی قانون کے مطابق ورثہ کی فوری تقسیم کے نتیجہ میں جو تنازعات اور الجھنیں پیدا نہیں ہوتیں، مرحوم کے ورثاء میں سے کسی ایک وارث کے انتقال کے نتیجے میں پیدا ہوسکتی ہیں۔ اسلام کا قانون وراثت خاندان کے درمیان رشتے اور تعلق کو مضبوط کرتا ہے۔ لیکن جب ورثہ کی تقسیم مؤخر کرنے کی وجہ سے تنازعات پیدا ہوتے ہیں، تو یہ رشتے کمزور ہونے لگتے ہیں اور اس کے منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کسی شخص کی وفات کے بعد اس کے ترکے کی فوری تقسیم کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشاد کے مطابق اگر کسی شخص نے اپنے ترکے میں صرف ایک مسواک بھی چھوڑی ہو تو اس کو ورثاء کے درمیان تقسیم کر دینا چاہیے۔ جب ایک شخص کا انتقال اس صورت میں ہوتا ہے کہ پس ماندگان میں اس کے اپنے بچوں کے علاوہ اس کا باپ بھی شامل ہے، تو مرنے والے کی اولاد اپنے دادا کے ترکے میں حصہ دار نہیں ہوتی۔ ان بچوں کو صرف اپنے والد کی جائیداد میں حصہ ملے گا۔ تاہم اس صورت میں دادا، وصیت کے ذریعے اپنے پوتے، پوتیوں کو اپنے ورثے میں سے حصہ دے سکتا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہر مسلمان اپنے ورثے کا زیادہ سے زیادہ ایک تہائی حصہ وصیت کے ذریعے ان لوگوں میں تقسیم کر سکتا ہے جو اس کے ورثاء میں شامل نہیں ہیں۔ اس اصول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بات کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ دادا اپنے یتیم پوتے پوتیوں کو وصیت کے ذریعے اپنے ورثے میں شریک کرے۔ امام ابن حزم کا فتویٰ تو یہ ہے کہ اس قسم کے معاملے میں ''لازمی وصیت'' کے اصول کا اطلاق ہوتا ہے جس کے مطابق دادا نے اپنے یتیم پوتے پوتیوں کے حق میں وصیت کی ہو یا نہ کی ہو، انہیں حصہ ملتا ہے۔

مذہبی عالم کی حیثیت سے آپ کے پردادا نے وصیت کے اصول کے ذریعے اپنی جائیداد اپنے پوتے یعنی آپ کے والد کے نام کی تھی، لیکن جس بات سے مجھے الجھن ہے وہ اس حصے کی مقدار ہے جو انہوں نے آپ کے والد کو دیا۔ اگر آپ کے پردادا کے تمام بچے حیات تھے تو آپ کے دادا کو اپنے والد کی جائیداد کا چالیس فیصد حصہ ملنا چاہیے تھا۔ اس کا مساوی حصہ دادا کے دوسرے بھائی کو اور ۲۰ فیصد حصہ بہن کو ملنا چاہیے تھا۔ یہ تقسیم اس مفروضے کی بنیاد پر ہے کہ ورثاء میں ان تین کے علاوہ کوئی اور شخص شامل نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ آپ کے پردادا نے ورثے کی تقسیم کر لی ہو اور اپنی بیٹی کو اس کا حصہ دیگر ذرائع (علاوہ جائیداد) سے دے دیا ہو۔ یہاں یہ فرض کرنا

نہایت مناسب ہے کہ آپ کے پردادا نے اپنے پوتے (یعنی آپ کے والد) کو وصیت کے ذریعے اپنے ورثے میں سے جو کچھ دیا وہ اتنا ہی تھا جو انہیں ملنا چاہیے تھا اور میرے خیال میں اب جو تنازعہ ہے، یہ بات اس میں شامل نہیں ہے۔ متنازعہ مسئلہ وہ جائیداد ہے جو بالکل دوسرے ذریعہ سے آپ کے والد کو دی گئی ہے۔ یعنی وہ قطعہ اراضی جو آپ کی دادی تائی (آپ کے دادا کے بھائی کی بیوی یعنی آپ کے پردادا کی بہو) کی ملکیت تھی۔

میری رائے میں آپ کے پردادا کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ اپنی بہو کی جائیداد کسی کو تقسیم کریں یا یکمشت وہ پوری جائیداد اپنے پڑپوتے کو دے دیں۔ یہ صرف اسی وقت ممکن تھا جب آپ کی دادی تائی اپنی یہ زمین اپنے سسر (یعنی آپ کے پردادا) کو یا آپ کے والد کو بطور تحفہ دے دیتیں۔ لیکن آپ نے سوال میں جو تفصیل بیان کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم سے کم اس وقت تک تو ایسا نہیں ہوا تھا، جب آپ کے پردادا نے وصیت لکھی۔ جب کسی کو تحفہ پیش کیا جاتا ہے تو اس کی ملکیت فوری طور پر منتقل ہوجاتی ہے، لیکن جب کسی سامان یا جائیداد کی ملکیت کی منتقلی کسی کے انتقال سے مشروط ہو تو اس کی صورت تحفہ کی نہیں ہوتی بلکہ یہ وصیت کے ذریعے منتقلی ہوتی ہے۔ ان خاتون (آپ کی دادی تائی) کا یہ حق تھا کہ وہ جس طرح چاہیں اور جس کے حق میں چاہیں اپنے سسر یا شوہر کی مداخلت کے بغیر اپنی آزاد مرضی سے وصیت کریں۔

آپ کے والد کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اپنی تائی کی زمین کی ملکیت پر اصرار نہ کریں اور صرف اس جائیداد کی ملکیت کا حق حاصل کریں جو ان کے دادا کی ملکیت تھی، اور جو انہوں نے وصیت کے ذریعے آپ کے والد کو دی۔

غیر قانونی اولاد کا حق وراثت؟

سوال: اگر باقاعدہ نکاح سے پہلے حمل قائم ہوگیا ہو تو اس صورت میں یہ بچہ اپنے والد کی وفات کے بعد والد کے ورثے کا حق دار ہوگا یا نہیں۔ اگر ورثے میں ایسے بچے کا حصہ ہوگا تو کیا اس کا حصہ اتنا ہی ہوگا جتنا شادی کے بعد پیدا ہونے والے اس کے دوسرے بہن بھائیوں کا ہوگا؟

جواب: آپ بخوبی واقف ہیں کہ نکاح سے پہلے ہر قسم کے جنسی تعلقات قطعی ممنوع ہیں۔ یہ امر اسلامی اخلاقیات کا نہایت اہم حصہ ہے۔ غیر شادی شدہ افراد کے درمیان جنسی تعلق اور شادی شدہ افراد کے درمیان غیر قانونی جنسی تعلق کی سزاؤں میں یہ فرق تو ہے کہ شادی شدہ افراد کے درمیان جنسی تعلق کی سزا (رجم) انتہائی سخت ہے لیکن ان دونوں سزاؤں کی نوعیت سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے

کہ یہ جرائم انتہائی نوعیت کے ہیں۔

علاوہ ازیں، اسلامی نظام انصاف کا ایک اصول یہ ہے کہ ایک شخص کی غلطی کا ذمہ دار دوسرے فرد کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اگر ایک بچہ غیر قانونی تعلقات کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے تو اسلامی اصول کے مطابق اسے اپنے والد کی غلطی کی وجہ سے نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ لیکن ایسے بچے کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی ولدیت ثابت نہیں کر سکتا۔ سوائے کے کہ باپ خود اس بات کی تصدیق کرے۔ اگر باپ بچے کی ولدیت کا اقرار کر لے تو اس سے تفصیلات نہیں پوچھنی چاہئیں کہ کن حالات کے نتیجے میں اس بچے کی ولادت ہوئی۔ محض اس بچے کے بارے میں اس کے اس اعلان کو قبول کر لینا چاہیے کہ وہ اس کا باپ ہے۔

مثال کے طور پر ایک ایسے شادی شدہ جوڑے کو لیجیے جس میں بیوی نکاح سے پہلے حمل سے تھی۔ اگر یہ جوڑا اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے وقت مناسب اقدامات کر لے تو کوئی بھی اس بچے کی قانونی حیثیت کے بارے میں سوال نہیں اٹھائے گا اور اس صورت میں یہ بچہ اپنے والدین کے ورثہ میں اسی طرح حصہ دار ہوگا جس طرح اس کے دوسرے بہن بھائی حصہ دار ہوں گے۔ یعنی اسلامی قانون وراثت کے مطابق والد کے ورثے میں اس بچے کو دوسرے بھائیوں کے ساتھ، بہنوں کے مقابلے میں دو حصے ملیں گے۔

ترکے کی تقسیم پر تحفہ کا اثر

سوال: ایک شخص اپنے بچوں کو کوئی تحفہ دیتا ہے، اس کی وفات کے بعد ترکے کی تقسیم کے وقت اس بات کا کوئی اثر ہوگا؟

جواب: مسلمان مرد کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنی رقم جہاں چاہے خرچ کرے، بشرطیکہ یہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف نہ ہو اور کسی ایسے شخص کے ساتھ ناانصافی نہ ہو جس پر اس کا کوئی حق ہے۔ لہذا اسے یہ اجازت ہے کہ وہ مکان، جائیداد، گاڑی یا اسی نوعیت کی کوئی چیز خریدے اور اسے اپنی بیوی یا بچوں کو تحفتہً پیش کرے۔ لیکن اس بات میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ (اگر اس کی دوسری بیوی یا بیویاں ہیں تو) دوسری بیوی یا دوسرے بچوں کی حق تلفی نہ ہو۔ ایک سے زیادہ بیویوں کی صورت میں تمام ازواج کے ساتھ مساوی سلوک کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح ایک سے زائد بچے ہیں تو تمام بچوں کے ساتھ برابر کا رویہ رکھا جائے۔

اگر کوئی شخص بیوی یا کسی بچے کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہوئے اسے اس قسم کا تحفہ پیش

کرتا ہے جس سے دوسرے بچوں (اور بیوی) کی حق تلفی ہوتی ہے تو یہ جائز نہیں ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث روایت ہے کہ ان کے والد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ''میں نے اپنے اس بیٹے کو غلام کا تحفہ دیا ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم نے اپنے تمام بچوں کو اسی طرح کا تحفہ دیا ہے۔'' جب اس کا جواب نفی میں دیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی کہ اپنا تحفہ واپس لے لو۔ اس حدیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ والدین کو اپنے بچوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنا چاہیے۔ یہ بچے خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں ان میں فرق نہیں برتنا چاہیے۔

اگر ایک شخص جسمانی اور ذہنی طور پر صحت مند ہے تو وہ اپنی دولت کو جس طرح چاہے خرچ کرسکتا ہے۔ شرط وہی ہے کہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ زندگی میں کسی کو تحفہ دینے سے ترکے کے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ترکہ کی تقسیم کسی شخص کی وفات کے بعد ہوتی ہے۔ انتقال سے پہلے ایک شخص کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس کے کسی وارث کا اس کی زندگی میں اس کے مال میں کوئی مخصوص حصہ نہیں ہوتا، صرف زیر کفالت افراد کی ضروریات پوری ہونا ضروری ہیں۔ جن میں بیوی، بچے اور والدین شامل ہیں جن کا ذریعہ آمدنی کوئی نہ ہو۔ اگر کوئی شخص اپنی وصیت کے ذریعے تحفہ دینا چاہتا ہے تو اسے محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اسلام میں وصیت کے ذریعہ قانونی وارثوں میں سے کسی کے حق کو متاثر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ وصیت کے مطابق ورثاء کو وہی حصہ ملنا چاہیے جس کا اسلام میں نہایت واضح طور پر حکم دیا گیا ہے۔ ایک شخص اپنے ترکے کا ایک تہائی حصہ اپنی وصیت کے ذریعہ دوسروں کو دے سکتا ہے، بشرطیکہ اس نے اپنے قانونی ورثاء میں سے کسی کو اس کے جائز حصہ کے علاوہ کچھ اور نہ دیا ہو۔

اولاد کے لیے تحائف اور ورثہ

سوال ا: ایک شخص کا انتقال ہوچکا ہے پس ماندگان میں بیوہ، دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ ان میں ترکے کی تقسیم کس طرح کی جائے گی؟

۲: ایک شخص کے کئی بچے ہیں جن میں سے بعض کو وہ پسند کرتا ہے اور انہیں قیمتی اشیاء اور جائیداد کے تحفے دیتا ہے۔ اس رویے سے ان بچوں کو ذہنی تکلیف بھی ہوتی ہے اور مالی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے جو باپ کی خصوصی توجہ سے محروم رہے۔ براہ کرم ان دونوں سوالوں کے مفصل جوابات مرحمت فرمائیں۔

جواب: پہلے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ متوفی کے ترکے میں سے بیوہ کو کل جائیداد میں سے آٹھواں حصہ ملے گا۔ باقی ترکہ بچوں میں اس طرح تقسیم ہوگا کہ ہر لڑکی کو، ہر لڑکے کی وفات سے پہلے، وصیت کے ذریعہ کل جائیداد کا ایک کے حصہ کا نصف ملے گا لیکن ترکے کی یہ تقسیم اس مفروضے کے ساتھ ہے کہ متوفی کے والدین (ماں اور باپ دونوں) کا انتقال ہو چکا ہے۔ اگر والدین یا دونوں میں سے ایک بھی حیات ہے تو ان میں سے ہر ایک کو متوفی کے ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا۔ ترکے کی وارثوں میں تقسیم سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اگر متوفی کے ذمہ کوئی قرض یا کسی کی واجب الادا رقم یا شے ہو تو وہ مرنے والے کے ترکہ میں سے ادا کر دی جائے۔

۲۔ اپنی زندگی میں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی دولت اپنی مرضی ومنشاء کے مطابق خرچ کرے بشرطیکہ خرچ کی مدات اللہ کے حکم کے منافی نہ ہوں۔ اس لیے اگر کوئی شخص اپنے عزیزوں، رشتہ داروں یا غیر لوگوں کو تحفے، تحائف یا جائیداد دیتا ہے تو یہ اس کا حق ہے۔ آپ نے جس شخص کی مثال دی ہے اسلامی شریعت کے مطابق اس کا یہ عمل اسلامی روح کے خلاف نہیں ہے۔ تاہم اسکے ساتھ ہی یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اسلام جانبداری کو کسی صورت میں بھی پسند نہیں کرتا۔

ازدواجی تعلقات

نکاح: مفہوم و معنی

سوال: ''نکاح'' کے اصل معنی کیا ہیں۔ عام طور پر اس کا مطلب عقد شادی لیا جاتا ہے۔ اسلامی شریعت کی روشنی میں اس کے معنی واضح فرمائیں؟

جواب: نکاح کا لفظ جب قرآن میں، کسی حدیث میں یا اسلامی فقہ سے متعلق عبارت میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی شادی کا معاہدہ ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ لفظ جنسی اختلاط کے معنی میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ سیاق و سباق واضح طور پر اسی جانب اشارہ کر رہے ہوں۔ جب تک وہ خاص مفہوم ادا نہ ہو رہا ہو، اس کے معنی شادی کے معاہدے کے لیے جاتے ہیں۔ یہ ایک قرآنی اصطلاح ہے جو قرآن مجید میں متعدد بار شادی کے معنی میں استعمال ہوئی ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ قرآن مجید میں یہ لفظ صرف ایک بار جنسی اختلاط کے مترادف کے طور پر استعمال ہوا ہے، اس لفظ کے عام معنی شادی ہی ہیں۔

والدین کی رضا کے بغیر شادی

سوال: کیا ایک شخص کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی شریک حیات کا انتخاب کرے خواہ والدین اس کی پسند کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر ایک شخص نے لڑکی سے وعدہ کرلیا ہو کہ وہ اس سے شادی کرے گا، تو کیا وہ اپنے والدین کا حکم ماننے کی صورت میں لڑکی کے ساتھ وعدہ خلافی اور فریب کا مرتکب ہوگا۔ ازراہ کرم بتایے کہ اس معاملے میں کون سی بات اہم ہے، وعدہ

کی تکمیل یا والدین کی اطاعت؟

جواب: اس سوال میں فرائض کے درمیان تصادم کی صورت پیدا ہورہی ہے۔ ایک مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے والدین کی اطاعت کرے بشرطیکہ والدین اس سے غیر معقول قسم کے مطالبات نہ کریں۔ اسلامی نقطہ نظر سے یہ بات بھی اہم ہے کہ ہر شخص کو وعدہ ایفا کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی ایک شخص پر اپنی ذات کا اور اپنے بچوں کا یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ شریک حیات کے طور پر ایک اچھی خاتون کا انتخاب کرے۔ یہ تمام فرائض جو عام طور پر بغیر کسی دشواری کے ادا ہوجاتے ہیں، بعض اوقات ایک دوسرے سے متصادم ہوکر بحرانی کیفیت پیدا کردیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب اس قسم کی صورتحال پیدا ہوتو کس فرض کو دوسرے پر فوقیت دینا چاہیے؟

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ شریک حیات کے طور پر بہتر سے بہتر خاتون کا انتخاب، سب سے زیادہ فوقیت رکھتا ہے۔ یہ انتخاب نہایت غوروفکر کے بعد متعدد باتوں کو سامنے رکھ کر کیا جانا چاہیے۔ اچھی شخصیت، ذہانت، تعلیم اور ظاہری حسن وصورت وہ خصوصیات ہیں جو ہم میں سے ہر ایک کے لیے قابل ترجیح ہوسکتی ہیں، لیکن چونکہ ہم میں سے کوئی بھی مکمل انسان نہیں ہے، اس لیے ممکن ہے کہ جسے ہم شریک حیات کے طور پر منتخب کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، اس میں بعض خصوصیات موجود ہوں اور بعض نہ ہوں۔ کن خصوصیات کو دوسری خصوصیات پر ترجیح دینا چاہیے؟ اس سوال کا جواب ہر شخص کے نزدیک مختلف ہوگا۔ بعض حضرات حسن وصورت کو اہم سمجھیں گے جبکہ دوسروں کے نزدیک یہ کم اہم ترجیح ہوگی۔ بعض کے نزدیک ہونے والی شریک حیات کو ذہین اور عقلمند ہونا چاہیے۔ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو کم تعلیم یافتہ لڑکی کو پسند کریں گے۔ مختصر یہ کہ ہر شخص کی پسند کا اپنا معیار ہے جس کے مطابق وہ اپنی ہونے والی شریک حیات میں چند خصوصیات کو ترجیح دے گا۔ اس ضمن میں کوئی ایسا قاعدہ نہیں بنایا جاسکتا جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ لڑکی اور لڑکے کی رضامندی کے بغیر شادی عمل میں آئی ہوتو اس صورت میں جلد ہی مختلف مسائل پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے اور عام طور پر اس قسم کی شادی کی کامیابی کی توقع نہیں کی جاتی۔ بالکل واضح طور پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لڑکی کا انتخاب کون کرتا ہے، اس بات کی اس وقت کوئی اہمیت نہیں جب تک اس معاملے کے دونوں فریق، یعنی لڑکے اور لڑکی کی رضامندی حاصل نہ کرلی جائے۔ تاہم ان باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے شریک حیات کے انتخاب کے معاملے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پیش نظر رکھنی چاہیے۔ اس ہدایت میں جو دانائی پوشیدہ ہے، صدیوں سے لوگ اسے تسلیم کرتے آرہے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شادی کے لیے ایک

عورت کا انتخاب چار باتوں میں سے کسی ایک کے پیش نظر کیا جاسکتا ہے، مال و دولت، حسنِ صورت، حسب ونسب یا ایمان کی پختگی، اور اگر تم پھلنا پھولنا چاہتے ہو تو اس عورت کا انتخاب کرو جس کا ایمان راسخ ہو۔ اس حدیث مبارک کی روشنی میں، ہونے والی شریک حیات میں دیگر خصوصیات کے ساتھ سب سے زیادہ اہمیت اس خصوصیت کو دینی چاہیے جس کی ہدایت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کا انتخاب درست ہوگا۔ یہی اصول ان والدین کے لیے بھی ہے جو اپنے بیٹے کے لیے لڑکی منتخب کرنے جارہے ہیں اور یہی ہدایت ان والدین کے لیے بھی ہے جو اپنی بیٹی کے لیے آئے ہوئے رشتوں پر غور کر رہے ہوں۔ ممکن ہے کہ ایک دولت مند شخص سے شادی کر کے ان کی بیٹی خوش نہ رہ سکے، جبکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی روشنی میں کی گئی شادی کے بعد وہ خوش وخرم اور مطمئن زندگی گزار سکے۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ایک شخص جس کا ایمان راسخ ہے اور وہ دیانت دار ہے رشتہ لے کر آتا ہے تو اسے قبول کرلو، اگر تم ایسا نہ کرو گے تو معاشرے میں بے حیائی پھیلے گی۔ میں یہ بات پھر دہراؤں گا کہ شادی کے معاملے میں حتمی انتخاب جو کوئی بھی کر رہا ہو، اسے ان خصوصیات کو ترجیح دینی چاہیے۔ جب لوگ ان ہدایات پر عمل کریں گے تو ان کا فیصلہ درست ہوگا۔

جب لڑکے کی پسند اور اس کے والدین کی پسند میں اختلاف ہو تو کیا کرنا چاہیے؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس قسم کے معاملات میں والدین کا حکم کس حد تک قابل قبول ہے۔

جب ایک لڑکا بالغ ہوجاتا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے والدین کی عزت کرے، ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اور صلہ رحمی کا مظاہرہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیٹے کو اپنے والدین کے ساتھ محبت و احترام سے پیش آنا چاہیے، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا چاہیے اور ہر وہ کام کرنا چاہیے جس کی ایک فرمانبردار بیٹے سے توقع کی جاتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کم عمر بچے کی طرح والدین کا ہر حکم مانے۔ جہاں تک ممکن ہے وہ والدین کی خواہشات کا احترام کرے بشرطیکہ وہ معقول ہوں۔ بعض اوقات والدین اپنی بالغ اولاد سے بھی بچوں کی طرح پیش آتے ہیں اور ان سے ایسے مطالبے کرتے ہیں جنھیں معقول نہیں کہا جاسکتا۔ جس بچے کی انہوں نے پرورش کی ہے، بڑا ہونے پر اسے بچے کے بجائے ایک ساتھی سمجھنا ان کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ اولاد خواہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہوجائے وہ اس سے ''مکمل اطاعت'' کی توقع کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ''بچوں کے لیے کیا اچھا ہے، یہ ہم بہتر جانتے ہیں۔'' اس قسم کے

والدین اولاد کے ذاتی معاملات میں ان کی رائے اور پسند کو اہمیت دینے کے بجائے اپنی رائے اور پسند ہی کو حتمی قرار دیتے ہیں۔

جب اس قسم کی صورتحال پیش آئے اور والدین کے مطالبات کسی حد تک غیر معقول ہوں تو انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرنا چاہیے کہ ان کی خواہش پر عمل نہ کرنے کا مطلب نافرمانی قطعی نہیں ہے۔صرف اتنی سی بات ہے کہ جس چیز کو وہ اپنے لیے بہتر سمجھ رہا ہے، اسے اختیار کر رہا ہے۔ والدین کی پسند پر معقول وجوہات کے ساتھ اعتراضات کیے جاسکتے ہیں اور ایسا کرنے سے بیٹا نافرمانی کا مرتکب نہیں ہوگا۔

اس کے ساتھ اسے یہ بھی بتانا چاہیے کہ جس لڑکی سے اس نے شادی کا وعدہ کیا ہے اسے کن خصوصیات کی بنیاد پر منتخب کیا ہے۔ اگر اس لڑکی کا ایمان راسخ ہے اور اس کے اخلاق اچھے ہیں تو والدین محض بودے، ... پر اس انتخاب کو آسانی سے رد نہیں کرسکتے۔ اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے دانشمندی کی ضرورت ہے۔

کوئی بھی اس معاملے میں شرعی فیصلہ نہیں دے سکتا کہ والدین کی اطاعت اور شادی کے لیے وعدے کی تکمیل میں سے کس کو دوسرے پر ترجیح دی جانی چاہیے۔ مختلف معاملات میں صورتحال کے پیش نظر کوئی بات کہی جاسکتی ہے۔

ان معاملات میں کوئی حتمی نظریہ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اس قسم کی صورتحال میں مختلف پہلوؤں کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے اور ان پر غور وفکر کیا جائے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا انتخاب درست ہے اور آپ نے شادی کے لیے جس لڑکی سے وعدہ کیا ہے وہ آپ کے لیے بہترین بیوی ثابت ہوگی تو آپ کوشش کریں کہ آپ کے والدین اسے قبول کرلیں۔ اگر والدین اس کے باوجود غیر معقول رویہ قائم رکھیں تو آپ اپنی پسند کے مطابق شادی کرنے پر نافرمانی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔

سول میرج کی اسلامی حیثیت

سوال: اگر ایک مسلمان مرد اور ایک عورت رجسٹرار کے دفتر میں جاکر، بغیر مہر ادا کیے شادی کرلیں تو کیا یہ رشتہ جائز ہوگا۔ اگر فریقین کے والدین سے اس شادی کے لیے اجازت نہ لی گئی ہو تب کیا صورتحال ہوگی؟

جواب: اسلام ہر شادی کو قبول کرلیتا ہے خواہ وہ کہیں بھی عمل میں آئی ہو، شرط یہ ہے کہ نکاح کے

لیے اسلام نے جو شرائط عائد کی ہیں وہ پوری کی گئی ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رجسٹرار کے دفتر میں منعقد ہونے والی شادی پر اسلامی نقطہ نظر سے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا، بشرطیکہ شادی کرنے والے جوڑے نے وہ شرائط پوری کر دی ہوں جو اسلام کے مطابق شادی کے لیے ضروری ہیں۔ یہ شرائط نہایت سادہ ہیں: لڑکی کے والد یا سرپرست کی موجودگی اور کم سے کم دو گواہوں کی شہادت۔ اگر نکاح کا عمل اور ایجاب وقبول ان افراد کی موجودگی میں ہوا ہے تو یہ شادی درست ہے، خواہ مہر کی رقم کا تعین کیا گیا ہو یا نہیں۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق شادی کے معاملے میں پہلا نکتہ ایجاب وقبول کا ہے۔ ایجاب (رضامندی) لڑکی کی طرف سے ہوتا ہے اور بالعموم لڑکی کے والد، سرپرست یا ان کا کوئی نمائندہ (وکیل) یہ اعلان کرتا ہے کہ اسلامی شریعت کے مطابق اس شادی کے لیے لڑکی رضامند ہے۔ اس ایجاب کے بعد دولہا یہ اعلان کرتا ہے کہ اس نے اسلامی شریعت کے مطابق لڑکی کو اپنے نکاح میں قبول کیا۔ اگر یہ تمام عمل دو گواہوں کی موجودگی میں ہوا ہے تو نکاح جائز ہے۔ اگر شادی کا یہ معاہدہ رجسٹرار کے دفتر میں ہوتا ہے تب رجسٹرار یا اس کا نائب اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ ایجاب وقبول کا عمل درست طریقے پر ہوا ہو، ممکن ہے کہ اس کے لیے حکومت نے چند اضافی ضابطے ضروری قرار دیئے ہوں، اگر ایسا ہو تو ان ضابطوں کو پورا کرنا ہوگا، بشرطیکہ یہ ضابطے اسلامی شریعت کے خلاف نہ ہوں۔ اس قسم کے ضابطے صرف ریکارڈ کی درستگی اور دفتری کارروائیوں کی تکمیل کے لیے ہوتے ہیں۔

بعض ممالک میں سول میرج کے لیے لڑکی کے والد یا سرپرست کی موجودگی ضروری نہیں ہوتی۔ یہ طریقہ اسلام کے قانون کے خلاف ہے، کیونکہ اس معاملے میں اسلام کے احکامات نہایت واضح ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی بھی شادی عمل میں نہیں لائی جا سکتی جب تک (لڑکی کے) سرپرست اور دو گواہ موجود نہ ہوں۔ بصورت دیگر شادی جائز نہیں ہوگی۔ ایک اور حدیث کے مطابق آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کوئی عورت کسی دوسری عورت کو شادی کی اجازت نہیں دے سکتی اور نہ کوئی عورت خود شادی کر سکتی ہے۔ ان احادیث کی روشنی میں شادی کے لیے لڑکی کے سرپرست کی موجودگی ضروری ہے۔ اس بارے میں تمام فقہاء کی رائے ایک ہے، سوائے امام ابوحنیفہؒ کے۔ امام ابوحنیفہؒ اس معاملے کو دوسری طرح دیکھتے ہیں۔ ان کی رائے میں شادی کا معاہدہ اسی طرح کا کاروباری معاہدہ ہے جو عورت اپنے طور پر آزادانہ انجام دے سکتی ہے۔ اس لیے ایک اسلامی عدالت کسی ایسی شادی کو جائز قرار دے سکتی ہے جس میں عورت نے اپنی نمائندگی خود کی ہو اور یہ شادی کسی غیر مسلم ملک میں انجام پائی ہو۔ لیکن یہ صرف معاملات کو

سلجھانے اور شادی کے رشتہ کو محفوظ رکھنے کے لیے ہوگا۔ اسلامی عدالت کسی مسلمان ملک میں انجام پذیر شادی کے اس معاہدے کو قبول نہیں کرے گی۔

دو گواہوں کی موجودگی، شادی کے اعلان (تشہیر) کے لیے ضروری کم سے کم معیار ہے۔ شادی کی جتنی زیادہ تشہیر ہو اتنا بہتر ہوتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم : شادی کا جشن، گیت اور موسیقی کے ساتھ منانے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دولہا کی جانب سے ولیمے کی دعوت کی بھی ترغیب دی ہے۔ ان تمام باتوں کا مقصد ایک ہے کہ معاشرے میں ایک نئے جوڑے کے قانونی بندھن کا لوگوں کو زیادہ سے زیادہ علم ہو جائے۔

مہر ضروری ہے۔ مہر ایک طے شدہ رقم ہوتی ہے جس پر دونوں فریق رضامند ہوتے ہیں۔ مہر دولہا کے ذمے ہوتا ہے اور دلہن کو شادی کے معاہدے کے وقت یا بعد میں ادا کیا جاتا ہے۔ اگر مہر کی رقم کا تعین نہ کیا گیا ہو تب بھی یہ قابل ادا ہوتا ہے خواہ شادی کئی برس جاری رہے۔ عورت جب چاہے، مہر طلب کرسکتی ہے اور مرد کو یہ ادا کرنا ہوگا۔ اگر اس وقت مہر کی رقم کے تعین میں یکساں رائے نہ ہو تو یہ معاملہ اسلامی عدالت کے سامنے لے جایا جاسکتا ہے جہاں قاضی عورت کے سماجی مرتبہ کو پیش نظر رکھ کر مہر کی رقم کا تعین کرے گا۔

سرپرست کے بغیر شادی؟

سوال: میرے ایک دوست نے ایک لڑکی سے شادی کے لیے منگنی کی جس میں لڑکی اور اس کے والدین کی رضامندی شامل تھی۔ بعد میں کسی خاندانی مسئلے کی وجہ سے لڑکی کے والدین اس شادی کے خلاف ہوگئے۔ میرے دوست اور اس کی منگیتر نے لڑکی کے والدین کا انتظار کیے بغیر شادی کرلی۔ اب ان کے تین بچے ہیں۔ اس شادی کی اسلام میں کیا حیثیت ہے؟

جواب: علماء کی بڑی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ شادی کے موقع پر لڑکی کے والدین یا سرپرست اس کی جانب سے کارروائی میں شریک ہوں۔ اگر لڑکی کے والد حیات ہیں تو والد بذات خود یا ان کی جانب سے نامزد کردہ کوئی شخص نکاح کی کارروائی میں شریک ہو۔ اس کے علاوہ کسی اور کو یہ حق نہیں ہے۔ اگر والد موقع پر موجود نہ ہوں یا فوت ہو چکے ہوں تو یہ ذمہ داری لڑکی کے کسی دوسرے قریب ترین عزیز مثلاً دادا، نانا، بھائی، چچا، ماموں (مطلقہ کی صورت میں عورت کے بیٹے) کو ادا کرنی چاہیے۔

جو علماء اس نقطہ نظر کے حامی ہیں وہ قرآن مجید کی اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں جس میں اللہ

تعالیٰ نے مسلمان مردوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے زیر کفالت عورتوں کی شادی میں تاخیر نہ کریں۔ اگر عورت اپنی شادی کا معاملہ خود کرسکتی ہے تو اس کے کفیل کو یہ حکم دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ان کی شادی میں تاخیر نہ کی جائے۔ علاوہ ازیں بعض مصدقہ احادیث بھی موجود ہیں جن کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کسی عورت کی شادی کے موقع پر جب تک اس کے سرپرست موجود نہ ہوں اور ان کی رضامندی نہ ہو، اس وقت تک شادی کا معاہدہ مؤثر نہیں ہوتا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ کوئی عورت اپنی شادی خود نہیں کرسکتی اور نہ ہی کوئی عورت دوسری عورت کی شادی کے موقع پر اس کی طرف سے عمل کرسکتی ہے۔

شافعی، مالکی اور حنبلی فقہا درج بالا نقطہ نظر پر متفق ہیں۔ علاوہ ازیں ہر دور کے دیگر علماء بھی اسی موقف کے حامی رہے ہیں۔ تاہم حنفی فقہ میں شادی کے موقع پر عورت کے سرپرستوں کی موجودگی کو احسن سمجھا جاتا ہے لیکن یہ لازمی نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ اسلام میں عورت کو ہر طرح کے معاہدے (مثلاً تجارتی و کاروباری معاملات) خود کرنے کی اجازت ہے اور چونکہ شادی بھی ایک معاہدہ ہے اس لیے عورت اپنی جانب سے خود اس معاہدے کو انجام دے سکتی ہے۔

دونوں نقطہ ہائے نظر کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ اس بارے میں پہلا موقف زیادہ وزنی ہے۔ یہ صرف علماء کی اکثریت کی رائے نہیں ہے بلکہ قرآن مجید اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہوں گا کہ شادی کے معاہدے میں عورت کا اپنی جانب سے خود پیروی کرنے کے، امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے موقف کو چیلنج بھی نہیں کیا جاسکتا۔ شادی ایک خصوصی اور استثنائی معاہدہ ہے کہ نہیں، یہ بحث قطعی الگ ہے۔

آپ نے اپنے دوست کے جس معاملے کے بارے میں رائے جاننا چاہی ہے اس سلسلے میں امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی رو سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ شادی درست ہے۔ میرا خیال ہے کہ شادی کے بعد آپ کے دوست کی بیوی کو اس کے والدین کی رضامندی حاصل ہوگئی ہوگی۔ دوسری جانب اگر شادی کے موقع پر لڑکی کی جانب سے حکمراں، یا ضلعی سربراہ موجود رہا تو تب بھی شادی کا معاہدہ بالکل درست ہوگا، خواہ اس شادی میں لڑکی کے والدین موجود ہوں یا نہیں۔ آپ کے دوست کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنی شادی کی حیثیت کے بارے میں فکرمند نہ ہوں اور خاص طور پر اس صورت میں جب بیوی کے والدین کے ساتھ ان کے تعلقات معمول پر آچکے ہیں۔

آخر میں نہایت اصرار کے ساتھ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ کسی شخص کو لڑکی کے والدین کی

رضامندی اور موجودگی کے بغیر شادی کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔

غیر کنواری لڑکی سے شادی؟

سوال: ایک طویل عرصے کی منگنی کے بعد اور شادی سے چند روز قبل لڑکی نے اپنے منگیتر کو بتایا کہ وہ کنواری نہیں رہی ہے۔ اس اعتراف کے بعد لڑکا منگنی توڑنا چاہتا ہے، لیکن اس کے ایک دوست نے مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ لڑکی سے شادی کر لے اور اسے پاک زندگی گزارنے کا موقع دے تو یہ ایک نیکی کا کام ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس کا اجر عطا فرمائے گا۔ کیا یہ مشورہ درست ہے؟

جواب: اس قسم کے معاملات کے لیے کوئی خاص اصول مقرر نہیں ہے۔ ہر معاملے کا جائزہ اس کی نوعیت اور حالات کو سامنے رکھ کر لیا جانا چاہیے اور اس کی بنیاد پر فیصلہ کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں صرف متعلقہ افراد ہی کو ایسے معاملے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے یا وہ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ جس خاتون کے ساتھ بھی اس نوعیت کا معاملہ ہو اس کی شخصیت نہایت اہم ہوتی ہے۔ اس خاص معاملے میں جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، لڑکے کو سب سے پہلے تو یہ جائزہ لینا چاہیے کہ اس کی منگیتر نے جو اعتراف کیا ہے کیا وہ واقعی درست اور مبنی برحقیقت ہے۔ اسے ان اسباب کا بھی تعین کرنا چاہیے جن کی وجہ سے یہ صورتحال پیدا ہوئی۔ کیا اس کی منگیتر ایک پاک دامن لڑکی ہے اور محض کسی خاص موقع پر، مخصوص حالات کی ترغیب کا شکار ہوگئی ہے اور آیندہ اس قسم کے فعل کے ارتکاب سے توبہ کی ہے۔ کیا وہ زنا بالجبر کا شکار ہوئی ہے۔ یا اس کے کردار میں خامی ہے۔ ان سوالوں کے جواب معاملے کی نوعیت میں نہایت اہم فرق پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کی سنگین غلطی کرنے والی ہر لڑکی قابل معافی نہیں ہوسکتی۔ کمزور کردار کی حامل کسی لڑکی کو معاف کرنا درست نہیں ہوگا اور اس اجر کی اللہ سے توقع نہیں کی جانی چاہیے۔ اس کے برخلاف اگر یہ محض ایک مرتبہ کا واقعہ ہے اور اس قسم کے حالات کا نتیجہ ہے جس میں متعلقہ لڑکی ان حالات پر قابو نہ پاسکی، تو اس صورت میں اس لڑکی کو سیدھے راستے پر آگے بڑھنے میں مدد دینی چاہیے۔ یہ ایک نیک کام ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوں گے۔ آپ کے سوال کے جواب میں لڑکے کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنی منگیتر کے کردار کا اندازہ لگائے۔ اگر لڑکی نیک ہے، وہ پاک صاف زندگی گزارنا چاہتی ہے اور مذہبی فرائض انجام دیتی ہے، تو اس لڑکی سے شادی کرنا یقیناً ایک نیک کام ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس کا اجر عطا کریں گے۔ اگر صورتحال اس کے برخلاف ہو تو لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ لڑکے کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ اپنے لیے ایسی بیوی تلاش کرے جو اسلامی اقدار کی پاسدار ہو اور ان پر عمل کرتی ہو۔

بھائی کی مطلقہ سے شادی

سوال: اگر کسی شخص کے بھائی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو کیا بھائی کی مطلقہ سے شادی کرنا درست ہوگا؟

جواب: اسلامی تعلیمات کے مطابق ایسی خاتون سے شادی کرنے کی اجازت ہے۔ جب کسی خاتون کا نکاح ہوتا ہے تو شوہر کے خاندان میں شادی کے ذریعہ اس کا تعلق صرف ایک شخص تک محدود ہوتا ہے اور اس کا اپنا خاندان، وہ ہوتا ہے جو شوہر سے تعلق کے نتیجہ میں جنم لیتا ہے۔ ایسی خاتون کی دوسرے فرد سے شادی پر پابندی اسی بناء پر ہوتی ہے کہ وہ پہلے ہی اپنے شوہر سے بیاہی جاچکی ہے۔ جب یہ شادی طلاق کے نتیجہ میں ختم ہو جاتی ہے تو اس خاتون کی حیثیت اپنے سابقہ شوہر کے بھائی کے لیے وہی ہے جو کسی بھی دوسری خاتون کی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا بھائی کی مطلقہ سے شادی کی جاسکتی ہے۔

بیوی کی بھانجی سے شادی

سوال: کیا ایک مسلمان اپنی بیوی کی بہن کی لڑکی سے شادی کرسکتا ہے جبکہ اس کی بیوی اور بیوی کی بہن، دونوں حیات ہوں؟

جواب: اس سوال کے جواب کا انحصار اس بات پر ہے کہ بیوی کی بھانجی سے شادی کے وقت پہلی شادی مؤثر ہے یا نہیں؟ اگر ایک شخص کا نکاح اپنی بیوی سے قائم ہے اور اس کے ساتھ وہ دوسری شادی بیوی کی بھانجی سے کرنا چاہتا ہے تو اس شادی کی اجازت نہیں ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ بیک وقت دو بہنوں سے شادی کرنا منع ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں ایک عورت اور اس کی ددھیالی یا ننھیالی رشتے کی چچی، خالہ یا ممانی کا اضافہ فرمایا ہے۔ اگر ایک شخص اپنی بیوی کی بھانجی سے شادی کرتا ہے تو اس کی نئی بیوی اور نئی بیوی کی خالہ ایک سطح پر آجائیں گی۔ اس کی ممانعت ہے۔

دوسری طرف اگر دوسری شادی اس وقت ہورہی ہے جب موت یا طلاق کے نتیجے میں پہلا نکاح منسوخ ہوچکا ہو، تب اس رشتے کی شادی درست ہوگی۔ ایک شخص دو ایسے قریبی رشتوں کی حامل عورتوں سے بیک وقت شادی نہیں کرسکتا۔

غیر اسلامی لباس پہننے والی عورت سے شادی

سوال: کیا ایسی خاتون سے شادی کی اجازت ہے جو گھر سے باہر جاتے وقت اسلامی لباس نہ پہنتی ہو۔ کیا ایسی خاتون سے شادی کرنے والا گناہ کا مرتکب ہوگا۔ کیا شادی کے بعد شوہر بیوی کو اسلامی لباس پہننے پر مجبور کر سکتا ہے؟

جواب: ایک خاتون عام لوگوں کے سامنے کس طرح کا لباس پہنتی ہے، اس بات کا شادی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نکاح متاثر نہیں ہوتا۔ شادی دو فریقوں کے درمیان ہونے والا ایسا معاہدہ ہے جو چند لوگوں کے سامنے ہوتا ہے اور ایک مرد اور ایک عورت کے تعلقات کو قانونی شکل دیتا ہے۔ اسلام میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو فریقین یا کسی ایک فریق کو پابند کرتی ہو کہ وہ کوئی معاہدہ کرتے وقت کسی خاص طرز کا لباس پہنے، نہ ہی یہ بات ضروری ہے کہ کسی معاہدے کا کوئی فریق اسلام کی مطلوبہ ضروریات سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

اگر ایک شخص کسی ایسی خاتون سے شادی کرتا ہے جو اسلامی لباس نہیں پہنتی تو مذکورہ شخص سے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ آپ کو علم ہوگا کہ ایک مسلمان مرد ایک عیسائی خاتون یا ایک یہودی خاتون سے شادی کر سکتا ہے۔ ان دونوں مذاہب کے پیرو اس اعتبار سے زیادہ سنگین گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں کہ وہ مسخ شدہ عقائد پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ایک مسلم خاتون کا گناہ کم درجہ کا ہے۔ اس کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ مسلم خواتین کے ایک طبقے کی اس بات کو نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ لباس کے معاملے میں اسلامی احکامات کی خلاف ورزی کرتی رہیں۔ لباس کی ضروریات کا حکم اللہ نے دیا ہے، اور ان کو نظر انداز کرنا خلاف ورزی اور نافرمانی کے زمرے میں آتا ہے۔ کسی مسلمان کو خواہ وہ عورت ہو یا مرد اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ علاوہ ازیں مسلم خاتون کے لیے یہ بات گناہ کے مترادف ہے کہ وہ عام لوگوں کے سامنے اس طرح آئے کہ اس کا چہرہ اور پہنچوں سے نیچے ہاتھ کے علاوہ باقی جسم اور سر ڈھکا ہوا نہ ہو۔

مسلمانوں میں یہ عام رجحان پایا جاتا ہے کہ اگر ایک شخص سے کوئی واضح گناہ سرزد ہو جائے تو اسے بالکل ہی برا سمجھ لیا جاتا ہے یہ نقطہ نظر صحیح نہیں ہے۔ مسلم معاشرے میں کسی فرد کے ساتھ قطع تعلقات اس وجہ سے نہیں کیا جا سکتا کہ اس شخص سے کوئی گناہ (صغیرہ یا کبیرہ) سرزد ہو گیا ہو۔ اگر کسی مسلم معاشرے میں ایسا کیا جاتا ہے تو یہ اس اسلامی قانون کی خلاف ورزی ہے کہ ''جو درست ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور جو غلط ہے اس سے رکا جائے۔'' ضرورت اس بات کی ہے کہ

لوگوں کو اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی زیادہ سے زیادہ تلقین کی جائے۔ اگر ہر گناہ گار شخص سے قطع تعلق کر لیا گیا تو آپ انہیں نیکی کی طرف راغب کس طرح کر سکیں گے؟

آپ نے دریافت کیا ہے کہ کیا ایک شوہر کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اسلامی لباس پہننے پر مجبور کرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام جبر کو قبول نہیں کرتا۔ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق لوگوں کو اچھے اور نیک کام کی ترغیب دینی چاہیے۔ ان کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔ شائستہ انداز میں مشورہ دینا چاہیے، تاکہ کوئی شخص پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ برضا و رغبت وہ کام انجام دے۔ بعض اوقات کسی کو کسی کام پر مجبور کرنے کا نتیجہ منفی ردعمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی ایسی خاتون کو اسلامی لباس پہننے پر مجبور کریں گے، جو نوعمری کے دور سے ہی غیر اسلامی لباس پہنتی رہی ہے تو اس کا نتیجہ کھلم کھلا نافرمانی اور حکم عدولی کی صورت میں بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔ آپ کا جبر ان کے لیے قابل نفرت ہو جائے گا اور وہ سمجھیں گی کہ انہیں پابندی کی بیڑیاں پہنائی جا رہی ہیں۔ وہ یہ سمجھنے لگیں گی کہ ان کی آزادی صرف اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہے جب وہ غیر اسلامی لباس استعمال کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ناپسندیدہ صورتحال ہوگی کیونکہ اس طریقے سے کسی خاتون کو یہ یقین دلانا ناممکن ہوگا کہ وہ جس مذہب پر یقین رکھتی ہیں اس کا تقاضا ہے کہ لباس ایک خاص طریقے سے پہنا جائے۔ ایک ایسے شوہر کو جس کی بیوی لباس کے معاملے میں، دین کے بجائے اپنی پسند کو ترجیح دیتی ہو، وقتاً فوقتاً نرم لہجے میں مناسب موقع پر مشورہ دینا چاہیے کہ ان کے لیے کون سا لباس مناسب ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی کہ ''اپنی بیوی کو عبادت کرنے کا حکم دو اور اس کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ'' اگر یہ طریقہ عبادات کے معاملے میں موثر ہے جو ایک مسلمان کے لیے فرض ہے، تو پھر اسے ہر اسلامی حکم کی اطاعت و ادائیگی میں بھی مؤثر ہونا چاہیے۔ ایک دوسرے کو دوستانہ مشورہ دے کر اور ایک دوسرے کے معاملات میں شریک ہو کر تلقین کے زیادہ بہتر نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

نکاح کے لیے نومسلم کا ولی کون ہوگا؟

سوال: ایک غیر مسلم لڑکی نے اسلام قبول کر لیا ہے اور وہ اب شادی کرنا چاہتی ہے۔ لیکن چونکہ اس کے والدین اور گھر کے دیگر افراد غیر مسلم ہیں، اس لیے اسے شادی کے لیے سرپرست میسر نہیں ہے۔ اس صورت حال میں کیا قاضی، لڑکی کا سرپرست بن سکتا ہے۔ اگر اس بات کی اجازت ہے تو کیا قاضی کسی ایسی مسلمان خاندان کی لڑکی کا بھی سرپرست بن سکتا ہے، جس کے گھر والے اسے شادی کی اجازت دینے پر اس لیے تیار نہ ہوں کہ وہ جس مرد سے شادی کرنا چاہتی ہے وہ انہیں

قبول نہیں ہے؟

جواب: اگر نکاح کی کارروائی انجام دینے والا شخص سرکاری ملازم ہے اور اس کے فرائض میں نکاح کرانا شامل ہے تو وہ شخص (قاضی) کسی بھی ایسی لڑکی کا سرپرست بن سکتا ہے جس کا کوئی سرپرست نہ ہو۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ لڑکی اس شخص سے اپنا سرپرست بننے کے لیے کہے۔ اصول یہ ہے کہ مسلمان حکمران اپنی مملکت کے ہر اس شخص کا سرپرست (ولی) ہوتا ہے، جس کا کوئی ولی نہ ہو۔ اوپر بیان کی گئی صورت حال میں نکاح کرانے والا (قاضی یا رجسٹرار) اس خاص کام کے لیے حکمران کا نائب سمجھا جائے گا۔ آپ نے جو مسئلہ پیش کیا ہے اس میں رجسٹرار کو یہ یقین کر لینا چاہیے کہ لڑکی کے والدین/ سرپرست غیر مسلم ہیں کیونکہ کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کا سرپرست یا ولی نہیں ہوسکتا۔

مسلمان گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی کے معاملے میں صورتحال قدرے مختلف ہوگی۔ اس صورت میں رجسٹرار کو یہ یقین کرنا ہوگا کہ لڑکی کو شادی کے حق سے محروم رکھا جارہا ہے۔ اگر لڑکی کے خاندان والوں کے پاس شادی سے روکنے کی معقول وجوہ موجود ہیں تو اس صورت میں رجسٹرار لڑکی کا ولی نہیں بن سکتا۔ اس طرح کی صورت حال میں یہ معاملہ کسی اسلامی عدالت کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔

غلط نام سے نکاح

سوال: نکاح کے وقت نکاح نامے میں اصل نام کے بجائے میری عرفیت درج کر دی گئی کیونکہ جو صاحب میری جانب سے وکیل بنے تھے انہیں میری عرفیت ہی بتائی گئی تھی۔ لوگوں کی اکثریت مجھے میرے عرفی نام سے پہچانتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بیشتر لوگوں کو میرے اصل نام کا علم ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب میری ایک دوست نے شادی کے وقت میری عرفیت بتائی تو میں نے اس وقت اس کی تصحیح ضروری نہیں سمجھی۔ ازراہ کرم بتایئے کہ کیا میرا نکاح مؤثر ہے؟

جواب: چونکہ آپ کی عرفیت کے نام سے لوگوں کی اکثریت آپ کو جانتی ہے اس لیے یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ عرفی نام آپ کا اضافی نام ہے اس بنیاد پر آپ کا نکاح درست بھی ہے اور مؤثر بھی، تاہم ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے آپ کو اپنے ملک میں قانونی معاملات میں مسائل کا سامنا کرنا پڑے۔ خاص طور پر وراثت کے کسی معاملے میں۔ اس لیے آپ کو یہی مشورہ دیا جاسکتا ہے کہ آپ

نکاح نامے میں اپنا درست نام درج کرائیں اور اس کے لیے اپنے ملک کے مروجہ طریقے پر عمل کریں۔ یہ کام جس قدر جلد کرالیا جائے اتنا ہی بہتر ہے کیونکہ نہ جانے کس وقت کس نوعیت کا مسئلہ پیدا ہو جائے۔

شوہر کے بھائی کی جانب سے دی گئی طلاق کی حیثیت

سوال: کئی برس قبل جب میرے بھائی کی شادی ہوئی تو اس وقت میرے والد اور میرے نانا نے آپس میں صلاح مشورے سے یہ رشتہ طے کیا تھا۔ جب نکاح کا موقع آیا تب بھی انہیں دونوں حضرات (والد اور نانا) نے دولہا اور دلہن کی جانب سے عمل کیا۔ چند برس بعد میرے بھائی اور ان کی بیوی کے درمیان کسی غلط فہمی کی وجہ سے اختلافات ہو گئے اور لڑکی کے گھر والوں نے طلاق کا مطالبہ شروع کر دیا۔ میرے بھائی اس وقت بیرون ملک ملازمت کر رہے تھے۔ ان اختلافات کو دور کرنے اور معاملات کو سلجھانے کے لیے وہ چھٹی لے کر گھر آئے اور معاملات درست کرنے کی کوشش کی، لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ چھٹی ختم ہونے پر وطن سے واپس جاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا ''اگر وہ لوگ طلاق پر اصرار کریں تو میری جانب سے تم طلاق دے دینا۔'' بھائی کی واپسی کے کچھ عرصہ بعد لڑکی کے گھر والوں نے ایک عائلی عدالت میں خلع کا مقدمہ داخل کر دیا اور دونوں خاندانوں کے درمیان تعلقات کی صورت حال اس قدر سنگین ہو گئی کہ یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ معاملات قابو سے باہر ہو جائیں گے اور کسی کو نقصان پہنچے گا۔ چونکہ میرے بھائی ملک سے باہر تھے اور طلاق کے کاغذات دستخط کے لیے بذریعہ ڈاک انہیں بھیجنے اور ان کی واپسی میں خاصا وقت لگنے کا یقین تھا، اس لیے والد نے مجھ سے کہا کہ خاندان کی بھلائی اور سکون کے لیے تم اپنے بھائی کی جانب سے طلاق کے کاغذات پر دستخط کر دو۔ میں نے ان کے کہنے پر عمل کیا۔

طلاق کے بعد اس لڑکی کی شادی کہیں اور ہو گئی اور اب اس کے کئی بچے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اسلام کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ ہوتا گیا اور مجھے اس پورے معاملے کے متعلق تشویش ہونے لگی۔ کیا وہ طلاق درست تھی؟ کیا طلاق کے کاغذات پر میرا دستخط کرنا صحیح عمل تھا؟ شاید میں نے اسلامی احکام سے لاعلمی کے نتیجہ میں ایسا کیا لیکن میرا مقصد دو خاندانوں کے درمیان معاملات کو سلجھانا تھا۔ میرے والد ان حالات میں خاصے پریشان تھے۔ علاوہ ازیں میرے بھائی نے مجھے یہ اجازت دی تھی کہ اگر مسئلہ کسی طرح حل نہ ہو تو میں ان کی جانب سے طلاق دے سکتا ہوں۔ از راہ کرم اس مسئلے پر روشنی ڈالیے۔

جواب: آپ کے سوال کے کئی پہلو ہیں۔ غالباً پہلے مرحلے میں آپ اس شادی کے مؤثر ہونے کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں جس میں دولہا اور دلہن کی جانب سے ان کے والدین نے نکاح کا معاہدہ کیا۔ شادی کے معاملے میں لڑکی کی جانب سے اس کے والدین یا سرپرست ہی کو نکاح کا معاہدہ کرنا ہوتا ہے اور یہی صحیح اسلامی طریقہ ہے۔ جہاں تک آپ کے بھائی کی شادی کا تعلق ہے، اگر ان کے نکاح میں آپ کے والد نے آپ کے بھائی کی رضامندی حاصل کر کے ان کی جانب سے نکاح کا معاہدہ کیا تو یہ قطعی درست ہے۔ آپ کے سوال سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شادی بخیر وخوبی انجام پائی تھی، کسی نے بھی اس کے مؤثر ہونے کے بارے میں سوال نہیں اٹھایا تھا اور میاں بیوی، شادی کے بعد ایک خاندان کی طرح رہے۔ اس صورتحال میں اگر والد نے آپ کے بھائی سے ان کی پیشگی رضامندی حاصل نہ بھی کی ہوتی تب بھی یہ ثابت ہوتا کہ آپ کے بھائی نے اس شادی کو قبول کرلیا تھا۔ چنانچہ یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ شادی بالکل درست تھی۔

آیئے اب طلاق کے معاملے کا جائزہ لیں کہ یہ کس طرح انجام پایا۔ آپ نے اس حوالے سے دو نکات اٹھائے ہیں۔ ایک یہ کہ اپنی روانگی سے پہلے آپ کے بھائی نے آپ سے کیا کہا اور دوسرے یہ کہ دونوں خاندانوں کے درمیان کشیدگی کی بڑھتی ہوئی صورتحال، جس نے آپ کو عمل پر اکسایا۔ یہ دونوں علیحدہ معاملے ہیں۔ ہم دوسرے نکتے کا پہلے جائزہ لیتے ہیں:

دونوں خاندانوں کے درمیان اس حد تک بڑھتی ہوئی کشیدگی اور تناؤ کہ لڑائی جھگڑے کی نوبت آجائے اور کسی کے زخمی ہوجانے کا اندیشہ ہوجائے، آپ کو یا کسی اور کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ آپ اپنے بھائی کی بیوی کو طلاق دے دیں۔ طلاق صرف شوہر کا حق ہے اور جب تک وہ خود یہ حق استعمال نہ کرے یا کسی اور کو اس کے استعمال کا حق نہ دے، بیوی کو کسی صورت طلاق نہیں ہوسکتی۔ دوسری طرف بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے شوہر سے خلع حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کرے۔ اس صورت میں اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ خلع حاصل کرنے کے لیے ضروری وجوہات موجود ہیں۔ تاہم اس معاملے کا فیصلہ اعلیٰ اختیارات کا حامل منصف کرے گا جو حکمران یا قاضی ہوسکتا ہے۔ خلع کا معاملہ کسی عائلی عدالت یا خاندان کے بزرگوں کے درمیان طے نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں تک کہ شوہر کے والد کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی بہو کو بیٹے کی جانب سے طلاق دے سکے، الا یہ کہ بیٹے نے باپ کو یہ اختیار دیا ہو۔ اس بحث سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ طلاق صرف شوہر کا حق ہے اور وہی اسے استعمال کرسکتا ہے۔

آپ کا کہنا ہے کہ آپ کے بھائی نے روانگی سے پہلے آپ کو ہدایت کی تھی کہ ان کی بیوی کے والدین اگر طلاق پر اصرار کریں تو آپ اپنے بھائی کی جانب سے طلاق دے دیں۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ آپ کے بھائی نے اس خاص معاملے میں آپ کو یہ مختار نامہ (پاور آف اٹارنی) دیا تھا کہ آپ بوقت ضرورت اپنے بھائی کی جانب سے عمل کر سکیں۔ یہ طریقہ بالکل درست ہے کہ ایک شخص کسی خاص معاملے میں اپنی جانب سے ایک دوسرے شخص کو عمل کرنے کا اختیار دے دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بنت ابوسفیان سے شادی کا ارادہ کیا تو اس وقت حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا حبشہ میں تھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی کو حبشہ کے حکمراں کے پاس بھیجا، جنہوں نے ایک پیغامبر کے ذریعہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتے سے آگاہ کیا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے حبشہ کے حکمراں نے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مذکورہ صحابی (رضی اللہ عنہ) نے نکاح کا معاہدہ کیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابی کو اس خاص معاملے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے عمل کا اختیار دیا تھا۔

اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کسی خاص معاملے میں کسی دوسرے شخص کو اپنا مختار بنا سکتا ہے۔ اسی بنیاد پر آپ کے بھائی نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کے معاملے میں آپ کو مختار بنایا تھا اور چونکہ آپ نے ان کی جانب سے یہ اختیار استعمال کیا، اس لیے ثابت ہوا کہ آپ نے اپنے بھائی کا مختار بننا اور وقت ضرورت ان کی جانب سے عمل کرنے کا فیصلہ قبول کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں اس کی تصدیق آپ کے والد کے رویے سے بھی ہوتی ہے جو طلاق کے کاغذات دستخط کے لیے آپ کے پاس لائے۔ گویا آپ کے والد اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ آپ کے بھائی نے آپ کو طلاق کے معاملے میں مختار بنایا ہوا ہے۔ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ جب آپ کے بھائی نے طلاق کے سلسلے میں گفتگو کی تو وہ آپ سے مخاطب تھے اور چونکہ آپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا اس لیے یہ معاملے طے پا گیا کہ جب ضرورت ہوئی آپ اپنے بھائی کا حق استعمال کریں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے بھائی گفتگو کے وقت صرف آپ سے مخاطب نہ ہوں بلکہ والد سے بھی مخاطب ہوں۔ اس صورت میں ان کا مطلب یہ ہوگا کہ وقت ضرورت آپ دونوں میں سے کوئی بھی ان کی جانب سے عمل کر سکتا ہے۔ یہ طریقہ بھی بالکل درست ہے کہ ایک شخص کسی ایک معاملے میں دو یا دو سے زائد اشخاص کو اپنا مختار مقرر کرے۔ دوسری طرف اس کا یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ آپ کے بھائی آپ دونوں سے یہ چاہتے ہوں کہ بوقت ضرورت آپ دونوں (والد اور آپ) مشترکہ طور پر ان کی جانب سے عمل کریں۔ لیکن آپ کے خط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب آپ نے ان کی جانب سے طلاق دیدی تو انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا، اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے آپ کے عمل کی توثیق کی۔

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو کچھ آپ نے کیا وہ بالکل درست ہے اور آپ کو کسی اندیشے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ طلاق دیتے وقت آپ وہ اختیار استعمال کر رہے تھے جو آپ کے بھائی نے آپ کو دیا تھا اور اس فعل پر آپ کے بھائی نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے بھائی کی مرضی کے مطابق کام کیا جو اسلامی طریقے کے مطابق بھی بالکل درست ہے۔ طلاق واقع ہو چکی ہے اور بالکل مؤثر ہے آپ کو اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ناجائز اولاد سے شادی درست ہوگی؟

سوال: میری ایک عزیزہ نے جو مسلمان ہیں، بہت عرصے پہلے ایک ہندو مرد سے سول میرج کر لی تھی۔ شادی کے بعد خاتون بدستور اپنے اسلامی فرائض اور عبادات انجام دیتی رہیں۔ مرد نے ابتداء میں اسلام میں دلچسپی ظاہر کی، لیکن ہماری معلومات کے مطابق اس نے اسلام قبول نہیں کیا۔ ان دونوں کے بچے اب جوان ہیں۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوش اخلاق اور خوش اطوار ہیں اور خود کو مسلمان کہتے ہیں۔ ان میں سے سب سے چھوٹا انجینئر ہے اور اس نے میری بہن کے لیے رشتہ تجویز کیا ہے۔ میرے والدین اس رشتے کے خلاف ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہ لڑکا ناجائز اولاد ہے، کیونکہ اس کے والدین کی شادی کو اسلام قبول نہیں کرتا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس لڑکے کا رشتہ لڑکی کی حیثیت کے مطابق نہیں ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر تمام مسلمان خاندان اس لڑکے کے رشتہ کو انہی بنیادوں پر مسترد کرتے رہیں گے تو اس کے لیے ایک اچھا مسلمان بننا کیسے ممکن ہوگا۔ براہ کرم اس صورتحال کے بارے میں وضاحت فرمایئے؟

جواب: آپ کی دلیل بالکل درست ہے۔ مسلم علماء جب شادی کے لیے برابر کی حیثیت کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ قطعی نہیں ہوتا کہ یہ شادی کے جائز ہونے کے لیے کوئی پیشگی شرط ہے۔ لڑکی اور لڑکے اور ان کے خاندانوں کا مساوی سماجی حیثیت کا ایک ہونا ایک اچھی بات ہے، لیکن یہ فرض نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلمانوں کے درمیان بیشتر شادیاں، شوہر و بیوی کے خاندانوں کے درمیان سماجی تفاوت کی وجہ سے انجام ہی نہیں پا سکتی تھیں۔ برابر کی سماجی حیثیت ایک ایسا پہلو ہے جسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ ایک شخص کی غلطی کا ذمہ دار دوسرے شخص کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اگر والدین سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے تو اس کے لیے اولاد کو قصوروار ٹھہرانا درست نہیں

ہے۔ ایک شخص کی پیدائش کو ناجائز کہا جاسکتا ہے، لیکن اگر اس شخص نے اسلام کے بارے میں سیکھا ہے اور وہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرتا ہے تو وہ شخص ایک اچھا مسلمان ہوسکتا ہے۔ کسی شخص کی حیثیت کا تعین کرنے کے لیے پہلی بات یہ دیکھی جاتی ہے کہ وہ کتنا اچھا مسلمان ہے۔ لہٰذا اس شریف آدمی کی پیدائش کا معاملہ جس نے آپ کی ہمشیرہ کے لیے رشتہ تجویز کیا ہے، اس کے خلاف نہیں لیا جاسکتا۔ یہ بات درست ہے کہ اس کے والدین کی شادی اس وقت تک جائز قرار نہیں پاتی جب تک اس کے والد حقیقتاً اور عملاً یہ اعلان نہ کردیں کہ وہ شادی کے وقت یا اس سے پہلے مسلمان تھے۔ جس لڑکے نے رشتہ تجویز کیا ہے، آپ کے کہنے کے مطابق وہ مسلمان ہے، چنانچہ اس رشتے کو اسی بنیاد پر پرکھنا چاہیے۔ اگر انہوں نے اسلام کو اپنی رضا و رغبت سے قبول کیا ہے تو یقیناً وہ اعلیٰ اقدار کے حامل مسلمان ہیں اور یقیناً انہیں یہ موقع دینا چاہیے کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق اپنی خاندانی زندگی گزار سکیں۔ اگر ان کا کردار تسلی بخش ہے اور ان کا ایمان مستحکم ہے تو انہیں قبول کرلینا چاہیے۔ ہمیں اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ حدیث فراموش نہیں کرنی چاہیے جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کے لیے آنے والے رشتوں کو ایمان کی بنیاد پر پرکھیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ اگر ایک دیانتدار اور قابل قبول حیثیت کے ایمان کے حامل شخص کا رشتہ شادی کے لیے آئے تو اسے قبول کرلو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو تمہارا انکار (معاشرے کو) بے حیائی کی طرف لے جائے گا۔ اس حدیث کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ شادی کے لیے آنے والے رشتوں کا جائزہ متعلقہ شخص کے کردار کو سامنے رکھ کر کیا جانا چاہیے نہ کہ اس کی پیدائش کو۔

طلاق کا صحیح طریقہ اور سابقہ شوہر کی ذمہ داریاں

سوال: میں نے طلاق کے مسئلے پر سوالات اور ان کے جوابات پڑھے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اب تک طلاق کا صحیح طریقہ مجھ پر واضح نہیں ہوسکا ہے۔ براہ کرم وضاحت فرمایے کہ اگر ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے تو کس طرح دے سکتا ہے اور اس سلسلہ میں اسے کن امور کا خیال رکھنا ہوگا۔ مزید یہ کہ طلاق کا عمل کب تکمیل کو پہنچتا ہے۔ علاوہ ازیں اس پہلو پر بھی روشنی ڈالیے کہ طلاق کے بعد سابقہ شوہر پر مطلقہ بیوی کی جانب کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟

جواب: شادی، مرد اور عورت کے درمیان زبانی معاہدہ ہے اس لیے اس کا خاتمہ بھی زبانی ہوتا ہے۔ جب ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے تو پہلے اسے اس بات کا یقین کرلینا چاہیے کہ اس کی

بیوی مخصوص ایام سے نہیں گزر رہی ہے اور گزشتہ ایام سے پاکیزگی حاصل کرنے کے بعد شوہر اور بیوی کے درمیان مباشرت نہیں ہوئی ہے۔ اگر بیوی مخصوص ایام سے ہو یا دونوں مباشرت کر چکے ہیں تو اس موقع پر طلاق دینے کی ممانعت ہے۔ اس صورت میں دونوں کو انتظار کرنا ہوگا کہ عورت مخصوص ایام کے بعد پاکیزگی حاصل کر لے یا اگلے مخصوص ایام سے گزر جائے۔

طلاق کا عمل ان سادہ الفاظ سے شروع ہو جاتا ہے کہ ''میں نے تمہیں طلاق دی'' یا ''میں نے کو طلاق دی'' (خالی جگہ میں بیوی کا نام آئے گا)۔ یہ الفاظ صرف ایک بار کہنے چاہئیں۔ یہ عمل تحریری بھی کیا جا سکتا ہے اور بذریعہ ڈاک بھیجا جا سکتا ہے۔ اس وقت کے بعد سے عورت کی عدت شروع ہو جاتی ہے جو اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک وہ تین مرتبہ مخصوص ایام سے نہ گزر جائے یا مخصوص ایام کے بعد تین مرتبہ پاکیزگی حاصل نہ کر لے۔ اگر کبرنی (ضعیفی) یا صغرنی (کم عمری) کی وجہ سے عورت کو مخصوص ایام نہ ہوتے ہوں تو اس کے لیے عدت کی مدت تین ماہ ہوتی ہے۔ اگر عورت حاملہ ہے تو اس کے لیے عدت کا عرصہ بچے کی ولادت تک ہوگا۔ اس پورے عرصے (عدت) میں عورت اپنے شوہر کے گھر پر ہی رہے گی۔ شوہر اسے گھر سے نہیں نکال سکتا۔ عورت کے تمام اخراجات شوہر کی ذمہ داری ہوتے ہیں لیکن وہ دونوں (مطلقہ اور اس کا سابقہ شوہر) ایک بستر پر نہیں سو سکتے۔ عدت کے عرصے میں عورت اس بات کی ذمہ دار نہیں ہے کہ وہ گھر کے کام کرے۔

یہ عدت یا زمانہ انتظار دراصل عورت اور مرد دونوں کو اپنے معاملات پر غور کرنے اور صورتحال کا از سرِ نو جائزہ لینے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اگر اس عرصے میں دونوں اس بات پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ اپنی ازدواجی زندگی کو بحال کر لیں، تو عدت کے دوران میں وہ شوہر اور بیوی کے رشتے کی تجدید کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے کسی نئے نکاح کی ضرورت نہیں ہوگی اور نہ ہی شوہر کو از سرِ نو مہر ادا کرنا ہوگا۔

اگر عدت کے دوران میں مطلقہ عورت اور مرد نے اپنے رشتے کی تجدید نہیں کی تو طلاق کا عمل مکمل ہو جائے گا۔ اس صورت میں عورت اپنے والدین کے گھر چلی جائے گی اور اگر اس کے مہر کا کوئی حصہ سابقہ شوہر پر واجب الادا ہے تو وہ اس کی حقدار ہوگی۔ تاہم سابقہ شوہر اس کے نان نفقہ کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔ اگر عورت کے ساتھ چھوٹے بچے ہیں تو ان بچوں کے اخراجات سابقہ شوہر کو ادا کرنے ہوں گے۔ دونوں اپنے بچوں سے معمول کے تعلقات رکھ سکتے ہیں۔

اگر عدت کا عرصہ گزرنے کے بعد عورت اور مرد اپنے ازدواجی رشتے کی تجدید کرنا چاہیں تو انہیں اس کی اجازت ہے لیکن اب انہیں نئے سرے سے نکاح کرنا ہوگا اور شوہر کو نیا مہر ادا کرنا ہوگا۔ یہ پورا عمل دو مرتبہ دہرایا جا سکتا ہے۔ اگر مرد اور عورت اس عمل سے تیسری بار بھی گزر گئے،

خواہ اس دوران وہ عدت کے دوران میں تجدید تعلق کر چکے ہوں یا عدت کے بعد رشتے کی تجدید کی ہو، تو اب وہ ایک دوسرے سے دوبارہ ازدواجی تعلق نہیں رکھ سکتے، سوائے اس کے کہ مطلقہ عورت کی شادی بالکل عام حالات میں کسی دوسرے شخص سے ہو اور اگر اس دوسرے شوہر سے اس کو طلاق ہو جائے (یا دوسرے شوہر کا انتقال ہو جائے) تو اب سابقہ شوہر سے نئے سرے سے نکاح ممکن ہے۔ یہاں یہ بات نہایت اہم ہے کہ پہلے شوہر سے حتمی طلاق (طلاق کا عمل تین مرتبہ مکمل ہونے) کے بعد اگر عورت کے لیے کسی اور شخص کا نیا رشتہ آتا ہے اور عورت اسے قبول کرتی ہے تو یہ شادی مستقل ارادے کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اگر دوسری شادی کے ایک سال یا دس سال یا اس سے کم یا زیادہ مدت کے بعد اسے دوسرے شوہر سے طلاق ہو جاتی ہے، تو اس طلاق کی عدت کا عرصہ گزرنے کے بعد اگر وہ اور اس کا سابقہ شوہر اپنے سابقہ رشتہ ازدواج کی تجدید کرنا چاہیں اور یہ سمجھیں کہ اب ان کی شادی کامیاب رہے گی، تو وہ از سر نو نکاح کر سکتے ہیں۔

جس بات کو میں واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پہلے شوہر سے حتمی طلاق کے بعد مطلقہ عورت کی کسی دوسرے شخص سے شادی اس نیت سے نہیں ہونی چاہیے کہ ایک شرعی ضرورت پوری کرنی ہے، جیسا کہ اکثر حضرات کرتے ہیں۔ اگر کسی دوسرے شخص سے مطلقہ عورت کی شادی اس ارادے سے کی جا رہی ہو کہ حلالہ کے بعد طلاق حاصل کر کے پہلے شوہر سے شادی کر لی جائے اور اس دوسرے شخص کی حیثیت محض کرائے کے شوہر کی ہو تو اس کارروائی میں ملوث ہر ایک شخص ایک سنگین گناہ کا مرتکب ہوگا۔ علاوہ ازیں اس تمام معاملے کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ بہ الفاظ دیگر حلالہ کے لیے اس دوسری شادی کے بعد عورت اپنے پہلے شوہر سے تجدید تعلق نہیں کر سکتی۔

ازدواجی حقوق کی ادائیگی سے انکار

سوال: براہ کرم اس بات کی وضاحت فرمائیں کہ اگر شوہر یا بیوی میں سے کوئی ایک اپنے ازدواجی حقوق ادا کرنے سے انکار کر دے جس کی کوئی معقول وجہ موجود نہ ہو تو دوسرے کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: انسان میں اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا تقاضا فطری ضرورت ہے۔ اسے پورا کرنے کے لیے اسلام کے نزدیک واحد جائز راستہ ''شادی'' ہے۔ اس تقاضے کو پورا کرنے کے جتنے دیگر طریقے ہیں وہ سب ناقابل قبول ہیں۔ اس نظریے کی بنیاد اسلام کا وہ سنجیدہ نقطہ نظر ہے جو وہ اخلاقیات، خاندان اور فرد و معاشرہ کے حقوق اور ذمے داریوں کے بارے میں اختیار کرتا ہے۔

انسان کی جبلت اور اس کی فطری خواہشات کے سلسلے میں اسلام کا رویہ بے حد عملی ہے۔

اسلام خواہشات کو کچلنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا نہ ہی وہ زبردستی کسی چیز کا جواز پیدا کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ وہ زوجین کے درمیان ایک خوشگوار توازن قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انسان کی فطری خواہشات کی تکمیل اس انداز میں کرتا ہے کہ اس سے بقائے نوعِ انسانی کا اہم مقصد پورا ہو سکے۔ وہ جنسی پہلو کو اجاگر کرنے والے کسی ایسے راستے کو اپنانے کی اجازت نہیں دیتا جو انسان کے لیے سودمند نہ ہو۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک میاں اور بیوی دونوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک دوسرے کی فطری خواہشات کی جائز طریقے سے تکمیل کریں۔ کئی احادیث میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ کسی عورت کو معقول وجہ کے بغیر اپنے شوہر کو اس سے اپنی خواہش پوری کرنے سے روکنا نہیں چاہیے۔ اسی طرح کوئی شخص لمبے عرصے کے لیے اپنی بیوی کو ہاتھ نہ لگانے کی قسم نہیں کھا سکتا۔ قرآن پاک کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص چار ماہ سے زائد عرصہ کے لیے اس طرح کی قسم کھالے تو اس کے سامنے دو راستے ہیں یا تو وہ اپنا رویہ تبدیل کرے اور اپنی بیوی سے ازدواجی تعلق قائم کر لے یا پھر اسے طلاق دے دے۔ کسی شخص اور اس کی بیوی کے درمیان معمول کے تعلقات قائم ہو جانے کے لیے چار ماہ کا عرصہ کافی سمجھا گیا ہے۔ اگر اس عرصے کے بعد بھی وہ شخص اپنی بیوی سے علیحدہ رہتا ہے تو وہ اپنی بیوی کو (خلع لے کر) کسی اور سے شادی کرنے سے نہیں روک سکتا۔ دوسری جانب کوئی شخص چند مخصوص ایام چھوڑ کر اپنی بیوی سے کسی وقت کے بغیر ازدواجی تعلق قائم کر سکتا ہے۔ ان ایام کے سوا بقیہ دنوں میں زوجین کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک دوسرے کی فطری خواہشات کی تکمیل کریں۔

اسلام ایسے سخت ضابطے نہیں پیش کرتا جن میں بتایا گیا ہو کہ زوجین کو یہ ذمہ داری کس انداز میں پوری کرنا چاہیے۔ وہ سیدھے سادھے طریقے پر زوجین کے درمیان ایسا تعلق استوار کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس کی بنیاد باہمی محبت اور افہام و تفہیم پر ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس تعلق کو حکمت اور نرمی سے قائم کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ نرمی کے ساتھ گفتگو اور محبت کا اظہار بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ جنسی تقاضے کا احساسات اور جذبات سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ زوجین میں سے ہر ایک کو مکمل تسکین کے لیے دوسرے کی توجہ اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص ایسا نرم رویہ اپنائے گا تو وہ اپنی بیوی کو بالعموم تعاون پر راضی پائے گا۔ اگر وہ کسی معقول وجہ کے بغیر اپنے شوہر کے ساتھ تعاون نہیں کرتی تو شوہر کو اس جائز مقصد کے حصول کا پورا پورا حق ہے۔ اگر یہ صورتحال طویل عرصہ تک برقرار رہے اور زوجین کے درمیان تعلقات ناخوشگوار ہو جائیں جس کے اثرات پورے خاندان پر پڑنے لگیں، تو شوہر کو چاہیے کہ وہ اس

صورتحال کے حقیقی اسباب جاننے کی کوشش کرے۔ بیوی کی جانب سے اس قسم کا رویہ کسی گمبھیر مسئلے کے باعث ہوسکتا ہے جسے سلجھانا چاہیے۔ کسی قابل بھروسہ شخصیت سے صلاح مشورہ بے حد مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بیوی کی جانب سے ہونے والا انکار حقیقی نہ ہو۔ ایک عورت بظاہر آمادہ نہ ہو لیکن دراصل وہ اپنے شوہر سے دل سے محبت رکھتی ہو اور اس کا اظہار نہ کرپاتی ہو۔

خاندانی منصوبہ بندی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے؟

سوال: یہ بات کہاں تک درست ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی، اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے؟

جواب: ایک حدیث سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ چند صحابہ کرام رضی اللہ اجمعین نے مباشرت کے عمل کے دوران عزل کے طریقے (جنسی عمل کو انزال سے پہلے ختم کردینا) کو اختیار کرنے کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس طریقہ سے آگاہ تھے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہؓ کو اس سے منع نہیں فرمایا اور نہ ہی اس کی مخالفت کے بارے میں کوئی حکم جاری فرمایا۔ بعض صحابہ کرامؓ کے مطابق یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب قرآن مجید مکمل نہیں ہوا تھا اور وحی کا نزول جاری تھا۔ علاوہ ازیں ہمیں قرآن مجید میں اس بارے میں نہ تو کوئی بات اس کے خلاف ملتی ہے اور نہ کہیں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طریقہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ حمل کو روکنے یا اسے مؤخر کرنے کے بارے میں ان کی (صحابہؓ کی) کوئی بھی تدبیر رضائے الٰہی کو تبدیل نہیں کرسکتی۔ اگر اللہ کی رضا یہ ہے کہ فلاں جوڑے کے یہاں بچے کی ولادت ہو تو کوئی طریقہ اور کوئی طاقت اس امر میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

اوپر جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی بنیاد پر مسلم علماء یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حمل کو روکنے یا مؤخر کرنے کے لیے مانع حمل طریقوں سے رجوع کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ان سے زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ اگر کسی مانع حمل طریقے سے ماں کی زندگی خطرے میں پڑنے کا اندیشہ ہو تو اس کی ممانعت ہے کیونکہ اس میں انسانی جان تلف ہوجانے کا خدشہ ہوگا۔ باالفاظ دیگر مانع حمل طریقے یا طریقوں کے اختیار کرنے کے بارے میں جس بات کی ممانعت ہے وہ یہ ہے کہ انسانی جان کو خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہیے۔

یہاں میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ انفرادی طور پر مانع حمل طریقوں کا استعمال اس چیز سے قطعی مختلف ہے کہ کوئی حکومت آبادی میں کمی کرنے کے لیے اسے بطور پالیسی اختیار کرے۔

چین کی مثال لیجیے جہاں حکومت کی جانب سے ہر خاندان پر یہ پابندی ہے کہ وہ صرف ایک بچہ پیدا کر سکتا ہے۔ یہ طریقہ اسلامی نقطہ نظر کے قطعی خلاف ہے۔ اس بات کی بھی اجازت نہیں ہے کہ حکومت کسی پابندی اور اس پابندی پر سختی سے عمل درآمد کے ذریعہ قوم کی آبادی کو کم کرنے کی کوشش کرے۔ افراد قوم کی صحت پر ایسے اقدامات کے بہت سے اثرات ہو سکتے ہیں۔ اگر حکومت کی یہ کوشش ہو کہ عوام میں اس بات کا شعور اور آگہی پیدا ہو کہ متوقع ماں کی زندگی اور صحت کی حفاظت کے لیے بچوں کی پیدائش میں زیادہ وقفہ ہونا چاہیے، تب اس امر کی، یعنی بچے کی پیدائش مؤخر کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ یہ طریقہ ان ممالک کے لیے خاص طور پر ضروری ہے جہاں وضع حمل کے دوران خواتین کی اموات کی شرح زیادہ ہے۔

بیرون ملک روزگار کی وجہ سے بیوی سے طویل علیحدگی

سوال: روزگار کی وجہ سے میرا قیام سعودی عرب میں ہے اور میں طویل عرصہ تک اپنے خاندان سے علیحدہ رہنے پر مجبور ہوں۔ ایک مقتدر صاحب علم نے مجھے بتایا کہ ایسا کرنا میرے لیے جائز نہیں ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں گا اگر آپ اسلامی احکامات کی روشنی میں اس مسئلے کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: اسلام کے مطابق شادی ایک دوطرفہ معاہدہ ہے جو ہر ایک فریق کو دوسرے کے لیے چند فرائض کی ادائیگی کا پابند کرتا ہے۔ اس رشتہ ازدواج میں عورت کا یہ حق ہے کہ شوہر اس کی ضروریات کا خیال رکھے اور اسے تحفظ فراہم کرے۔ دونوں پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ ہر مشکل میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ پاکیزہ زندگی بسر کرنے میں ایک دوسرے کا خیال رکھیں اور ہر قسم کے ناشائستہ اور غیر اخلاقی امور سے اجتناب برتیں۔ شادی کے بعد عام طور پر یہی توقع کی جاتی ہے کہ شوہر اور بیوی ایک ساتھ رہیں لیکن بعض اوقات سفر ناگزیر ہو جاتا ہے اور اگر اس کا دورانیہ طویل ہو جائے تو اس قسم کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے جس میں شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے بعض حقوق کی ادائیگی نہیں کر سکتے۔ اس قسم کی صورتحال کے لیے ہمارے پاس واضح ہدایت موجود ہے کہ جب شوہر کو بیوی سے علیحدہ رہنا پڑے تو اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

ایک شخص کاروبار کے سلسلہ میں گھر سے باہر رہ سکتا ہے لیکن اس سلسلہ میں دو یا تین باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ گھر سے دوری کی یہ مدت چار ماہ سے زائد نہ ہو اور دوسرے یہ کہ اس سفر سے پہلے اپنی شریک حیات سے مشورہ ضرور کرے اور ان کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرے، اور تیسرے یہ کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے اہل خانہ حفاظت سے رہیں اور اتنی

ر[illegible] موجود ہو کہ وہ اپنی تمام ضروریات آرام وسکون سے پوری کرسکیں۔ اگر شوہر کی غیر موجودگی کی مدت چار ماہ سے زائد ہو، تو اس صورت میں [illegible] اپنی شریک حیات کی اجازت حاصل کرنا چاہیے۔ طویل عرصے تک گھر [illegible] ہر کی غیر موجودگی، بیوی کے بوجھ اور ذمہ داریوں میں غیر ضروری اضافوں کا باعث ہوسکتی ہے، خاص طور پر اس صورت میں جب چھوٹے بچوں کا ساتھ ہو۔

جو حضرات اپنے ملک سے باہر کسی دوسرے ملک میں کام کرنے جاتے ہیں، تو بالعموم یہ فیصلہ باہمی صلاح مشورے اور رضامندی سے کیا جاتا ہے اور اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ خاندان کو معاشی آسودگی اور مستقبل کا تحفظ حاصل ہو اور بچوں کی تعلیم وتربیت اچھے طریقے سے ہوسکے۔ اس فیصلے پر عملدرآمد کی صورت میں ازدواجی بندھن کے دونوں فریق خاندان کے مستقبل اور خوشحالی کے لیے زبردست ایثار سے کام لیتے ہیں۔ بیرون ملک کام کرنے والے حضرات اپنی آمدنی کا زیادہ سے زیادہ حصہ بچانا چاہتے ہیں اور بار بار سفر کرکے اپنی بچت کا اچھا خاصا حصہ خرچ نہیں کرنا چاہتے، خواہ انہیں اپنے آجر کی جانب سے بار بار سفر کی سہولت حاصل ہو۔ دین فطرت ہونے کی وجہ سے زندگی کے ہر معاملے میں اسلام حقیقت سے قریب تر اور بالکل عملی احکامات وہدایات فراہم کرتا ہے۔ ایک شخص طویل عرصے تک گھر سے دور قیام کرسکتا ہے بشرطیکہ اس کی شریک حیات اس بات سے اتفاق کرے۔ اگر اس کی بیوی طویل عرصہ تک گھر سے شوہر کی غیر موجودگی پر متفق نہ ہو تو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شوہر سے علیحدگی (خلع) اختیار کرلے۔ شرعی عدالت اس معاملے میں یہ کوشش کرسکتی ہے کہ وہ دونوں فریقوں کے درمیان کوئی ایسا فیصلہ کرے جو دونوں کے لیے موزوں ہو، اور اگر اس قسم کا کوئی فیصلہ ناممکن ہو تو طلاق یا خلع کے ذریعہ تصفیہ کیا جائے گا۔

والدین کے لیے بیٹیوں کی شادی کا بوجھ

سوال: ہمارے خطے میں والدین کے لیے بیٹیوں کی شادی زبردست مالی بوجھ بن جاتی ہے۔ لڑکے والے یہ توقع کرتے ہیں کہ لڑکی کے والدین، دولہا کے والدین، دولہا اور اس کے بہن بھائیوں کو سونے کی اشیاء کے تحفے بھیجیں۔ اس کے علاوہ دیگر گھریلو اشیاء اور تحفے بھی طلب کیے جاتے ہیں اور بعض صورتوں میں فرنیچر بھی مانگا جاتا ہے۔ میں سات بیٹیوں کا باپ ہوں۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا اسلام میں اس بات کی اجازت ہے کہ دولہا کے گھر والے شادی کے لیے اس طرح کے مطالبات رکھیں جبکہ انہیں یہ بھی علم ہو کہ لڑکی کے والدین یہ سب کچھ نہایت ناپسندیدگی کے ساتھ بحالت مجبوری کرتے ہیں۔ اگر لڑکی اپنے ساتھ سونے کے بہت سے زیورات اور سسرال والوں کے لیے خاطر خواہ تحائف لے کر نہ جائے تو سسرال میں اس کے والدین کی غربت کو طعن وتشنیع کا نشانہ

بنایا جاتا ہے۔

جواب: اس موضوع پر پہلے بھی سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں۔ ان جوابات میں ہمیشہ وضاحت کے ساتھ شادی کے نظام اور لڑکی اور لڑکے کے والدین کے حقوق و فرائض بیان کیے گئے ہیں۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں کرسکتا کہ نکاح کے معاہدے کے لیے اس خاکے کی نشاندہی کردوں جو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مطلوب ہے۔ اگر لوگ اسلامی شعائر پر کم سے کم توجہ دیں اور اپنے علاقوں کے غیر اسلامی رسوم و رواج پر اصرار کرتے رہیں، جیسا کہ اکثر معاملوں میں پایا جاتا ہے، تو انہیں اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ شادی کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے وہی صحیح عمل ہے اور تمام لوگوں کو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ بعض اوقات مجھے حیرت ہوتی ہے کہ لوگ دوسروں کے رسم و رواج سے متاثر ہوکر ایسے طریقے کیوں اپنا لیتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہوتے ہیں۔

طلاق کا حق مرد کے لیے کیوں؟

اسلامی نقطہ نظر سے شادی کے معاملے میں مرد کو زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ شادی کے نتیجے میں مرد کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ جائز اور قانونی طریقے سے اپنی ذاتی، سماجی اور جسمانی ضروریات کی تکمیل کرسکے۔ شادی کے ذریعہ وہ اپنی فطری خواہشات پوری کرسکتا ہے۔ ایک گھر تشکیل دے سکتا ہے جہاں اسے الفت اور آرام میسر آتا ہے۔ شادی کی رفاقت کے نتیجے میں ایسے بچے جنم لیتے ہیں جو اس کے مستقبل کے لیے نئی سرگرمیوں اور نئی خوشیوں کا سامان بنتے ہیں۔ جب کبھی یہ رشتہ ٹوٹتا ہے تو اس وقت مرد کو زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ ایک طرف اس کا خاندان بکھر جاتا ہے اور دوسری جانب اسے مہر اور نان نفقہ کی صورت میں مالی بوجھ برداشت کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ اسلام نے شادی کے اخراجات کی ذمہ داری مرد کے سپرد کی ہے اس لیے اسے طلاق کا حق بھی دیا گیا ہے۔

مالی لحاظ سے دیکھا جائے تو، وہ طریقہ جو آپ کے علاقے میں رائج ہے، قطعی غیر منصفانہ ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ شادی کے وقت عورت مالی طور پر زیر بار ہو اور دوسری جانب طلاق کے وقت تمام حقوق مرد کو میسر ہوں۔ اس معاملے میں اسلام کا نقطہ نظر قطعی مختلف اور واضح ہے۔ شادی کے نتیجہ میں عورت کی وجہ سے مرد کو سماجی فرض کی ادائیگی اور ذاتی ضروریات و خواہشات کی تکمیل کا موقع ملتا ہے چنانچہ وہ مہر کی صورت میں عورت کو ادائیگی کرتا ہے۔ یہاں ہمیں ان طریقوں پر بھی نظر ڈالنی چاہیے جو مہر کی ادائیگی کے لیے تجویز کیے گئے ہیں۔ فرض کیجیے ایک نکاح اس طرح قرار پایا کہ مرد اور عورت کے درمیان مہر کی رقم کا تعین نہیں ہوا۔ اس صورت میں

نکاح برقرار رہے گا لیکن مہر واجب الادا ہوگا اور عورت، جب بھی طلب کرے، مرد کو مہر کی رقم ادا کرنی ہوگی۔ اگر اس موقع پر عورت ایک خاص رقم کا مطالبہ کرے اور مرد وہ رقم ادا کرنے پر تیار نہ ہو تو اس صورت میں عدالت سے رجوع کیا جائے گا اور عدالت شادی کے وقت عورت کی تعلیم، خاندانی حیثیت، عمر، بکارت وغیرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کرے گی۔

جب مرد، مہر ادا کر دیتا ہے تو وہ رقم عورت کی ذاتی ملکیت ہو جاتی ہے اور یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس رقم کو جہاں چاہے خرچ کرے۔ اگر نکاح کے وقت مہر ادا نہیں کیا گیا اور شادی کے کچھ عرصے بعد مرد کا انتقال ہو گیا تو مرد کے چھوڑے ہوئے ترکے میں سے عورت کو مہر کی ادائیگی کی جائے گی اور اس معاملہ میں مہر کی رقم ''قرض'' تصور کی جائے گی۔

آپ کے علاقے میں یہ ہوتا ہے کہ نکاح کے وقت مہر کی رقم طے کر لی جاتی ہے، لیکن شادی کی پہلی رات عورت، مہر کی رقم معاف کر دیتی ہے۔ یہ ایک رسم بن گئی ہے۔ اکثر عورتیں اس کام کی اہمیت کو سمجھے بغیر یہ حرکت کرتی ہیں جبکہ درحقیقت یہ بات اسلامی تعلیمات کا بالارادہ مضحکہ اڑانے کے مترادف ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ جو لڑکی جہیز میں اپنے ساتھ سونے کے خاصے زیورات لے کر نہ آئے اسے سسرال میں طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہ ایک افسوسناک صورتحال ہے۔ اسلام میں تو کسی بھی مسلمان کو اس کی غربت کی بنا پر لعن طعن کرنے یا اس کا مذاق اڑانے کی اجازت نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی بھی وجہ سے کسی بھی مسلمان کا تمسخر اڑانے کی ممانعت ہے۔ تیسرے یہ کہ کسی بھی شخص کو اس کی کسی خطا کے بغیر لعن طعن کرنا ناپسندیدہ حرکت ہے۔ اس صورتحال کی اصلاح کے لیے مسلمانوں کو دین سے متعلق امور کی تعلیم دینا نہایت ضروری ہے۔ آپ کے علاقے کے علماء کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ خلاف اسلام طریقوں کو تبدیل کرنے کے لیے انتھک کوششیں کریں اور عوام الناس کو اسلامی طریقوں سے روشناس کرائیں۔ اس مقصد کے لیے ابلاغ کے ذرائع کو استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

دوسری جانب والدین پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان غیر اسلامی رسوم و رواج کے خلاف عملی اقدامات کا عزم کریں۔ جب بھی کسی شادی کے معاملے میں لڑکے کے والدین کی جانب سے بھاری جہیز اور دیگر نامعقول مطالبات پیش کیے جائیں تو لڑکی کے والدین کو واضح طور پر یہ بتا دینا چاہیے کہ وہ اسلامی طریقے کے مطابق شادی کرنا چاہتے ہیں اور اس صورت میں لڑکے کو مطالبات پیش کرنے کا کوئی حق نہیں ہے بلکہ لڑکی کو مہر ملنا چاہیے۔

مجھے احساس ہے کہ یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس پر عمل کر کے صورتحال کو تبدیل کرنے میں خاصا وقت لگے گا لیکن اس کے سوا کوئی اور طریقہ مؤثر ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس عرصے میں آپ جیسے

حضرات، جن کی کئی بیٹیاں ہیں، یقیناً ان نامعقول رسم ورواج کا شکار ہوں گے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی بیٹیوں کے لیے ایسے لڑکوں کے رشتے تلاش کریں جو خدا کا خوف رکھتے ہوں اور اسلامی تعلیمات سے واقف ہوں اور ان پر عمل کرتے ہو۔ یہ وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو سونے اور چاندی سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو عزیز جانتے ہیں۔ یقیناً ایسے لوگ معاشرے میں کم ہیں، لیکن معاشرہ ان سے خالی نہیں ہے۔

شادی کے بعد لڑکی کی میکے میں رہائش

سوال: ہمارے ملک کے دیہی علاقوں میں یہ رواج ہے کہ شادی کے بعد بعض لڑکیاں بدستور اپنے والدین کے یہاں رہتی ہیں اور بچوں کی ولادت کے بعد بھی یہی طریقہ بدستور جاری رہتا ہے۔ اس رواج کی وجہ سے اکثر خاندان میں کشیدہ صورتحال پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ خاندان کی شادی شدہ بیٹیوں اور ان کی بھاوجوں کے درمیان سماجی حیثیت، گھر کے اندر برتری اور حقوق کی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی صورتحال کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ ایسی صورت میں کس کا حق زیادہ ہے۔ شادی شدہ بیٹی کا یا بہو کا؟

جواب: جب ایک لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے تو اس کی کفالت کی ذمہ داری اس کے شوہر پر عائد ہوتی ہے۔ کفالت کا مطلب یہ ہے کہ شوہر، بیوی کو غذا، لباس، رہنے کے لیے گھر اور بیماری کی صورت میں علاج فراہم کرے۔ جواباً بیوی کو شوہر کے حقوق ادا کرنے ہوتے ہیں۔

آپ نے جو سوال کیا ہے وہ سماجی حالات اور رواج سے پیدا ہونے والی صورتحال سے متعلق ہے۔ عام زندگی میں شادی کے بعد شوہر بیوی کو اس کے گھر سے لے جاتا ہے اور اپنا گھر الگ بساتا ہے۔ ایک شادی شدہ مرد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بیوی کے والدین کے گھر میں رہتا ہے تو بیشتر اوقات اسے اسی قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اپنے والدین کے گھر رہنے کی صورت میں پیش آ سکتی ہے۔ آج کل کے نوجوان شادی کے بعد اپنا گھر الگ بسانا پسند کرتے ہیں لیکن ہر ایک کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے شادی کے بعد بالعموم شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اپنے والدین کے گھر رہتا ہے۔ آپ نے درپیش صورتحال میں جو سوال کیا ہے اس کا جواب محض حقوق و فرائض کے نقطہ نظر سے تلاش کرنا مناسب نہیں ہوگا بلکہ حقیقت پسندی، تحمل اور درپیش حالات کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی حل ڈھونڈنا ہوگا۔

جو لڑکی شادی کے بعد اپنے شوہر کے ہمراہ اپنے والدین کے گھر میں رہتی ہے، ممکن ہے اس

کے پاس والدین کے گھر رہنے کا معقول جواز موجود ہو۔ ایسی صورت میں خاندان کے ہر فرد کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ دوسرے ارکان خاندان کے ساتھ رواداری کے ساتھ پیش آئے اور محبت کا رشتہ استوار رکھے۔ کسی خاندان میں اختلافات کو کم سے کم کرنے کا انحصار ان افراد پر ہوتا ہے جو خاندان کی تشکیل کرتے ہیں۔ میری رائے میں اس قسم کی دشوار خاندانی صورتحال میں ایک مسلمان کو اہل خانہ کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لیے دوسروں کے ساتھ رواداری کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اگر ایک گھر میں رہنے والی بہوئیں اور بیٹیاں، داماد اور بیٹے اس طریقے پر عمل کریں گے تو وہ اپنے والدین کو زیادہ خوشی، سکون اور آرام پہنچا سکیں گے جنھوں نے اپنے گھر کے دروازے سب کے لیے کشادہ دلی کے ساتھ وا کردیئے ہیں۔ والدین کے حقوق ادا کرنے کی ایک بہترین صورت یہی ہے کہ انہیں کسی بھی قسم کی دردسری اور پریشانی سے بچایا جائے اور انہیں خوش رکھا جائے۔

بیوی کی تنخواہ پر شوہر کا حق؟

سوال: ایک خاندان میں شوہر اور بیوی دونوں ڈاکٹر ہیں۔ شوہر کو سعودی عرب میں ملازمت مل گئی اور دو سال بعد بیوی بھی ان کے پاس آ گئیں۔ یہاں آنے کے بعد بیوی نے بھی ملازمت کے لیے درخواست دی۔ شوہر نے اس ملازمت کے حصول میں بھرپور کوشش کی۔ ملازمت کے بعد شوہر نے بیوی کو ملنے والی تمام تنخواہ پر اپنا حق جتایا۔ شوہر کا کہنا ہے کہ اسلام کے مطابق بیوی صرف اس رقم کی حقدار ہے جو وہ اپنے والد کے گھر سے اپنے ساتھ لائے۔ شادی کے بعد بیوی، ملازمت کی صورت میں جو کچھ کمائے گی وہ شوہر کی ملکیت ہوگا۔ اس صورتحال کی وجہ سے خاندان میں پیچیدہ مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ بیوی کو اپنی آمدنی سے گھر کے تمام اخراجات پورے کرنے پڑ رہے ہیں جبکہ شوہر اپنی آمدنی کی رقم سے وطن میں اپنے نام سے جائیداد خرید رہے ہیں۔ چونکہ بیوی کی تمام تنخواہ گھر کے اخراجات میں صرف ہوجاتی ہے، اس لیے ان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے والدین کو اخراجات کے لیے تھوڑی بہت رقم بھیج سکیں اور اس وجہ سے بیوی کے لیے یہ صورتحال قطعی خوشگوار نہیں ہے۔ بیوی کا خیال ہے کہ اس کی آمدنی پر والدین کا حق ہے، کیونکہ والدین نے طب کی اعلیٰ تعلیم کے حصول میں اس کی ہر ممکن مدد کی، محنت کی اور سخت دن گزارے اور ان ہی کی کوششوں سے وہ ڈاکٹر بن سکی اور اب یہ ان کا حق ہے کہ وہ اپنی محنت اور ایثار کے خوش کن نتائج میں حصہ دار بنیں اور تھوڑا بہت آرام پائیں۔ لیکن شوہر نے بیوی کے لیے یہ راستہ بند کردیا ہے۔ ازراہ کرم اس مسئلے کے بارے میں اپنی رائے عنایت فرمائیے۔

جواب: اسلامی تعلیمات کے مطابق کسی عورت کو اپنی گزر بسر کے لیے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک شادی شدہ عورت کے شوہر کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے وسائل کے مطابق، معیاری زندگی کی آسائشیں فراہم کرے۔ اگر ایک بیوی اپنے شوہر کے مقابلے میں مال دار ہے، تب بھی بیوی کی کفالت اور اس کی ضروریات کی تکمیل شوہر ہی کی ذمہ داری ہے۔ بیوی کی دولت اس بات میں مانع نہیں ہوسکتی۔ اگر شوہر، بیوی کی رضا کے بغیر، اس کی دولت سے فائدہ اٹھاتا ہے تو وہ اس فعل کے لیے جوابدہ ہے اور بیوی اگر چاہے تو اس بنیاد پر خلع کا دعویٰ کرسکتی ہے کہ شوہر اس کی کفالت نہیں کرتا۔

یہاں یہ کہنا غیر متعلق نہ ہوگا کہ ایک غیر شادی شدہ عورت کو بھی اپنی گزر بسر کے لیے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس صورت میں عورت کے والدین یا دیگر قریبی اعزاء مثلاً بھائیوں کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اس کی ضروریات پوری کریں۔ تاہم اگر ایک غیر شادی شدہ عورت کام کرتی ہے تو اسلام اسے اس بات سے منع بھی نہیں کرتا۔

یہ جاننا نہایت اہم ہے کہ اگر ایک عورت ملازمت اختیار کرے تو اس صورت میں حقوق و فرائض کی نوعیت کیا ہوگی۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ اسلام کی رو سے ملکیت، جائیداد، کاروباری معاملات اور تجارتی لین دین میں عورت اور مرد کی حیثیت برابر کی ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا جب کوئی عورت اپنے کام کے عوض کچھ آمدنی حاصل کرتی ہے تو یہ تمام رقم اس کی ملکیت ہے۔ اگر عورت غیر شادی شدہ ہے تو اس کے والد اس رقم پر دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح شادی شدہ عورت کی آمدنی پر شوہر کا کوئی حق نہیں ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جب ایک شادی شدہ عورت ملازمت کے لیے باہر جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی بعض گھریلو ذمہ داریوں کو ادا نہیں کیا۔ اس صورت میں شوہر کا یہ حق ہے یا وہ یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ بیوی اپنی آمدنی میں سے کچھ حصہ گھریلو ذمہ داریوں کی عدم ادائیگی کے عوض ادا کرے۔

گھر کے کام بیوی کی ذمہ داری نہیں ہیں

اسلام نے ان تمام فرائض کی تفصیل سے وضاحت کی ہے جو شوہر کی طرف سے بیوی پر عائد ہوتے ہیں۔ ان فرائض میں گھر کی صفائی، کپڑوں پر استری، کھانا پکانا اور دیگر گھریلو کام شامل نہیں ہیں۔ شادی ایک ایسا معاہداتی رشتہ ہے جس کے تحت عورت اور مرد کو قانونی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی خواہشات کی تکمیل کی اجازت ہے۔ اگر ایک عورت کوئی ایسی ذمہ داری اپنے سر

لے لیتی ہے جو اس کے گھریلو فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ بنے تو شوہر کو یہ حق ہے کہ وہ اس ذمہ داری سے بیوی کو منع کرے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ ''پھر گھر کا کام کون کرے گا۔'' اس سوال کے دو پہلو ہیں:

اگر محض ''حقوق و فرائض'' کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات صاف ہے کہ شوہر کے گھر کے کام انجام دینا بیوی کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر شوہر یہ چاہتا ہے کہ گھر کے کام اچھی طرح انجام پائیں تو اسے خود اس کا بندوبست کرنا چاہیے، لیکن خوشگوار ازدواجی زندگی ''حقوق و فرائض'' سے بڑھ کر کوئی چیز ہوتی ہے، جسے اسلام ''خیر خواہی کی بنیاد پر رفاقت'' کا نام دیتا ہے اور اسی اصول کی بنیاد پر خاندان کے اندر حقوق و فرائض کی تقسیم شوہر و بیوی کے درمیان عمل میں آتی ہے۔ اس موضوع پر رہنمائی فوری طور پر دستیاب ہے۔ کسی مرحلے پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے درمیان اختلاف رائے ہوا۔ دونوں نے اپنا معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیا اور درخواست کی کہ ہر ایک کی ذمہ داریوں کی وضاحت فرمادیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی (رضی اللہ عنہ) سے فرمایا: ''گھر کے اندر کے کام لازماً آپ کریں گی اور گھر کے باہر کے کام علی انجام دیں گے'' گھر کے کاموں سے متعلق فرائض کی یہ تقسیم منصفانہ بھی ہے اور عملی بھی۔

جب ایک بیوی ملازمت کے سلسلے میں باہر جانا چاہتی ہے اور شوہر یہ محسوس کرتا ہے کہ بیوی کی ملازمت سے گھریلو زندگی، خصوصاً بچوں کی پرورش، متاثر ہوگی تو وہ بیوی کو ملازمت سے منع کرسکتا ہے۔ تاہم اگر شادی سے پہلے لڑکی ملازمت کر رہی تھی اور اس وقت لڑکے نے یہ بات واضح طور پر نہیں کہی کہ شادی کے بعد لڑکی کو ملازمت ترک کرنا ہوگی، تو اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ شادی کے بعد بیوی کی ملازمت کو شوہر کی رضامندی حاصل ہے۔ شادی کے بعد شوہر بیوی سے یہ مطالبہ نہیں کرسکتا کہ وہ ملازمت چھوڑ دے۔ اگر شادی کے بعد شوہر یہ مطالبہ کرے اور بیوی اس بات سے انکار کرے تو بیوی کا موقف درست ہوگا۔ کیونکہ شادی کے وقت شوہر نے یہ شرط عائد نہیں کی تھی کہ بیوی ملازمت جاری نہیں رکھ سکے گی۔

جہاں تک اس آمدنی کا تعلق ہے، جو ملازمت کی وجہ سے بیوی کو حاصل ہو رہی ہے، تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ تمام آمدنی بیوی کی ملکیت ہے اور اسے اس رقم کو اپنی آزاد مرضی کے مطابق خرچ کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہے۔ اگر وہ اس رقم کا کچھ حصہ یا تمام رقم اپنے خاندان کے لیے استعمال کرنا چاہے تو کرسکتی ہے۔ اگر وہ اس رقم سے اپنے میکے کے لوگوں کی مدد کرنا چاہے تو اسے اس بات کا بھی پورا اختیار حاصل ہے اور اس صورت میں اللہ تعالیٰ اسے اجر عطا کریں گے۔

اس مخصوص معاملے میں جس کی سوال میں نشاندہی کی گئی ہے، کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ شوہر اپنی بیوی سے ناجائز فائدہ حاصل کر رہا ہے۔ یہ دعویٰ قطعی غیر منصفانہ ہے کہ بیوی کی کمائی پر شوہر کا حق ہے۔ اس دعویٰ کو کسی بھی صورت میں حق و انصاف پر مبنی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر شوہر، بیوی کی آمدنی لیتا رہا ہے تو اس کا یہ اقدام غیر قانونی ہے بیوی کی اجازت اور رضا کے بغیر شوہر اس کی رقم کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔

بعض لوگ یہ تجویز کرسکتے ہیں کہ چونکہ شوہر اور بیوی دونوں ملازمت کرتے ہیں اس لیے گھر کے اخراجات میں دونوں کو اپنا حصہ ادا کرنا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن ہوسکتا ہے لیکن اس کے لیے دونوں کا متفق ہونا ضروری ہے۔ بر بنائے استحقاق، بیوی کی آمدنی پر شوہر کا حق قطعی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اگر بیوی اپنی رضا سے گھر کے اخراجات کے لیے شوہر کو کچھ دے تو اسے چاہیے کہ اسے خوش دلی سے قبول کرے لیکن اگر بیوی نہ دینا چاہے تو شوہر اسے مجبور نہیں کرسکتا اور اگر زور زبردستی سے وہ بیوی کی رقم حاصل کرتا ہے تو اس بات پر اسے اللہ کی طرف سے سزا ملے گی۔

سوال میں جن خاتون کا تذکرہ ہے وہ اپنی مرضی کے خلاف اپنے حق سے دستبردار ہو رہی ہیں۔ انہیں اپنے شوہر پر یہ واضح کردینا چاہیے کہ وہ ان سے جو کچھ حاصل کر رہے ہیں وہ غیر قانونی ہے اور اگر اس کے باوجود شوہر، بیوی کی آمدنی پر اپنا حق جتائیں تو اس صورت میں خاتون کو باہمی تعلقات کے بارے میں انتہائی نوعیت کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

نکاح کے بعد بیوی کے نام میں شوہر کے نام کا اضافہ

سوال: ازراہ کرم اس مسئلے کی وضاحت کیجیے کہ شادی کے بعد عورت کے نام کے ساتھ، شوہر کا نام شامل کرنا چاہیے یا نہیں۔ آج کل لاکھوں مسلمان خواتین شادی کے بعد اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام شامل کرلیتی ہیں۔ اگر شادی سے پہلے کسی عورت کے نام کے ساتھ خاندانی نام شامل نہ ہو تو کیا اسے اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام استعمال کرنے کی اجازت ہے؟

جواب: اسلامی نقطہ نظر سے ایک باپ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے احسن نام منتخب کرے۔ اچھے نام کا انتخاب، بچے کا حق ہے اور یہ ذمہ داری والدین کو پوری کرنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے اچھے نام رکھنے کے معاملے کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ آپ نے اپنے نواسوں کے نام تبدیل کرکے رکھے۔ حضرت علی اپنے بڑے صاحبزادے کو ''حرب'' کے نام سے پکارتے تھے۔ (''حرب'' کے معنی ''جنگ'') اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام کو تبدیل کرکے ان کا

نام ''حسن'' (خوب، اچھا) رکھا، دوسرے نواسے کا نام تبدیل کر کے آپ نے ''حسین'' (خوبصورت) اور تیسرے کا نام ''محسن'' (فیاض، احسان کرنے والا) رکھا۔

اولاد کا نام رکھنا ایسا کام نہیں ہے جسے معمولی نوعیت کا سمجھا جائے اور اہمیت نہ دی جائے۔ بچے کا نام، اس کے والدین سے اس کے تعلق اور ان تمام ذمہ داریوں اور حقوق کا اظہار کرتا ہے، جو بچے کی پرورش کے سلسلہ میں ان پر عائد ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یہ بچہ اپنے والدین کے ورثہ میں حقدار ہے اور یہ کہ کن عزیز و اقارب سے اس کی شادی نہیں ہوسکتی۔ باالفاظ دیگر بچے کا نام اس کے سماجی حقوق و فرائض کی علامت ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں معاشرتی رشتوں کو مستحکم بناتا ہے۔

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی بھی شخص کا نام ایسا ہونا چاہیے جو صرف اس کے خاندان کے تعلق کو جائز طور پر ظاہر کرے۔ جب کوئی مرد یا عورت، اپنے خاندان کے علاوہ کسی دوسرے کا نام اپنے نام کے ساتھ شامل کرتا ہے تو رشتوں کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کے نام اختیار کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے احسن نہیں ہے، حالانکہ دوسرے معاشروں میں اس کا عام رواج ہے۔ اسلام سے پہلے کے عرب معاشرے میں بھی اس کا رواج تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اپنے ایک غلام، حضرت زید رضی اللہ عنہ کو متبنیٰ بنایا تھا۔ نبوت سے پہلے ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضرت زید کو تحفتہً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیا تھا۔ متبنیٰ ہونے کے بعد حضرت زید رضی اللہ عنہ، زید بن محمد کے نام سے پکارے جانے لگے، لیکن مدینے میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی صورت میں وہ ہدایت نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو دوسروں کے بچے متبنیٰ بنانے اور اپنا نام انہیں دینے کے بارے میں ممانعت کی گئی تھی۔ سورہ احزاب کی چوتھی اور پانچویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں احکامات دیئے ہیں۔

> ''اور نہ تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے بنایا۔ یہ سب تمہارے منہ کی باتیں ہیں اور خدا تو سچی بات فرماتا ہے اور وہی سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ لے پالکوں کو ان کے (اصلی) باپوں کے نام سے پکارا کرو کہ خدا کے نزدیک یہی بات درست ہے۔ اگر تم کو ان کے باپوں کے نام معلوم نہ ہوں تو وہ دین میں تمہارے بھائی اور دوست ہیں۔'' (سورہ احزاب ۴-۵)

اسلام، اس مسئلے کو نہایت سنجیدہ اور اہم تصور کرتا ہے۔ یہی اصول خواتین کے ناموں کے ساتھ شوہر کا نام شامل کرنے کے بارے میں منطبق ہوتا ہے۔ نکاح کے بعد بیوی کے نام میں شوہر

کے نام کا اضافہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اب اس عورت کا تعلق اپنے خاندان سے زیادہ اپنے شوہر سے ہے۔ شادی کے بعد خواتین کے بارے میں یہ رویہ اور طرز فکر یورپی تہذیب کا ہے۔ اسلام میں نہ اس قسم کی روایت ہے اور نہ اس کی گنجائش ہے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یورپی تہذیب اور معاشرے میں، ماضی میں عورت کو بھی ذاتی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ جب کسی خاتون کی شادی ہوتی تھی تو ماضی سے اس کا تعلق بالکل ختم ہوجاتا تھا۔ یہ رویہ نہ تو باعزت ہے اور نہ اسے باوقار طرز عمل کہا جاسکتا ہے۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ بیوی کے نام کے ساتھ شوہر کا نام شامل کرنا عیسائیوں کی روایت ہے کیونکہ عیسائیت (کیتھولک فرقے) میں طلاق کو قبول نہیں کیا جاتا۔ وہاں شادی کا رشتہ اٹوٹ سمجھا جاتا ہے۔ شادی کے بعد عورت کی پچھلی زندگی کو اس طرح فراموش کردیا جاتا ہے جیسے اس کا وجود ہی نہ تھا۔ خواتین اور ازدواجی زندگی کے بارے میں اسلام کا طرز فکر بالکل مختلف ہے۔ اسلامی شریعت کے مطابق، عورت بھی اپنے سماجی کردار کی ادائیگی اور اپنے حقوق وفرائض کی تکمیل میں اسی طرح خودمختار ہے جتنا مرد۔ شادی کے بعد بیوی کی حیثیت رفیق زندگی کی ہوتی ہے۔ وہ شوہر کی ماتحت نہیں ہوجاتی اور نہ ہی ہر معاملے میں اس پر شوہر کی اطاعت واجب ہوتی ہے۔ یہاں ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اسلامی شریعت کے مطابق شادی کے بعد عورت کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی دولت کو شوہر کی مرضی کے مطابق نہیں، بلکہ اپنی پسند کے مطابق خرچ اور استعمال کرے۔ عورت کے انتقال کے بعد اس کے ورثہ میں شوہر اور بچوں کے ساتھ ساتھ اس کے والدین اور اس کے دیگر رشتہ داروں کا حصہ بھی ہوتا ہے۔

بدقسمتی سے مسلمان خواتین کے نام کے ساتھ شوہر کا نام استعمال کرنے کا طریقہ، ان ملکوں کے یورپی تسلط میں رہنے کا نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں رہنا چاہیے کہ یہ طریقہ غیر اسلامی ہے اور مسلمان خواتین کو اس پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔

بیوی کے نام کے ساتھ شوہر کا نام لگانا غیر اسلامی ہے

سوال: لاپروائی کی وجہ سے میں نے اپنی بیوی کے پاسپورٹ اور نکاح نامے میں ان کے نام کے ساتھ اپنا نام شامل کرادیا۔ ہمارے ملک میں یہ عام طریقہ ہے کہ شادی کے بعد بیوی کے نام کے بعد شوہر کا نام لگادیا جاتا ہے۔ کیا اب یہ ضروری ہے کہ نکاح نامے اور بیوی کے پاسپورٹ وغیرہ میں ان کا نام تبدیل کراکے، شادی سے پہلے والا نام درج کراؤں۔ اس عمل میں نہ صرف اچھی خاصی کوشش کرنا ہوگی بلکہ وقت بھی خاصا لگے گا۔

جواب: آپ نے خود تسلیم کیا ہے کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ شادی کے بعد بیوی کے نام کے ساتھ شوہر کا نام شامل کیا جائے۔ بیوی کو یہ حق ہے کہ وہ اپنا اصل نام ہی استعمال کرے، کیونکہ اسلام مردوں کی طرح خواتین کو بھی ان کی اپنی علیحدہ شناخت کی آزادی دیتا ہے کسی خاتون کو یہ نہیں کرنا چاہیے کہ اگر کسی شخص سے اس کی شادی ہوگئی ہے تو وہ اپنا نام تبدیل کر کے اپنی شناخت ختم کردے۔ اس شادی کے باوجود وہ اپنے باپ کی بیٹی رہتی ہے۔ دوسرے معاشروں میں ایک خاتون جتنی بار شادی کرتی ہے، ہر بار اس کا نام تبدیل ہوجاتا ہے۔ یہ خواتین کو زیردست بنانے اور ان کی آزادی سلب کر کے انہیں مردوں کے مقابلے میں کمتری کے احساس میں مبتلا کرنے کا طریقہ ہے، جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

چونکہ آپ نے اپنے ملک کے قانون کے مطابق عمل کیا ہے، اس لیے اب نام کی دوبارہ تبدیلی کی خاطر اس سارے عمل کو نئے سرے سے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سہولت کا معاملہ ہے اور چونکہ آپ کے لیے سہولت اسی میں ہے کہ آپ کی اہلیہ کے پاسپورٹ اور نکاح نامے میں ان کا نام جوں کا توں رہنے دیا جائے اس لیے آپ ازسرنو نام تبدیل کروانے کا تردد نہ کریں۔

ولیمہ کب جائز ہوتا ہے؟

سوال: ہمارے ملک میں یہ رواج ہے کہ نکاح کے دوسرے دن لڑکے کی جانب سے دعوت کی جاتی ہے۔ لوگوں کا یہ یقین ہے کہ یہ دعوت جس میں تمام عزیز دوست اور پڑوس کے لوگ شریک ہوتے ہیں، اسی وقت جائز ہے جب میاں اور بیوی کے درمیان مباشرت کا عمل تکمیل پاچکا ہو۔ بصورت دیگر یہ دعوت حرام ہوگی۔ ازراہ کرم اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں؟

جواب: نکاح کے اگلے دن کی دعوت کو ''ولیمہ'' کہتے ہیں۔ اس کی پرزور سفارش کی گئی ہے۔ بلکہ بعض علماء تو اسے لازمی قرار دیتے ہیں کیونکہ صحابی رسول حضرت عبدالرحمان رضی اللہ عنہ بن عوف نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی کہ انہوں نے شادی کرلی ہے تو اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہیں ہدایت کی کہ وہ کھانے کا انتظام کریں اور لوگوں کو دعوت دیں۔ کسی شخص کو ولیمے کی دعوت پر بلایا جائے تو اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس میں شریک ہو، سوائے اس کے کہ واقعی کوئی ایسی وجہ ہو جو اس کے جانے میں مانع ہو، مثلاً اسے علم ہو کہ جس جگہ ولیمہ ہورہا ہے وہاں کوئی گناہ سرزد ہوچکا ہے۔ اگر ایک شخص روزے سے ہے اور اسے ولیمہ میں مدعو کیا جاتا ہے تو اس کو بھی جانا ضرور چاہیے لیکن میزبان کو یہ بتا کر کہ اس کا روزہ ہے وہ کھانے سے پرہیز کرسکتا

ہے۔ اگر اس نے نفلی روزہ رکھا ہوا ہے تو وہ روزہ معطل کر سکتا ہے۔

آپ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ نکاح کا اعلان شادی کا لازمی حصہ ہے۔ یہ اعلان دراصل ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان قائم ہونے والے تعلق کے جائز ہونے کی وضاحت کرتا ہے۔ نکاح کی جتنی تشہیر ہو، اتنا ہی بہتر ہے۔ کم سے کم شہرت کے لیے اسلام نے دو گواہوں کی حد مقرر کر دی ہے۔ یعنی کوئی بھی شادی کم سے کم دو افراد کے سامنے ضرور انجام پانی چاہیے جو اس شادی کے گواہ ہوں گے۔ شادی خواہ چھوٹے پیمانے پر منعقد ہو یا بڑے پیمانے پر اس کا انعقاد کیا جائے، نکاح کے بعد اس شادی کی تشہیر کے لیے ولیمہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ولیمے کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ جس جگہ شادی ہوئی ہے وہاں کے لوگ خوشی کی اس تقریب میں شریک ہوں۔ ولیمے کا اصل مقصد اس حقیقت کی تشہیر ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان قانونی رشتہ استوار ہوا ہے۔ شوہر اور بیوی کے درمیان مباشرت کے عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے اس کے جائز یا ناجائز ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مقامی طور پر اگر کوئی بات رسم و رواج اور روایت کا حصہ بن جائے تو اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ہنی مون کی اجازت

سوال: کیا شادی کے بعد ماہ عسل (ہنی مون) کی اجازت ہے؟

جواب: جی ہاں، ماہ عسل کی بالکل اجازت ہے۔ شادی کے بعد آپ اپنی بیوی کے ساتھ جب چاہیں، جہاں چاہیں اور جتنی مدت کے لیے چاہیں جا سکتے ہیں۔ صرف یہ خیال رکھنا ہوگا کہ اس سفر کا مقصد ایسا نہ ہو جو اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہو۔ میں بطور انتباہ یہ کہنا چاہوں گا کہ اگر آپ شادی کے بعد ماہ عسل کے لیے اس لیے جا رہے ہیں کہ یہ غیر مسلم معاشروں کا طریقہ ہے تو اس صورت میں آپ کے اس عمل کی توثیق نہیں کی جا سکتی۔ اسلام میں تمام اعمال کا جائزہ نیت کی بنیاد پر لیا جاتا ہے۔ اگر ماہ عسل پر جاتے وقت نیت یہ ہے کہ اس سے آپ کو اور آپ کی زوجہ کو تفریح میسر آئے گی تو یہ بالکل درست ہے۔

بیوی کی جانب سے شوہر کو دوسری شادی کی مشروط اجازت

سوال: میرے نکاح کے وقت نکاح نامے میں یہ شرط شامل کی گئی کہ اگر شادی کے بعد اولاد نہ ہوئی تو شوہر کو دوسری شادی کی اجازت ہوگی۔ مجھے یہ شرط قبول تھی کیونکہ یہ منصفانہ بات تھی۔ شادی کے

چند ماہ بعد ہی میرے شوہر نے دوسری شادی کے لیے مناسب رشتے کی تلاش شروع کر دی۔ اس مرحلہ پر میں نے اپنے شوہر سے گفتگو کی جس کے نتیجے میں طبی معائنہ کرانے پر اتفاق رائے ہوا۔ معالج نے معائنہ کے بعد بعض معمولی نقائص کو دور کر دیا اور مشورہ دیا کہ اب اولاد نہ ہونے کی کوئی طبی وجہ نہیں رہی ہے۔ تاہم شادی کے آٹھ برس گزرنے کے باوجود ہم دونوں اولاد سے محروم ہیں۔ اس تمام عرصے میں میرے شوہر نے متعدد منگنیاں کیں لیکن شادی کسی سے بھی نہیں کی۔ اس صورتحال سے میں شدید ذہنی پریشانی اور دل شکستگی میں مبتلا رہی اور یہ محسوس کرتی ہوں کہ اس حالت کو زیادہ عرصہ برداشت نہیں کرسکتی۔ شادی کا مطلب ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری اور ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہے اور مجھے ان دونوں باتوں سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ براہ کرم مشورہ دیجیے کہ اس صورتحال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: آپ نے جو صورتحال بیان کی ہے وہ شادی کے بعد اولاد نہ ہونے کی صورت میں ایک مسئلے ہے اور افسوسناک بات یہ ہے کہ مختلف سماجی عناصر کی وجہ سے ایسے معاملات میں نقصان عورت کو پہنچتا ہے۔ مجھے یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ آپ نے نکاح نامے میں شادی کے بعد اولاد نہ ہونے پر شوہر کی دوسری شادی کی اجازت کی شرط کو درست قرار دیا۔ اس شرط کے ذریعہ آپ نے ایک ایسے معاملے کی ذمہ داری قبول کر لی جو آپ کے اختیار سے باہر ہے۔ آپ کے مسئلے کا جائزہ لینے سے پہلے میں دو اہم نکات واضح کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا نکتہ کثرت ازدواج کے بارے میں ہے اور دوسرا نکاح ناموں میں شرائط سے متعلق ہے۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اسلام نے مرد کو ایک وقت میں چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔ یہ ایک ایسا حق ہے جو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور دوسری یا تیسری یا چوتھی شادی کرنے کے لیے مرد کو کوئی خاص وجہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کے نکاح نامے میں جو شرط شامل کی گئی، وہ بے معنی ہے کیونکہ شادی کے بعد آپ کے یہاں اولاد ہو یا نہ ہو، آپ کے شوہر کو دوسری، تیسری اور چوتھی شادی کرنے کی اجازت ہے۔

اسلام میں مرد کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت بعض معاشرتی مسائل کے حل کے لیے دی گئی ہے جو کسی خاندان یا کسی معاشرے میں پیدا ہوسکتے ہیں۔ عام حالات میں یک زوجی نظام ہی مناسب ہے جس میں ایک مرد ایک وقت میں ایک بیوی رکھ سکتا ہے۔

دوسری بات نکاح نامے میں بعض خاص شرائط شامل کرنے سے متعلق ہے۔ بعض انفرادی معاملات میں یہ درست ہوسکتا ہے کہ لوگ کسی خاص شرط کو نکاح نامے کا حصہ بنالیں۔ مثال کے طور

پر لڑکی والے یہ شرط عائد کرنے کی خواہش کر سکتے ہیں کہ شادی کے بعد لڑکی شہر، صوبے یا ملک سے باہر نہیں رہے گی۔ اس شرط کا مقصد صرف یہ ہوگا کہ والدین اپنی لڑکی کو اپنے سے قریب رکھنا چاہتے ہیں۔ نکاح نامے میں ایسی شرائط شامل کرنے کے مسئلہ پر علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض علماء اس قسم کی شرائط کی اجازت دیتے ہیں اور بعض انہیں درست نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا آپ کے نکاح نامے میں شادی کے بعد اولاد نہ ہونے پر شوہر کو دوسری شادی کرنے کی اجازت کی شرط کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے کیونکہ شوہر کو دوسری شادی کی اجازت اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ آپ کے ملک کے قانون میں اس طرح کی گنجائش ہو جس میں اولاد نہ ہونے پر شوہر کو دوسری شادی کی اجازت دی گئی ہو، ورنہ اس پر پابندی ہو۔ لیکن چونکہ یہاں ہم اسلامی شریعت کے حوالے سے گفتگو کر رہے ہیں، اس لیے اس قسم کی شرط کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔

آپ کے مسئلے کی نوعیت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے خاندان میں اولاد کے ہونے کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے جبکہ مسلمان گھرانوں میں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شادی کے بعد ہر جوڑا یہ چاہتا ہے کہ اس کے یہاں بچے ہوں۔ ہر جاندار مخلوق کی طرح انسانوں کی بھی یہ فطری خواہش ہے جو ان کی نسل کے تسلسل اور بقا کا معاملہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ یہ فیصلہ صرف ہم کرتے ہیں کہ کس جوڑے کو لڑکی یا لڑکا دیا جائے یا دونوں سے نوازا جائے، یا انہیں بے اولاد رکھا جائے۔ جب ہم اللہ کے اس فرمان پر ایمان لاتے ہیں تو پھر ہمیں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو صدق دل سے قبول کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔ وہ جس سے چاہے ہمیں نوازے اور چاہے تو محروم رکھے۔ بعض لوگوں کی یہ شدید خواہش ہوتی ہے کہ ان کے گھر میں کم سے کم ایک لڑکی ضرور ہو۔ بعض حضرات لڑکیوں کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ بعض خاندان لڑکے اور لڑکیوں دونوں کی خواہش رکھتے ہیں۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو لڑکیوں کو لڑکوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن یہ سب خواہشیں اور ترجیحات، پسند اور ناپسند کوئی اہمیت نہیں رکھتیں کیونکہ انسان یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ اسے کس طرح نوازیں گے۔

بعض حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ جب تک ان کے یہاں اولاد نہیں ہوگی، ان کی زندگی میں خوشیاں نہیں آئیں گی۔ بعض لوگ اولاد کے حصول کے لیے طب کا سہارا لیتے ہیں۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی، کی یورپی ٹیکنالوجی، انسانوں کی اسی خواہش کا نتیجہ ہے۔ اولاد کے حصول کی خواہش کے اس جذبے کے خلاف میں کچھ نہیں کہنا چاہتا، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جب ایک شادی شدہ جوڑے کے یہاں آپ کی طرح اولاد نہ ہونے کی کوئی طبی وجہ موجود نہ ہو، اور پھر بھی وہ اولاد سے محروم رہے تو اسے اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ

اولاد ہمیشہ خوشیوں کا سبب نہیں بنتی۔ اپنے آس پاس غور سے دیکھیے تو آپ کو متعدد مثالیں مل جائیں گی جہاں اولاد، والدین کی پریشانی اور مصیبت کا باعث بنتی ہے۔ یہ دعویٰ کون کرسکتا ہے کہ اولاد ہمیشہ خوشیوں میں اضافے کا سبب ہوتی ہے۔ ممکن ہے اولاد کی بے پناہ خواہش رکھنے والے کسی جوڑے کے یہاں ایسا بچہ پیدا ہو جس کی عادتیں اور اطوار والدین کے لیے ہمیشہ پریشانی اور پشیمانی کا باعث بنی رہیں یا کوئی معذور بچہ پیدا ہو جسے انتہا سے زیادہ نگہداشت کی ضرورت ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے یہاں صالح اولاد پیدا ہو، وہ بڑے اشتیاق کے ساتھ اس کی پرورش کریں اور جب وہ جوان ہو تو اس کا انتقال ہوجائے اور والدین عمر بھر کے لیے اس کی جدائی کا داغ اپنے دل پر لگالیں۔ اس کے علاوہ بھی متعدد ایسے حالات ہوسکتے ہیں جن میں اولاد، والدین کے لیے خوشیوں کے بجائے رنج، دکھ، افسوس اور پشیمانی کا باعث بن سکتی ہے۔ ایسے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان جوڑوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنا چاہیے جو شادی کے بعد اولاد سے محروم رہتے ہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے وہی چیز منتخب کی ہو جس میں ان کی بھلائی ہے۔ آپ کو ایسی مثالیں بھی مل جائیں گی جہاں بے اولاد جوڑے ہنسی خوشی زندگی بسر کررہے ہیں اور انہوں نے اپنے فاضل وقت کو خلق خدا کی بھلائی کے کاموں کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ اگر ایک شادی شدہ جوڑا ایک دوسرے سے مطمئن ہے تو اسے اولاد کے نہ ہونے کو مسئلہ نہیں بنانا چاہیے بلکہ اپنی خوشیوں میں اضافے کی کوشش کرنی چاہیے خواہ ان کے خاندان کے حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔

آپ نے اپنے خط میں جو حالات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے شوہر دوسری شادی کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اسے وقت گزاری کا مشغلہ بنالیا ہے۔ ان کا رویہ نہ تو آپ کے حق میں منصفانہ ہے اور نہ ان لڑکیوں کے حق میں جنھیں وہ شادی کے لیے تجویز کرتے ہیں یا نسبت طے کرلیتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں میں آپ کے ان جذبات کا احساس کرسکتا ہوں جن کے تحت آپ نے لکھا ہے کہ میں اس معاملے کو مزید برداشت نہیں کرسکتی۔ اگر آپ کے شوہر دوسری شادی کرلیتے ہیں تو آپ عدالت کے ذریعے خلع لے سکتی ہیں۔ آپ کو قاضی (جج) کے سامنے صرف یہ کہنا ہوگا کہ آپ اپنے شوہر کے ساتھ کسی دوسری عورت کی شراکت برداشت نہیں کرسکتیں۔ نکاح نامے میں شامل کی گئی شرط آپ کو پابند نہیں کرسکتی کہ آپ شوہر کے دوسری شادی کرنے کے بعد ان کے نکاح میں رہیں۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کو اپنے شوہر سے کھلے دل کے ساتھ گفتگو کرنی چاہیے لیکن یہ احتیاط رکھنی ضروری ہے کہ یہ مباحثہ خاندانی لڑائی جھگڑے میں تبدیل نہ ہو۔ آپ کا رویہ ہونا چاہیے کہ مسئلے کو حل کرنا ہے، اسے بگاڑنا نہیں ہے۔ آپ اپنے شوہر کو بتادیجیے کہ اگر وہ دوسری بیوی لائے

تو آپ کے جذبات و احساسات کیا ہوں گے اور یہ کہ اس صورت میں آپ کا ان کے ساتھ رہنا ممکن نہیں ہوگا۔ تاہم اس بیان کا انداز انتہائی نہیں ہونا چاہیے بلکہ سمجھانے والا اور ہمدردانہ ہونا چاہیے۔ اگر آپ یہ واضح کردیں کہ آپ بدستور ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں لیکن یہ بات پسند نہیں کرتیں کہ سر پر ہر وقت شوہر کی دوسری شادی کی دھمکی کی تلوار لٹکی رہے۔ اگر آپ کے شوہر سمجھ دار ہیں تو وہ آپ کے مسئلے اور جذبات کو سمجھیں گے اور اپنا طرز عمل تبدیل کرلیں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو سکون قلب اور خوشیاں عطا فرمائے۔

دوسری شادی کن حالات میں کرنی چاہیے؟

سوال: کن حالات میں مرد کو دوسری شادی کرنی چاہیے؟ وہ عام حالات اور شرائط کیا ہوسکتی ہیں جن کے نتیجے میں دوسری شادی کی جاسکے؟

جواب: یہ سوال ان سوالات میں سے ایک ہے جو بار بار سامنے آتے رہتے ہیں۔ قارئین مختلف النوع اسباب بیان کرتے ہوئے یہ پوچھتے ہیں کہ درپیش مخصوص حالات میں کیا وہ دوسری یا تیسری یا چوتھی شادی کرسکتے ہیں؟ یہ سوال بھی اکثر پوچھا جاتا ہے کہ دوسری شادی کی صورت میں کیا پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہے۔ بعض مرتبہ یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کیا شوہر کو اپنی پہلی بیوی کو ذاتی طور پر اپنے فیصلے کے بارے میں بتادینا چاہیے یا نہیں بتانا چاہیے۔ بعض حضرات سوال کرتے ہیں کہ دوسری شادی سے پہلے شوہر کو اپنی پہلی بیوی کے معاملے میں تمام حقوق و فرائض کی ادائیگی کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ بعض قارئین کہتے ہیں کہ ان کی زوجہ بچوں کی اور گھر کی دیکھ بھال نہایت مناسب طریقے سے کرتی ہیں، لیکن مباشرت کے عمل سے انکار کردیتی ہیں۔ اس لیے ان کا سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر صورتحال طویل عرصے جاری رہے تو کیا اس سے ان کی شادی کے جائز ہونے پر کوئی اثر پڑسکتا ہے؟

ان مختلف سوالات کے جواب دینے سے پہلے میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کثرت ازدواج کی اجازت دیتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مرد بیک وقت چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ مردوں کو ایک سے زیادہ شادی کی یہ اجازت ایک جانب سے بہت سے سماجی اور خاندانی مسائل کا حل پیش کرتی ہے اور دوسری جانب مسلم معاشرے میں اخلاقی اقدار کے اعلیٰ معیار کی ضمانت ہے۔ لیکن ایک مسئلے کے حل کے نتیجے میں کوئی دوسرا مسئلہ پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم سب اس بات سے واقف ہیں کہ اسلام، ناانصافی کو سخت ناپسند کرتا ہے، خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو اور اس

ناانصافی کا شکار کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ ایک مرد اور اس کی دو یا دو سے زائد بیویوں کے درمیان تعلق بہت آسانی سے ناانصافی کی شکل اختیار کرسکتا ہے۔ کوئی ایک بیوی ناانصافی کا شکار ہوسکتی ہے اور دوسری بیوی کو مرد کی خصوصی توجہ اور اس کے نتیجے میں گھر کے اخراجات کے لیے زیادہ رقم مل سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ان قاری کا معاملہ لیجیے جنھوں نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے کہ ایک شوہر کی زوجہ، شوہر کی فطری خواہش کی تکمیل سے انکار کرتی ہیں۔ اگر یہ شوہر دوسری شادی کرلے اور دوسری بیوی کو دوسری شادی کی وجہ معلوم ہوجائے تو وہ نہایت چالاکی کے ساتھ شوہر کو اپنی جانب زیادہ راغب کرسکتی ہے۔ اگر شوہر کی رغبت صرف جذبات کی حد تک رہے تو درست ہے۔ لیکن اگر شوہر دوسری بیوی کی محبت میں دیوانہ ہوجائے اور اسے تحائف اور اس کی پسند و آرام کی اشیاء فراہم کرنے لگے اور اپنا زیادہ وقت دوسری بیوی کے ساتھ بسر کرے تو یہ صورتحال پہلی بیوی کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

ہر اس شخص پر جس نے ایک سے زیادہ شادیاں کی ہوں، یہ پابندی عائد ہوتی ہے کہ وہ تمام بیویوں کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔ اس پر لازم ہے کہ ہر بیوی کو زندگی کی سہولتیں یکساں معیار کی فراہم کرے۔ دوسری بیویوں کے مقابلے میں اسے کسی ایک بیوی کے ساتھ زیادہ التفات کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہی اصول اس رہائش گاہ کے بارے میں بھی منطبق ہوگا جس میں وہ اپنی ازواج کو رکھتا ہو، یعنی سب کو ایک جیسی، ایک معیار کی، یکساں سہولتوں کی حامل رہائش فراہم کرنی ہوگی۔ ہر بیوی کو گھر کے اخراجات کے لیے یکساں رقم دینی ہوگی۔ لباس، زیوارت اور گھریلو و ذاتی استعمال کی دیگر اشیاء کی فراہمی میں بھی مساوات کے اسی اصول کی سختی سے پابندی کرنا ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی راتیں بھی ازواج میں یکساں تقسیم کرنا ہوں گی اور اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ ہر بیوی کے گھر کی ضروریات پوری ہو۔ ایک سے زائد بیویوں کی صورت میں انصاف کے تقاضوں کو جس طرح پورا کیا جانا چاہیے، اس کی عملی مثال ہمیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز سہ پہر کو اپنی ہر زوجہ مطہرہ (رضی اللہ عنہ) کے یہاں تشریف لے جاتے اور ان کی خیریت دریافت فرماتے اس کے ساتھ ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ بھی پوچھتے کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی ان زوجہ (رضی اللہ عنہا) کے یہاں تشریف لے جاتے جن کے یہاں وہ شب بسر کرنی ہوتی۔ ازواج مطہرات میں سے ہر ایک کے لیے ایک شب مقرر تھی۔

مذہبی اعتبار سے دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری نہیں ہے۔ دوسری شادی کی اجازت اسلام نے دی ہے اور اس بات سے ہر مسلمان مرد اور عورت واقف ہے۔ جب ایک عورت کی شادی ہوتی ہے تو وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہوتی ہے کہ اسلام نے اس کے

شوہر کو دوسری، تیسری اور چوتھی شادی کی اجازت دے رکھی ہے۔ دوسری شادی سے پہلے، پہلی بیوی کو شادی کے بارے میں بتانا اسے شادی کی تقریب میں بلانا، ایسے معاملات ہیں جن کا فیصلہ ہر شخص اپنے حالات کے پیش نظر کرسکتا ہے۔ ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اگر کسی عورت سے اس معاملے میں اس کی مرضی معلوم کی جائے تو وہ کبھی بھی یہ پسند نہیں کرے گی کہ کوئی دوسری عورت اس کے شوہر میں حصہ دار ہو۔ بعض خواتین ان معاملات سے آگاہ ہوتی ہیں جن کے نتیجے میں ان کی شادی مسائل کا شکار ہوسکتی ہے۔ تاہم بعض خواتین اپنی جانب سے بڑی قربانی دے کر ایسے معاملے میں مددگار ہوتی ہیں۔ میں ایک خاتون سے واقف ہوں جنہوں نے اپنے شوہر کو تجویز کیا کہ وہ دوسری شادی کرلیں۔ جب شادی کے انتظامات کیے جارہے تھے تو مذکورہ خاتون نے ہر مرحلے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور دلہن کے لیے شادی کا لباس خود خرید کر لائیں تاہم انہوں نے تقریب میں شرکت نہیں کی۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگر پہلی بیوی کے شوہر نے دوسری شادی کرلی ہو اور پہلی بیوی کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہو کہ کوئی دوسری عورت اس کی سوکن بنے تو وہ خلع کا مطالبہ کرسکتی ہے اور اسلامی عدالت سے ایسی خاتون کو خلع مل جائے گا۔ ہر وہ شخص جو دوسری شادی کا ارادہ کرتا ہے وہ اس شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل سے بھی واقف ہوتا ہے۔ دوسری شادی کوئی آسان قدم نہیں ہے۔ اس اقدام کے نتیجے میں اس کی پوری گھریلو زندگی پر اثر پڑسکتا ہے۔ اس لیے بیشتر حضرات کو دوسری شادی کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ان مسائل کو دوسری شادی کے بغیر ہی حل کرنے کے راستے تلاش کریں، جن کی وجہ سے انہیں یہ فیصلہ کرنا پڑ رہا ہو۔ ایک بار پھر ان شوہر کی مثال لیجیے جن کی بیوی نے ان کی فطری خواہش کی تکمیل سے انکار کیا۔ اس معاملے میں بہتر یہ ہوگا کہ شوہر نہایت دوستانہ ماحول میں اس موضوع پر اپنی بیوی سے بات کریں اور ان پر یہ واضح کریں کہ شوہر کی فطری خواہش کی تکمیل ان کا فرض ہے اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے وہ اپنے شوہر کو اسلامی اخلاق کا مطلوبہ معیار قائم رکھنے میں مدد دے سکتی ہیں۔ اگر انہوں نے اس عمل سے انکار کیا تو شوہر پر غیر ضروری بوجھ پڑے گا۔ شوہر اور بیوی دونوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایک دوسرے کی عصمت کی پاکیزگی قائم رکھنے میں معاون ہوں اور اگر پہلی شادی کے ذریعے یہ مقصد پورا نہیں ہورہا ہے تو مرد کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا جائز راستہ نہیں رہتا کہ وہ دوسری شادی کرے۔ دوسری شادی کے فیصلے سے پہلے، پہلی بیوی کو دو باتوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا موقع ضرور دینا چاہیے کہ یا تو وہ شوہر کی خواہشات کی تکمیل میں معاون ہو یا پھر اس بات کے لیے تیار رہے کہ شوہر دوسری شادی کرلے گا۔ اگر بیوی کا انکار

بدستور رہے تو شوہر کو وہ اسباب تلاش کرنے چاہئیں جو اس انکار کی وجہ بنے ہیں۔ ممکن ہے ان اسباب کو دور کر کے صورتحال بہتر ہو سکتی ہو۔

بہر حال دوسری شادی کے لیے بنیادی شرط یہی ہے کہ شوہر دونوں بیویوں کے ساتھ زندگی کے ہر معاملے میں مساوات قائم رکھے۔ دوسری شادی کے بارے میں حتمی فیصلے سے قبل شوہر کو ان تمام ممکنہ نتائج وعواقب کا بہت غور سے جائزہ لینا چاہیے جو اس کے اس اقدام کے بعد اس کی اپنی زندگی اور اس کے خاندان کی زندگی میں رونما ہو سکتے ہیں۔ بصورت دیگر شوہر کا یہ فیصلہ نہ صرف اس کی بیویوں اور بچوں کے لیے ناانصافی کا باعث ہوگا بلکہ خود اس کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

شوہر کی دوسری شادی اور پہلی بیوی کا رویہ

سوال: اسلام واحد مذہب ہے جو کثرت ازواج کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام میں کسی کا دل توڑنا سخت گناہ ہے۔ جب ایک شخص دوسری شادی کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں پہلی بیوی شدید مایوسی، دل شکستگی اور یاسیت کا شکار ہو جاتی ہے اور بعض اوقات انتقامی جذبے کے تحت اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب بھی ہو سکتی ہے۔ براہ کرم اس صورتحال کے بارے میں اظہار خیال فرمایئے۔

جواب: اگر کوئی عورت، اپنے شوہر کے دوسری شادی کے فیصلے اور اقدام کے نتیجے میں انتقامی کارروائی کے طور پر کسی گناہ کے ارتکاب کا ارادہ کرتی ہے تو وہ خود کو نہایت سنگین صورتحال میں مبتلا کر لیتی ہے، بلکہ درحقیقت وہ اس قسم کی حرکت سے خود کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک نہایت سخت سزا کے لیے بے نقاب کر دیتی ہے۔ زنا قطعی ممنوع ہے، خواہ وہ کسی بھی وجہ سے کیا جائے۔ زنا ایک بنیادی نوعیت کا گناہ ہے۔ کوئی بھی مسلمان اسے بالارادہ نہیں کر سکتا، خواہ اس کے اسباب کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر ایک شادی شدہ خاتون اپنے شوہر سے انتقام کے جذبے کے تحت اس گناہ کی مرتکب ہوتی ہے تو شوہر سے زیادہ خود اپنے آپ کو نقصان پہنچاتی ہے۔ وہ خود کو اللہ کی سزا کا حقدار ٹھہرا لیتی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ اس نے عمداً اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی کی ہے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ شوہر نے ایک ایسا کام کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت دی ہے جب کہ اس کے جواب میں عورت وہ کام کرنے جارہی ہے جس کی نہ صرف اجازت نہیں ہے بلکہ وہ ایک سنگین گناہ بھی ہے۔

یہ بات درست ہے کہ کوئی بھی عورت یہ پسند نہیں کرتی کہ کوئی دوسری عورت اس کے شوہر کی شریک ہو، لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ اسلام مرد کو ایک سے زائد شادی کی اجازت دیتا ہے۔ دوسری شادی کے نتیجہ میں عورت مایوس اور دل شکستہ ہوسکتی ہے لیکن اس بات کا اسے شادی سے پہلے علم ہوتا ہے کہ شوہر اس کے علاوہ تین بیویاں مزید رکھ سکتا ہے۔ اگر شوہر اپنے حق کا استعمال کرتا ہے تو اس کے اس اقدام کو کسی گناہ کے ارتکاب کا جواز نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر کسی عورت کو شوہر کی دوسری شادی پر اعتراض ہے تو وہ خلع لے سکتی ہے۔ اس کے لیے اسے صرف قاضی کی عدالت میں درخواست دینی ہوگی کہ شوہر کی دوسری شادی اس کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ ایک مسلمان قاضی اس درخواست کی بنیاد پر خلع کا فیصلہ دے دے گا لیکن اس صورت میں اسے مہر کی رقم معاف کرنا ہوگی۔

ایک عورت کے دو شوہر

سوال: شوہر کے ساتھ ڈھائی سال کا عرصہ گزارنے کے بعد ایک خاتون اپنے عزیزوں سے ملنے وطن چلی گئیں۔ شوہر کے ساتھ قیام کے دوران ان کے یہاں ایک بیٹا بھی ہوا۔ شوہر نے بیرون وطن ملازمت جاری رکھی۔ کئی ماہ بعد شوہر کو یہ اطلاع ملی کہ اس کی بیوی کسی اور مرد کے ساتھ رہ رہی ہے۔ شوہر حقیقت حال کا پتا لگانے وطن گئے تو انکشاف ہوا کہ مذکورہ خاتون نے دوسرے مرد سے شادی کرلی ہے اور اس کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ چونکہ یہ معاملہ ایک غیر مسلم ملک میں ہوا، اس لیے خاتون کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ اس قسم کی شرمناک زندگی بسر کریں۔ آپ سے سوال یہ ہے کہ بیان کی گئی صورتحال میں بچہ کس کے پاس رہے گا۔ کیا خاتون کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے فعل پر نادم ہوں اور تائب ہوجائیں۔ کیا پہلے شوہر کے ساتھ ان کا نکاح ہنوز مؤثر رہے گا۔ کیا شوہر کو یہ اجازت ہے کہ وہ خاتون کو دوبارہ بیوی کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھے اور کیا شوہر کا یہ عمل اسلام کے مطابق ہوگا؟

جواب: آپ نے سوال میں جن خاتون کا ذکر کیا ہے انہوں نے دوسرے مرد کے ساتھ اپنا تعلق شادی کے معاہدے کے ذریعے قائم کیا ہوگا۔ اس قسم کے کسی بھی معاہدے کے لیے جب وہ نکاح رجسٹرار کے سامنے پیش ہوئی ہوں گی تو انہوں نے لازماً یہ جھوٹ بولا ہوگا کہ وہ غیر شادی شدہ ہیں۔ میری معلومات کے مطابق، دنیا کے کسی بھی ملک کا قانون ایک وقت میں عورت کو ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تاریخ کے گم گشتہ کسی دور میں اس طریقے کا ذکر ملتا ہے اور

ممکن ہے کہ دنیا کے دورافتادہ کسی علاقے میں اس پر آج بھی عمل کیا جارہا ہو، لیکن مہذب دنیا میں قانونی طور پر عورت کو ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے عورت کو بیک وقت ایک سے زیادہ شادی کی قطعی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اگر ایک شادی شدہ خاتون، کسی دوسرے مرد سے شادی کے عمل سے گزرتی ہے تو یہ پورا عمل ایک چیستاں ہوگا۔ دوسرے مرد سے اس کا تعلق زنا کے زمرے میں آئے گا، جسے کسی بھی طور شادی نہیں کہا جاسکتا۔ اگر اس تعلق کے نتیجے میں بچہ پیدا ہو تو وہ غیر قانونی ہوگا۔

ایسی خاتون کے پہلے شوہر (پہلا شوہر صرف بیان کو واضح کرنے کے لیے کہا جارہا ہے، کیونکہ درحقیقت دوسرا مرد، شوہر نہیں ہوسکتا) کا حق زوجیت بدستور رہے گا۔ اگر شوہر، بیوی کو طلاق دے دے تو بچہ شوہر کے پاس رہے گا۔ طلاق کے عام معاملے میں سات برس کی عمر تک بچہ ماں کے پاس رہ سکتا ہے لیکن اس معاملے میں شوہر کا بچہ کو اپنے زیر پرورش لینے کی بنیاد یہ ہوگی کہ ماں بچے کی پرورش کے لیے ناموزوں ہے کیونکہ وہ اسلام کی اخلاقی اقدار سے انحراف کرتی ہے۔

آپ نے یہ سوال بھی کیا ہے کہ کیا شوہر، اپنی بیوی سے دوبارہ تعلق رکھ سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کی شادی بدستور قائم ہے، کیونکہ طلاق یا کسی ایک فریق کی وفات کی وجہ سے یہ ختم نہیں ہوئی ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ ایسی صورتحال میں دونوں کو دوبارہ ساتھ رہنا چاہیے یا نہیں۔ اگر شوہر مذکورہ خاتون کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی جاری رکھنا چاہتا ہے تو اسے یہ بات یقینی بنانی چاہیے کہ اس کی بیوی ایک دوسرے مرد کے ساتھ ناجائز تعلق پر نادم اور شرمندہ ہے اور اس سے تائب ہوچکی ہے۔ اس یقین دہانی کے بغیر، ایسی عورت کے ساتھ رہنے سے اسے ان اثرات کا اندازہ کرلینا چاہیے جو اس کے بچوں پر مرتب ہوسکتے ہیں۔

آپ نے یہ بھی پوچھا ہے کہ کیا مذکورہ خاتون کے لیے معافی کی گنجائش ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر گناہ گار کے لیے توبہ کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کی توبہ قبول کرتے ہیں جو صدق دل اور خلوص نیت کے ساتھ اپنے گناہوں کی معافی چاہے۔ حقیقی توبہ کے لیے یہ پختہ ارادہ بنیادی ضرورت ہے کہ وہ فعل دوبارہ سرزد نہیں ہوگا۔ اگر مذکورہ خاتون اپنے فعل پر حقیقتاً پشیمان ہیں تو انہیں اپنی توبہ کا اعلان کرنا چاہیے اور یہ وعدہ کرنا چاہیے کہ وہ آئندہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ اس قسم کا تعلق نہیں رکھیں گی۔

آپ کا سوال ہے کہ ایسی خاتون کو اسلامی حدود میں رکھنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی ایسا طریقہ تجویز نہیں کرسکتا جو آپ کے سوال کا جواب ہوسکے۔ اس سوال کا جواب تو متعلقہ خاتون ہی دے سکتی ہیں۔ اگر وہ اس قسم کا قابل مذمت فعل جاری رکھنا چاہتی ہیں تو

کوئی بھی شخص ان پر ایسی پابندیاں عائد نہیں کرسکتا جو انہیں اسلامی حدود میں رکھیں اور اگر وہ اپنی توبہ میں مخلص ہیں تو ان کے شوہر کو یہ بات یقینی بنانی چاہیے کہ ان کی بیوی اسلامی تعلیمات کو صحیح طریقے سے سمجھیں۔ بعض لوگ کسی جرم کی سنگینی کے علم کے بغیر اس کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

بیوہ کو کس طرح سوگ منانا چاہیے

سوال: اسلام میں کسی شخص کے انتقال پر سوگ منانے کا طریقہ کیا ہے۔ اگر ایک عورت کا شوہر انتقال کر جائے تو اسے کس طرح سوگ منانا چاہیے؟

جواب: مسلمان، بالعموم موت کو ایک ایسا عمل سمجھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لیے مقدر کیا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی عقیدے کے مطابق موت اس دنیا کی زندگی سے آخرت کی زندگی میں تبادلے کا نام ہے۔ موت انسانی زندگی کا حتمی خاتمہ نہیں ہے، لہٰذا مسلمانوں کو کسی کی موت پر بے انتہا غم و افسوس کے جذبات کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے یا اس طرح سوگ نہیں منانا چاہیے جیسا کہ غیر مسلم مناتے ہیں۔ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے نزدیک موت انسانی زندگی کا حتمی خاتمہ ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ بات قطعی ناقابل قبول ہے۔ اس لیے کسی کی وفات پر سوگ منانے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ مسلمان کسی کے انتقال پر نہ تو کوئی خاص لباس پہنتے ہیں نہ کوئی خاص رنگ استعمال کرتے ہیں جو یہ ظاہر کرے کہ ہم اپنے کسی عزیز کا سوگ منا رہے ہیں۔ کسی مسلمان مرد کو سیاہ ٹائی اس لیے نہیں پہننی چاہیے کہ وہ تعزیت وصول کرے۔ کسی شخص کے انتقال کے بعد پہلے تین دن تک تعزیت کی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص دور گیا ہوا ہو تو وہ واپس آنے پر متوفی کے اہل خانہ سے تعزیت کر سکتا ہے۔

مردوں کی طرح خواتین کو بھی اپنے شوہر کے علاوہ کسی بھی عزیز کی وفات کا تین دن سے زیادہ سوگ نہیں منانا چاہیے۔ شوہر کی وفات کی صورت میں یہ عرصہ طویل ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

> ''کسی مومن کے لیے یہ جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ سوگ منائے، البتہ بیوہ کے سوگ کی مدت چار مہینے دس دن ہے۔ اس مدت میں نہ وہ کوئی رنگین کپڑا پہنے، نہ خوشبو لگائے اور نہ کوئی اور بناؤ سنگھار کرے۔'' (ترمذی)

بخاری اور مسلم کی ایک اور حدیث میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ بیوہ کو عدت کے دوران کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ بیوہ عدت کے عرصے میں سرمہ نہیں لگا سکتی، زیور نہیں

پہن سکتی، ریشمی لباس، خوشبو اور میک اپ استعمال نہیں کر سکتی۔ اگر عورت اپنے بیٹے، والد یا بھائی یا کسی اور عزیز کے انتقال پر سوگ کر رہی ہے تو اس سوگ کی مدت تین دن ہوگی، لیکن شوہر کی وفات پر سوگ کی مدت وہی ہوگی جو اس کی عدت کا عرصہ ہوگا۔

یہ بات بالعموم سب کو معلوم ہے کہ شوہر کے انتقال کے بعد بیوہ کی عدت کا عرصہ چار ماہ دس دن کا ہوتا ہے۔ اگر بیوہ حمل سے ہے تو اس صورت میں عدت کا عرصہ بچے کی ولادت تک ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کے لیے سوگ کی جو حدود متعین کر دی ہیں، عورت کو ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

غیر قانونی اولاد

سوال: اگر ایک جوڑے کے یہاں غیر قانونی طور پر بچے کی ولادت ہوئی تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اسلامی شریعت کے احکامات کے مطابق اگر کوئی غیر شادی شدہ عورت حاملہ ہو جاتی ہے، تو یہ زنا کا ناقابل تردید ثبوت مانا جاتا ہے اور اسلام میں یہ فعل قابل سزا ہے۔ اس فعل میں ملوث مرد اور عورت، دونوں کے لیے یکساں سزا مقرر ہے۔ والدین کے جرم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ زنا کے مرتکب شخص کو اپنے فعل پر نادم ہونا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے اس گناہ کی معافی طلب کرنی چاہیے۔ ایک حکم جو ہر قسم کے گناہوں کے ارتکاب پر لاگو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جرم کے مرتکب کو اپنے جرم کی تشہیر نہیں کرنی چاہیے۔ یہ حکم یہاں بھی لاگو ہوگا۔ اگر زنا کا مرتکب ایک شخص اپنے گناہ کا اعتراف کر لیتا ہے یا چار افراد اسے گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھ لیتے ہیں اور اس کی شہادت دیتے ہیں تو اس شخص پر حد جاری ہونی چاہیے۔ گناہ کے ارتکاب کے بعد، عورت کا حمل وضع ہونے پر اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اگر مرد اور عورت نے شادی کر لی تو ان کا یہ اقدام درست ہوگا، خاص طور پر اس صورت میں جب وہ اپنی غلطی پر پشیمان ہوں اور اللہ سے معافی کے خواستگار رہے ہوں۔ یہ جوڑا اللہ کی رحمت سے توقع کر سکتا ہے کہ ان کا گناہ معاف کر دیا جائے گا۔ اس صورتحال میں شوہر اگر خود کو بچے کا والد قرار دے تو اس کا یہ دعویٰ تسلیم کیا جائے گا اور اس سلسلہ میں یہ سوال نہیں کیا جانا چاہیے کہ حمل کب قائم ہوا اور یہ کہ بچہ جائز ہے یا ناجائز۔

غیر مرد سے بچے کی مشابہت

سوال: ایک خاتون کے ہاں بچے کی پیدائش عمل میں آئی تو انہوں نے دیکھا کہ بچہ شکل وصورت کے اعتبار سے نہ تو اپنی ماں کے مشابہ ہے اور نہ باپ سے۔ البتہ بچے کی صورت ایک اور شخص سے ملتی ہے جو خاتون کے مکان میں ہی رہائش پذیر ہے۔ کیا ایسی صورت میں خاتون پر کسی قسم کا شک کیا جاسکتا ہے؟

جواب: کسی اور ثبوت کی غیر موجودگی میں محض بچے اور مذکورہ شخص کی صورتوں میں مماثلت، بچے کو ناجائز قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ کسی پر حرام کاری کا الزام لگانے سے قبل ٹھوس اور واضح ثبوت فراہم کیا جائے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایک نوزائیدہ بچے اور ایک بالغ شخص کی صورتوں میں مماثلت تلاش کرنا یوں بھی مشکل ہے کیونکہ بچے کی شکل وصورت واضح ہونے اور اس کے ایک منفرد انداز اختیار کرنے میں وقت لگتا ہے۔

ضبط ولادت

سوال: اگر میاں بیوی کی یہ خواہش ہو کہ ان کے یہاں ایک سے زائد بچہ نہ ہو تو کیا وہ ضبط ولادت کے طریقے اختیار کر سکتے ہیں؟

جواب: حمل قرار پانے کو روکنے کی اجازت ہے بشرطیکہ اختیار کیے جانے والے طریقے سے زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ مانع حمل گولیاں مشتبہ ہیں۔ چھلے کا استعمال انتہائی مشکوک ہے، کنڈوم کی اجازت ہے، اسقاط حمل کی اجازت نہیں ہے۔

طلاق کے بعد عدت کی ضرورت اور دوسری شادی

سوال: طلاق کے بعد دوسری شادی کے سلسلے میں میری ایک عزیزہ کے لیے ایک صاحب کا رشتہ آیا، جن صاحب نے رشتہ دیا، وہ اپنے بعض حالات کی وجہ سے یہ چاہتے ہیں کہ نکاح جلد ہو جائے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مطلقہ کی عدت پوری نہیں ہوئی ہے۔ طلاق کے بعد مطلقہ عورت کی عدت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر مطلقہ طلاق سے پہلے حاملہ ہوگئی ہو تو اس عرصہ میں یہ بات ظاہر ہو جائے۔ کیا اس بات کی اجازت ہے کہ لیبارٹری ٹیسٹ کے ذریعے حمل کے ہونے یا نہ ہونے کا تعین کر لیا جائے اور

اگر یہ معلوم ہو جائے کہ خاتون حمل سے نہیں ہیں تو عدت ختم ہونے سے پہلے نکاح کیا جا سکتا ہے؟

جواب: یہ بات تو درست ہے کہ طلاق کے بعد عورت کے لیے عدت کی پابندی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ حمل کے ہونے یا نہ ہونے کا علم ہو جائے لیکن کسی بھی صورت میں عدت کا محض یہ ایک مقصد نہیں ہے۔ اس مخصوص معاملے میں ایک بیوہ اور ایک مطلقہ کی عدت میں فرق ہے۔ بیوہ خاتون کے معاملے میں عدت کی مدت زیادہ ہوتی ہے تاکہ حمل کے ہونے یا نہ ہونے کا یقینی تعین کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں عدت کی پابندی اس بات کی بھی علامت ہے کہ بیوہ خاتون اپنے متوفی شوہر کے ساتھ تعلق کا احترام کرتی ہے اور شوہر کی وفات کے فوراً ہی بعد کسی دوسرے مرد کیساتھ تعلق نہیں رکھتی۔

مطلقہ عورت کی صورت میں بعض قوانین نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ مطلقہ عورت کی عدت کے عرصہ کا شمار دنوں یا مہینوں میں نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے ایام حیض سے کیا جاتا ہے۔ اگر مطلقہ خاتون کے حمل نہیں ہے تو اس کی عدت طہر (حیض سے پاک ہونا) ہوگی۔ اگر خاتون کی عمر بہت زیادہ یا بہت کم ہو (جس کی وجہ سے ایام حیض نہ ہوتے ہوں) تو اس صورت میں عدت کا عرصہ تین ماہ ہوگا۔ اگر مطلقہ خاتون حمل سے ہے تو اس صورت میں اس کی مدت بچے کی ولادت تک جاری رہے گی۔

عدت کی مدت خواہ کوئی بھی ہو، عدت کے دوران مطلقہ اپنے سابقہ شوہر کے گھر میں رہے گی۔ کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ طلاق کے بعد عورت کو اپنے گھر سے نکالے اور نہ عورت کو سابقہ شوہر کا گھر چھوڑنا چاہیے۔ عدت کی پوری مدت میں عورت کے اخراجات کی ذمے داری مرد پر عائد ہوتی ہے اگر دونوں میں اتفاق رائے ہو جائے تو وہ رشتہ ازدواج دوبارہ قائم کر سکتے ہیں (بشرطیکہ ۲ طلاقیں دی گئی ہوں) اس کے لیے انہیں نئے سرے سے نکاح کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

کوئی مطلقہ خاتون جب عرصہ عدت میں ہو تو اسے دوسری شادی کے لیے کسی بھی شخص کا رشتہ قبول نہیں کرنا چاہیے۔ نہ ہی کسی مرد کو یہ اجازت ہے کہ وہ عدت کے عرصے کے دوران مطلقہ خاتون کو رشتہ دے یا شادی کا وعدہ کرے۔ اگر مرد کچھ کر سکتا ہے تو صرف یہ کہ اشارتاً اپنے ارادے کا ذکر کر دے۔

مندرجہ بالا بحث کی بنیاد پر آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایک ڈاکٹر طبی جانچ کے بعد یہ رائے دے سکتا ہے کہ مطلقہ خاتون حمل سے نہیں ہے لیکن خاتون کی دوسری شادی کے لیے یہ رائے کافی نہیں ہے۔ مطلقہ خاتون کے پہلے شوہر کا یہ حق کہ وہ عدت کے دوران رجوع کر لے،

آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بالفرض سابقہ شوہر کو مطلقہ خاتون کی دوسری شادی پر کوئی اعتراض نہ ہو، تب بھی اللہ کے عائد کردہ قانون کو نہیں توڑا جا سکتا۔

طلاق کی اجازت

سوال: شادی کے دو ہفتے بعد مجھے علم ہوا کہ میری بیوی اور میرے ایک عزیز کے درمیان تعلق رہا ہے۔ میں نے اس بنیاد پر بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا ہے تاہم میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ایسے معاملات میں اسلام کیا مشورہ دیتا ہے؟

جواب: آپ نے اپنے خط میں جو تفصیلات دی ہیں انہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا طلاق کا فیصلہ غالباً درست ہے۔ ہر مسلمان اور یقیناً ہر سمجھ دار شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی وفادار ہو جو خود اپنی اور اپنے شوہر کی عزت و ناموس کی حفاظت کرے۔ آپ نے جس خاتون سے شادی کی ہے لگتا ہے کہ وہ اس بات کی اہل نہیں ہیں۔ اس معاملے کو جلد اور بغیر کسی فضیحتے کے نمٹانے کے لیے آپ کو اپنی بیوی سے صرف یہ کہنا ہے کہ ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔'' یہ الفاظ صرف ایک بار کہیں۔ انہیں تین مرتبہ دہرانے کی غلطی نہ کریں کیونکہ اس کی ممانعت ہے۔ اس کام کے لیے آپ کو درست وقت کا انتخاب کرنا چاہیے یعنی ایسا وقت جب آپ کی بیوی ایام سے نہ ہوں اور ایام ختم ہونے کے بعد آپ نے صحبت نہ کی ہو۔ صحبت کی صورت میں آپ کو اگلے ایام کے خاتمے تک انتظار کرنا ہوگا۔ آپ کے لیے بہتر ہوگا کہ آپ بیوی کا مہر ادا کر دیں اور عدت کے عرصے میں انہیں اخراجات کے لیے رقم دیتے رہیں اس طرح آپ کسی الجھن کے بغیر طلاق دے دیں گے۔

اس معاملے میں یہ دلیل دینا آسان ہے کہ چونکہ اس شادی میں دھوکہ دہی کا عنصر تھا اس لیے مطلقہ مہر کی حق دار نہیں ہے۔ یہ دعویٰ بالکل درست ہے اور اگر آپ چاہیں تو اس کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔ تاہم اگر آپ اس پر اصرار کریں گے تو ممکن ہے اس سے پیچیدگیاں اور خاندان کے اندر نفاق پیدا ہو۔ اس لیے جلد اور آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ بغیر کسی فساد کے اس معاملے کو نپٹا دیں۔

یہاں میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایسے معاملے میں جہاں شوہر اپنی بیوی کو اس کے کردار کی بناء پر طلاق دے رہا ہو وہاں صورتحال کا ہر پہلو سے بغور جائزہ لینا چاہیے۔ اگر شوہر یہ محسوس کرے کہ بیوی سے کوئی غلطی اتفاقاً سرزد ہوگئی ہے ورنہ وہ اچھے کردار کی مالک ہے تو اس صورت میں شوہر کو چاہیے کہ کمزوری پر قابو پانے میں بیوی کی مدد کرے اور اس کی غلطی نظر انداز

کردے۔ بیوی ایک اچھی شریک حیات ہے اور اسلام کی اخلاقی اقدار و روایات پر عمل کرتی ہے تو اس صورت میں طلاق کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن آپ کے معاملے میں بہت سی پیچیدگیاں ہیں جس کی وجہ سے یہ متبادل صورت اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔

شادی کے آٹھ ماہ بعد بچے کی پیدائش

سوال: یہاں میرے ساتھ کام کرنے والا ایک شخص گزشتہ دسمبر میں چھٹیوں پر وطن گیا، جہاں اس کی اسی ماہ شادی ہوگئی۔ جنوری کے آخر میں اس کی اہلیہ کے ماں بننے کے کچھ آثار پیدا ہوئے تو وہ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا، ڈاکٹر نے کوئی رائے ظاہر کیے بغیر انہیں دو ہفتے بعد بلایا۔ دو ہفتے بعد جب وہ شخص اپنی اہلیہ کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا تو ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی اہلیہ ڈھائی ماہ سے حاملہ ہیں۔ ایک ماہ بعد اس نے اس بات کی تصدیق کردی۔ ۲۶ اگست کو یعنی شادی کے صرف آٹھ ماہ بعد خاتون نے ایک صحت مند بچی کو جنم دیا۔ یہ مدت اس وقت مشکوک ہوجاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی خاتون نے متلی اور قے کی شکایت شروع کردی تھی جو حاملہ ہونے کی نشانی ہے۔ بہرحال اس شخص کے والدین اس پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے کیونکہ خاتون کے کردار پر انہیں شک ہے۔ جب اس شخص نے اپنی بیوی سے اس معاملے پر بات کی تو اس نے کسی اور شخص سے کسی قسم کے تعلق سے انکار کیا۔ یہ شخص اپنی بیوی اور بچی سے کسی قسم کی ناانصافی نہیں کرنا چاہتا۔ آپ کی رائے میں اسے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: آپ نے جو صورت بیان کی ہے اس میں شک وشبہ پیدا ہونے کے لیے ممکن ہے کوئی بنیاد ہو لیکن کوئی فیصلہ کرنے کے لیے واضح ثبوت ہونا چاہیے اور شک وشبہ کو واضح ثبوت کے طور پر نہیں لیا جاسکتا۔ آپ نے اپنے دوست کی شادی کی تاریخ نہیں لکھی، بہرحال آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے دوست اپنی اہلیہ کو شادی کے پانچ ہفتے بعد ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور بچی کی پیدائش شادی کو ۹ ماہ مکمل ہونے سے صرف تین ہفتے قبل عمل میں آئی۔ اس مدت کو قبل از وقت نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ آپ کے دوست کی اہلیہ کے پہلی بار معائنہ کے وقت ڈاکٹر اس بات کا تعین نہیں کرسکی تھی کہ خاتون حاملہ ہیں یا نہیں، ڈاکٹر نے انہیں دو ہفتے بعد آنے کا مشورہ دیا۔ یہ بات اس نکتہ کے حق میں جاتی ہے کہ خاتون شادی سے پہلے حاملہ نہ تھیں۔ اگر اس وقت انہیں دو ماہ کا حمل تھا تو ڈاکٹر کو اسی وقت تصدیق کردینی چاہیے تھی۔ صرف دو ہفتے بعد ڈاکٹر کا یہ کہنا کہ خاتون ڈھائی ماہ سے حاملہ ہیں، حیرت انگیز ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر حمل کی مدت کے بارے میں محض

اندازے ہی سے کوئی بات کہتے ہیں۔ ان کے خیال کو کسی ٹھوس حقیقت کے طور پر نہیں قبول کیا جاسکتا۔ ممکن ہے ڈاکٹر سے اندازے کی غلطی ہوئی ہو۔

خاتون کے شادی سے قبل حاملہ ہونے کے سلسلے میں غالباً جو واحد علامت ملتی ہے وہ یہ ہے کہ شادی کے چند ہی دنوں بعد خاتون کو قے اور متلی کی شکایت ہوئی، حمل ٹھہرنے کی یہ علامت عام طور پر حمل قرار پانے کے چار ہفتے بعد ظاہر ہوتی ہے لیکن کیا آپ کے دوست کو یقین ہے کہ جب یہ علامت ظاہر ہوئی اس وقت شادی کو صرف ایک ہفتہ گزرا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس وقت تین ہفتے گزر چکے ہوں۔ آپ کے دوست کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور ممکن ہے ان سے مدت کا اندازہ لگانے میں غلطی ہوئی ہو۔ میں یہ سوال صرف اس لیے اٹھا رہا ہوں کہ آپ کے دوست اور ان کے اہل خاندان کو محض شک کی بنیاد پر کوئی اقدام کرنے اور یوں ناانصافی کرنے کے خلاف خبردار کردوں۔ اگر آپ کے دوست کوئی ناانصافی کریں تو اس ناانصافی کا شکار وہ خود، ان کی اہلیہ اور ان کی بچی ہوگی چنانچہ انہیں ایسا کوئی فیصلہ کرنے سے قبل بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

آپ نے اپنے خط میں بچی اور باپ کے خون کے گروپ کے تجزیے کی تجویز بھی دی ہے، اس قسم کے تجزیے سے کوئی بات ثابت نہیں کی جاسکتی۔ تاہم کہا گیا ہے کہ اس طرح کے تجزیے کیے جاتے ہیں لیکن وہ کہاں تک درست ہوتے ہیں، مجھے اس کا علم نہیں۔ بہتر ہے کہ آپ کے دوست اس سلسلے میں کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کرلیں۔ اگر وہ ڈاکٹر یقین دلادے کہ اس قسم کے تجزیے سے کسی شک وشبہ کے بغیر کسی حتمی فیصلے تک پہنچا جاسکتا ہے تو آپ کے دوست اپنے اور اپنی بچی کے خون کا تجزیہ کرواسکتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ اس قسم کے تجزیے سے حتمی ثبوت نہیں مل سکتا تو آپ کے دوست کو ایسا تجزیہ نہیں کروانا چاہیے کیونکہ ایسی صورت میں اندیشہ ہے کہ وہ کسی غلط نتیجے تک پہنچ جائیں گے۔ اس موقع پر میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا شادی کے وقت خاتون باکرہ (کنواری) تھیں۔ اگر ایسا تھا تو آپ کے دوست کو معلوم ہونا چاہیے کہ کیا ایسی صورت میں کسی شک کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ کے دوست کو یقین ہے کہ ان کی اہلیہ اچھے کردار کی مالک ہیں اور انہوں نے اپنی اہلیہ کو باوفا اور دیانت دار پایا ہے تو انہیں چاہیے کہ اپنی اہلیہ کو اعتماد میں لیں اور علیحدگی میں نہایت نرمی سے ان سے بات چیت کرلیں۔ اگر ان کی اہلیہ انہیں یقین دلادیں کہ وہ ہمیشہ سے ان کی وفادار ہیں تو انہیں اپنی اہلیہ کے الفاظ کو قبول کرلینا چاہیے اور اس کے بعد انہیں چاہیے کہ وہ اپنے ذہن سے تمام شکوک وشبہات کو نکال پھینکیں تاکہ وہ ان کی ازدواجی زندگی کو متاثر نہ کرسکیں۔

غیر مسلم مرد سے شادی کی اجازت کیوں نہیں ہے؟

سوال: ایک عیسائی دوست نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ جب مسلمان مرد کو عیسائی خاتون سے شادی کی اجازت دی گئی ہے تو مسلمان عورت کو عیسائی مرد سے شادی کی اجازت کیوں نہیں ہے۔ میں اپنے دوست کو اطمینان بخش جواب نہیں دے سکا۔ ازراہ کرم اس سوال پر روشنی ڈالیے؟

جواب: یہ بات تو درست ہے کہ مسلمان مرد کو ایک عیسائی یا ایک یہودی خاتون سے شادی کی اجازت دی گئی ہے لیکن علماء کے نزدیک ایک مسلمان مرد کو مسلمان خاتون سے ہی شادی کرنا چاہیے۔ بین المذاہب شادی میں اسلام کی دی گئی اجازت کا اطلاق مسلمان خاتون پر نہیں ہوتا۔ مسلمان خاتون کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی بھی دوسرے مذہب کے ماننے والے مرد سے شادی کرے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں:

اس قسم کی شادی کے معاملے میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پیدا ہونے والے بچوں کا مذہب کیا ہوگا۔ اسلامی شریعت کے مطابق بچے اپنے والدین کے مذاہب میں سے، برتر مذہب اختیار کریں گے۔ اسلامی نقطہ نظر سے اگر مذاہب کی فہرست مرتب کی جائے تو اس فہرست میں سب سے پہلا مذہب اسلام ہے اس کے بعد دوسرے درجہ پر عیسائیت اس کے بعد یہودیت اور پھر دیگر مذاہب بتدریج آئیں گے۔ عیسائی اور یہودی، مرد، عورت کے درمیان شادی کے نتیجے میں جو بچے پیدا ہوں گے، اسلامی نقطہ نظر کے مطابق وہ عیسائی مذہب اختیار کریں گے۔ اگر مسلمان خاتون کو غیر مسلم مرد سے شادی کی اجازت دے دی جائے تو اس صورت کی روشنی میں بچوں کا مذہب اسلام ہوگا، لیکن بالعموم خاندان کے اندر مرد کو برتری حاصل ہوتی ہے اور گھر کے اندر تمام فیصلے اس کی مرضی ومنشا کے مطابق ہوتے ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مرد ہی کی بات حکم آخر ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں مرد یہ فیصلہ دے سکتا ہے کہ اس کے بچوں کا مذہب وہ ہوگا جو خود اس کا مذہب ہے۔

اگر ایک مسلمان مرد، کسی عیسائی یا یہودی خاتون سے شادی کرتا ہے تو اسے بیوی کو یہ اجازت دینی ہوگی کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق اپنی عبادات کرے۔ مسلمان مرد کو غیر مسلم بیوی کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کا اختیار نہیں ہے اور نہ ہی یہ اجازت ہے کہ وہ غیر مسلم بیوی کو مسلمان بنانے کے لیے دباؤ ڈالے۔ قرآن مجید کے مطابق ''دین میں کوئی جبر نہیں۔''

بین المذاہب شادی میں اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی آزادی کی ضمانت

اس وقت نہیں دی جا سکتی جب برتر فریق یعنی شوہر، غیر مسلم ہو۔ علاوہ ازیں جب ایک خاتون کی شادی ہوتی ہے تو وہ اپنا گھر چھوڑ کر اپنے شوہر کے خاندان کی رکن بن جاتی ہے۔ اگر شوہر مسلمان نہیں ہے تو اس صورت میں بیوی کو غیر مسلم شوہر کے غیر مسلم عزیزوں کے زبردست سماجی دباؤ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مسلمان مرد کی غیر مسلم بیوی کے لیے اس قسم کے سماجی دباؤ کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

اس قسم کے معاملات میں ایک اور اہم بات وہ رویہ ہے جو ایک فریق، دوسرے فریق کے مذہب کے بارے میں رکھتا۔ مسلمان کی حیثیت سے ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ دونوں اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر تھے اور اللہ کی وحدانیت کا آفاقی پیغام لے کر آئے تھے۔ تمام مسلمان دیگر تمام انبیاء سمیت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دل سے تکریم کرتے ہیں اور ان انبیاء پر ایمان ان کے عقیدے کا لازمی جزو ہے۔ اس صورتحال میں یہ بالکل فطری امر ہوگا کہ جب ایک مسلمان مرد کسی عیسائی یا یہودی خاتون سے شادی کرے، تو وہ اپنی بیوی کے مذہب کا احترام کرے گا اور ہر اس بات کا خیال رکھے گا جسے اس کے مذہب نے مقدس قرار دیا ہے۔ اسی طرح مسلمان شوہر اپنی بیوی کے مذہب کی رسوم و روایات کا بھی احترام کرے گا۔ اس صورتحال کے برخلاف، چونکہ عیسائی یا یہودی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے اس لیے ایک غیر مسلم شوہر، ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں وہ رویہ نہیں ہوگا جو ایک مسلمان شوہر کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہوتا ہے۔ غیر مسلم شوہر، اپنی بیوی کے مذہبی عقائد اور رسوم و روایات کے بارے میں ایسی رواداری کا مظاہرہ نہیں کرے گا، جو ایک مسلمان شوہر کر سکتا ہے۔ اس لیے یہ بات غیر یقینی ہوگی کہ ایک مسلمان خاتون جو ایک عیسائی یا یہودی مرد سے شادی کرے، اسے رواداری کا وہی سلوک میسر ہو، جو ایک مسلمان مرد، اپنی عیسائی یا یہودی بیوی کے ساتھ روا رکھ سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں یہ کہنا چاہوں گا کہ دیگر مذہب کے ماننے والوں میں یقیناً بعض ایسے حضرات بھی پائے جاتے ہیں جو رواداری اور حسن سلوک کا بہترین نمونہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔ جب کسی معاشرے کے لیے قانون سازی کی جاتی ہے تو وہ اوسط صورتحال کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے، استثنیات کو مدنظر رکھ کر نہیں کی جاتی۔ اس لیے عورت اور اس کے بچوں کے مذہب کی حفاظت کے لیے اسلام نے مسلمان خاتون کو کسی بھی غیر مسلم سے شادی کی اجازت نہیں دی۔

مسلمان ہونے کے بعد محرم سے شادی کی حیثیت

سوال: میرے ایک ہندو دوست نے اپنی بھانجی/بھتیجی سے شادی کی تھی۔ اب وہ، ان کی بیوی اور بچے مسلمان ہوگئے ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان صاحب کو اپنی بیوی کو طلاق دے دینا چاہیے۔ کیا یہ بات ان کے لیے لازمی ہوگی؟

جواب: آپ کے دوست کو جو مشورہ دیا گیا ہے، وہ درست ہے۔ مسلمان کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی بھانجی/بھتیجی کو اپنے نکاح میں رکھے، خواہ وہ بھائی کی بیٹی ہو یا بہن کی۔ اس معاملے میں اسلامی احکامات تبدیل نہیں ہوسکتے کیونکہ ان کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، لہٰذا یہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ کسی ممنوعہ چیز کو جائز قرار دے۔ چونکہ آپ کے دوست اور ان کی بیوی، دونوں نے اسلام قبول کرلیا ہے، اس لیے وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ موجودہ رشتہ کا جاری رہنا ممکن نہیں ہے۔ انہیں یہ علیحدگی، اللہ کے حکم کے طور پر قبول کرنا ہوگی۔ علیحدگی کے بعد آپ کے دوست کو نہایت سختی کے ساتھ اس رشتہ کے آداب کو قائم رکھنا ہوگا، جو بھانجی کی حیثیت سے ان کی سابقہ بیوی سے ہوں گے، کیونکہ ان دونوں کے درمیان چچا بھتیجی یا ماموں بھانجی کا رشتہ برقرار رہے گا۔

عام صورتحال میں چچا یا ماموں کا رشتہ محرم کا رشتہ ہے اور اس رشتہ میں ماموں/بھانجی یا چچا/بھتیجی تنہائی میں مل سکتے ہیں، لیکن اس خاص معاملے میں چونکہ دونوں پہلے رشتہ ازدواج میں منسلک رہ چکے ہیں، اس لیے تنہائی میں ملنے کی صورت میں سابقہ رشتہ کی یادیں تازہ ہونے کا اندیشہ ہوگا، اس لیے اس صورتحال سے گریز کیا جانا چاہیے۔ چونکہ ان کی شادی کا واقعہ اسلام سے پہلے کا ہے، اس لیے اس کے بارے میں ان سے کوئی سوال نہیں ہوگا۔

قبول اسلام کے بعد شادی کی حیثیت؟

سوال: اگر شوہر یا بیوی میں سے کوئی ایک اسلام قبول کرلے تو ان کی شادی پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ کیا یہ شادی خود بخود ختم ہوجائے گی۔ اس معاملے میں بچوں کے ساتھ کیا ہوگا؟

جواب: آپ نے جو مسئلہ پیش کیا ہے اس میں شادی کے متاثر ہونے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں اور اس کا زیادہ انحصار اس شادی شدہ جوڑے کے اس مذہب پر ہے جس پر وہ اسلام لانے سے پہلے کاربند تھے۔ اگر دونوں میں سے کوئی بھی قبول اسلام سے پہلے کسی آسمانی مذہب، یعنی عیسائیت یا

یہودیت کا پیرو نہیں ہے تو یہ شادی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ہاں اگر دوسرا فریق بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جاتا ہے تو نکاح برقرار رہے گا۔ اسلام کسی کافر سے شادی یا ازدواجی تعلقات کی اجازت نہیں دیتا۔

اگر اس جوڑے کا مذہب عیسائیت یا یہودیت ہے یا ان میں سے ایک عیسائی اور ایک یہودی ہے اور شوہر نے اسلام قبول کیا ہے اور بیوی اپنے مذہب پر قائم ہے تو اس صورت میں بھی یہ شادی برقرار رہے گی بشرطیکہ ان شرائط کی خلاف ورزی نہ کی جائے جو اسلام نے ایک شادی کے برقرار رہنے کے لیے عائد کی ہیں۔ اس بات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ایک مثال پر غور کیجیے۔ اگر قبول اسلام سے پہلے جو شادی ہوئی تھی اس میں بیوی، شادی سے پہلے کے رشتے میں شوہر کی پھوپھی، خالہ یا چچی یا ممانی نہیں تھی یا یہ کہ میاں بیوی دونوں کو ایک ہی عورت نے دودھ پلایا ہو، خواہ یہ عمل صرف ایک ہی دن کے لیے کیوں نہ ہوا ہو۔

اگر بیوی نے اسلام قبول کیا ہے اور شوہر اپنے مذہب پر قائم ہے تو اس صورت میں شوہر اور بیوی کو علیحدہ علیحدہ کمروں میں سونا چاہیے۔ کسی مسلمان خاتون کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ غیر مسلم مرد سے ازدواجی تعلقات قائم رکھے خواہ اس مرد کے ساتھ اس کی شادی ہی کیوں نہ ہوئی ہو۔ اس صورت میں شادی کا معاہدہ معطل رہے گا شوہر کو قبول اسلام کی دعوت دی جائے اور اسلامی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے۔ اگر شوہر اسلام قبول کر لیتا ہے تو یہ شادی برقرار رہے گی اور اس کے لیے دوبارہ نکاح کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اگر شوہر اسلام قبول نہیں کرتا تو ازدواجی تعلقات زیادہ سے زیادہ تین ماہ تک معطل رہ سکتے ہیں یا اگر عورت حاملہ ہے تو بچے کی ولادت تک۔ اگر اس مدت میں شوہر اسلام قبول نہیں کرتا تو یہ شادی خود بخود ختم ہو جائے گی۔

اس معاملے میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ بیوی کے قبول اسلام کی اطلاع شوہر کو فوراً کر دی جائے۔ اگر وہ گھر سے باہر (کسی دوسرے شہر یا ملک) گیا ہوا ہے تو اسے وہاں اطلاع بھجوائی جائے۔ اگر شوہر کا پتہ معلوم نہیں ہے تو بیوی کے قبول اسلام کے تین ماہ بعد یہ شادی خود بخود ختم ہو جائے گی۔

اگر بچے نابالغ ہیں تو وہ بلوغت کو پہنچنے تک ماں کے پاس رہیں گے، خواہ ماں نے اسلام قبول نہ کیا ہو۔ تاہم بچے خود بھی ماں کے پاس رہنے پر تیار ہوں۔ ماں کو یہ کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ وہ بچوں کو ان کے مذہب (اسلام) سے تبدیل کرے بلکہ اسے چاہیے کہ بچوں کی غذا کے معاملے میں اسلامی تعلیمات کا خیال رکھے۔

مسلمان عورت کا غیر مذہب کے مرد سے نکاح

سوال: اگر ایک مسلمان عورت، غیر مسلم مرد سے شادی کرے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی۔ وہ مرتد قرار پائے گی یا مسلمان رہے گی۔ ایسی عورت کی نماز، روزہ اور دوسری عبادات قابل قبول ہوں گی۔ کیا ایسی عورت کے لیے اس کی موت کے بعد مغفرت کی دعا کی جاسکتی ہے؟

جواب: ایک مسلمان عورت کے لیے کسی غیر مسلم سے شادی کرنا گناہ ہے۔ مسلمان مرد، صاحب کتاب عورت، یعنی عیسائی یا یہودی سے شادی کرسکتا ہے لیکن مسلمان عورت کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک مسلمان مرد کسی عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کرتا ہے تو وہ اپنے عقیدے کے مطابق بیوی کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ جس مذہب سے تعلق رکھتی ہے اس کے مطابق اپنی عبادات ادا کرتی رہے۔ اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب میں یہ رعایت موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس بات کا یقین نہیں دلایا جاسکتا کہ اگر مسلمان عورت، غیر مسلم سے شادی کرے تو اسے اپنے عقیدے پر قائم رہنے اور عبادات ادا کرنے کی اجازت ہوگی یا نہیں۔ پوری دنیا میں خاندان کا جو ڈھانچہ ہے اس میں فوقیت مرد کو حاصل ہے۔

مسلمانوں کو اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ اپنی خوشی سے خود کو غیر مسلموں کی غلامی میں دے دیں یا غیر مسلموں کے ساتھ اس قسم کے رشتے اور تعلقات قائم کریں جہاں ان کی اپنی حیثیت کمتر یا محکوم کی ہو۔ شادی جیسے معاملے میں ہونے والے بچوں کے مستقبل کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے۔ اگر مسلمان عورت کا غیر مسلم شوہر ہو تو بچے غیر مسلم ہی کے طور پر پہچانے بھی جائیں گے اور اسی طرح ان کی ذہنی تربیت بھی ہوگی۔ لہٰذا کسی مسلمان عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح جائز نہیں ہوتا، ان دونوں کے تعلقات ''ناجائز'' ہی کے زمرے میں آئیں گے اور کسی بھی مسلمان عورت سے اس قسم کے غیر اخلاقی تعلقات کے قیام کی نہ تو توقع کی جاسکتی ہے اور نہ اسے یہ اجازت دی جاسکتی ہے۔ جو عورت اس اسلامی اصول کو ماننے سے انکار کرتی ہے اسے مسلمان نہیں کہا جاسکتا۔

مسلم عورت کا غیر مسلم سے نکاح

سوال: ایک ایسی مسلمان عورت کے بارے میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے جس نے ایک غیر مسلم مرد سے، ایک ایسے ملک میں شادی کرلی ہو جہاں کا قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔ کیا اس معاملے میں وراثت کا اسلامی طریقہ قابل عمل ہوگا؟

جواب: اسلام مسلمانوں کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کرلیں۔ اس قسم کی شادی کی اجازت تو ہے لیکن اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ تاہم ایک مسلمان عورت کو کسی بھی غیر مسلم سے شادی کی اجازت نہیں ہے۔ خواہ وہ عیسائی ہو، یہودی ہو یا کسی اور مذاہب کا ماننے والا ہو۔ اس حکم میں جو حکمت ہے، اس کی تفصیل پہلے سوال کے جواب میں بیان کی جا چکی ہے۔ آج کی جدید دنیا میں یہ بات ممکن ہے کہ ایک مسلمان عورت، ایسے ملک میں رہ رہی ہو جہاں غیر مسلموں کی حکومت ہو اور وہ غیر مسلم مرد سے شادی کرلے۔ اس صورت میں متذکرہ خاتون، اس ملک کے قانون کے مطابق شادی شدہ ہوگی لیکن اسلامی نقطہ نظر سے اس شادی کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی۔ اسلام کی روشنی میں شادی کا ایسا معاہدہ ہو ہی نہیں سکتا۔ دو فریقوں کے درمیان باہمی رضامندی سے طے پانے والا معاہدہ، جو گواہوں یا بااختیار شخص کے سامنے کیا گیا ہو، اس حقیقت کو تبدیل نہیں کرسکتا۔ اسلامی شریعت کی روشنی میں یہ معاہدہ باطل ہے، کوئی بھی مسلمان قاضی یا جج شادی کے اس معاہدے کو اس وقت تک جائز قرار نہیں دے سکتا جب تک شوہر اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان نہ کرے۔

کسی مسلمان عورت کو اس بنیاد پر مرتد قرار نہیں دیا جاسکتا کہ اس نے ایک غیر مسلم مرد سے شادی کی ہے۔ وہ بدستور اس وقت تک مسلمان رہے گی جب تک اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھے گی۔ تاہم وہ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوئی ہے لہٰذا گناہ کی حالت میں رہے گی۔ جس قدر جلد وہ خود کو اس قسم کے تعلقات سے علیحدہ کرلے اتنا ہی بہتر ہوگا۔ اگر ایک مرد اور عورت کے درمیان شادی کے بغیر جنسی تعلق قائم ہو تو اسلام کی نظر میں وہ ''زنا'' ہے اور مذکورہ عورت اس گناہ کی مرتکب قرار پائے گی۔ ان تعلقات کے نتیجے میں عورت کسی بچے کو جنم دیتی ہے تو وہ بچہ مسلمان تصور کیا جائے گا۔

وراثت کے اسلامی طریقے کا بچوں کے معاملہ میں مروجہ طریقے سے اطلاق ہوگا۔ انہیں اپنی ماں اور دوسرے مسلمان رشتے داروں مثلاً نانی، نانا یا ماموں وغیرہ سے وراثت ملے گی، بشرطیکہ شریعت کے مطابق ان رشتوں سے ورثہ منتقل ہو رہا ہو۔ ان بچوں کو باپ سے وراثت نہیں ملے گی کیونکہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دو مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے سے ورثہ نہیں پاسکتے۔'' عورت کو اپنے مسلمان رشتے داروں سے ورثہ ملے گا۔ ایک کبیرہ گناہ کا ارتکاب اس کے شرعی حق سے اس کو اس وقت تک محروم نہیں کرسکتا جب تک وہ مسلمان ہے۔

غیر مسلم بیوی کو اسلام کی ترغیب نہ دینا گناہ ہے؟

سوال: میری زوجہ رومن کیتھولک عقیدے کی ہیں۔ ہمارے دو بچے ہیں جنہیں اسلامی طریقے کے مطابق بپتسمہ دیا گیا۔ بیوی ہنوز اپنے عیسائی عقیدے پر قائم ہیں۔ ابھی حال ہی میں مجھے ایک عالم نے بتایا کہ اپنی زوجہ کو قبول اسلام کی ترغیب نہ دے کر میں گناہ کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ ان کی اس بات نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا ہے کیونکہ ہم دونوں کی شادی صرف محبت کی بنیاد پر ہوئی تھی میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ اگر اپنی بیوی کو قبول اسلام کی ترغیب دوں تو کیا اللہ تعالیٰ اس کا اجر دے گا۔

جواب: آپ کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو امور کے بارے میں آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ پہلی بات یہ کہ آپ نے لکھا ہے کہ ہم نے اپنے بچوں کو اسلامی طریقے کے مطابق ''بپتسمہ'' دیا ہے۔ درحقیقت اسلام میں بچوں کو بپتسمہ دینے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بپتسمہ ایک ایسے مذہب (عیسائیت) کی اصطلاح اور طریقہ ہے جو ظہور اسلام کے بعد اہمیت نہیں رکھتا۔ اسلام کو پچھلے مذاہب پر فوقیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی اولاد کے لیے بپتسمہ دینے کے الفاظ استعمال کریں۔ ہمارے یہاں بچے کی ولادت کے ساتھ کسی قسم کی روایات کا طریقہ رائج نہیں ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق بچے کی پیدائش کے بعد چار چیزیں ضروری ہیں۔ پہلی یہ کہ اس کا اچھا سا نام رکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ ایک یا دو بکرے (یا اسی قسم کے کسی جانور) کی قربانی کی جائے اور پاس پڑوس کے لوگوں وعزیز واقارب اور دوست احباب میں گوشت تقسیم کیا جائے، تیسرے یہ کہ بچے کے سر کے بال مونڈے جائیں اور ان بالوں کے ہم وزن سونا یا چاندی خیرات کیا جائے اور چوتھے یہ کہ اگر پیدا ہونے والا بچہ لڑکا ہے تو اس کا ختنہ کیا جائے۔ آپ یقیناً اتفاق کریں گے کہ ان چاروں کاموں میں سے کوئی بھی کا بپتسمہ کی رسم سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ فطرتاً معصوم ہوتا ہے اور اس کی تمام تسلیم ورضا اللہ کے لیے ہوتی ہے۔ بچے کے والدین اور معاشرہ وقت کے دوران کے ساتھ اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسے سلامتی کے راستے (اسلام) سے دور لے جاتے ہیں۔

شرعی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کسی بھی بین المذاہب شادی میں بچوں کا مذہب وہ ہوتا ہے جو والدین کے مذاہب میں بہتر وبرتر ہو۔ آپ کے معاملے میں بچوں کا مذہب اسلام ہی ہوسکتا ہے، کیونکہ یہ تمام مذاہب میں افضل ہے۔

آپ کے سوال میں دوسری الجھن یا غلط فہمی یہ ہے کہ ـــــ آپ کے بیان کے مطابق آپ کی شادی کی بنیاد کسی مذہبی ترجیح کے بجائے صرف ''محبت'' ہے۔ شاعری اور افسانوں میں تو ''محبت'' شادی کا سب سے اہم عنصر ہوسکتی ہے، لیکن حقیقی اور عملی زندگی میں یہ پائیدار اور خوشگوار ازدواجی زندگی کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ اس کا سبب یہ حقیقت ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کا مزاج اور رویہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ کم و بیش ہر معاشرے میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ محبت کی بنیاد پر ہونے والی زیادہ تر شادیاں پائیدار نہیں ہوتیں۔ شادی تو زندگی بھر کی رفاقت کا نام ہے اور اس میں سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ زندگی اور اس کے معاملات و مسائل کے بارے میں فریقین کا طرز فکر ملتا جلتا ہو اور وہ افہام و تفہیم سے کام لیتے ہوں۔ ازدواجی زندگی میں یہ عنصر موجود ہو تو ''محبت'' اپنے آپ پیدا ہوتی ہے اور پروان چڑھتی ہے۔ یہ محبت زیادہ پائیدار ہوتی ہے اور اس کی جڑیں دلوں میں گہری ہوتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کو ۴ وجوہات کی بناء پر شادی کے لیے منتخب کیا جاسکتا ہے۔ ایک اس کا مال و دولت، دوسرے حسن، تیسرے نسب اور چوتھے دین، پس شادی کے لیے کسی عورت کو دین کی بنیاد پر منتخب کرو۔

اگر شادی کے لیے ان پہلے تین اسباب کو اہمیت دی جائے جن کا اس حدیث میں ذکر ہے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ یہ اسباب ایک پائیدار و خوشگوار اور طویل ازدواجی زندگی کے لیے مستحکم بنیاد فراہم نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف انسان کا عقیدہ اس کی عادت و اطوار، طرز فکر، رویہ و کردار پر سب سے زیادہ اثر ڈالتا ہے اور ازدواجی زندگی میں اپنے رفیق زندگی کے ساتھ زیادہ وفادار اور مخلص رہنے کا سبب بنتا ہے۔

ایک مسلمان مرد کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ عیسائی یا یہودی خاتون سے شادی کرے بشرطیکہ اخلاقیات اور عصمت و عفت کی قدروں کا خیال رکھا جارہا ہو۔ مسلمان شوہر کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی بیوی کو قبول اسلام کے لیے مجبور کرے۔ اسلام جبر کے ذریعہ کسی کو مسلمان کرنے کا کوئی تصور نہیں رکھتا۔ تاہم ہر مسلمان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اسلام کا پیغام ہر انسان تک پہنچائے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ دوسروں کو اپنے مذہب کی صداقت اور اس طرز زندگی کے بارے میں بتائیں جو انسان کو ایک کامیاب اور بامراد زندگی گزارنے کا موقع دیتا ہے۔ ہمارا کام صرف پیغام پہنچانا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا ان کا کام ہے کہ وہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں۔ اسلام کی تبلیغ صرف ہمارا دینی فرض ہی نہیں ہے بلکہ یہ انسانیت کی خدمت بھی ہے۔ اس احسن کام کے لیے اپنے قریبی عزیزوں سے بڑھ کر اور کون مستحق ہوسکتا ہے، خاص طور پر ایسے معاملے میں جب بیوی ''غیر مسلم'' ہو وہی اس پیغام کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔ ایسی صورت میں شوہر کو چاہیے کہ وہ اسلام کے

بنیادی عقائد، اس کے اخلاقی نظام، سماجی ضابطے اور پرسکون خاندانی زندگی کے بارے میں وضاحت سے اپنی بیوی کو بتائے۔ آپ کو چاہیے کہ آپ اپنی بیوی کو یہ بھی بتائیں کہ مسلمان ایک پیغمبر کی حیثیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کتنا احترام کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انہوں نے حضرت مریم علیہ السلام کے کنوارے بطن سے جنم لیا اور یہ کہ اللہ نے ان کو معجزے عطا کیے تھے۔ لیکن آپ کو یہ کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ اپنی زوجہ پر اسلام قبول کرنے کے لیے دباؤ ڈالیں۔ قبول اسلام کا معاملہ ان کی اپنی خواہش پر طے ہونا چاہیے۔ اگر آپ کی کوششوں کے نتیجے میں وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جاتی ہیں تو یقیناً اس کا اجر آپ کو اللہ کے یہاں سے ملے گا کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عم زاد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اگر اللہ کسی بندے کو اپنی ہدایت قبول کرنے کا وسیلہ تمہیں بناتا ہے تو تمہارے لیے دنیا میں اس سے زیادہ بہتر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ اس حدیث کا اطلاق سب مسلمانوں پر ہوتا ہے، خواہ وہ عورت ہو یا مرد۔

خواتین

عورتوں کے حقوق اور خاتون پیغمبر

سوال نمبرا: کیا اسلام میں عورتوں کے وہی حقوق اور ان کی وہی حیثیت و مرتبہ ہے جو مردوں کو حاصل ہے؟

سوال نمبر۲: اللہ نے جتنے بھی نبی اور رسول بھیجے وہ تمام مرد تھے، ایک بھی عورت کو نبی نہیں بنایا گیا۔ ایسا کیوں ہے؟

جواب: آپ کے سوال کا جواب اگر وضاحت سے دیا جائے تو یہاں محدود جگہ میں یہ ممکن نہیں ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ ایمان کے معاملے میں عورت اور مرد کی حیثیت یکساں ہے۔ دونوں کے ایمان لانے کی شرائط اور دونوں کے لیے اعمال کے اجر کی بنیاد یکساں ہے۔ عبادات دونوں پر فرض ہیں اور نیک مردوں اور نیک عورتوں کے لیے اللہ کے یہاں برابر کا انعام ہے۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ صرف عورتوں کو ان کے مخصوص ایام میں، چند عبادات، مثلاً نماز و روزے سے استثناء دیا گیا ہے۔ یہ رعایت ان کی طبعی کیفیت کی وجہ سے ہے۔

البتہ اسلام کے سماجی اور معاشرتی نظام میں عورت اور مرد کا دائرہ کار مختلف ہے۔ مثلاً عورت کو مرد کے مقابلے میں ترکے کا نصف حصہ ملتا ہے۔ دوسری جانب اسلامی نظام معاشرت و معیشت میں، عورت خاندان کی کفالت کی ذمہ داری سے آزاد ہے۔ عورت اور مرد کے کردار میں یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ انہیں مسلم خاندان اور معاشرے میں مختلف نوعیت کے فرائض سونپے گئے ہیں۔ فرائض کے اعتبار سے مسلمان عورت اور مرد کے حقوق کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ دونوں کو

برابر کی حیثیت حاصل ہے۔

جو لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ اسلام میں عورت کا درجہ مرد کے مقابلے میں کم تر ہے، وہ عورتوں کی بابت اسلام کا سطحی زاویہ نظر پیش کرتے ہیں۔ وہ عورتوں کے حقوق کا اندازہ ان کے فرائض کو سامنے رکھ کر نہیں کرتے۔ اسی طرح وہ مرد کو برتر ثابت کرتے وقت اس کے حقوق و فرائض میں توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ انداز فکر سطحی اور تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اسلامی فقہ کے بارے میں کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اسلام کو مکمل طور پر اپنایا جا رہا ہے یا اس کے کسی ایک پہلو کو سامنے رکھ کر بحث چھیڑ دی گئی ہے۔ اگر پورے نظام کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اسلام میں عورتوں کو ان کے مزاج اور ساخت کے اعتبار سے نہایت موزوں ذمہ داریاں سپرد کی گئی ہیں اور خاندان کی زندگی میں اطمینان، سکون اور روانی برقرار رکھنے کے لیے عورتوں کو تمام ضروری تحفظات فراہم کیے گئے ہیں۔ عورت اور مرد کو ایک ہی جیسے فرائض سونپ دیئے جاتے تو ان میں تصادم کی صورت پیدا ہو جاتی، جس کا نتیجہ معاشرے کے لیے سودمند نہ ہوتا۔

کسی خاتون کو نبی یا رسول اس لیے نہیں بنایا گیا کہ یہ اہم ذمہ داری صرف مرد ہی بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں۔ آپ یہ تسلیم کریں گے کہ رسول یا نبی کے ذمے ایک عام آدمی سے زیادہ کام ہوتا ہے۔ آپ کسی بھی پیغمبر کی سوانح حیات کا مطالعہ کریں، خاص طور پر نبی آخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات کا، جو نہایت احتیاط کے ساتھ اور نہایت تفصیل کے ساتھ جمع کیے گئے ہیں، تو آپ کو علم ہوگا کہ ہر پیغمبر کے سامنے ایک بہت بڑا مقصد تھا، جسے بہر صورت اسے پورا کرنا تھا اور اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے اسے اپنی تمام تر صلاحیتیں اور قوت، بہترین اور ممکنہ حد تک بروئے کار لانی پڑیں۔ ایک عورت کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے خاندان کی دیکھ بھال بھی کرے، گھر کے روزمرہ کے کام بھی انجام دے، بچوں کی تربیت بھی کرے اور اس کے ساتھ ہی منصب رسالت کے شایان شان عظیم مقاصد کے حصول کے لیے بھی جدوجہد کرے۔

مرد کو عورت پر برتری کیوں؟

سوال: اسلام، عورت اور مرد کو برابر کے حقوق دیتا ہے لیکن روزمرہ زندگی کی یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ عملاً مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے۔ ہر عورت کو اپنی زندگی کے تمام معاملات میں کسی نہ کسی مرد کے احکامات کی پابندی کرنی ہوتی ہے اور اسے کبھی یہ آزادی میسر نہیں آتی کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق عمل کر سکے۔ بچپن اور نوعمری میں جب وہ اپنے والدین کے گھر میں رہتی ہے تو والد کے احکامات کی پابند ہوتی ہے۔ شادی کے بعد اپنے شوہر کی مرضی کے تابع ہو جاتی ہے اور آخری عمر میں

اپنے بیٹے کی ماتحت بن کر رہ جاتی ہے۔ بعض خواتین اپنے شوہر کی دوسری بیویوں کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں جو ان کے لیے مستقل ذہنی اذیت کا سبب بنتی ہے۔ علاوہ ازیں عورت کے لیے کیا ضروری ہے کہ وہ شادی کے وقت اپنے شوہر کے لیے (فرمائشی) جہیز لے کر آئے؟

جواب: آپ کے بہت سے سوالات کے جواب کا آغاز میں آپ کے آخری سوال سے کرتا ہوں اور اس معاملے میں، میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ ایک لڑکی شادی کے وقت اپنے ساتھ جہیز کیوں لے کر آئے۔ یہ قطعی غیر منصفانہ عمل ہے کیونکہ اسلام اس کے بالکل خلاف عمل کی ہدایت دیتا ہے۔ اسلامی شریعت کے مطابق شادی کے وقت مرد اس بات کا پابند ہے کہ وہ عورت کو مہر ادا کرے۔ مہر عورت کا حق ہے اور اس کی رقم کے تعین کا حق بھی عورت ہی کو حاصل ہے۔ جس عورت کی شادی ہو رہی ہے وہی یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ اس کا مہر کتنا ہونا چاہیے۔ اگر مرد مہر کی رقم سے اتفاق کر لیتا ہے تو اسے نکاح کے وقت یہ رقم ادا کرنی ہوگی۔ سوائے اس کے کہ عورت یہ اجازت دے کہ مہر بعد میں اس کے طلب کرنے پر ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگر مہر ادا کیے بغیر شوہر کا انتقال ہو جائے تو اس کے ورثے میں سے اس کی بیوہ کو مہر کی رقم ترجیحی طور پر ملنی چاہیے۔ عورت کا یہ حق ہے کہ وہ اس رقم کو جہاں چاہے خرچ کرے۔ اس طریقہ کار کی روشنی میں عورت کو کیا ضرورت ہے کہ وہ جہیز لے کر آئے یا ہونے والے شوہر کو نقد رقم ادا کرے۔ یہ طریقہ کار قطعی غیر اسلامی ہے۔ بدقسمتی سے بعض مسلم معاشروں میں یہ طریقہ رائج ہے لیکن عملاً یہ ان علاقوں میں اسلام کی آمد سے قبل پائی جانے والی تہذیبوں کی رسوم و رواج کا ورثہ ہے جسے اپنا لیا گیا ہے۔ مثلاً ہندوستان کے بعض علاقوں میں اس رسم پر عمل ہوتا ہے کیونکہ یہ ہندوؤں کے تمدن کا حصہ ہے۔ وہاں واضح طور پر یہ طریقہ ہندوؤں کی تہذیب سے لیا گیا ہے۔

میری رائے میں یہ طریقہ کار صرف عورت کے حق میں ہی غیر منصفانہ نہیں ہے بلکہ مردوں کے لیے بھی پریشانی کا باعث بنتا ہے کیونکہ عملاً یہ ہوتا ہے کہ ایک باپ کی حیثیت سے ہر مرد اپنی بیٹی کی شادی اور اس کے جہیز کے بارے میں اسی وقت سے فکر کرنا شروع کر دیتا ہے جب لڑکی کم عمر ہوتی ہے۔ وہ اس کے جہیز کے لیے رقم بچاتا ہے اور سامان جمع کرتا ہے۔ وہ بھائی جو ملازمت کے لیے بیرون ملک جاتے ہیں، ان کی ترجیحات میں بہن کی شادی اور اس کے جہیز کی خریداری سرفہرست ہوتی ہے۔ اکثر خاندانوں میں بھائی اپنی شادی میں اس لیے تاخیر کرتے ہیں کہ پہلے بہن یا بہنوں کی شادی اچھے طریقے سے ہو جائے اور اچھے طریقے سے شادی کا مطلب ہے کہ مناسب اور ہم پلہ خاندان کا رشتہ، جو عموماً جہیز کے لیے اپنے مطالبات پیش کرتے ہیں۔ یہ طریقہ قطعی غیر

منصفانہ ہے اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

آپ نے اپنے سوال میں عورت پر مرد کی برتری کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے اور آپ کے بیان کے مطابق عورت کو زندگی کے ہر مرحلے میں مرد کی تابعداری کرنا ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اسلام کا سماجی ڈھانچہ ایسا نہیں ہے جس میں عورت کو مرد کا اس طرح تابع بنایا گیا ہو جس طرح آپ نے لکھا ہے۔ اصل صورتحال اس کے برخلاف ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سے زائد مرتبہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''عورتوں کا اچھی طرح خیال رکھو'' یہ ہدایت واضح طور پر مردوں کے لیے ہے کیونکہ اسلامی شریعت کے مطابق عورتوں کی دیکھ بھال اور ان کی ضرورتوں کی تکمیل کرنا مرد کی ذمہ داری ہے۔ اس کے جواب میں عورت کے لیے لازم ہے کہ وہ احترام سے پیش آئے، لیکن اس احترام کا مطلب غلامانہ اطاعت گزاری ہرگز نہیں ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاندانی معاملات میں مردوں اور عورتوں کو باہم مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ خود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس پر عمل کیا اور عورتوں کے ساتھ بہترین سلوک کی مثال قائم کر کے دکھائی۔ ایک مصدقہ حدیث کے مطابق آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے صحابہ کو بتایا کہ میں اپنے اہل خانہ کی خدمت کرتا ہوں اور یہ سب کو معلوم ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور آپ کی صاحبزادیوں (رضی اللہ عنہن) کے سوا کوئی مرد نہیں تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی ازواج مطہراتؓ یا اپنی صاحبزادیوں (رضی اللہ عنہن) کو گھر کے کاموں کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا۔ اس کے برخلاف آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی دیکھ بھال فرماتے اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع ہر مسلمان پر فرض ہے اور ہر شوہر کو اپنی ازدواجی زندگی میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریقہ کار پر عمل کرنا چاہیے۔

اسلام کی تعلیمات اور مسلمانوں کے عمل میں فرق پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے قول وعمل کے تضاد کا ذمہ دار اسلام کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تو لوگ ہیں جو یا تو اسلام پر کم عمل کرتے ہیں یا اسے کم اہمیت دیتے ہیں۔ اس لیے عمل کی ذمہ داری لوگوں پر ہے، شریعت پر نہیں ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان مساوات کے بارے میں متعدد قرآنی آیات موجود ہیں۔ ان قرآنی احکامات کی موجودگی میں، عورتوں کو مرد کے تابع رکھنے کی ذمہ داری اسلامی تعلیمات پر نہیں، بلکہ تعلیمات کے خلاف عمل کرنے والوں پر عائد ہوتی ہے۔

آپ نے کثرت ازواج کے بارے میں بھی سوال کیا ہے۔ میں متعدد مرتبہ اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ بات واضح کر چکا ہوں کہ ایک وقت میں مرد کو چار شادیوں کی اجازت کے معاملے کو ہنگامی قانون کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ (''ازدواجی تعلقات'' کے عنوان سے اس

کتاب میں کثرت ازدواج کے مسئلے پر سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں)۔

آبادی میں عورتوں کی کثرت اور معاشرتی مسائل

سوال: دنیا کے اکثر علاقوں میں عورتوں کی آبادی مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ عورتوں اور مردوں کی آبادی میں عدم توازن کی وجہ سے بہت سے معاشرتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ ان مسائل کا حل کیا ہے؟

جواب: مجھے یقین ہے کہ آپ کا یہ دعویٰ درست ہے کہ دنیا میں عورتوں کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ بیشتر معاشروں میں خواتین اور مردوں کی آبادی میں مساوی تناسب ہوتا ہے۔ یہ بات تو شاید صحیح ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے لڑکیاں زیادہ پیدا ہوتی ہیں، لیکن بالغ افراد کی آبادی میں مردوں اور عورتوں کا تناسب تقریباً برابر رہتا ہے۔ تاریخ کے بعض اسباب، خصوصاً جنگ کی وجہ سے آبادی میں خواتین کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا ہے، جس کی وجہ سے معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں اور مردوں کی کم تعداد کی وجہ سے شادی کے قابل ہر عورت کے لیے مرد دستیاب نہیں ہوتا۔ ایسی صورتحال میں مرد کے لیے ایک سے زیادہ شادی کی اجازت اس مسئلے کا ایسا عملی اور منصفانہ حل فراہم کرتی ہے جس کی وجہ سے معاشرہ خرابیوں سے محفوظ رہتا ہے۔ غیر مسلم معاشروں میں جب بھی مردوں اور عورتوں کی آبادی میں توازن بگڑتا ہے، وہاں افراتفری اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

اگر کسی معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں کی آبادی سے قابل ذکر حد تک بڑھ جائے اور اس معاشرے میں مردوں کو ایک سے زائد شادیوں کی اجازت نہ ہو تو معاشرہ کا اخلاقی نظام خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ لیکن اگر صورتحال اس کے برخلاف ہو یعنی مردوں کی آبادی عورتوں سے بڑھ جائے تو وہ حالات پیدا نہیں ہوں گے جو عورتوں کی آبادی میں اضافہ سے ہوتے ہیں۔ اس دوسری صورت میں، یعنی مردوں کی اکثریت میں کثرت ازدواج کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

اس تمام بحث کی روشنی میں اسلام میں چار شادیوں کی اجازت کے معاملے کو ایک ایسے قانون کے طور پر دیکھنا چاہیے جو ہنگامی صورتحال میں قابل عمل ہوتا ہے۔

شوہر کے کاروبار میں کام کرنے والی عورت کی حیثیت؟

سوال: ایک ایسی عورت کی کیا حیثیت ہوگی جو اپنے شوہر کے کاروبار میں کیشیئر یا سیلز وومن کے طور پر کام کر رہی ہو؟

جواب: اگر ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ یا اس کے لیے کام کرتی ہے تو شوہر کو خاص طور پر خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ بیوی اپنے کسی حق سے محروم نہ رہے۔ اگر بیوی، شوہر کے کاروبار میں شریک (پارٹنر) ہے تو اسے کاروبار کے شریک کی حیثیت سے، اپنے حصے اور طے شدہ معاہدے کے مطابق منافع ملنا چاہیے۔ اگر وہ ملازم کی حیثیت سے کام کر رہی ہے تو اسے اس عہدے پر کام کرنے والے دوسرے ملازموں کے برابر تنخواہ ملنی چاہیے۔

ایک بیوی، رضاکارانہ طور پر اپنے شوہر کے کاروبار میں مدد دے سکتی ہے۔ اس صورت میں ان دونوں کے درمیان جو بھی معاہدہ ہو، وہ جائز ہوگا۔ بشرطیکہ شوہر کے ہاتھوں بیوی کا استحصال نہ کیا جارہا ہو۔ بعض حضرات یہ طے کر لیتے ہیں کہ خاندانی کاروبار (فیملی بزنس) شوہر اور بیوی مشترکہ طور پر چلائیں گے۔ اس صورت میں کاروبار کے مالی امور دونوں کی مشترکہ تحویل میں ہوتے ہیں اور بینک میں مشترکہ کھاتا ہوتا ہے۔ اگر دونوں اس پر متفق ہیں، تو یہ جائز ہے۔ اگر اس معاملے میں کسی بھی مرحلے پر ایک فرد کے ہاتھوں دوسرے کا استحصال شروع ہوجائے یا غیر منصفانہ طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ جائز نہیں ہوگا۔

مشترکہ کاروبار، یا کاروبار میں ملازمت کی صورت میں، دونوں فریقوں یعنی شوہر اور بیوی کے درمیان معاملات واضح طور پر طے ہونے چاہئیں۔ بہتر صورت یہ ہے کہ یہ معاہدہ تحریری شکل میں ہو تاکہ کسی تنازع کی صورت میں اسے خوش اسلوبی سے طے کیا جاسکے اور اگر خدانخواستہ دونوں فریقوں میں سے کوئی ایک انتقال کر جائے تو وراثت کے مسائل میں پیچیدگی پیدا نہ ہو۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اسلام میں عورت کو منصفانہ طور پر مرد کے مساوی حیثیت دی گئی ہے۔ عورت اپنے طور پر کاروبار کرسکتی ہے۔ ایسی تمام آمدنی پر صرف اس کا اپنا حق ہونا چاہیے۔ وہ ایک فریق کی حیثیت سے کسی کے ساتھ لین دین کے معاملات کرسکتی ہے اور اپنے شوہر کے حوالے کے بغیر اپنا کاروبار چلاسکتی ہے۔

لڑکیوں کے لیے شادی کی عمر

سوال: لڑکی کے لیے شادی کی موزوں عمر کیا ہے۔ کیا ۱۴ سال کی عمر میں اس کا نکاح کیا جاسکتا ہے۔ میرے ملک میں ۱۸ سال سے کم عمر لڑکیوں کی شادی پر پابندی ہے۔ ازراہ کرم وضاحت فرمایئے کہ ہم اسلامی قانون کی خلاف ورزی کے بغیر کس طرح اپنے ملک کے قانون پر عمل کرسکتے ہیں؟

جواب: اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ لڑکی کے بلوغت کی عمر کو پہنچنے سے پہلے، باپ اس کی

جانب سے شادی کا معاہدہ کرلے تاہم اس صورت میں شوہر کو یہ اجازت نہیں ہوگی کہ وہ لڑکی کے بالغ ہونے سے پہلے اس کے ساتھ تعلق قائم کرے۔ بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے بعد لڑکی چاہے تو شادی کے اس معاہدے کو برقرار رکھ سکتی ہے اور اگر نہ چاہے تو اسے توڑ سکتی ہے۔ لڑکی کے باپ کے علاوہ کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اسے شادی پر مجبور کرے۔ اسلام کی نظر میں لڑکی کی ۱۴ سال عمر شادی کے لیے غیر موزوں نہیں ہے کیونکہ بالعموم اس عمر تک لڑکیاں بالغ ہوجاتی ہیں۔ اس لیے اگر ۱۴ برس کی عمر میں کسی لڑکی کی شادی ہوئی ہے تو اسلامی نقطہ نظر سے وہ جائز ہے۔

آپ نے جس مخصوص صورتحال کا حوالہ دیا ہے، اس کے لیے اسلام ہمیں ایک رہنما اصول فراہم کرتا ہے جس کے مطابق حکمران یہ حق رکھتا ہے کہ ابتداء میں جس چیز کی اجازت دی گئی تھی اسے وہ منع کردے بشرطیکہ یہ پابندی معاشرے کے مفاد کے لیے ہو۔ اس قسم کی پابندی سے اسلام کے کسی اصول کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

آپ کی بیان کردہ مخصوص صورتحال میں اگر حکمران تمام متعلقہ حالات وشواہد کا جائزہ لینے کے بعد عوام کے مفاد میں یہ ضروری اور بہتر سمجھتا ہے کہ شادی کے لیے لڑکیوں کی عمر میں اضافہ کردیا جائے، تو اسے اس بات کا اختیار ہے۔

حالیہ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ جو لڑکیاں، بھرپور جسمانی نشونما سے پہلے کم عمر میں ماں بن جاتی ہیں، حمل کے دوران یا بچے کی ولادت کے وقت ان کی موت کے خدشات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ صورتحال ترقی پذیر اور پسماندہ ملکوں میں زیادہ خطرناک ہے جہاں افلاس کی وجہ سے آبادی کا بڑا حصہ غذائیت کی کمی کا شکار رہتا ہے۔ اگر ایسے کسی ملک کا حکمران، ان اسباب کے پیش نظر لڑکیوں کی شادی کے لیے عمر کی زیادہ یا کم حد مقرر کرتا ہے تو اس کا حکم ماننا چاہیے۔

محرم اور غیر محرم سے حجاب

سوال: کیا ایک لڑکی اپنے والد کے دوستوں یا اپنے چچا، تایا وغیرہ کے سامنے بغیر سر ڈھانپے آسکتی ہے۔

جواب: اگر لڑکی بالغ ہے تو اسے کسی بھی ایسے شخص کے سامنے موزوں اسلامی لباس کے علاوہ نہیں آنا چاہیے جس سے اس کی شادی ہوسکتی ہو۔ اسلامی لباس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا پورا جسم مناسب طور پر ڈھنپا ہوا ہو۔ البتہ چہرہ اور ہاتھ کھلے ہوسکتے ہیں۔ چونکہ ایک مسلمان عورت کی، اس کے چچا، تایا، وغیرہ سے شادی نہیں ہوسکتی، اس لیے وہ ان افراد کے سامنے اسی طرح آسکتی ہے جس طرح

اپنے والد یا بھائی وغیرہ کے سامنے آتی ہے۔

غسل ضروری ہے یا وضو؟

سوال: اگر شوہر اور بیوی صبح سو کر اٹھتے ہیں اور نماز سے پہلے انہیں غسل کی ضرورت ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ اگر وقت تنگ ہو تو وہ محض وضو کر کے نماز ادا کر لیں؟

جواب: جی نہیں! ایسی صورت میں نماز کی ادائیگی سے پہلے مکمل غسل ضروری ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ پورے جسم پر اس طرح پانی بہایا جائے کہ جسم کا کوئی بھی حصہ خشک نہ رہے۔ وقت کی کمی کے باوجود دونوں کا جنابت کی حالت سے نکلنا ضروری ہے جو صرف مکمل غسل سے ممکن ہے۔

بچے کو دو سال سے زیادہ دودھ پلانے کی ممانعت

سوال ا۔ کیا بچے کو دو سال سے زیادہ ماں کا دودھ پلانے کی ممانعت ہے؟

سوال ۲۔ کیا عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز کے دوران ٹخنے سے نیچے پاؤں ڈھانپ کر رکھیں؟

ا۔ بچے کو دو سال تک اپنا دودھ پلانے کے بعد وہ مدت مکمل ہو جاتی ہے جو بچے کو ماں کا دودھ پلانے کے لیے متعین کی گئی ہے۔ اگر ماں دو سال کے بعد بھی بچے کو اپنا دودھ دینا چاہے تو وہ کسی ممنوعہ امر کی مرتکب نہیں ہوگی، تاہم اس مدت کے بعد اس کا دودھ بچے کو پوری توانائی فراہم نہیں کر سکے گا۔ علاوہ ازیں دو سال کی مدت سے زائد دودھ پلانے پر دودھ پلانے والی عورت اور بچے کے درمیان رشتے پر بھی کوئی اثر نہیں پڑے گا، اگر بچہ اس کا اپنا نہیں ہے۔

۲۔ نماز کے دوران عورت اپنا چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھ سکتی ہے ان کے علاوہ اس کے جسم کے تمام حصے مع پاؤں ڈھانپے ہوئے ہونے چاہئیں۔

مانع حمل طریقے اور اسقاط حمل

سوال: ازراہ کرم بتایئے کہ کیا خاندانی منصوبہ بندی کی اسلام میں اجازت ہے۔ حمل ساقط کرانے کے بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب: بچوں کی پیدائش کو محدود رکھنے کے لیے مانع حمل اشیاء کے استعمال کی اجازت ہے، بشرطیکہ یہ انفرادی سطح تک رہے۔ اگر ایک شادی شدہ جوڑا اپنے مخصوص حالات کے پیش نظر مانع حمل طریقے اختیار کرتا ہے تو اس کا یہ عمل اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مصدقہ روایت ہے کہ قرآن مجید ابھی مکمل نازل نہیں ہوا تھا اور وہ (صحابہ رضی اللہ عنہم) مانع حمل طریقے اختیار کرتے تھے اور جب اس بارے میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نہ تو اس طریقے کی حوصلہ افزائی کی اور نہ ہی اس کی ممانعت فرمائی۔

اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مانع حمل انسانی طریقے اور اشیاء اللہ تعالیٰ کی منشا کو بدل نہیں سکتے۔ اگر اللہ کی یہ مرضی ہے کہ کسی خاندان میں بچے کی ولادت ہو، تو دنیا کا کوئی بھی مانع حمل طریقہ، اس خاندان میں بچے کی ولادت کو نہیں روک سکتا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ رضائے الٰہی ان طریقوں کو غیر مؤثر بنا سکتی ہے جو بصورت دیگر مؤثر ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ابھی تک کوئی بھی مانع حمل طریقہ ایسا دریافت نہیں ہوا ہے جو سو فیصد محفوظ ہو، حتیٰ کہ غیر بار آوری کا طریقہ بھی، بعض اوقات غیر مؤثر رہتا ہے۔ چند برس قبل اسکاٹ لینڈ کی ایک ایسی خاتون کے یہاں حمل قرار پایا جو غیر بار آوری (اسٹیریلائزیشن) کے عمل سے گزر چکی تھیں۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ان خاتون نے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے ڈاکٹروں کو الزام نہیں دیتیں، کیونکہ ''یہ تو ہونا تھا کہ اللہ کی منشا یہی تھی۔'' اس واقعہ کے بعد برطانیہ میں ڈاکٹر ہر اس خاتون کو جو سو فیصد غیر بار آوری کے لیے آپریشن کی درخواست کرتی ہے، متنبہ کر دیتے ہیں کہ وہ سو فیصد کی ضمانت نہیں دے سکتے۔

اس گفتگو سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق مانع حمل طریقے مؤثر نہیں ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی منشاء کسی بھی ایسے طریقے کو غیر مؤثر کر سکتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مدینے کے یہودیوں نے مانع حمل طریقے پر اعتراض کیا تھا جو اس دور میں مسلمان اختیار کرتے تھے۔ ان کے اعتراض کے مطابق یہ ''بچوں کو مارنے کا قدرے کم مہلک طریقہ'' تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے اس اعتراض کے جواب میں فرمایا، یہودی جھوٹ بولتے ہیں اگر اللہ ایک بچے کو پیدا کرنا چاہے تو یقیناً وہ بچہ پیدا ہو گا۔

اسقاط حمل کا جہاں تک تعلق ہے، اس بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا کوئی فرمان نہیں ہے جیسا مانع حمل طریقوں کے بارے میں ہے۔ علاوہ ازیں اسقاط حمل کو ختم کرنے کا طریقہ ہے جبکہ مانع حمل طریقے حمل کو روکنے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ اس سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر اللہ کسی بچے کی ولادت چاہتا ہے تو اس کے لیے کوئی بھی اسقاط کامیاب نہیں رہے گا۔ جب مانع حمل طریقہ اختیار کیا جاتا ہے تو اس وقت شکم مادر میں کسی اور زندگی کا وجود نہیں ہوتا

جبکہ اسقاط کا مطلب یہ ہے کہ شکم مادر میں ایک زندگی موجود ہے اور اس کو ختم کرنے کے لیے کارروائی کی جارہی ہے، لہٰذا اس کی ممانعت ہے۔

اسقاط حمل کی اجازت

سوال: ایک عالم نے اپنے خطاب کے دوران کہا کہ اگر کسی وجہ سے ایام حمل میں بچہ کی وجہ سے ماں کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو تو اسقاط حمل کی اجازت ہے لیکن یہ اسقاط، استقرار حمل کے بعد ۱۲ ہفتوں کے اندر ہوسکتا ہے۔ ۱۲ ہفتوں کے بعد اسقاط کی اجازت نہیں ہے خواہ اس کی وجہ سے ماں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ اس ہدایت کی حکمت یہ بتائی گئی کہ رحم مادر میں استقرار حمل کے ۱۲ ہفتوں بعد بچہ میں روح پیدا ہو جاتی ہے اور اس مدت کے بعد اسقاط کا مقصد یہ ہے کہ دو ذی روح میں سے کسی ایک کو باقی رکھا جائے۔ اس انتخاب کا حق انسان کو نہیں ہے۔ یہ صرف اللہ کے اختیار اور قدرت میں ہے کہ وہ جس کو چاہے باقی رکھے، ماں کو یا بچے کو۔ ازارہ کرم اس بارے میں اپنی رائے سے آگاہ فرمایئے۔

جواب: یہ بات تو درست ہے کہ ایک حدیث میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ استقرار حمل کے چار ماہ بعد روح پھونکی جاتی ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ علماء کی اکثریت کو اس مدت کے اندر اندر اسقاط حمل کرانے پر اعتراض نہیں ہے لیکن زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسلام اسقاط حمل کو پسند نہیں کرتا، سوائے اس کے کہ طبی امور کی بناء پر یہ ناگزیر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم روح کی اصل سے ناواقف ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ روح کیا ہے۔ جب کفار نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کی حقیقت کے بارے میں دریافت کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی کہ انہیں کہہ دیجیے کہ روح کی اصل سے صرف اللہ ہی واقف ہے۔ استقرار حمل کے بعد اول دن سے ہی رحم مادر میں ایک اور زندگی وجود میں آجاتی ہے خواہ وہ کسی بھی درجہ کی ہو۔ اس زندگی کی حفاظت کرنی چاہیے۔ آپ نے جن عالم کا حوالہ دیا ہے انہوں نے اس بات میں یہ فرق بتایا کہ ابتدائی ۱۲ ہفتوں کے دوران رحم مادر میں موجود حمل زندہ نہیں ہوتا۔ یہ بات قابل مباحثہ ہے۔ ابتدائی ہفتوں میں تخم پروان چڑھتا ہے اور ایک خاص شکل وصورت اختیار کرتا ہے۔ اس کے باوجود کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت حمل میں زندگی نہیں ہے۔ اگر حمل زندہ ہوتا تو اس صورت میں ہم کس طرح یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ماں کی زندگی بچانے کے لیے اسقاط کردیا جائے۔ یہی بات ان عالم نے کہی ہے جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے (کہ دو زندگیوں میں سے ایک کو باقی رکھنے کا فیصلہ ہم نہیں کرسکتے۔) میرے خیال میں ان کی

دلیل زیادہ وزنی نہیں ہے کیونکہ رحم مادر میں زندگی موجود ہوتی ہے اور اس کے شواہد ملتے ہیں۔

علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر بچہ کی وجہ سے ماں کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو اور یہ خطرہ اسقاط کے بعد دور ہوسکتا ہو تو اسقاط کرالینا چاہیے اس طریقے سے ایک امکانی زندگی (بچے) کے عوض ایک یقینی زندگی (ماں) کو بچایا جاسکتا ہے۔ یہ انتخاب ہمارے لیے کردیا گیا ہے ہمیں فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلامی قوانین کا بنیادی قاعدہ یہ ہے کہ اس اصل کو ترجیح دی جائے جس سے شاخیں نکلتی ہوں۔ بالکل اس طرح کہ ایک درخت کے تنے کو مضبوط بنانے کے لیے اس کی شاخیں کاٹی جاسکتی ہیں۔ جب ہم ماں کی زندگی بچاتے ہیں تو اس میں پسند اور انتخاب کا سوال پیدا نہیں ہوتا، ہم محض اسلامی ہدایت پر عمل کر رہے ہوتے ہیں۔ طبی نقطۂ نظر سے اسقاط جس قدر جلد عمل میں آئے، وہ ماں کے لیے اتنا ہی کم خطرے کا باعث ہوتا ہے۔ اس لیے جب یہ بات یقینی طور پر طے پا جائے کہ ماں کی زندگی کو بچانے کے لیے اسقاط ضروری ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو کرالینا چاہیے۔ اس معاملے میں طبی نقطۂ نظر اور اسلامی نقطۂ نظر میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بالعموم ایسے معاملات کے بارے میں پیشگی علم ہوجاتا ہے اور جب یہ بات معلوم ہوجائے کہ ماں کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہے جس کی وجہ سے زچگی اس کی زندگی کے لیے خطرناک ہوگی تو حمل کو قائم اور جاری رکھنا غلط ہوگا۔ ڈاکٹروں کی بہرحال یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ماں کے ساتھ ساتھ اگر بچے کے بچنے کے امکانات ہیں، تو اسے بھی بچالیں۔ اس صورت میں اگر ڈاکٹر مناسب سمجھے تو وہ اسقاط کو کچھ عرصہ کے لیے ملتوی کرسکتا ہے، بشرطیکہ اس سے ماں کی زندگی خطرے میں نہ پڑے۔ یہ طریقہ بھی قابل قبول ہے۔ ڈاکٹر مناسب سمجھے تو چار ماہ کے بعد بھی اسقاط کرسکتا ہے۔

اسقاط حمل کی سزا

سوال: اسلام میں اسقاط حمل کی کیا سزا ہے۔ جس عورت نے اسقاط کا عمل انجام دیا ہو، اسے اللہ سے معافی طلب کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اسلام میں اسقاط حمل کی ممانعت ہے لیکن جس عورت یا مرد نے اسقاط کیا ہو یا اگر حاملہ نے خود اسقاط کیا ہو تو اس کے لیے کوئی خاص سزا مقرر نہیں ہے۔ قاضی ملک کے قانون کے مطابق جو سزا چاہے تجویز کرسکتا ہے۔ اگر یہ سزا نہیں دی گئی تو متعلقہ فرد (مرد یا عورت) اللہ کے سامنے اپنے اس فعل کے لیے جوابدہ ہوگا۔

اگر ایک عورت نے اسقاط کیا ہے اور اپنے فعل پر نادم ہے تو اسے خلوص دل کے ساتھ اللہ

سے اپنے اس فعل کی معافی طلب کرنا چاہیے اور آئندہ اس کام سے اجتناب کرنا چاہیے۔

غیر مسلم ڈاکٹر سے خواتین کا علاج

سوال: جو مسلمان خواتین، مسلم اور غیر مسلم مرد ماہرین امراض نسواں سے علاج کراتی ہیں ان کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں بھی بتائیے جو قابل اور تعلیم یافتہ خواتین ڈاکٹروں کی موجودگی میں مرد معالج کو ترجیح دیتے ہیں اور ان سے وقت لے کر علاج کرانا پسند کرتے ہیں۔

جواب: جب اسلامی احکامات کی وضاحت کا معاملہ ہو تو لفظوں کو چبا کر بین السطور بات کہنے کے بجائے ہمیں بالکل صاف اور کھلے الفاظ میں بات کہنی چاہیے۔ کسی مسلمان خاتون کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ جب ایک تعلیم یافتہ اور ماہر خاتون ڈاکٹر میسر ہو تو وہ مرد معالج سے اپنا علاج کرائے۔ اسی طرح مسلم خاتون ڈاکٹر کے ہوتے ہوئے کسی غیر مسلم خاتون ڈاکٹر سے علاج کرانا بھی درست نہیں ہے تاہم اگر صرف مرد مسلمان ماہر امراض نسواں میسر ہو تو اس صورت میں غیر مسلم خاتون ڈاکٹر سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ اسلام عملی حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر کے کبھی بھی کوئی حکم عائد نہیں کرتا۔ فرض کیجیے کسی خاص معاشرے میں ایسی کوئی قابل مسلمان ڈاکٹر موجود نہیں ہے جو کسی مخصوص نسوانی مرض کا علاج کر سکے، تو اس صورت میں ایک غیر مسلم ماہر کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس صورت میں بھی پہلے کسی خاتون ڈاکٹر کو تلاش کرنا چاہیے وہ نہ ملے تو بحالت مجبوری مرد ڈاکٹر سے علاج کرایا جاسکتا ہے۔ یہ ایک منطقی، قابل عمل اور ذمہ دارانہ طریقہ ہے جس کی اسلام اجازت دیتا ہے۔

خواتین کو چہرہ ڈھانپنے کی ضرورت نہیں ہے؟

سوال: علماء کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ اگر ایک مسلمان خاتون نے اپنے لباس کے ذریعہ صحیح طریقے پر ستر پوشی کر رکھی ہو تو اسے اپنا چہرہ ڈھانپنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس صورت میں ان خواتین کے بارے میں کیا رائے ہے جو نقاب استعمال کرتی ہیں۔ ان کا یہ عمل پسندیدہ یا قابل جزا ہے۔ دوسری بات یہ کہ کیا سورہ الاحزاب کی آیت ۵۹ میں عورتوں کے چہرے ڈھانپنے کا ذکر نہیں ہے؟

جواب: اگر ایک خاتون لباس کی اسلامی ضرورت کو پورا کرتے ہوئے چہرہ ڈھانپ کر گھر سے باہر

جاتی ہے تو اس بات پر کوئی بھی اعتراض نہیں کرسکتا۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ خواتین چہرہ ڈھانپنے کی پابند نہیں ہیں، اس لیے شوہر، باپ یا سرپرستوں کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ عورت پر جو پابندی اللہ تعالیٰ نے عائد نہیں کی ہے، وہ اس پر اصرار کریں۔ اگر ایک مسلمان خاتون یہ فیصلہ کرتی ہے کہ وہ اپنا چہرہ کھلا رکھے گی، اور ایسا معقول لباس پہنے گی جس میں سر سے پیر تک اس کا جسم چھپا رہے، لباس دوسروں کی توجہ مبذول کرانے والا یا غیر مسلم خواتین کی نقالی کرنے والا نہ ہو، لیکن چہرے اور ہاتھوں کا نچلا حصہ کھلا رہے، تو خاتون لباس کے معاملے میں اسلامی فرائض کو پورا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ جو بھی کرے، وہ رضا کارانہ ہوگا اور جو افعال اللہ نے اپنے بندوں کی اپنی رضا پر چھوڑ دیے ہیں، ان کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا کسی عورت کو چہرہ ڈھانپنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

بعض معاشروں میں، جہاں اسلام کی تعلیمات پر عمل کیا جاتا ہے، وہاں خواتین کے لیے اسلامی لباس پہننا آسان ہے۔ ان معاشروں میں خواتین کا نقاب استعمال کرنا قابل قبول ہے۔ لیکن اس کے برخلاف، دوسرے معاشروں میں ایک مسلمان خاتون کو لباس کے بنیادی اسلامی تقاضے پورے کرنے میں دشواریوں کا سامنا ہوسکتا ہے۔ ایسی جگہوں پر نقاب اوڑھنا نقصان دہ اثرات پیدا کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر کام کے لیے ہمیں آسان، معقول اور قابل عمل ہدایات دی ہیں۔ بعض افعال میں یہ فیصلہ انسان پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جسے زیادہ بہتر سمجھتا ہے وہ طریقہ اختیار کرے۔ جب ہم اسلام کے بنیادی تقاضوں کو اپنا کر زندگی گزارتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کا اجر عطا کرتے ہیں۔

آپ نے قرآن مجید کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے اس میں خواتین کی سرپوشی یا چہرے کو ڈھانپنے کا ذکر نہیں ہے۔ اس آیت میں لمبا لباس پہننے کا ذکر ہے، جو اسلامی لباس کی خصوصیت ہے۔ جب ایک خاتون (چادر جیسے) طویل لباس سے ستر پوشی کرے گی تو یہ پہچانا جائے گا کہ یہ ایسی خاتون ہے جو اپنے دین کے اصولوں پر عمل کرتی ہے۔ اس صورت میں کوئی اسے چھیڑنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ عورتوں کی سرپوشی کے بارے میں سورہ نور کی ۳۱ ویں آیت میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس میں ہدایت کی گئی ہے کہ عورتوں کا سر کا لباس اس قدر لمبا ہو کہ وہ ان کے سر، گردن اور سینہ کے درمیانی حصوں کو اچھی طرح ڈھانپ لے۔

لڑکیوں کے لیے فوجی تربیت

سوال: ہمارے وطن میں بعض تعلیمی اداروں میں طلبہ و طالبات کو فوجی تربیت فراہم کی جاتی ہے جو

تقریباً ایک سال جاری رہتی ہے۔ جو طلبہ و طالبات فوجی تربیت مکمل کر لیتے ہیں انہیں ان کے سالانہ امتحانات کے مجموعی نشانات میں ۲۰ نشانات مزید دیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے طلبہ و طالبات کے لیے پروفیشنل کالجوں میں داخلہ لینا ممکن ہو جاتا ہے۔ یہ فوجی تربیت صرف مرد افسر دیتے ہیں۔ طالبات کو اجازت ہے کہ تربیت کے دوران سر کو ڈھانپ کر رکھیں، تاہم یہ لازمی نہیں ہے۔ کیا ایک لڑکی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اچھی درسگاہ میں داخلہ کو ممکن بنانے کے لیے یہ تربیت حاصل کرے؟

جواب: یہ اسی قسم کی صورتحال ہے جس پر اسلام کے اس اصول کا اطلاق ہوتا ہے کہ ہر بات کی اجازت ہے بشرطیکہ اس میں کوئی ایسا کام شامل نہ ہو، جو اسے ممنوع قرار دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی عمل صرف اس وجہ سے ممنوع نہیں ہے کہ اسلام نے اصولی طور پر اس کی اجازت نہیں دی بلکہ اس عمل میں کوئی ایسا عنصر یا ایسے حالات شامل ہو گئے جن کی وجہ سے وہ عمل اسلامی نقطہ نظر سے قابل قبول نہیں رہا۔ آپ کے سوال کے جواب میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فوجی تربیت مسلمان لڑکیوں کے لیے جائز ہے لیکن جس قسم کے ماحول یا تنظیم یا حالات میں یہ تربیت دی جارہی ہے اگر وہ اسلامی تعلیمات اور اصولوں کے خلاف ہیں تو اجازت کا حکم تبدیل ہو جائے گا۔ اگر ان مسلمان طالبات کو چار دیواری میں، خواتین انسٹرکٹر کے ذریعہ تربیت دی جائے تو یہ قطعی جائز ہوگا۔ اسی طرح اگر یہ تربیت دینے والے مرد ہوں اور طالبات نے تربیت کے وقت اسلامی اصول کے مطابق لباس پہن رکھا ہو اور اس بات کا کوئی امکان نہ ہو کہ تربیت دینے والے کو کسی طالبہ کے ساتھ تنہائی کا موقع ملے، تب بھی اس تربیت کی اجازت ہے، تاہم اس قسم کی تربیت حاصل کرنے والی خواتین کو اپنی نیت واضح رکھنی چاہیے کہ اس تربیت کا مقصد مسلم برادری یا اپنے خاندان کا یا اپنا ذاتی دفاع ہے۔

غیر مسلم عورت سے آرائش و زیبائش

سوال: کیا ایک مسلمان خاتون کسی غیر مسلم خاتون سے اپنے بالوں کی زیبائش اور چہرے کا میک اپ کرا سکتی ہے اور غیر مسلم خاتون سے اپنی تصویر کھنچوا سکتی ہے؟

جواب: اگر بال سنوارنے اور میک اپ کرنے والی غیر مسلم خاتون، مسلم خاتون کے بارے میں مردوں سے گفتگو نہ کرے تو بال بنوانے اور میک اپ کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر یہ شبہ ہو کہ مشاطہ، مسلمان خاتون کا سراپا مردوں سے بیان کرے گی تو ایسی عورت کی خدمات حاصل نہیں کرنا چاہئیں۔ تصویر کھنچوانے کی اجازت ہے۔

خواتین کے سر کے بال چھوٹے کرانا منع نہیں ہے

سوال: کیا خواتین کو یہ اجازت ہے کہ وہ بناؤ سنگھار کے معاملے میں شوہر کی بات نہ مانیں، مثلاً اگر شوہر مطالبہ کریں کہ بیوی کو میک اپ کرنا چاہیے یا سر کے بال کسی خاص انداز سے بنانے چاہئیں، تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اس سوال کے جواب سے پہلے یہ بات واضح ہونا ضروری ہے کہ بناؤ سنگھار کے معاملے میں شوہر کا مطالبہ کس نوعیت کا ہے۔ اگر یہ مطالبہ صرف گھر کے اندر رہتے ہوئے ہے جب گھر میں شوہر، بیوی اور بچے ہوں اور گھر پر کوئی ایسی محفل نہ ہو رہی ہو جس میں باہر کے مرد و خواتین شریک ہوں، تو اس صورت میں متعلقہ خاتون کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ شوہر کی خواہش کے مطابق عمل کرے۔ اس طریقے سے وہ اپنے شوہر کو اپنے گھر میں مطمئن و مسرور رہنے میں مدد دیں گی اور شوہر دوسروں کی جانب متوجہ نہیں ہوں گے۔ علاوہ ازیں انسان کو اپنی ظاہری حالت کی درستگی سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسے اپنے گھر پر پرسکون، آرام دہ اور اطمینان بخش ماحول میسر آئے۔ اگر خاتون خانہ ہر روز ایک ہی جیسا لباس پہنے رہیں اور اپنی ظاہری حالت کی درستگی کو نظر انداز کرتی رہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ شریک حیات کے بارے میں شوہر کے دل میں رفتہ رفتہ منفی سوچ پیدا ہو جائے گی۔ اس کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔ خاتون خانہ کے لیے یہ مناسب بلکہ قابل تعریف ہے کہ جب ان کے شوہر کام سے واپس گھر آنے والے ہوں تو وہ اپنی ظاہری حالت درست کرلیں اور لباس وغیرہ تبدیل کرلیں۔

اب سر کے بالوں کی کسی خاص طرز سے بناوٹ کا معاملہ لیجیے۔ فرض کیجیے کہ جب شوہر گھر آتے ہیں اور اپنی رفیق حیات کو اس حالت میں دیکھتے ہیں کہ وہ گھر میں کام کاج کے معمولی کپڑے پہنے ہوئے ہیں، سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور زیادہ وقت باورچی خانے میں صرف ہو رہا ہے تو لازماً وہ اپنی بیوی کا مقابلہ دوسری خواتین سے کریں گے جو انہیں سڑک پر چلتے ہوئے، دفتر میں یا ٹیلی ویژن پر نظر آتی ہیں۔ وہ یہ محسوس کریں گے کہ ان کی خانگی زندگی میں کس چیز کی کمی ہے۔ اگر شوہر بیوی سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے بال چھوٹے رکھیں اور بیوی اس خواہش پر عمل نہیں کرتی تو شوہر کو مایوسی ہوگی۔ بیوی یہ احتجاج کرسکتی ہیں کہ عورتوں کے لیے بال کاٹنا غیر اسلامی فعل ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، جبکہ حقیقتاً یہ ایک غلط فہمی ہے اور بعض معاشروں کے رسم و رواج کی بنا پر پیدا ہوئی ہے۔ اگر ایک خاتون اپنے سر کے بال چھوٹے کرالیتی ہیں تو وہ کسی گناہ کی مرتکب نہیں ہوتیں

بشرطیکہ وہ اپنے شوہر، والد، بھائیوں اور چچا، تایا، ماموں وغیرہ کے علاوہ کسی غیر مرد کے سامنے نہ آئیں۔ یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ عورتوں کے بال چھوٹے کرنے کی اسلام میں ممانعت ہے۔

ماتھے پر بندیا کا استعمال۔ جائز یا ناجائز؟

سوال: ماتھے پر بندیا لگانا منع ہے؟

جواب: اس معاملے میں عام اصول یہ ہے کہ جس چیز کی ممانعت نہیں کی گئی ہے اس کا استعمال جائز ہے لیکن مسلمانوں کو کسی ایسی چیز کے استعمال کرنے کی ممانعت ہے جو غیر مسلموں کی پہچان بن گئی ہو۔ ان اشیاء میں لباس بھی شامل ہے اور دیگر اشیاء بھی (مثلاً گلے میں صلیب کی شکل کی زنجیر، ہاتھ میں لوہے کا کڑا، ماتھے پر بندیا وغیرہ) اگر بندیا کا استعمال کسی غیر مذہب مثلاً بدھ یا ہندومت کی پیروکار عورتیں کرتی ہیں تو اس کی ممانعت ہے۔ یہ ممانعت اس وجہ سے نہیں کہ بندیا میں کوئی خرابی ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ بندیا کا استعمال غیر مسلم خواتین کی پہچان ہے۔

اس مسئلے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بندیا اگر ایسے مادے سے بنی ہے جو مزاحم آب ہے تو بندیا استعمال کرنے والی خاتون کا وضو مکمل نہیں ہوگا کیونکہ وضو کرتے وقت پانی ماتھے کے اس حصے تک نہیں پہنچے گا جہاں بندیا لگی ہے، اور وضو مکمل نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان خاتون کی نماز اور دیگر عبادات غیر مؤثر رہیں گی۔

خواتین کے بالوں کی آرائش

سوال: اگر ایک خاتون اپنے بال چھوٹے کرتی ہے تو کیا اس عمل سے وہ اسلام کی ہدایات کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا اس کو اپنے بال خود تراشنے چاہئیں یا کسی خاتون گیسو تراش کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اگر کوئی خاتون گیسو تراش دستیاب نہ ہو تو کیا کسی مرد گیسو تراش کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں؟

جواب: ایک مسلمان خاتون کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر اور والد اور والدہ کے بھائیوں، اپنے شوہر کے اور بھائی بہن کے بچوں کے علاوہ کسی اور مرد کے سامنے اپنے بالوں کی نمائش کرے۔ خواہ اس کے بال لمبے ہوں یا چھوٹے۔ اس بات کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی خاتون اپنے بال کسی خاص فیشن کے مطابق بنوائے۔ بعض خواتین جو اپنے بال چھوٹے کراتی ہیں، اس کی

وجہ یہ ہوتی ہے کہ یا تو وہ ان پر اچھے لگتے ہیں یا ان کے شوہر چھوٹے بال پسند کرتے ہیں یا کسی طبی ضرورت کے لحاظ سے انہیں ایسا کرنا پڑتا ہے یا لمبے بالوں کی دیکھ بھال کا وقت نہ ہونے کی وجہ سے انہیں بال ترشوانے پڑتے ہیں۔ اگر کسی خاتون کو بال ترشوانے کی ضرورت پیش آئے تو انہیں چاہیے کہ وہ اپنے بال خود کاٹیں اور کٹے ہوئے بالوں کو زمین میں دفن کردیں۔ یہ طریقہ ہر اس چیز کے لیے ہے جو ہم اپنے جسم سے علیحدہ کرتے ہیں۔ مثلاً بال، ناخن، کھال اور دانت وغیرہ، اور اس کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر ہوتا ہے۔ ایک خاتون اپنے بال ترشوانے کے لیے دوسری خاتون کی خدمات حاصل کرسکتی ہیں خواہ وہ اس فن کی ماہر ہوں یا نہ ہوں۔ بہت سی خواتین کے لیے یہ دشوار ہوگا کہ وہ اپنے بال خود تراشیں۔ اس لیے کسی دوسری خاتون کی مدد لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن کسی خاتون کے بال تراشنے کے لیے مرد کی خدمات حاصل کرنے کی اجازت قطعی نہیں ہے خواہ یہ مرد اپنے فن کا ماہر ہو یا نہ ہو۔ خواہ خاتون کے بال طبی ضرورت کے تحت کاٹے جارہے ہوں۔ بعض معاملوں میں اسلامی قواعد وضوابط میں نرمی کی جاسکتی ہے۔ خاص طور پر جب ہنگامی نوعیت کی ضرورت درپیش ہو۔ تاہم بال کٹوانے کے معاملے میں اس قسم کی کوئی ہنگامی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر کوئی ہنگامی ضرورت پیش آ بھی جائے اور خاتون گیسوتراش دستیاب نہ ہوں تو اپنے بال خود کاٹے جاسکتے ہیں۔

تہمت لگانے کی سزا

سوال: اگر کسی شخص یا بہت سے افراد کے ایک گروہ پر دوسرے گروہ یا کسی ادارے کی جانب سے ''زنا'' کی تہمت لگائی گئی ہو، اور عدالت نے ملزمان کو بے گناہ قرار دے کر رہا کردیا ہو تو اس صورت میں شریعت کی جانب سے ان لوگوں کے لیے کیا سزا ہے جنہوں نے زنا کی تہمت لگائی تھی؟

جواب: جھوٹی تہمت لگانا، اسلامی نقطہ نگاہ سے سنگین نوعیت کا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تہمت لگانے والوں کو بتوں کی پوجا کرنے والے کفار کے برابر قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔

''بتوں کی عبادت اور جھوٹی تہمت سے دور رہو۔'' (قرآن: ۲۲:۳۰)

تہمت کے لیے کوئی مخصوص سزا نہیں ہے، تاہم یہ قابل سزا جرم ہے، سزا کے تعین کا اختیار منصف یا قاضی کو ہے کہ وہ تہمت کی سنگینی کی نوعیت کے اعتبار سے سزا تجویز کرے۔

کسی شخص پر جھوٹی تہمت عائد کرنا، بہتان تراشی کی ایک سنگین قسم ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں سزا بیان کردی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''جو لوگ پاک عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں اور پھر اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہیاں پیش نہیں کرتے، انہیں اسی درے مارے جائیں اور آئندہ کے لیے ان کی شہادت قبول نہ کی جائے، ایسے لوگ بدکار ہیں۔ (قرآن: ۲۴:۴)

قرآن میں جو سزا بیان کی گئی ہے وہ بیشک سخت ہے۔ علاوہ ازیں یہ سزا جسمانی بھی ہے اور اخلاقی بھی اور اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام اخلاقیات کو نہایت اہمیت دیتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ سماجی اخلاقیات کا بہترین مظاہرہ کریں اس لیے ایسے بے احتیاط لوگوں کو دوسروں پر زنا جیسے سنگین گناہ کی تہمت عائد کرنے سے روکنے کے لیے سزا کا سخت ہونا ضروری ہے۔ اسلام کے نقطہ نظر سے یہ بات بہتر ہے کہ اس دنیا میں کسی جرم کو بغیر سزا کے رہنے دیا جائے بجائے اس کے کہ معاشرے میں شکوک وشبہات پھیلائے جائیں اور جن لوگوں پر بہتان تراشی کی گئی ہو وہ معاشرے میں اس احساس کے ساتھ رہیں کہ لوگ ان پر شبہ کرتے ہیں اور پھر زنا جیسے سنگین الزام کا شبہ!۔ ایک شخص جو کسی مسلمان پر زنا کی تہمت عائد کرتا ہے، اور پھر اپنے الزام کو ثابت کرنے کے لیے مطلوبہ شہادت پیش نہیں کرتا وہ ان لوگوں میں سے ہے جو اسلام کی سماجی اور اخلاقی اقدار کا احترام نہیں کرتے۔ لہٰذا یا تو وہ اس شخص سے کینہ رکھتے ہیں جس پر الزام دھرا جارہا ہو یا پھر معاشرے کے اخلاقی نظام کی پروانہیں کرتے۔ ایسے شخص کے لیے سخت سزا ہی مناسب ہے۔

غیر مسلم معاشروں میں رہنے والے مسلمانوں کے مسائل

اسلام: آج ناکام نظام زندگی کیوں ہے؟

سوال: خاصے عرصے سے ایک غیر مسلم دوست سے اسلامی طرز حیات اور اس کے مختلف پہلوؤں پر ایک مکالمہ جاری ہے اور بعض اوقات میں اپنے دوست کے اٹھائے ہوئے سوالات اور اعتراضات کے سامنے لاجواب ہو جاتا ہوں۔ یوں سمجھئے کہ میرا یہ غیر مسلم دوست اسلامی نظریہ حیات سے متاثر تو ہے، لیکن وہ یہ سوال کرتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان یہ عدم مساوات کیوں ہے۔ وہ بنگلہ دیش کی مثال دیتا ہے جہاں کے باشندوں کی اکثریت بھوک اور افلاس کا شکار ہے اور ہر شخص اپنی بقاء کی جنگ میں مصروف ہے۔ اس کے برخلاف مسلم دنیا کے بعض ممالک میں لوگ عیش وعشرت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ اس صورتحال میں وہ مساوات کیا حیثیت رکھتی ہے، جس کی اسلام تبلیغ کرتا ہے؟

اس دوست کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ غیر مسلم ممالک میں ایسی متعدد تنظیمیں ہیں جو انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے کام کر رہی ہیں، لیکن بیشتر مسلم ممالک میں اس قسم کی سرگرمیاں نظر نہیں آتیں۔ اس کے ساتھ ہی ان مسلم ملکوں کی عدالتیں انصاف کے تقاضے بھی پورے نہیں کرتیں۔

اخلاقی کمزوریاں اور جھوٹ بولنے کا چلن عام ہے۔ لوگ اپنے کیے ہوئے وعدے پورے نہیں کرتے، دوسروں کے ساتھ معاملات میں صحیح نہیں ہیں، جبکہ اسلام اپنے پیروکاروں سے اعلیٰ اخلاقی اقدار کی توقع کرتا ہے اور مسلمان ان اقدار کا احترام کرتے نظر نہیں آتے۔

اس دوست کا یہ بھی کہنا ہے کہ صرف اسلامی نظام تعلیم پر عمل ہوتا دکھائی دیتا ہے جبکہ باقی تمام نظام محض نظریاتی ہیں۔ بیکاری کا اسلامی نظام ہنوز محروم تعارف ہے۔ کیا آپ اس صورتحال پر

روشنی ڈال سکتے ہیں۔ اسلامی نظریات پر عملدرآمد کی کمی کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے؟

جواب: آپ کے دوست بھی وہی غلطی کرتے ہیں، جو غیر مسلم دنیا کے بیشتر افراد اسلامی طرز زندگی کو اپنانے کی دعوت کو شکوک وشبہات کی نظر سے دیکھتے ہوئے کرتے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ مسلم ممالک میں جو کچھ ہورہا ہے، وہ ان نتائج کی انتہا ہے جو اسلام پیدا کرسکتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر اسلام، مسلمانوں کو ان کی موجودہ زندگی سے بہتر زندگی مہیا نہیں کرسکتا تو اس نظام حیات کو دوسرے معاشروں میں اپنانے کی کیا ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ دوسرے نظام ہائے حیات کے مقابلے میں اسلام کو اپنائے رکھنے کی کیا ضرورت ہے، جبکہ دوسرے نظام زندگی کو اختیار کرکے معاشرے کا معیار بڑھایا جاسکتا ہے۔ ان معاملات میں یہ لوگ مسلم معاشرے کا مغربی معاشروں سے مقابلہ کرتے ہیں اور مغرب کی ترقی کو ان معاشروں کے غیر مذہبی فکر وعمل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ مسلم ممالک کی پس ماندگی کی وجہ اسلام کو ٹھہراتے ہیں۔

اس نقطہ نظر اور زاویہ فکر کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ یہ تنگ نظری پر مبنی ہے۔ یہ نقطہ نظر مسلم دنیا کی موجودہ صورتحال کو، وقت کے ایک خاص دورانئے میں اسلام کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ یہ زاویہ فکر ان بہت سے عوامل کو پیش نظر نہیں رکھتا جو اس صورتحال کے ذمہ دار ہیں اور نہ ہی یہ لحاظ کرتا ہے کہ یہ عوامل مستقل ہیں یا عارضی، اسلام کا ورثہ ہیں یا باہر سے مسلط کیے گئے ہیں وغیرہ۔ میرے نزدیک یہ انداز فکر انتہائی غلطی پر مبنی ہے۔ کسی نظریے کو اطلاق کی صرف ایک شکل میں نہیں جانچا جاسکتا۔ ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اگر وہی نظریہ، دوسرے معاشرے میں ایک مختلف زمانے میں، دوسرے لوگوں کے ذریعہ روبہ عمل لایا جائے تو وہ پہلے سے بہتر نتائج نہیں دے سکے گا۔ کسی بھی نظام، نظریے، عقیدے یا فلسفے کو اس کی خوبیوں، موزونیت (اطلاقیت) اور ایسے مختلف معاشروں میں اس کے نتائج کی بنیاد پر پرکھا جائے گا، جنہیں ترقی کے مختلف مدارج پر پہنچنا ہو۔

اسلام ۱۴ صدیوں سے دنیا میں موجود ہے اور تاریخ کے اس طویل دورانیے میں اس کی حیثیت ایسے محوری مرکز سے، جس کے گرد پورا معاشرہ گردش کرتا تھا، گر کر انتہائی دوسرے درجے کی ہوگئی ہے۔ تاریخ کے ایسے دور بھی گزرے ہیں جب ایک مسلم ریاست متعدد ایسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگئی جو باہم دست وگریباں تھیں۔ مثال کے طور پر مسلم ہسپانیہ کے زوال کا دور لیجیے۔ اس دور کے ہسپانیہ میں رہنے والے مسلمانوں کی حالت کو ہم اسلامی نمونے کے طور پر پیش نہیں کرسکتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرے مثالی نمونوں سے آنکھیں بند کرکے یہ فیصلہ نہیں دے سکتے کہ اسلام ایک مستحکم اور خوش حال معاشرہ پیدا نہیں کرسکتا۔ مسلم ہسپانیہ اس وقت انتشار اور خانہ

جنگی میں مبتلا تھا اور زوال کے راستے پر بڑھ رہا تھا۔ اسلام کی تاریخ میں ایسے دور بھی آئے ہیں جب اسلام سے متصادم گروہوں اور قوتوں نے سر اٹھایا اور اسے نقصان پہنچایا۔ مثلاً مصر میں فاطمی دور حکومت، اسلامی قوت کے مرکز کے نزدیک قرامطہ کی سلطنت۔ یہ قوتیں بنیادی طور پر اسلام کی مخالف تھیں، اور اس دور میں ان معاشروں پر ان قوتوں کا خاصا اثر ونفوذ ہو چکا تھا، جس کے نتیجے میں صلاح الدین ایوبی کی عظیم قیادت اور صلیبی جنگوں میں ان کی شاندار فتوحات کے نتائج کو مصر کے معاشرے سے فاطمی دور کے غیر صحت مند اثرات ختم کرنے میں خاصا وقت لگا۔

موجودہ دور میں، مسلم دنیا سامراجی تسلط سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد اپنی آزادی کے ابتدائی دور میں ہے۔ مغرب کی سامراجی طاقتوں نے نوآبادیاتی نظام کے ذریعے متعدد مسلم ملکوں کے نظام حکومت، نظام انصاف (عدلیہ) اور سماجی ڈھانچوں کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ مثال کے طور پر سوڈان کو دیکھیے جہاں کئی برسوں سے اسلامی قوانین کے دوبارہ نفاذ کے مسئلے پر گڑبڑ ہو رہی ہے۔ یہ بحث ایک ایسے ملک میں برسوں سے جاری ہے جہاں آبادی کی اکثریت مسلمان ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سوڈان کا سماجی نظام کئی برسوں سے اسلامی نہیں ہے۔ اگر یہاں اسلام نافذ ہوتا ہے تو ''اسلامی قوانین کے دوبارہ نفاذ'' کی بحث کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ ایسے تمام ملکوں میں جہاں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہے، اسلام کو تو اولین ترجیح کے طور پر نافذ ہونا چاہیے۔

میں مسلم ممالک کی موجودہ صورتحال کی تمام ذمہ داری سامراجیت پر ڈالنا نہیں چاہتا۔ اگر ۱۹ویں صدی کے آغاز میں مسلم دنیا اتنی طاقتور ہوتی کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑی رہ سکتی اور اپنا دفاع کر سکتی تو وہ سامراجی طاقتوں کے آگے زیر ہی نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم دنیا میں بحیثیت مجموعی اسلامی قوتیں زوال پذیر ہیں۔

یہ بالکل فطری امر ہے کہ ایک مضبوط طاقت میں وقت گزرنے کے ساتھ کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب یا تو وہ طاقت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے یا اگر اپنی اصلاح کر لے تو باقی رہ جاتی ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کو موقع بہ موقع یہ مہلت دی ہے کہ وہ اپنی طاقت کو مجتمع کر لیں، تاہم ۱۹ ویں صدی میں مسلم ممالک کے زوال اور یورپی ملکوں کے قوت پذیر ہونے کا عمل بیک وقت ہوا اور بیشتر مسلم ممالک یورپی سامراجیت کے طوفان کی زد میں آ گئے۔

مسلم ممالک کی موجودہ صورتحال سامراجی تسلط کا ورثہ اور قومیت سمیت دیگر نظریات کا نتیجہ ہے۔ اسلام کے احیاء کی تحریک ان معاشروں میں صرف ایک طرز فکر ہے جسے سخت مخالفت اور شدید دشواریوں کا سامنا ہے۔ یہ بات ناقابل تردید ہے کہ بعض مسلم معاشروں میں سماجی برائیاں موجود ہیں لیکن یہ برائیاں اسلامی طرز حیات کا نتیجہ نہیں ہیں، کیونکہ ان معاشروں میں اسلامی نظام حیات

پر کئی نسلوں سے عمل نہیں ہو رہا۔ تاہم ان معاشروں میں انفرادی مثالیں موجود ہیں کہ مسلمان، مخالف حالات کے باوجود اپنی زندگی اسلام کے مطابق بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان چند افراد کی کوششوں یا زندگیوں کی بنیاد پر اس معاشرے کو اسلامی معاشرہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اکثر صورتوں میں ان افراد کے لیے انتخاب نہایت مشکل ہوتا ہے اور بعض حالات میں تو انتخاب کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ مثلاً بینکاری کے نظام کو لیجیے۔ بیشتر مسلم ممالک میں بینکاری کا نظام مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے مطابق ہے جس کی بنیاد سود پر ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے سود نا قابل قبول ہے۔ اب جو لوگ اسلام پر عمل کرتے ہیں وہ سودی نظام میں اپنی بچت جمع نہیں کراتے۔ سرمایہ کاری کے جو دوسرے طریقے ہیں وہ بھی غیر محفوظ یا ممنوع ہیں یا مسلمانوں کے لیے نا قابل قبول ہیں۔ اس صورتحال میں ایک مسلمان کے لیے تو کوئی راستہ بچا ہی نہیں کہ وہ اپنی مالی حالت بہتر بنا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر مسلمان معاشرے میں افلاس کا شکار ہیں۔ افراد کی بچتیں غیر پیداواری طور پر ان کے پاس جمع ہیں جس سے نہ تو خود ان کو کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے اور نہ معاشرے کو۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم دنیا کے بڑے حصے میں ناانصافی کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں لیکن جب آپ ایسے معاملوں پر بغور نظر ڈالیں گے تو آپ کو پتا چلے گا کہ ان مسلم ملکوں میں اسلامی قوانین پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ وہاں ان لوگوں کے لیے بہت سی فوجی عدالتیں اور بے اصول مقدمات ہیں، جن کا ضمیر صاف ہے اور جو بااصول لوگ ہیں۔ لیکن یہ تمام ناانصافیاں اور خرابیاں مطلق العنان نظام حکمرانی کا نتیجہ ہیں۔ اسلام کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مشرقی یورپ کے ملکوں میں نافذ آمرانہ نظام کے لیے ہم عیسائیت کو ذمہ دار قرار نہیں دے سکتے، اسی طرح چین میں جو نظام جاری ہے اس کے لیے بدھ مت کو ذمے دار قرار نہیں دیا جاسکتا تو پھر بعض مسلم آبادی کے ملکوں کی خرابیوں کے لیے اسلام کو کیوں الزام دیا جاتا ہے؟

آپ کے دوست کا کہنا ہے کہ ان ملکوں میں صرف اسلامی نظام تعلیم رائج ہے۔ میرے خیال میں یہ بات بھی درست نہیں ہے۔ اگر اسلامی نظام تعلیم رائج ہوتا تو اس کے نتیجہ میں خالص مسلمان نسل کو پیدا ہونا چاہیے تھا جو اسلام کو بطور نظام حیات اپناتی اور اس کا دوبارہ نفاذ عمل میں لاتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور نہ ہوتا نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیشتر مسلم ممالک ابھی تک انہیں نظام ہائے تعلیم کو اپنائے ہوئے ہیں جو سامراجی قوتوں نے اپنے دور تسلط میں اپنے مخصوص مقاصد کے لیے رائج کیے تھے۔ مسلم ممالک ابھی تک اپنی قومی ضروریات مقاصد اور مستقبل کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور اسلامی اصولوں پر مبنی نظام تعلیم رائج نہیں کر سکے ہیں۔

اس تمام بحث کا نتیجہ آخر کیا نکلتا ہے؟

میری رائے میں آپ کے دوست کا یہ خیال درست ہے کہ اسلامی نظریہ حیات اور مسلمانوں کی موجود حالت کے درمیان بہت نمایاں فرق ہے، جو یقیناً تکلیف دہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ ماضی کے ادوار میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسلامی اصولوں پر ہر قسم کے معاشروں میں عمل کیا جاسکتا ہے۔ جب کبھی بھی اسلام کے نفاذ اور اس پر عمل کی کوشش کی گئی، اس کے شاندار نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ لہٰذا آج کے مسلمانوں کو اپنی موجودہ حالت کا جائزہ لینا چاہیے، غور کرنا چاہیے اور اسلام کو اپنی زندگی پر لاگو کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جو کوششیں ہونی چاہئیں ان کی ذمہ داری مسلم دانشوروں پر بھی عائد ہوتی ہے کیونکہ یہ لوگ معاشرے میں قائدانہ کردار ادا کرتے ہیں۔ ان حضرات کو وسیع پیمانے پر اور شاندار طریقے سے اپنے معاشروں میں یہ بحث عام کرنی چاہیے کہ اسلام کسی کڑے اور بے لوچ نظام حکومت یا سماجی نظام کا نام نہیں ہے۔ اسلام میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ زمانے کی ترقی کے ساتھ خود میں تبدیلی کر سکے اور اپنے بنیادی اصولوں سے انحراف کیے بغیر جدید دور کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ انفرادی طور پر ہمیں اسلامی تعلیمات کے سیکھنے اور ان پر عمل کرنے کی بہترین کوشش کرنی چاہیے اور اسلامی تعلیمات کو اسی طریقے پر اپنانا چاہیے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے، نہ کہ ان طریقوں پر جو لوگوں نے غلط تعبیر کر کے وضع کیے ہیں۔ اگر ہم نیک نیتی اور خلوص عمل کے ساتھ ایسا کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے راستے پر چلنا آسان ہے اور اس سے فرد اور معاشرہ دونوں فلاح پا سکتے ہیں۔

مغربی معاشرے میں پیدا ہونے اور تربیت پانے والے مسلمانوں کے سوالات

سوال: میں ان ہزاروں نوعمر مسلمان لڑکیوں میں سے ایک ہوں جن کی پیدائش انگلستان میں ان والدین کے یہاں ہوئی جو ایشیا کے مسلم ملکوں سے ہجرت کر کے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ہماری تعلیم برطانیہ کے اسکولوں میں ہوئی، جس کے نتیجہ میں متعدد غیر مسلم لڑکے اور لڑکیاں میرے ہم جماعت اور قریبی دوست بن گئے۔ ہم نے تھوڑی بہت اسلامی تعلیم حاصل کی ہے اور نماز، روزہ اور عربی میں قرآن مجید کی تلاوت کرنا سیکھ لیا ہے۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم شادی کی عمر کو پہنچتی ہیں۔ والدین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کی لڑکی ماں باپ کی پسند کے لڑکے سے شادی کرے۔ میں والدین کی طے کی ہوئی شادی کے خلاف نہیں ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ شادی کے

وقت دونوں فریقوں کا رضا مند ہونا ضروری ہے۔ آپ کے سوال و جواب پڑھنے سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ اسلام میں مسلمان مرد کو عیسائی عورت سے شادی کرنے کی اجازت ہے۔ یہ بات جانتے ہوئے کہ اسلام، مرد اور عورت کے ساتھ مساوی سلوک رکھتا ہے، میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا ایک مسلم عورت، عیسائی مرد سے شادی کر سکتی ہے؟

برطانیہ میں پرورش پانے والی نوعمر مسلم لڑکیوں کے بہت سے عیسائی دوست ایسے ہوتے ہیں جو اچھے شوہر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر ایک مسلم خاتون عیسائی مرد سے شادی کرتی ہے تو دونوں کے درمیان یہ واضح معاہدہ ہوگا کہ ان کے بچوں کو مکمل آزادی ہوگی کہ وہ جس مذہب کو چاہیں اختیار کریں۔ کیا اس قسم کی شادی صحیح ہوگی؟

یہاں میں یہ واضح کرنا چاہوں گی کہ میری طرح بیشتر نوعمر مسلمان لڑکیوں کے لیے یہ بہت آسان ہے کہ وہ گھر چھوڑ دیں، ملازمت کریں اور مناسب وقت پر سول میرج کر لیں، لیکن میں ایسا نہیں کرنا چاہتی، کیونکہ اس سے میرے والدین، جن سے میں بہت محبت کرتی ہوں، پریشان ہوں گے۔ دوسری طرف صورت یہ ہے کہ میرے والد اکثر دھمکی دیتے ہیں کہ وہ مجھے اپنے وطن واپس بھیج دیں گے۔ یہ تصور ہی میرے لیے ناقابل برداشت ہے، کیونکہ وہاں جا کر میں بالکل اجنبی ہوں گی۔ وہاں مجھے ملازمت بھی آسانی سے نہیں ملے گی اور مجھے میری مرضی کے خلاف شادی پر مجبور کیا جائے گا! آپ کے مشورے کے لیے شکر گزار رہوں گی۔

جواب: آپ نے ایک نہایت اہم مسئلے کی نشاندہی کی ہے۔ لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر ہجرت کرتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے معاشی وجوہ کی بنا پر ہجرت کی اور روزگار کی تلاش میں برطانیہ چلے گئے۔ ابتداء میں ان کا خیال تھا کہ وہ چند برس ملازمت کر کے کچھ سرمایہ جمع کر لیں گے اور پھر اپنے وطن واپس جا کر وہاں کوئی کاروبار شروع کر دیں گے۔ لیکن وقت گزرتا گیا، ان لوگوں نے یا تو وہاں شادیاں کر لیں یا اپنے بیوی بچوں کو بھی بلا لیا اور اس جگہ ان کے قدم جمتے چلے گئے اور جڑیں گہری ہوتی گئیں۔ ان کے بچے برطانیہ کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے لگے تو انہوں نے کوشش کی کہ اپنے بچوں کو گھر پر مذہبی تعلیم دی جائے یا اگر علاقہ میں مسجد ہے تو وہاں بھیجا جائے۔

ان بچوں کو آج جن مسائل کا سامنا ہے، اس کے لیے ان کے والدین کو زیادہ ذمے دار قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ان سے جو بھی ممکن تھا، انہوں نے اپنے بچوں کے لیے کیا۔ یہ والدین خود جن حالات میں پرورش پا کر بڑے ہوئے تھے، انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش اس سے بہتر

حالات میں کی۔ ان کا خیال تھا کہ غیر مسلم معاشرے میں رہتے ہوئے جو تھوڑی بہت اسلامی تعلیم وہ اپنے بچوں کو فراہم کر رہے ہیں، وہ انہیں (بچوں کو) اچھا مسلمان بنانے کے لیے کافی ہوگی۔ بیشتر بچے اپنے اسلامی تشخص سے خوش ہیں، خصوصاً وہ جنہیں اسلام کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ تاہم اکثریت اپنی اسلامی شناخت کو اپنے مجموعی تشخص کا حصہ سمجھتی ہے۔ اگر ان کے والدین کا تعلق پاکستان سے ہے تو وہ پاکستان نژاد برطانوی مسلمان ہیں۔ انہوں نے اس تشخص کو اسی طرح قبول کرلیا ہے جس طرح اپنے رنگ اور قد وغیرہ کو۔

جب ان بچوں کے والدین کو احساس ہوتا ہے کہ ان کے بچے ایسے خیالات اپنا رہے ہیں جو ان کے لیے ناقابل قبول ہیں تو مسئلے کو سمجھنا ان کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے بچوں کو اچھا مسلمان بنانے کے لیے جو تعلیم و تربیت انہوں نے فراہم کی وہ کافی تھی۔ ایسے والدین نے قرآن مجید کو عربی میں بغیر سمجھے پڑھا اور وہ اس سے مطمئن تھے۔ وہ قرآن کو اللہ کا کلام سمجھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد بھی ایسا ہی کرے، لیکن برطانوی معاشرے میں تعلیم و تربیت پانے والے بچے اس کو صحیح طریقہ سے نہیں سمجھتے۔ وہ سوالات کرتے ہیں اور ان کے جوابات چاہتے ہیں۔ والدین اس بات کو نہیں سمجھ پاتے کہ ان کے بچے باغی کیوں ہو رہے ہیں۔ یہ والدین اس تبدیلی کا ادراک نہیں کر پاتے جو ان کے بچوں میں وہاں کی تعلیم و تربیت اور اس معاشرے میں ہوش سنبھالنے کی وجہ سے ان کے انداز فکر اور ان کے عمومی رویے میں پیدا ہوئی ہے۔ یہ والدین اپنے بچوں کے اس رویے کو بھی پسند نہیں کرتے کہ وہ اپنے طور پر سوچیں اور اپنی رائے قائم کریں۔ چنانچہ وہ مغربی معاشرے کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور اپنے بچوں کو بھی موردِ الزام گردانتے ہیں۔

ان بچوں کو اسلام کے بارے میں جو ناکافی معلومات ہوتی ہیں، اس کے پیش نظر یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ وہ حلال و حرام کے بارے میں خود ہی رائے قائم کرلیتے ہیں اور اسلام کے غیر واضح تصور کے ساتھ خود ہی یہ طے کرلیتے ہیں کہ کس بات کی اجازت ہوسکتی ہے۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ بچے روزمرہ زندگی میں دوسرے مذاہب کے بچوں کے ساتھ گھلتے ملتے ہیں، اسکولوں میں ایک ہی جماعت میں، ایک ہی استاد سے پڑھتے ہیں، کھیلتے ہیں اور دوسری سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ اس ماحول میں پرورش پانے والے بچوں کے لیے، اپنے والدین کی طرح ان لگے بندھے خیالات پر کاربند رہنا، جو وہ اپنے وطن سے ساتھ لے کر آئے تھے، قطعی ممکن نہیں ہے۔

اس پس منظر کے ساتھ، کسی مسلمان لڑکے یا لڑکی کا کسی غیر مسلم سے شادی کرنے کا تصور،

والدین کے لیے جتنا ہولناک ہوتا ہے، اولاد کے لیے نہیں ہوتا۔ اولاد کو یہ بالکل فطری نظر آتا ہے۔ پھر ایک مسلمان لڑکے کے لیے تو یہ اجازت ہے کہ وہ عیسائی لڑکی سے شادی کرلے، لیکن اس کے برخلاف صورتحال کا تصور ناقابل قبول ہوتا ہے۔ اگر کوئی مسلم لڑکی اپنے والد سے اس شادی کے امکان کے بارے میں بات کرے تو یہ بالکل فطری ہوگا کہ والد اسے وطن واپس بھیجنے پر غور شروع کردے کیونکہ وہاں رہ کر وہ (لڑکی) کم سے کم ایسے فعل سے بچی رہے گی جو نہ صرف اس کی اخلاقی اقدار کے خلاف ہوگا بلکہ اسے (لڑکی کو) دائرہ اسلام سے بھی خارج کردے گا۔

آپ کو چاہیے کہ اپنے والدین کے نقطہ نظر کو بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کریں، کیونکہ ان کا رویہ جذبات پر یا فرسودہ تصورات پر مبنی نہیں ہے۔ آپ کے والد یہ بخوبی جانتے ہیں کہ ایک مسلم عورت، غیر مسلم مرد سے شادی نہیں کرسکتی۔ اب اگر آپ اس شادی کے امکان پر اصرار کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ ایک غیر مسلم مرد سے ناجائز تعلق قائم کرنا چاہتی ہیں۔ آپ اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اسلام نہایت اعلیٰ اخلاقیات کا مذہب ہے۔ یہ آپ کے والد کا اخلاقیات کا احساس ہی ہے کہ اس شادی کے امکان کو روکنے کے لیے وہ ایک انتہائی قدم اٹھانے اور آپ کو اپنے وطن واپس بھیجنے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوئے۔ میری رائے میں یہ مسئلہ دونسلوں کے درمیان بہت زیادہ فکری تفاوت (جنریشن گیپ) کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور ثقافتی تفاوت اور ابلاغ کے فقدان نے اسے پیچیدہ بنادیا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے ایک دوسرے کے موقف کو اچھی طرح سنا جائے اور سمجھا جائے۔

میں یہاں یہ واضح کرنا چاہوں گا کہ گو کہ اسلام عورت اور مرد کے ساتھ یکساں سلوک پر زور دیتا ہے، لیکن بین المذاہب شادی کی اجازت، نہایت واضح اور سخت شرائط کے ساتھ دی گئی ہے۔ ایک مسلمان مرد ایک عیسائی یا یہودی خاتون سے شادی کرسکتا ہے، لیکن مسلمان عورت، غیر مسلم مرد سے شادی نہیں کرسکتی۔ مسلم خاتون کو کسی غیر مذہب کے پیروکار سے شادی کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس کے متعدد اسباب ہیں:

پہلی بات تو یہ ہے کہ شادی کے بعد مرد یا شوہر کا کردار سرپرست کا ہوتا ہے۔ وہ خاندان کا سربراہ ہوتا ہے۔ کسی غیر مسلم کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کا سرپرست یا نگراں بنے۔ دوسری جانب جب ایک مسلمان مرد کسی عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کرتا ہے تو اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے مذہب اور عقائد کا احترام کرے اور اسلام قبول کرنے کے لیے اس پر کوئی دباؤ نہ ڈالے۔ اگر عورت اسلام قبول کرنا چاہے تو یہ اس کی اپنی پسند اور اختیار پر ہوگا۔ اسلام ہی یہ ضمانت دیتا ہے کہ مسلمان مرد سے شادی کرنے والی عیسائی یا یہودی عورت (کے مذہب) کی

اصلاح کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

اگر ایک مسلم خاتون ایک غیر مسلم مرد سے شادی کرتی ہے تو اسے اپنے عقیدے کی آزادی کی کیا ضمانت دی گئی ہے۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ آپ جس مرد سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں وہ ہر قسم کی آزادی دینے کو تیار ہے۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو، لیکن اصول وقوانین فرد واحد کو پیش نظر رکھ کر نہیں ترتیب دیے جاتے۔ ان کی بنیاد عمومی حالات ہوتے ہیں۔ اس قسم کی ضمانت دیگر مذاہب میں نہیں دی گئی ہے۔ اس لیے اسلام نہیں چاہتا کہ مسلم خاتون کو ایسی صورتحال میں مبتلا کیا جائے جہاں اسے اپنے گھر میں اپنے مذہبی عقیدے کی آزادی نہ ہو۔ چنانچہ مسلم خاتون، غیر مسلم مرد سے شادی نہیں کرسکتی۔

اس معاملے میں بچوں کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ ایک وسیع الذہن شوہر آپ سے اس بات پر اتفاق کرسکتا ہے کہ بچوں کو مکمل آزادی ہونی چاہیے کہ وہ جو بھی مذہب چاہیں اختیار کریں۔ اس کا مطلب ہوگا کہ جب تک بچے بڑے نہیں ہوجاتے، وہ ہر قسم کی مذہبی تعلیم و تربیت سے محروم رہیں گے۔ یہ بات بچوں کے ساتھ ظلم کے مترادف ہے، کیونکہ اس طرح انہیں اپنے اور کائنات کے پیدا کرنے والے کے بارے میں جاننے کی فطری خواہش کی تسکین کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔ وہ یہ نہ جان پائیں گے کہ اللہ نے انسانوں کے لیے کیا کیا نعمتیں فراہم کی ہیں، وہ کتنا رحمٰن ہے اور مشکل وقت میں مدد چاہنے کے لیے اس سے کیسے رجوع کیا جائے۔ علاوہ ازیں بین المذاہب شادی میں اصول یہ ہے کہ بچے، ماں اور باپ کے مذاہب میں سے اس مذہب کی پیروی کریں گے جو دوسرے کے مقابلے میں اعلیٰ ہو۔ مذاہب کی درجہ بندی میں اسلام سب سے اعلیٰ مذہب ہے۔ اس کے بعد عیسائیت ہے اور پھر یہودیت اور اس کے بعد دیگر مذاہب۔ فرض کریں کہ ایک عیسائی ایک بدھ مت کے ماننے والے سے شادی کرتا ہے اور یہ لوگ مسلم معاشرے میں رہتے ہیں۔ اگر ان کے درمیان کوئی اختلاف ہوگا اور مسئلہ مسلمان قاضی کی عدالت میں جائے گا تو قاضی کا فیصلہ یہ ہوگا کہ ان کے بچے بڑے ہوکر عیسائی ہوں گے۔ اس اصول کی روشنی میں جب، ایک مسلمان، عیسائی یا یہودی سے شادی کرتا ہے تو اس کے بچے مسلمان سمجھے جائیں گے۔

میرے خیال میں آپ کے مسئلے کے حل کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ آپ اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کریں۔ ہمارا مذہب محض چند رسومات اور عبادات کا مجموعہ نہیں ہے۔ یہ زندگی کا بھرپور نظام ہے۔ مسلمان ہونے کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ نماز پڑھے، روزہ رکھے، زکواۃ ادا کرے، قرآن کی تلاوت کرے اور حج ادا کرے۔ یہ عبادات بھی اہم ہیں، لیکن ان کا تعلق زندگی کے ایک چھوٹے سے حصے سے ہے۔ جبکہ اسلام انسانی زندگی کے ہر شعبے اور ہر سرگرمی

سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے پیروکاروں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اسے شعوری طور پر اختیار کریں، صرف اس لیے مسلمان نہ ہوں کہ وہ ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہو گئے ہیں۔

جب آپ اسلام سے بہتر طور پر واقف ہو جائیں گی تب آپ اسلامی عقائد، اصولوں اور تعلیمات کو بہتر طور پر اپنے دوست کے سامنے واضح کر سکیں گی۔ اگر وہ یہ بات سمجھ لیں اور تسلیم کر لیں کہ اسلام سچا مذہب ہے اور وہ مسلمان ہونا چاہیں تب یہ بالکل درست ہوگا کہ وہ ایک مسلمان عورت سے شادی کر سکیں۔

آپ کے والد کا یہ انتباہ کہ اگر آپ نے اس قسم کا کوئی قدم اٹھایا تو وہ آپ کو وطن واپس بھیج دیں گے، نہ تو غیر معقول ہے اور نہ متشددانہ۔ آپ اس مسئلے کو اپنے والد کے نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کیجیے۔ اگر ایک بیٹی سول میرج کرنے کا ارادہ ظاہر کرتی ہے تو باپ کے نزدیک اس کی بیٹی کا اس کے ''شوہر'' سے ناجائز تعلق ہوگا اور ایک مسلمان کے نزدیک یہ قطعی ناقابل قبول ہے۔ باپ کے لیے یہ بالکل فطری امر ہوگا کہ وہ اپنی بیٹی کو اس ظلم سے بچانے کی تدبیر کرے۔ انہیں علم ہے کہ برطانیہ میں رہتے ہوئے ان کے وسائل محدود ہیں، لہٰذا وہ بیٹی کو کسی محفوظ جگہ بھیجنے کے امکان پر غور کریں گے اور یہ محفوظ مقام ان کا اپنا وطن ہوسکتا ہے جہاں ان کے خاندان کے دیگر افراد رہتے ہیں۔ اگر یہ صورتحال آپ کے لیے ناقابل برداشت ہے تو پھر آپ اپنے والد کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ آپ کے سامنے دو راستے ہیں یا تو آپ اسلام کا اتباع کریں یا اس سے باغی ہو جائیں۔ آپ کے والد کے سامنے بھی صرف دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ یا تو آپ اسلام کا حکم مانیں اور دوسری یہ کہ وہ آپ کو خود آپ سے محفوظ رکھنے کی تدبیر کریں۔ میرے خیال میں یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ اپنے والد کے ساتھ افہام و تفہیم سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

مغرب میں رہائش پذیر بیوہ خاتون کا ذریعہ آمدنی

سوال: میری ایک عزیزہ کینیڈا میں رہائش پذیر ہیں۔ تقریباً سات سال قبل ایک حادثے میں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم کے تین چھوٹے بچے تھے۔ میری عزیزہ کو اس حادثے کے بعد بیمہ زندگی کی دو پالیسیاں ملیں، ایک ان کے مرحوم شوہر کی زندگی کی اور دوسری اس مکان کے بیمہ کی جس میں ان کی رہائش تھی۔ اس کے علاوہ جس یونیورسٹی میں مرحوم ملازم تھے وہاں سے دس سال کے لیے پنشن کی سہولت حاصل ہوئی۔ بیمے کی دونوں پالیسیوں کی وجہ سے میری عزیزہ اور ان کے بچوں کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنی زندگی معمول کے مطابق بسر کرتے رہیں۔

مستقل آمدنی حاصل کرنے کے لیے خاتون نے بیمہ زندگی کے معاوضے میں ملنے والی رقم

طویل المدت بچت اسکیم میں جمع کرادی تاکہ اس سے حاصل ہونے والی رقم سے اخراجات چلتے رہیں۔ مکان کے بیمے کے نتیجے میں ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ معاوضہ ادا کر کے اسے رہن سے آزاد کرالیں اور بدستور اس میں رہیں بصورت دیگر انہیں وہ مکان چھوڑنا پڑتا۔

مذکورہ خاتون نے یہ تمام معاملات اپنے مقامی دوستوں اور اس قانونی مشیر کے مشورے پر کیے جس نے کینیڈا کے قانون کے مطابق ان کے مرحوم شوہر کی جائیداد کے معاملے طے کیے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ فکرمند بھی رہیں کہ ان تمام معاملات کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بعض مسلم اسکالرز سے بھی رجوع کیا اور ان حضرات نے یقین دلایا کہ چونکہ وہ ایک غیر مسلم ملک میں رہائش پذیر ہیں اس لیے وہ مذکورہ بالا مالی امور کو جاری رکھ سکتی ہیں کیونکہ وہاں ان کے لیے کوئی دوسری متبادل صورت ممکن نہیں ہے اور کوئی دوسرا طریقہ ایسا نہیں ہے جس سے وہ اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی کی ضروریات پوری کرسکیں۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ خاتون اس قدر تعلیم یافتہ نہیں ہیں کہ ملازمت کر کے زندگی گزارنے کا سامان کرسکیں اور نہ ہی انہیں اپنے میکے یا سسرال کی جانب سے طویل عرصے تک مالی مدد مل سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے موجودہ صورت حال کو انتہائی دشوار حالات میں قبول کیا ہے۔ وہ ایک اچھی مسلمان خاتون ہیں ان کی یہ تمنا ہے کہ ان کے بچے اچھے مسلمان بنیں۔

مذکورہ بالا حالات میں ان خاتون نے جو راستہ اختیار کیا ہے کیا وہ اسلام کے نزدیک قابل قبول ہے۔ اگر نہیں، تو پھر ان کے لیے متبادل طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟

جواب: مغربی ممالک میں رہائش پذیر مسلمانوں کو جس قسم کا مسائل کا سامنا ہے آپ کا بیان کردہ مسئلہ اس کی ایک مثال ہے۔ سرمایہ دار معاشرے نے اپنے لوگوں کو سماجی اور مالی تحفظات فراہم کرنے کی غرض سے بعض نظام اور ادارے وضع کرلیے ہیں۔ بیمہ، سودی سرمایہ کاری اور مکانات رہن رکھنا، اس معاشرے کے وضع کردہ بعض نظاموں اور اداروں کی شکلیں ہیں۔ جب ایک مسلمان اس قسم کے معاشرے میں رہتا ہے تو اسے چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ ایک جانب ان اداروں اور اسکیموں سے فائدہ بھی اٹھائے اور اس کے ساتھ ہی یہ فکر بھی لاحق رہے کہ یہ طریقہ اسلام کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے، تو یہ عجیب سی بات ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ اسے اسلام کے بارے میں بہت سی معلومات ہوں، لیکن اس کی اسلامی جبلت ضرور یہ احساس دلائے گی کہ ان پیچیدہ قسم کے مالی انتظامات میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

اس قسم کے چیلنج کا مقابلہ نہایت ٹھوس، اجتماعی اور طویل المدت طریقہ کار سے کیا جاسکتا ہے

جو کسی بھی غیر مسلم معاشرے میں رہنے والی مسلم اقلیت کو یہ یقین دلائے کہ ان کا وضع کردہ طریقہ کار، اسلامی شریعت کے اصولوں کے منافی نہیں ہے۔ مغربی معاشرے میں مسلم اقلیت کی حیثیت کے پیش نظر میں صرف یہ کہوں گا کہ ابھی اس مرحلہ تک پہنچنے میں کافی وقت لگے گا۔ مغربی معاشرے میں کہیں بھی کوئی مسلم اقلیت ابھی تک اس مرحلہ پر نہیں پہنچی ہے کہ وہ اپنے مسائل کے حل کے لیے اجتماعی طور پر، طویل المدت طریقے تلاش کرے اور اختیار کرے۔ تاہم یہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی اصول وضوابط کی پاسداری کرے اور یہ خیال رکھے کہ اپنے سماجی اور مالی تحفظات کے لیے اقدامات کرتے وقت ان اصولوں کی خلاف ورزی نہ ہو۔

آپ کے بیان کردہ سوال میں مذکورہ خاتون کو جس قسم کے مسئلے کا سامنا ہے وہ نہایت حقیقی نوعیت کا ہے۔ اس کی نوعیت اس وجہ سے سنگین ہوگئی ہے کہ جدید اسلامی تحقیقات، مالیاتی امور اور مسائل کے بارے میں ان تمام مسائل کا حل پیش نہیں کرتیں جو آج کے جدید معاشروں کو درپیش ہیں۔ جو تحقیقات کی گئی ہیں ان کا دائرہ محدود ہے اور وہ روزمرہ زندگی میں ایک عام مسلمان کو درپیش مسائل سے متعلق نہیں ہیں، تاہم اسلام نے چند اصول متعین کر دیے ہیں جن کی خلاف ورزی کسی صورت میں بھی نہیں کی جانی چاہیے۔ بدقسمتی سے ایسے حضرات موجود ہیں جو کسی جھجک کے بغیر مذہبی معاملات کے بارے میں اپنا ''فیصلہ'' دے دیتے ہیں اور ان بنیادی اصولوں کا خیال نہیں رکھتے جو اسلام نے متعین کیے ہیں۔ ان اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جو فیصلے دیئے جاتے ہیں ان میں ہر فرد کے معاملے کی نوعیت کے اعتبار سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ معاملات کی اس غیر اطمینان بخش صورتحال کی وجہ سے بعض اوقات کوئی شخص ایسا فعل بھی انجام دے ڈالتا ہے جو اسلام کے نزدیک قطعی ناقابل قبول ہوتا ہے لیکن متعلقہ شخص کو یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ اسلام کے خلاف عمل کر رہا ہے، لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ کسی بھی مشکوک یا پیچیدہ معاملے میں رائے صرف اس حلقہ سے لی جائے جو رائے دینے کا اہل ہو۔

ان ابتدائی کلمات کے بعد میں یہ عرض کروں گا کہ ذاتی طور پر میں کسی بھی معاملے میں شدید موقف اختیار کرنا پسند نہیں کرتا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ موقف میں ضرورت سے زیادہ شدت کا رویہ اسلام کی فطرت کے خلاف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ، کوئی ایسا واضح اصول نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا جو اسلام نے متعین کیا ہو۔ اس وضاحت کی روشنی میں بیمہ زندگی کو کس طرح جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ جب ایک بیمے کمپنی کسی شخص کو ''بیمہ فروخت'' کرتی ہے تو وہ دراصل صرف ایک وعدہ ہوتا ہے اور بیمہ دار کی موت کی صورت میں اس کے ورثاء کو طے شدہ رقم ادا کردی جاتی ہے۔ خرید وفروخت کے بارے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ جب کسی شخص سے رقم وصول کی جائے

تو اس کے بدلے میں اسے کوئی چیز یا کوئی خدمت مہیا کی جائے یا پھر تحفتاً کچھ پیش کیا جائے۔ کیا بیمہ ان تینوں میں سے کسی بھی ایک چیز کا متبادل ہے؟ فرض کیجیے اس معاملے کو تھوڑی دیر کے لیے یہیں رہنے دیں اور ان تمام دلائل کو تسلیم کرلیں جو بیمہ فروخت کرنے والے اپنی ''تجارت'' کے بارے میں پیش کرتے ہیں، تب بھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''نقصان'' کی وہ کون سی قسم ہے جس کے لیے بیمہ کیا جارہا ہے۔ کیا یہ پیش بندی رضائے الٰہی کے خلاف نہیں ہے۔ آپ بتایئے کہ آپ کی عزیزہ، جو خود اپنی روزی کمانے کے قابل نہیں ہیں، کیا ان انتظامات کے بارے میں ہمیشہ مطمئن اور بالیقین رہیں گی جو اس وقت موجود ہیں۔ اگر ان انتظامات کے بارے میں انہیں شبہات ہیں تو کیوں۔ یہ بے یقینی اور یہ احساس اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی اسلامی جبلت انہیں یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ جو کچھ کر رہی ہیں وہ اللہ کی مرضی ومنشا کے خلاف ہے۔ ان کے دل میں یہ احساس موجود ہے کہ ان کے بچوں کی پرورش جس رقم سے ہورہی ہے وہ سود ہے اور سود پر بچوں کی تربیت نہیں ہونی چاہیے۔

میں آپ کی عزیزہ کو اس عمل کے لیے موردِ الزام نہیں ٹھہرا رہا۔ اس معاملے میں بڑی حد تک ذمہ دار کوئی اور ہے۔ میں ان ''اسکالرز'' کے بارے میں عرض کر رہا ہوں جنہوں نے قرآن اور سنت کے کسی ٹھوس حوالے اور بنیاد کے بغیر اس قسم کے اقدامات کو جائز قرار دے دیا۔ کسی غیر مسلم معاشرے میں رہنے کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ اسلام کے ان اصولوں کی خلاف ورزی کی جائے جو افراد اور معاشرے پر یکساں طور پر لاگو ہوتے ہیں۔ جو چیز کسی فرد کے لیے ممنوع قرار دے دی گئی ہے وہ ہر صورت میں ممنوع رہے گی خواہ کوئی کینیڈا میں رہے یا مکہ میں۔ اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح طور پر سود کو اس کی ہر حالت میں ممنوع قرار دیا ہے اور کسی بھی طریقے سے، کسی بھی شکل میں، یہ اللہ کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہایت واضح طور پر اس بارے میں اس طرح ہدایت کی ہے کہ کسی شبے یا گنجائش کا امکان نہیں رہا ہے۔ اس کے باوجود کچھ لوگ مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں کہ وہ سود سمیت، اس پورے مالیاتی اور معاشی نظام کو اس وجہ سے قبول کرلیں کہ وہ ایک سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی غیر اسلامی معاشرے میں رہ رہے ہیں۔ جس بات کو اللہ نے ناجائز قرار دیا ہے اسے جائز قرار دینے کی یہ نہایت اوچھی کوشش ہے۔ یہ حضرات اپنے اس قسم کے فیصلوں کے حق میں جو دلائل دیتے ہیں مجھے ان کا علم ہے اور یہ دلائل ٹھوس بنیادیں نہیں رکھتے۔

آپ کی عزیزہ کے معاملے میں یہ کہوں گا کہ جو کچھ ہوچکا ہے اس کے بارے میں اب وہ صرف اللہ سے معافی کی دعا کرسکتی ہیں۔ چونکہ انہوں نے یہ اقدامات اسلامی قوانین سے پوری

واقفیت کے بغیر کیے اور ان کی نیت جان بوجھ کر اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی کی نہیں تھی، اس لیے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس فعل سے درگزر فرمائیں گے اور انہیں معاف کر دیں گے کہ وہ مہربان اور رحم کرنے والے ہیں اور اپنے بندوں کی خطائیں معاف کر دیتے ہیں۔

اب مسئلہ یہ رہتا ہے کہ اس سودی آمدنی پر جو کچھ انتظام چل رہا ہے اس کے بارے میں کیا رویہ ہونا چاہیے۔ واضح بات یہ ہے کہ اب اس سلسلے کے جاری رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ کا فرمان ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سود سے بچے رہو اگر ایسا نہ کیا تو یاد رکھو کہ تمہارے اور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی۔ کیا سود کے خلاف اس سے زیادہ تنبیہ کوئی اور ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں حدیث مبارک میں ہے کہ جو شخص سود کی رقم وصول کرتا ہے، جو شخص سود کی رقم ادا کرتا ہے، جو شخص سودی لین دین کا معاہدہ کرتا ہے اور جو لوگ اس معاہدے کے گواہ بنتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب پر لعنت بھیجتا ہے۔

آپ کی عزیزہ کی رقم کی سرمایہ کاری کے لیے کئی طریقے ایسے ہیں جو اسلام کے مطابق ہیں۔ مثلاً وہ کسی مسلمان تاجر کے ساتھ شراکت کا معاہدہ کر سکتی ہیں اور اس کاروبار کی کارکردگی کے مطابق انہیں منافع ملتا رہے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ کسی ایسی اسلامی کمپنی میں اپنا سرمایہ لگا سکتی ہیں جو اس قسم کی سرمایہ کاری قبول کرتی ہو۔ مغرب میں ایسے ادارے بھی موجود ہیں جو اس قسم کے سرمائے کو مختلف کمپنیوں کے حصص میں لگا دیتے ہیں۔ کسی ایسے ادارے کے سوا جس کا نظام سود کی بنیاد پر چلایا جا رہا ہو یا اس کاروبار کی ممانعت نہ ہو، ہر ادارے میں سرمایہ کاری جائز ہوگی۔ ممکن ہے کہ آپ کی عزیزہ کو کسی ایسے شخص کی مدد کی ضرورت ہو جو انہیں مشورہ دے سکے کہ سرمایہ کس جگہ لگانا چاہیے ایسے کسی شخص کا تعاون حاصل کرنا دشوار نہیں ہوگا۔ میں انہیں یہی مشورہ دوں گا کہ وہ فوری طور پر سودی کاروبار میں سے اپنا سرمایہ نکال لیں اور کسی ایسی جگہ سرمایہ کاری کریں جو اسلام کے نزدیک قابل قبول ہو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرے گا اور انہیں اسلامی شریعت کی پابند رہتے ہوئے کامیابی عطا کرے گا۔

بدعنوان افسروں کی ماتحتی اور غیر مسلم حکومت کی ملازمت

سوال: میرے ایک دوست، جو نہایت متقی اور نیک مسلمان ہیں، ایک عجیب وجہ سے اپنی ملازمت ترک کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک غیر مسلم ملک کی سرکاری ملازمت میں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے افسران بدعنوان ہیں لیکن وہ اپنی بدعنوانیوں پہ پردہ ڈالنے کے لیے جو کاغذی کارروائیاں کرتے ہیں،

ان کاغذات پر میرے دستخط ضرور کرائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو جو تنخواہ ملتی ہے اس کا کچھ حصہ بھی غیر اسلامی آمدنی پر مشتمل ہوتا ہے کیونکہ حکومت یہ تنخواہ جس آمدنی سے ادا کرتی ہے وہ بعض ایسی اشیا کی فروخت سے حاصل ہوتی ہے جس کی فروخت کی اسلام میں اجازت نہیں ہے۔ دوسرے اس آمدنی میں ڈسکو کلب، قمار خانوں اور دیگر ممنوعہ سرگرمیوں کے ٹیکس بھی شامل ہوتے ہیں۔ میرے دوست کا کہنا ہے کہ ان تمام وجوہ کی بنا پر ان کی اپنی آمدنی ناپسندیدہ ہوگئی ہے اور وہ اس وجہ سے ملازمت ترک کرنا چاہتے ہیں۔ براہ کرم اس مسئلہ پر اظہار خیال فرمایے۔

جواب: آپ کے دوست کا یہ رویہ قابل تعریف ہے کہ وہ اپنی روزی اور رزق کے بارے میں فکر مند ہیں کہ جائز ہے یا نہیں۔ بد قسمتی سے اکثر ممالک میں بعض سرکاری افسران بدعنوان ہیں۔ وہ اپنے عہدوں سے ناجائز فائدے اٹھاتے ہیں، سرکاری ٹھیکے میں کمیشن لیتے ہیں اور لوگوں کے جائز یا ناجائز کام کرنے کے لیے رشوتیں طلب کرتے ہیں۔ بعض افسران سرکاری رقوم میں خورد برد کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایسی تمام آمدنی ناجائز اور غیر منصفانہ ہوتی ہے۔ دوسری طرف چونکہ حکومت کی آمدنی کا ایک حصہ خورد برد ہو جاتا ہے اس لیے وہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے ٹیکسوں میں اضافہ کر دیتی ہے جس کا بوجھ عوام پر پڑتا ہے اور نتیجہ میں پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابیؓ کو کسی دور دراز علاقے میں زکواۃ جمع کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ اپنا کام مکمل کر کے واپس آئے اور زکواۃ کی رقم بیت المال میں جمع کرائی۔ اس موقع پر انہوں نے بعض اشیاء کی نشاندہی کی اور بتایا کہ یہ میری ذاتی چیزیں ہیں کیونکہ لوگوں نے تحفتاً دی ہیں۔ اس بات کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ناراض ہوئے اور آپ نے منبر شریف پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ جب بعض لوگ کام مکمل کر کے واپس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انہیں تحفے دیے گئے ہیں۔ ان لوگوں کو ان کے گھروں پر ہی رکھا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ کون انہیں تحفے پیش کرتا ہے۔ اس واقعے میں یہ بات ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابیؓ کی دیانت میں کوئی شبہ نہیں تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان صحابیؓ کو تحفے دیے گئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بات کی نشاندہی کی وہ یہ تھی کہ ان صحابیؓ کو تحفے اس لیے دیے گئے کہ انہیں اسلامی حکومت کی جانب سے ایک خاص کام سونپا گیا تھا اور اس کی تکمیل کے لیے وہاں گئے تھے۔ گویا یہ تمام تحفے ان کی سرکاری حیثیت کی وجہ سے پیش کیے گئے تھے۔ کسی سرکاری ذمہ داری کی ادائیگی کے دوران اس قسم کے تحفے لینا منع ہے، کیونکہ یہ

سرکاری عہدے کا ناجائز استعمال ہے۔

آپ کے دوست کو واقعی ایک مشکل صورتحال کا سامنا ہے کیونکہ ان کے حکام بالا اپنی بدعنوانیوں کی پردہ پوشی کے لیے سرکاری کاغذات کی تکمیل میں ان کے دستخط طلب کرتے ہیں۔ یہ بدعنوان افسران سرکاری رقم کے خورد برد یا چوری کے مرتکب ہیں لیکن آپ کے دوست ان کی سرگرمیوں میں شامل نہیں ہیں۔ آپ کے دوست کو چاہیے کہ وہ اپنے حکام بالا کے خلاف آواز اٹھائیں اور ان کے ناجائز کاموں میں شرکت سے انکار کردیں۔

اس قسم کے اکثر معاملات میں ایک نیک ملازم کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ایسا ضرور ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ اپنا دفاع کرسکتا ہے لیکن ایسی صورتحال بھی ہوتی ہے جس میں ایک نیک چلن ملازم کے لیے کامیابی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا کیونکہ بدعنوانی کا سلسلہ اوپر تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ کیا اس صورت میں اس ملازم کو ملازمت چھوڑ دینا چاہیے؟ اس سوال کا ایسا واضح جواب دینا مشکل ہے جو ہر قسم کی صورتحال کے لیے موزوں ہو۔ میرے خیال میں متعلقہ سرکاری ملازم کو صورتحال کی اصلاح کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے اور اگر اصلاح کی کوئی گنجائش نہ ہو تب بھی ملازمت اس وقت چھوڑنا چاہیے جب متبادل ملازمت مل جائے۔

آپ کے دوست نے دوسرا سوال اپنی تنخواہ کے بارے میں کیا ہے کہ چونکہ حکومت کی آمدنی مشکوک ہے اور انہیں اس آمدنی ہی سے تنخواہ ملتی ہے لہٰذا وہ ناجائز ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حکومت کی کل آمدنی میں ناجائز آمدنی کا حصہ بہت قلیل ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ سرکاری ملازم ان ذرائع اور طریقوں کا ذمہ دار نہیں ہے جو حکومت اپنی آمدنی کے لیے اختیار کرتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ سرکاری ملازم کو اس کام کی تنخواہ ملتی ہے جو وہ انجام دیتا ہے۔ اگر وہ کام جو وہ انجام دے رہا ہے، ممنوعہ نوعیت کا نہیں ہے تو اس کی آمدنی جائز ہوگی۔ اگر وہ کام اسلامی نقطہ نظر سے ممنوع ہے مثلاً سرکاری شراب خانے کی یا شراب تیار کرنے کے کارخانے کی کوئی ذمہ داری، تو وہ یقیناً حرام ہوگا۔

آپ نے جو معلومات فراہم کی ہیں، ان کی بنا پر میرے خیال میں آپ کے دوست کے لیے ملازمت ترک کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ تاہم اگر انہیں بہتر ملازمت کا موقع ملتا ہے تو اس صورت میں وہ فیصلہ کرسکتے ہیں۔

غیر مسلم کے ہاتھ کا ذبیحہ

سوال: کیا غیر مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمان ایسے جانوروں کا گوشت استعمال کرسکتے ہیں جو

وہاں کے طریقے کے مطابق ذبح کیے جاتے ہیں۔ کیا ایک مسلمان کسی یہودی یا عیسائی کے ہاتھوں کا تیار کیا ہوا کھانا کھا سکتا ہے۔ غیر مسلم ملکوں کی درسگاہوں میں پڑھنے والے طلبہ کو اکثر درسگاہوں کے کیفے ٹیریا میں کھانا پڑتا ہے۔

جواب: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مسلمان، عیسائیوں اور یہودیوں اور دیگر اہل کتاب کا تیار کردہ کھانا کھا سکتے ہیں۔ لہٰذا جب تک ان لوگوں کی جانب سے کسی خاص ممنوعہ غذا/گوشت پر مشتمل کھانے کا اندیشہ نہ ہو، ان کا کھانا کھایا جا سکتا ہے۔ یہودی جانوروں کو اسی طرح ذبح کرتے ہیں جس طرح ہم لوگ کرتے ہیں۔ عیسائی بالخصوص مغربی یورپ اور امریکہ میں بسنے والے جانوروں کو مختلف طریقوں سے ذبح کرتے ہیں۔ مسلمان علماء اس بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں کہ ان طریقوں سے ذبح کیا ہوا گوشت جائز ہے، یا ناجائز۔ تاہم اس قسم کی صورتحال میں آسان صورتحال کو اختیار کر لینا چاہیے کیونکہ بعض لائق علماء اس کے حق میں دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔

ایک عیسائی ملک میں رہنے والے مسلمان کو ان طریقوں سے آگاہ ہونا چاہیے جو وہاں کے لوگ جانوروں کو ذبح کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ علم ہو جائے کہ وہاں رائج طریقے میں ذبح کرنے سے پہلے جانور ہلاک نہیں ہوتا تو آپ اللہ کا نام لیتے ہوئے ایسا گوشت استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر آپ کو یہ علم ہو جائے کہ ذبح کرنے سے پہلے جانور بجلی کے جھٹکے کے نتیجے میں ہلاک ہو جاتا ہے تو اس گوشت سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، بڑے جانور مثلاً بھیڑ، گائے وغیرہ بجلی کے جھٹکے سے ہلاک نہیں ہوتے محض بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ جانوروں کو بے ہوش کرنے کا مقصد انہیں ذبح کرتے وقت کی تکلیف سے بچانا ہے۔ ایسے جانوروں کا گوشت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چھوٹے جانور مثلاً مرغی وغیرہ بجلی کے جھٹکے کے نتیجے میں ہلاک ہو جاتے ہیں اور مردہ ہونے کی وجہ سے ان کا گوشت استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

کون سا گوشت کھایا جائے؟

سوال: ایک مذہبی عالم کا کہنا ہے کہ غیر مسلم یا مشرکین کے ہاتھوں سے جو جانور ذبح ہوا ہو، اس کا گوشت کھانا منع نہیں ہے بشرطیکہ ذبح کرنے والے نے اسلامی طریقے پر عمل کیا ہو یعنی ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو اور دوسری شرائط پوری کی گئی ہوں کیا یہ بیان درست ہے؟

جواب: جی نہیں! یہ بات درست نہیں ہے۔ ذبح شدہ جانور، جس کا گوشت کھانے کی اجازت ہے

لازماً کسی مسلمان، عیسائی یا یہودی کے ہاتھ سے ذبح ہونا چاہیے۔ مشرکین، کافر یا ملحدوں کے ہاتھوں سے ذبح کیے گئے جانور کا گوشت کھانے کی اجازت نہیں ہے۔ اللہ کا نام مشرکوں، کافروں یا ملحدوں کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ یہ لوگ اللہ پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر ان میں سے کوئی جانور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لے بھی لے تو وہ ایسا صرف کاروباری ضرورت کے تحت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صرف اہل کتاب کے ہاتھوں ذبح شدہ جانور کا گوشت کھانے کی اجازت دی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذکر نہیں ہے ان کے ہاتھوں ذبح شدہ جانور کا گوشت کھانے کی ممانعت ہے۔

سوال: مرغی ذبح کرتے وقت اگر ذبح کرنے والا مسلمان ہو، لیکن اس کام میں مدد دینے کے لیے مرغی کے جسم کو پکڑنے والا شخص غیر مسلم ہو تو اس صورت میں ذبیحہ پر کیا اثر پڑے گا۔ اس گوشت کا کھانا جائز ہوگا؟

جواب: آپ نے جو صورت بیان کی ہے اس کے مطابق ذبیحہ مرغی کو کھانا بالکل درست ہے بشرطیکہ ذبیحہ اسلامی قواعد کے مطابق کیا گیا ہو، یعنی ذبح کرنے والے نے چھری پھیرتے وقت اللہ کا نام لیا ہو، چھری کی دھار تیز ہو اور جانور کو شہ رگ سے کاٹا گیا ہو تا کہ وہ فوراً ہی ہوش کھو بیٹھے اور اسے کم سے کم تکلیف ہو۔ اگر جانور کو کسی غیر مسلم نے پکڑا ہوا ہے تو اس سے صورتحال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سوال: کیا عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاتھوں ذبح شدہ جانور کا گوشت استعمال کرنا جائز ہے خواہ یہ ذبیحہ اسلامی طریقے کے مطابق نہ ہوا ہو۔ اگر جانور ذبح کرنے کے دوران غلطی سے جانور کا سر اس کے دھڑ سے بالکل الگ ہو جائے تو ایسے جانور کا گوشت کھانا جائز ہوگا؟

جواب: اگر عیسائی یا یہودی جانور ذبح کرتے وقت بائبل میں بتائے گئے طریقے پر عمل کرتے ہیں تو وہ طریقہ وہی ہے جس کی تعلیم اسلام میں دی گئی ہے۔ یہودی تو اب تک اسی بتائے ہوئے طریقے پر عمل پیرا ہیں لیکن عیسائیوں نے اس سے انحراف کرتے ہوئے نئے طریقے رائج کر لیے ہیں جس میں جانور کو بجلی کے جھٹکے دے کر بے ہوش کرنے کا طریقہ بھی شامل ہے۔ اس طریقے سے جانور کو ذبح کرنے سے پہلے مکمل طور پر بے ہوش کر دیا جاتا ہے۔ بڑے جانوروں مثلاً بھیڑ یا گائے کی صورت میں جانور ایک دو منٹ کے اندر ہوش میں آ جاتا ہے بجز اس کے کہ اس دوران اس کو ذبح نہ کر دیا جائے۔ لہٰذا ایسے جانور کا گوشت استعمال کرنا درست ہے۔ (یعنی بے ہوشی یا ہوش کی

حالت میں ذبح شدہ جانور کا گوشت استعمال کیا جا سکتا ہے۔) چھوٹے جانوروں مثلاً مرغی وغیرہ کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ بجلی کا جھٹکا لگنے سے جانور کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایسے جانور کا گوشت استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ یورپ کے ملکوں میں عیسائیوں کے ہاتھوں ہلاک شدہ مرغیوں کا گوشت استعمال کرنے سے پرہیز کرنا زیادہ بہتر ہے مسلمان ملکوں میں عیسائی قصائی بالعموم وہی طریقہ استعمال کرتے ہیں جو مسلمانوں کا ہے۔ لہٰذا ایسے ممالک میں عیسائی قصائیوں سے گوشت خریدنا جائز ہے۔

اگر ذبح کے دوران غلطی سے جانور کی گردن جسم سے بالکل علیحدہ ہو جائے تو ایسے جانور کا گوشت استعمال کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ذبیحہ کی دیگر شرائط پر عمل کیا گیا ہو۔ ان شرائط میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

غیر مسلموں کے ساتھ میل جول

سوال: میرا تعلق ایک ایسے ملک سے ہے جہاں تین مذاہب یعنی اسلام، عیسائیت اور ہندومت کے پیروکار ایک ساتھ رہتے ہیں۔ کسی ایک مذہب کے تہوار پر دوسرے مذاہب کے ماننے والے تہوار منانے والوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ مثلاً عید کے موقع پر ہندو اور عیسائی مسلمانوں کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور کرسمس کے تہوار پر مسلمان، عیسائیوں کو تہنیت پیش کرتے ہیں۔ بعض لوگ اس رویے کے خلاف ہیں اور اسے ناقابل قبول قرار دیتے ہیں۔ ازراہ کرم اپنی رائے سے مطلع فرمایے۔

جواب: اسلام اس بات کو نہایت اہمیت دیتا ہے کہ مسلمان جس معاشرے میں رہتے بستے ہیں وہاں رہنے والے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں سے ان کے تعلقات خوشگوار ہونے چاہئیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر حکم دیا ہے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والے ایسے لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آیا جائے جو مسلمانوں سے جنگ پر آمادہ نہ ہوں اور مسلم ریاست کے خلاف نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مزید حکم دیا ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور یہ کہ اللہ اچھا سلوک کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ جو لوگ مسلمانوں کے خلاف جارحانہ عزائم رکھتے ہوں اور مسلم ریاست کے خلاف ہوں، ان کے ساتھ اچھے تعلقات نہ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

جس معاشرے میں مختلف مذاہب کے ماننے والے پرامن طور پر رہتے ہوں وہاں ایک دوسرے کی خوشی میں شریک ہونے اور تہواروں پر ایک دوسرے کو مبارکباد دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایسے مواقع پر ان کی پیش کی ہوئی چیز کھانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے بشرطیکہ ہمیں علم ہو

کہ انہوں نے جانور کا ذبیحہ غیر اسلامی طریقے سے کیا ہے۔

غیر مسلموں کو سلام کرنا چاہیے؟

سوال: کیا غیر مسلم کو ''السلام علیکم'' کہا جا سکتا ہے؟

جواب: کسی غیر مسلم سے ملاقات کے وقت پہل کرتے ہوئے اسے تہنیت پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بشرطیکہ وہ اسلام اور مسلم معاشرے کے لیے جارحانہ عزائم نہ رکھتا ہو۔ اگر ملاقات کے وقت سلام کرنے میں وہ سبقت حاصل کرلے تو ہمیں بھی اسی طرح کا جواب دینا چاہیے۔ آپ کے سوال میں نکتہ یہ ہے کہ کیا غیر مسلموں کے ساتھ سلام یا تہنیت کے وہی الفاظ۔۔۔ یعنی ''السلام علیکم''۔۔۔ استعمال کیے جا سکتے ہیں، جو مسلمان آپس میں استعمال کرتے ہیں؟ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ الفاظ ابتداء کرتے ہوئے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہئیں لیکن اگر غیر مسلم ''السلام علیکم'' کے الفاظ استعمال کرے تو جواب میں ''وعلیکم'' کہنا چاہیے جس کے معنی ہیں ''اور تم پر بھی۔''

علماء کے ایک دوسرے حلقے کا کہنا ہے کہ یہ الفاظ ان غیر مسلموں کے ساتھ استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جو مسلمانوں کے خلاف جارح نہ ہوں۔ مسلمانوں کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک نہ کرتے ہوں جیسا کہ سامراجی ممالک کے حکام اور فوجی ان مسلمان ملکوں کے باشندوں کے ساتھ کرتے تھے جن پر انہوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ایک مسلمان ملنسار، خوش اخلاق اور مہربان ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے اپنے دل میں نیک جذبات رکھتا ہے۔

غیر مسلم ڈاکٹر سے بچے کا ختنہ کرانا جائز ہے؟

سوال: میں جہاں رہتا ہوں وہاں کوئی مسلم ڈاکٹر دستیاب نہیں ہے۔ اس صورت میں میں اپنے بچے کا ختنہ غیر مسلم ڈاکٹر سے کرا سکتا ہوں؟

جواب: اگر کوئی مسلمان ڈاکٹر دستیاب نہیں ہے تو آپ غیر مسلم ڈاکٹر یا سرجن سے اپنے بچے کا ختنہ کرا سکتے ہیں، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

جدید دور کے مسائل

ٹیسٹ ٹیوب بے بی
کیا بچوں کی پیدائش کے لیے یہ طریقہ اپنایا جاسکتا ہے؟

سوال: بچوں کی پیدائش کے لیے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا سائنسی طریقۂ کار اپنانے کی اجازت ہے؟

جواب: کسی بھی سائنسی تحقیق یا دریافت کے بارے میں دوٹوک الفاظ میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسے استعمال کرنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس سائنسی تحقیق کو استعمال کس طرح کیا جارہا ہے۔ کسی بھی سائنسی دریافت کو اچھے اور برے دونوں مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ عورت کے جسم سے باہر مرد کے نطفے اور عورت کے بیضے کو ملا کر باروری کرانا اور بعد ازاں اس بارآور بیضہ کو عورت کے رحم میں داخل کردینا تاکہ وہ نو مہینہ تک اسے پیٹ میں رکھنے کے بعد بچہ کو پیدا کرسکے، جدید سائنسی طریقہ ہے اور اس سائنسی تحقیق کو بھی اسی اصول کی روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ اگر اس طریقۂ کار کو اسلامی قوانین کے تحت استعمال کیا جائے تو اس کی اجازت ہے اور اگر ان قوانین کو پامال کیا گیا ہو تو اس کی اجازت نہیں ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اگر اس سائنسی طریقۂ کار کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے کہ ایک شادی شدہ جوڑا بچہ حاصل کرسکے اور اس طریقے میں کوئی تیسرا فریق شامل نہ ہو تو اس کی اجازت ہے۔ اس بات کا مطلب یہ ہے کہ اس طریقۂ کار کو صرف شادی شدہ جوڑوں تک محدود رکھا جانا چاہیے۔ مغربی ملکوں کے اسپتالوں میں اس جدید سائنسی طریقۂ کار کو جس طرح

استعمال کیا جا رہا ہے، اس کی بہرحال اجازت نہیں ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ وہاں انسانی نطفے کے بینک کھل گئے ہیں اور ایسی عورتیں معاوضے پر دستیاب ہیں جو اس نطفے کی پرورش کرتی ہیں اور بعد ازاں اسے دوسری عورت کے رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے اور اس تکنیک میں دو یا دو سے زائد عورتیں اور مرد شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح کے تمام طریقوں کی ممانعت ہے کیونکہ اس سے رشتوں کی پہچان ہی ختم ہو جائے گی کہ کون ماں ہے اور کون باپ ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہنا مشکل ہو جائے گا کہ اس طرح پیدا ہونے والے بچے کی ماں وہ عورت ہے جس نے ابتداء میں اس نطفے کی پرورش کی تھی یا ماں وہ عورت ہے جس نے نو مہینہ تک اسے اپنے پیٹ میں رکھنے کے بعد اسے پیدا کیا۔ اسلام نے والدین کے حوالے سے بچوں کی شناخت پر بہت زور دیا ہے، اس لیے وضع حمل کا یہ طریقہ جو غیر فطری ہے صرف شوہر اور بیوی تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ بصورت دیگر اس کی اجازت نہیں ہے۔

اعضاء کی پیوندکاری اور عطیہ

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسانی اعضا مثلاً دل، گردے وغیرہ کی پیوندکاری کی اسلام میں ممانعت ہے کیونکہ اس عمل سے مردہ اجسام کی دانستہ بے حرمتی ہوتی ہے۔ خون چڑھوانا اور ہڈیوں کا گودا بدلوانا بھی کیا اس ممانعت کے زمرے میں آتے ہیں؟ کیا پوسٹ مارٹم کی بھی ممانعت ہے؟ اگر مندرجہ بالا خیال درست نہیں ہے اور مختلف اعضاء کی پیوندکاری کی اجازت ہے تو اس کی وضاحت فرمائیں کہ عطیہ دینے والے کے جسم کا مالک کون ہے، خود عطیہ دینے والا جو مر چکا ہے، مرحوم کے لواحقین یا حکومت؟ ایک زندہ شخص کے اعضاء مثلاً گردے وغیرہ کسی دوسرے شخص کے جسم میں پیوند کرنے کی اسلام میں اجازت ہے یا نہیں اور یہ کہ جانوروں کے اعضاء کی انسانی جسم میں پیوندکاری کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے؟

جواب: اسلام ہمیں مردہ اجسام کے احترام کا درس دیتا ہے۔ ایک حدیث ہے کہ کسی مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیسا کہ زندہ کی ہڈی توڑنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں لاشوں کی بے حرمتی کرنا قابل سزا جرم ہے۔ مردوں کے احترام کا یہ حکم مسلمانوں کے ذہنوں میں پوری طرح واضح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس میں دشمن کے ہلاک ہو جانے والے سپاہیوں کی بے حرمتی کی گئی ہو، حالانکہ جنگوں میں اکثر ایسا ہوتا رہا ہے۔

یہ اصول اس وقت نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جب معاشرے کی بہبود کا معاملہ درپیش ہو۔ مقتدر علمائے کرام کی رائے ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے فرد کی کوئی قیمتی چیز مثلاً ہیرے کی انگوٹھی نگل لے اور بعد ازاں مر جائے تو اس امر کی اجازت ہے کہ مرنے کے بعد اس کا پیٹ چاک کر کے وہ ہیرے کی انگوٹھی نکال لی جائے تاکہ اسے اس کے اصل مالک کو لوٹایا جا سکے۔ اسی طرح مسلمانوں سے برسرپیکار کافروں کا کوئی گروہ کسی مسلمان کو یرغمال بنالے یا اسے اپنی حفاظت کے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کرے تو اس مسلمان کو ایسی صورت میں ہلاک کر دینے کی اجازت ہے کہ ان کافروں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اس مسلمان کو ہلاک کرنا ناگزیر ہو۔

ان اصولوں کو بنیاد بناتے ہوئے موجودہ دور کے مقتدر علمائے کرام اس امر پر متفق ہیں کہ پیوند کاری کے آپریشن کی اجازت ہے۔ پیوند کاری کے ایسے آپریشنوں کا مقصد بالکل واضح ہے۔ یہ آپریشن مردہ اجسام کی بے حرمتی کے زمرے میں نہیں آتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ آپریشن عطیہ دینے والے کے لیے مکمل احترام کے جذبے سے کئے جاتے ہیں۔

مرنے والے کے لواحقین لاش کے وارث ہوتے ہیں اس لیے مرنے والے کے جسم کے کسی عضو کو پیوند کاری کی غرض سے نکالنے کے لیے ان لواحقین کی اجازت لینی ضروری ہے۔ مرنے والے نے اپنی زندگی میں اگر ایسی وصیت کر دی تھی کہ مرنے کے بعد اس کے جسمانی اعضاء کو پیوند کاری کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے تو پھر کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ موت کا سبب معلوم کرنے کی غرض سے یا کسی جرم کے ارتکاب کا پتہ چلانے کے مقصد سے کیے جانے والے پوسٹ مارٹم کی بھی اجازت ہے، جس سے کسی ماہر ڈاکٹر کی رائے میں تحقیق میں یا اسی نوعیت کی بیماریوں کا علاج تلاش کرنے میں مدد مل سکے۔

کسی زندہ آدمی کے عضو کو کسی دوسرے زندہ آدمی تک پیوند کرنے کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ عطیہ دینے والے کو عطیہ لینے والے یا اس کے اہل خاندان یا حکومت یا کسی اور بااثر شخصیت یا ادارے کی طرف سے عطیہ دینے پر مجبور نہ کیا گیا ہو۔ عطیہ دینے کا فیصلہ اسے خود بالکل آزادانہ طور پر کرنا چاہیے۔ بعض ملکوں میں جہاں سیاسی قیدیوں کو مختلف طریقوں سے اذیت دی جاتی ہے، وہاں حکام کے لیے یہ کوئی مشکل امر نہیں ہے کہ ان سیاسی قیدیوں کو زبردستی ان کے بعض جسمانی اعضاء سے محروم کر دیا جائے۔ دباؤ، دھونس یا طاقت کے استعمال کی اس معاملے میں سخت ممانعت ہے۔ جانوروں کے اعضاء کی انسانی جسم میں پیوند کاری کی بھی اجازت ہے اگر اس عمل سے اس عضو کے وصول کنندہ کی زندگی کو طول دینے میں مدد مل سکے۔

سوال ۲: کیا ایک شخص یہ وصیت کرسکتا ہے کہ انتقال کے بعد اس کے جسم کے بعض اعضاء کسی دوسرے شخص کے جسم میں لگا دیے جائیں؟

جواب ۲: (بعض علماء کے نزدیک) جسمانی اعضاء کا عطیہ دینا جائز ہے۔ اگر کسی عضو کے عطیے سے کسی دوسرے انسان کی جان بچانے کی کوشش کی جاسکتی ہے تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے کیونکہ مرنے والے کے لیے وہ عضو اب کسی کام نہیں آ سکتا۔ میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی آنکھیں عطیہ کردے تو قیامت کے دن وہ بغیر آنکھوں کے زندہ کیا جائے گا۔ یہ تصور درست نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کا دعویٰ کرنے والے حضرت اپنی بات کی تصدیق کے لیے کوئی ثبوت پیش نہیں کرتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ روز قیامت تمام انسانوں کو ان کی مکمل حالت میں زندہ کیا جائے گا۔ اگر دنیا میں کوئی شخص کسی حادثہ میں اپنا ایک بازو گنوا بیٹھا ہے تو روز محشر اسے صرف ایک بازو کے ساتھ زندہ نہیں کیا جائے گا بلکہ وہاں اس کے دونوں بازو ہوں گے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنا کوئی عضو دنیا میں کسی دوسرے شخص کو عطیہ کردیتا ہے تو قیامت کے دن اسے بھی مکمل حالت میں اٹھایا جائے گا۔

بلڈ بینک اور عطیہ خون

سوال: طب کے پیشے سے متعلق میرے ایک دوست ''نہ نفع نہ نقصان'' کے اصول کی بنیاد پر ایک ''بلڈ بینک'' قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اس بارے میں اسلامی نقطہ نظر سے آگاہ ہوں۔

جواب: ''بلڈ بینک'' میں مختلف افراد کا عطیہ کردہ خون قابل استعمال حالت میں رکھا جاتا ہے اور وقت ضرورت ایسے مریضوں کو دیا جاتا ہے جو خون کی کمی کا شکار ہوں خواہ یہ کمی جراحی کی وجہ سے ہوئی ہو یا کسی اور وجہ سے۔ مختلف افراد کا خون ملایا نہیں جاتا کیونکہ ایسا کرنے سے وہ قابل استعمال نہیں رہتا۔ انتقال خون کے عمل کی نگرانی کرنے والا ڈاکٹر اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ کسی مریض کو جس قسم کے خون کی ضرورت ہے اسے وہی خون فراہم کیا جائے۔ چونکہ یہ احتیاط ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ انتقال خون سے کسی کو نقصان نہ ہو اور اس سے مریض کو صحت یاب ہونے میں مدد ملے اس لیے یقیناً اس عمل میں کوئی غلط بات نہیں ہے اور یہ طب کا ایک مفید استعمال ہے۔

اس نیت اور مقصد کے ساتھ بلڈ بینک قائم کرنا کہ اس سے مریضوں کو ہنگامی ضرورت کے

وقت خون فراہم کیا جاسکے بالکل درست ہے۔ اس طرح دوسرے ضرورت مند انسانوں کی مدد کے لیے خون کا عطیہ دینا بھی ایک نیک عمل ہے جس کا اجر مل سکتا ہے۔ آپ کے دوست یقیناً اپنے منصوبے پر عمل کر سکتے ہیں۔ میں ان کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

کریڈٹ کارڈ کا استعمال

سوال: دنیا بھر میں کریڈٹ کارڈ جاری کرنے والے تجارتی ادارے (مثلاً امریکن ایکسپریس، ویزا وغیرہ) اپنی خدمات کے بدلے میں اور اپنے کارڈ استعمال کرنے کی اجازت کے عوض سالانہ فیس وصول کرتے ہیں، کیا اس قسم کی فیس کا شمار سود میں ہوتا ہے؟

جواب: کریڈٹ کارڈ جاری کرنے والے کاروباری ادارے رکنیت کے عوض یا کارڈ استعمال کرنے کی اجازت کے عوض جو رقم وصول کرتے ہیں وہ محض ان کی خدمات کا معاوضہ ہے لہٰذا اسے سود نہیں کہا جاسکتا۔ اس بات کی اجازت ہے کہ آپ کسی ادارے کی فراہم کردہ خدمات سے فائدہ اٹھائیں اور اس کے عوض رقم ادا کریں۔ بعض کریڈٹ کارڈ جاری کرنے والے ادارے ہر ماہ خریداری پر مکمل ادائیگی وصول نہیں کرتے بلکہ کچھ فیصد وصول کرتے ہیں بقایا رقم وہ اگلے ماہ کے حساب میں منتقل کردیتے ہیں اور اس پر سود وصول کرتے ہیں۔ یہ سود ناجائز ہے اگر آپ کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے ہیں تو اپنا حساب ہر مہینے بے باق کردیا کریں تاکہ ادھار کی صورت میں سود کے کاروبار میں ملوث نہ ہوں۔

فلموں کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کیا ہے؟

سوال: فلموں کے بارے میں (خواہ وہ سینما گھر میں چلنے والی فلمیں ہوں یا وڈیو اور ٹیلی ویژن کی فلمیں) اسلامی نقطہ نظر کیا ہے؟

جواب: فلمیں بنانے، ان کی نمائش کرنے اور انہیں دیکھنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ وہ کوئی ایسا مقصد پورا کرتی ہوں جس کی اجازت ہے۔ اگر وہ فلمیں کسی ایسی بات کو فروغ دیں جس کی اجازت نہیں ہے، مثلاً یہ فلمیں معاشرے میں آزاد روی کے فروغ کا سبب بنیں تو ایسی فلمیں بنانے کی ممانعت ہے۔ اسلام کسی چیز پر پابندی یا اجازت کا فیصلہ اس چیز کے استعمال کو دیکھ کر کرتا ہے اور اس چیز کے صحیح یا غلط استعمال سے ہی اس امر کا تعین کیا جاتا ہے کہ اسلام میں اس چیز کی ممانعت ہے یا

اجازت۔ فلموں کے معاملے میں بھی یہی اصول ہے۔

مکہ مکرمہ میں ٹیلی ویژن دیکھنے کی اجازت

سوال ا: مکہ شہر میں ٹیلی ویژن اور ویڈیو دیکھنا جائز ہے؟

جواب ا: ٹیلی ویژن، ویڈیو اور دیگر جدید ایجادات محض آلات ہیں۔ آپ انہیں نیک مقصد کے لیے استعمال کریں گے تو یہ مفید ثابت ہوں گے اور ان کی اجازت ہوگی۔ اگر انہیں دیگر ناقابل قبول کاموں کے لیے استعمال کیا جائے گا تو ان کی اجازت نہیں ہوگی۔ لہٰذا ان آلات کو آپ خواہ مکہ میں استعمال کریں یا کسی اور جگہ، جس مقصد کے لیے انہیں استعمال کیا جارہا ہے اس کے اچھے یا برے ہونے کا تعین کرنا ہوگا۔ اگر آپ ایک کیسٹ دیکھ رہے ہیں جس سے آپ کو مفید معلومات حاصل ہورہی ہیں یا آپ کو سکون و آرام مل رہا ہے یا اللہ کی عظمت و قدرت کے مناظر دیکھ رہے ہیں تو ان سب کے لیے اس کی اجازت ہے۔ عریاں فلموں پر دنیا بھر میں پابندی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ویڈیو یا ٹیلی ویژن کا اچھا استعمال نہیں ہے خاص طور پر مکہ جیسے شہر میں کہ یہ شہر اللہ کی عبادت کرنے والوں کا مرکز ہے۔

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا طریقہ اور اسلام کا نقطہ نظر

سوال: اگر طبی طور پر یہ بات ثابت ہوجائے کہ ایک شادی شدہ جوڑا بعض وجوہات کی بنا پر اولاد پیدا نہیں کرسکتا تو اس صورت میں اس جوڑے کو کیا کرنا چاہیے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ جوڑا ایک غیر مسلم معاشرے میں رہتا ہے جہاں کثرت ازدواج پر پابندی ہے۔ کیا انہیں ہمیشہ بے اولاد رہنا چاہیے۔ کیا یہ اولاد حاصل کرنے کے لیے مجازی ماں کو استعمال کرسکتے ہیں۔ کیا وہ کسی اور کے بچے کو متبنی بناسکتے ہیں۔ کیا شوہر بچہ حاصل کرنے کے لیے ایک اور رسمی شادی کرسکتا ہے۔ کیا وہ صرف اس وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے کہ وہ بانجھ ہے؟

جواب: اسلامی عقائد کے مطابق استقرار حمل (حمل کا ٹھہرنا) اور بچہ کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ بات بھی اللہ تعالیٰ کی منشا پر منحصر ہے کہ پیدا ہونے والا بچہ لڑکی ہوگی یا لڑکا۔ ایک شادی شدہ جوڑے کے یہاں بچے ہونا یا نہ ہونا اور بچوں کی تعداد—— ان تمام باتوں کا فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کرسکتے ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

''اللہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا جلا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے۔'' (الشوریٰ ۴۵-۵۰)

اس حقیقت کا ثبوت ہمیں عملی زندگی میں نظر آتا ہے۔ ایک شادی شدہ جوڑا برسوں بے اولاد رہتا ہے۔ پھر یہ لوگ طلاق حاصل کر کے دوسری شادیاں کر لیتے ہیں اور نئی شادی کے نتیجے میں ان دونوں کے یہاں اولاد پیدا ہوتی ہے۔ وہ کیا چیز تھی جو ان دونوں کے ملاپ کے باوجود بچوں کی ولادت میں مانع رہی۔ یہ بات مکمل اسرار ہے۔

اوپر قرآن مجید کی جس آیت مبارکہ کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی روشنی میں آپ کا پہلا سوال مہمل ہے۔ اگر ہمارا یہ ایمان ہے کہ بچوں کی ولادت اور ان کی تعداد وجنس کے تعین کے بارے میں فیصلہ کا قطعی اختیار اللہ تعالیٰ کا ہے تو یہ سوال بے معنی ہو جاتا ہے کہ کیا ایک جوڑے کو ہمیشہ بے اولاد رہنا چاہیے۔ شادی کے بعد اگر ایک شادی شدہ جوڑے کے یہاں اولاد نہیں ہوتی اور وہ رضائے الٰہی کو قبول کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کرتا ہے تو ان کا رویہ یقیناً قابل تحسین ہے۔ اسلام شادی کرنے اور اولاد پیدا کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، لیکن یہ تمام باتیں ہمارے عقیدے کے مطابق اللہ کی مرضی کے تابع ہیں۔ کوئی بھی شادی شدہ جوڑا یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس کے کتنے بچے ہونے چاہئیں اور ان میں سے کتنے لڑکے اور کتنی لڑکیاں ہوں۔ آج کل لوگ بچوں کی تعداد محدود رکھنے کے لیے مانع حمل طریقے استعمال کر رہے ہیں، لیکن مؤثر سے مؤثر مانع حمل طریقہ بھی سو فیصد ضمانت نہیں دے سکتا کہ اس کے بعد استقرار حمل نہیں ہوگا۔ مانع حمل آپریشن کے باوجود ڈاکٹر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ استقرار حمل کا امکان ہے۔ گو کہ یہ بہت ہی معمولی ہوتا ہے، تاہم امکان موجود ہوتا ہے۔

اگر ایک شادی شدہ جوڑا بے اولاد ہو تو وہ کسی ڈاکٹر سے طبی امداد طلب کر سکتا ہے تاکہ یہ پتا لگایا جا سکے کہ اولاد نہ ہونے کا سبب کیا ہے اور کیا یہ سبب علاج کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے۔ اس علاج کے زمرے میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا نیا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے لیے نہایت اہم شرط یہ ہے کہ میاں اور بیوی کے علاوہ کوئی تیسرا فریق اس معاملے میں ملوث نہ ہو۔ یعنی اس بات کی اجازت ہے کہ شوہر کے تخم اور بیوی کے بیضے کی رحم سے باہر ٹیسٹ ٹیوب میں آمیزش کے ذریعے بارآوری کی جائے اور پھر اس کے بعد جنین کو بیوی کے رحم میں پہنچا دیا جائے۔ اس طریقہ میں صرف شوہر اور بیوی شامل ہوتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ وغیرہ میں ٹیسٹ ٹیوب کے

ذریعہ بچے کی ولادت کے طریقے میں شوہر اور بیوی کے علاوہ ایک تیسری عورت (مجازی ماں) بھی شامل ہوتی ہے۔ یعنی تخم ریزی کے بعد جنین کو ماں کے رحم میں پہنچانے کے بجائے ایک غیر عورت کے رحم میں پہنچایا جاتا ہے اور بچہ کی ولادت مجازی ماں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس طریقہ کی قطعی ممانعت ہے کیونکہ اس کی وجہ سے نہ صرف اخلاقی، سماجی اور معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں بلکہ وراثت کے معاملے میں انتہائی پیچیدہ نوعیت کی دشواریاں سامنے آتی ہیں۔ خود یورپ اور امریکہ میں اس طریقہ کار کے خلاف اعتراضات سامنے آرہے ہیں۔

یہاں میں یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ ولادت کے طریقہ کو موجودہ دور کے علماء کی اکثریت قبول کرتی ہے تاہم بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ اس معاملے کا ابھی بغور مطالعہ نہیں کیا گیا ہے، اس لیے اس بارے میں فیصلہ دینے سے پہلے اس طریقہ کار کے ہر پہلو کا اور اس کے نتائج وعواقب کا اچھی طرح مطالعہ کرلینا چاہیے۔

آپ اتفاق کریں گے کہ یہ طریقہ ایک نئی دریافت ہے اس لیے اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف رائے ہونا بالکل فطری ہے۔ صورت حال اس وقت واضح ہوگی جب اس بارے میں تمام تحقیق سامنے آجائے۔

دوسرے کی اولاد کو متبنیٰ بنانے کی قطعی اجازت نہیں ہے اور اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف رائے نہیں ہے کیونکہ قرآن کے واضح احکامات موجود ہیں۔ کسی بچے کو متبنیٰ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی نظر میں ایک ایسے شادی شدہ جوڑے کو کسی بچے کا سرپرست (والدین) تسلیم کرلیا جاتا ہے جو دوسرے والدین کے یہاں پیدا ہوا ہو۔ اسلام میں اس کی ممانعت کی گئی ہے کیونکہ یہ ایک طرح کا فریب ہوتا ہے اور جو دعویٰ کیا جاتا ہے وہ حقیقت نہیں ہوتا، یعنی متبنیٰ کرنے والے اس بچے کے حقیقی والدین نہیں ہوتے۔ علاوہ ازیں دوسرے کی اولاد متبنیٰ کرنے سے اصل وارثوں کا حق بھی متاثر ہوتا ہے۔

آپ کا آخری سوال یہ ہے کہ کیا ایک عورت کو اس وجہ سے طلاق دی جاسکتی ہے کہ وہ بچہ پیدا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بالعموم اسلام میں طلاق کی اجازت ہے خواہ اس کی وجہ عورت کا بانجھ پن ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور سبب ہو، لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق کو ایک ایسا عمل قرار دیا ہے جو قابل اجازت امور میں اللہ کے نزدیک سب سے قابل نفرت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طلاق کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ یہ ایک سماجی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ طلاق کسی ناگزیر صورتحال کا بالکل آخری حل ہے۔ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی کو اس وجہ سے ختم نہیں کرنا

چاہیے کہ بیوی استقرار حمل کی اہل نہیں ہے۔

شادی شدہ جوڑوں کے یہاں اولاد نہ ہونے کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ شوہر یا بیوی میں سے کوئی ایک کسی ایسے مستقل نوعیت کے مرض کا شکار ہو جو بچے کی ولادت میں رکاوٹ کا سبب ہو۔ اس صورت میں دوسرے شریک حیات کو یہ رشتہ برقرار رکھنے کے لیے ایثار کرنا چاہیے۔ شوہر اس انداز سے کیوں نہیں سوچ سکتا کہ اس کی بیوی کسی مرض کی وجہ سے بچے پیدا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی اور دوسری بیماریوں کی طرح وہ اس بیماری کو بھی تحمل کے ساتھ نظر انداز کیوں نہیں کر سکتا۔

فرض کیجیے کہ ایک شادی شدہ جوڑے کے یہاں بچے کی ولادت نہ ہونے کا سبب شوہر ہو تو؟ — کیا شوہر اس صورت میں بیوی سے یہ نہ چاہے گا کہ وہ اس صورتحال کو قبول کرلے۔ کیا وہ خود کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے تقویت نہیں دے گا کہ اللہ نے جو کچھ تم کو دیا ہے اگر تم نے اس پر قناعت کرلیا تو تم دنیا کے امیر ترین آدمی ہو۔

اس معاملے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر ایک شوہر اور بیوی خوشگوار زندگی بسر کر رہے ہیں اور سوائے اس کے کہ وہ بے اولاد ہیں، تو انہیں اپنی زندگی کو جاری رکھنی چاہیے اور صرف بے اولادی کے سبب کو طلاق جیسے ناپسندیدہ عمل کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔ وہ یہ کر سکتے ہیں کہ کسی یتیم بچے کو گود لے لیں اور اس کی پرورش کریں لیکن اس بچے کو متبنیٰ نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ اس کی ممانعت ہے۔ وہ صرف اس بچے کی دیکھ بھال اور پرورش کریں اور بچہ اپنے اصل باپ کے نام پر پکارا جائے۔ یہ ایک نیک کام ہوگا اور یقیناً اللہ تعالیٰ اس کا بہترین اجر عطا فرمائیں گے۔

مرسی کلنگ (رحم کھا کر ہلاک کرنا) جائز ہے؟

سوال: براہ کرم وضاحت فرمایے کہ کیا اسلام میں رحم کھا کر ہلاک کرنا (مرسی کلنگ) جائز ہے۔ جو لوگ اس کی حمایت کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ جدید طبی ٹیکنالوجی کی وجہ سے کسی شخص کی زندگی کو مصنوعی طریقے سے بڑھانا ممکن ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ انسان کو وقار کے ساتھ مرنے کا حق ہونا چاہیے، بجائے اس کے کہ وہ طویل بیماری کی وجہ سے ناقابل برداشت تکلیف کا شکار ہو۔

جواب: انسانی زندگی کو ختم کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ صرف وہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کسی انسان کی زندگی کا خاتمہ کب ہونا چاہیے۔ انسان کی موت کے سبب کا فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں۔ جب اللہ کے فیصلہ کردہ اس طریقہ کار میں لوگ مداخلت کرتے ہیں تو وہ ''قتل'' کے

مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ''موت راحت'' (یوتھینی زیا) کو مرسی کلنگ'' کہا جاتا ہے۔ اس اصطلاح میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ یہ ''قتل'' ہے اور اسلام میں ہر طرح کا قتل منع ہے سوائے چند صراحت کردہ جرائم کے ارتکاب کی سزا کے طور پر قتل کے۔ اگر کسی شخص نے وہ مخصوص جرائم (قتل، ارتداد، زنا وغیرہ) نہ کیے ہوں تو اسے کسی بھی حالت میں قتل نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی شخص اس خواہش کا اظہار کرے کہ وہ مرنا چاہتا ہے اور اس کی یہ خواہش، طویل نا قابل علاج بیماری سے پریشانی کا نتیجہ ہو تب بھی اسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ جو بھی شخص موت کا فیصلہ صادر کرنے کی حیثیت میں آتا ہے تو درحقیقت وہ خود کو اللہ کے برابر درجہ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی شخص کب موت کا شکار ہوگا، یہ اللہ کے اختیار پر قبضہ کرنے کے مترادف ہے۔ موت راحت (یوتھینی زیا) کے حق میں جو دلائل دیے جاتے ہیں ان میں وزن نہیں ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ جدید طبی ٹیکنالوجی کی وجہ سے مریض کی زندگی مصنوعی طور پر بڑھ جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ''زندگی'' کی تعریف کیا ہے اور اس میں ''اضافہ'' کیسے ہوجاتا ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ مریض کو معاون حیات مشین پر رکھا گیا ہے اور اگر مشین بند کردی جائے تو اس کی زندگی ختم ہوجائے گی تو یہ ایک خاص نوعیت کا معاملہ ہوگا۔ یہاں یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا ''معاون حیات'' مشین کے ساتھ زندہ رہنے والے مریض کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تب اس مریض کی زندگی ختم ہوچکی ہے خواہ اس کا دل کسی مشین کی مدد سے کام کر رہا ہو۔ یہاں ہم موت راحت (یوتھینی زیا) کے بارے میں بات نہیں کر رہے ہیں بلکہ زندگی کی تعریف اور کسی شخص کے جسم میں اس کی موجودگی پر بحث کر رہے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ڈاکٹر کو مریض کی زندگی بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ معاون حیات مشینوں کا استعمال یقیناً سود مند ثابت ہوتا ہے بشرطیکہ ڈاکٹر کو یہ توقع ہو کہ سانس کی آمدورفت کو بذریعہ مشین قائم رکھنے سے مریض کے علاج میں سہولت ہوگی اور ڈاکٹر کو مریض کی صحت کی بحالی کی توقع ہو۔ لیکن جب یہ واضح ہوجائے کہ مریض کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے تو ایسے شخص کو زندہ نہیں کہا جاسکتا۔ مردہ شخص کو معاون حیات مشینوں پر زندہ رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ اس صورت میں صرف مریض کے دل کی دھڑکن قائم رہتی ہے جب کہ مریض کی صحت کی بحالی کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ درحقیقت مریض تو مر چکا ہوتا ہے وہ صرف تکنیکی طور پر زندہ ہوتا ہے۔ جیسے ہی معاون حیات مشین بند کی جاتی ہے، مریض کو فطری موت آجاتی ہے۔

مریض کے ''وقار کے ساتھ مرنے کے حق'' یا مریض کو ''نا قابل برداشت'' تکلیف سے بچانے کا خیال نا قابل قبول ہے۔ اگر کوئی شخص بیمار ہو تو اس کے علاج معالجے کی وجہ سے اس کے

شخصی وقار میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ اگر مریض اپنے جسم پر قابو نہیں رکھ سکتا تو ادویات اور طبی آلات کی مدد سے اس کی مدد کی جانی چاہیے، لیکن اس بنیاد پر اس کی زندگی ختم کردینا غیر انسانی فعل ہوگا۔ ایسے معاملے میں موت راحت (یوتھینی زیا) کی بات کرنے کا مطلب یہ ہے لوگ اس مریض کے علاج معالجے اور دیکھ بھال میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ جدید معاشرے کے لیے یہ بات قابل ملامت ہے کہ اس قسم کے مریضوں کے معاملے میں ''مرسی کلنگ'' کے حق میں دلیلیں دی جاتی ہیں۔ اس قسم کے قتل میں رحم کا کوئی عنصر نہیں ہوتا۔ اگر لوگ واقعی رحم سے کام لینا چاہتے ہیں تو انہیں ایسے مریضوں کی زیادہ سے زیادہ دیکھ بھال اور بہتر سے بہتر علاج کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں بیشتر قسم کے درد، موزوں طریقہ علاج سے دور کیے جاسکتے ہیں۔ جدید طبی تحقیق اور طریقوں کی بنا پر یہ ممکن ہوگیا ہے کہ شدید قسم کے درد کی تکلیف یا شدت کو کم کیا جاسکے۔ جہاں درد میں کمی ممکن نہ ہو، وہاں مریض کو یہ یاد دلانا چاہیے کہ وہ جو تکلیف برداشت کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اس کا اجر دیں گے اگر وہ اسے صبر اور حوصلے کے ساتھ برداشت کرے اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہے تو اس کے بدلے میں اس کے گناہ معاف کیے جاسکتے ہیں۔ ایک سچا مسلمان اس قسم کی ہر تکلیف کو اپنے گناہوں کی معافی کے بدلے خندہ پیشانی سے قبول اور برداشت کرتا ہے۔

بتدریج اور آہستہ آہستہ خودکشی

سوال: یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں خودکشی حرام ہے اور آخرت میں اس کے لیے سخت سزا ہے۔ مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ تمباکو نوشی، نشہ آور ادویات کے استعمال یا صحت کو نقصان پہنچانے والی غذا کھانے سے انسان بتدریج اور آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے۔ کیا یہ معاملات خودکشی کے زمرے میں آتے ہیں؟

جواب: جو شخص خود کو ہلاک کرتا ہے اس کے لیے سخت سزا کی وعید ہے کیونکہ وہ شعوری طور پر ایسا فیصلہ کرتا ہے جو اللہ کی شان میں گستاخی کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زندگی کی نعمت سے نوازا اور اس شخص نے زندگی کو ختم کردیا۔

تمباکو یا شراب نوشی کرنے یا نشہ آور ادویات استعمال کرنے یا مضر صحت غذا استعمال کرنے والا شخص خودکشی کی نیت سے یہ سب نہیں کرتا۔ اس کا بنیادی مقصد لطف اندوزی ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس کا یہ غیر صحت مندانہ رویہ وقت سے پہلے اس کی زندگی کے خاتمے کا باعث بنے گا۔ لہٰذا ارادی طور پر خودکشی کرنے اور لطف اندوزی کے لیے تمباکو یا شراب نوشی اور دیگر نشہ آور اشیاء

استعمال کرنے والے شخص کو یکساں طور پر نہیں دیکھنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی بھی قسم کا نشہ کرنا یا مضر صحت غذا کا استعمال کرنا، اسلامی نقطہ نظر سے قابل قبول ہے۔ ان میں سے بعض اشیاء (شراب، نشہ آور ادویات وغیرہ) قطعی ممنوع ہیں۔ پر تکلف اور مرغن غذا، بظاہر منع نہیں ہیں۔ جو شخص زیادہ چکنائی استعمال کرتا ہے اور بہت زیادہ کھانا کھاتا ہے، وہ کھانے کے معاملے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کو نظر انداز کرتا ہے۔ مثلاً اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس وقت تک نہیں کھانا چاہیے جب تک بھوک نہ ہو اور کھاتے وقت اپنا پیٹ ضرورت سے زیادہ نہیں بھرنا چاہیے۔ ایک اور حدیث میں ہدایت کی گئی ہے کہ کھاتے وقت ایک تہائی پیٹ کھانا کھاؤ ایک تہائی پیٹ پانی کے لیے رکھو ایک تہائی پیٹ خالی رکھو۔

متفرق سوالات

نیک کام کس کے لیے؟

سوال: اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نیک کام صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کیا جانا چاہیے۔ اگر کوئی شخص نام ونمود اور شہرت کی خاطر کوئی اچھا کام کرے تو کیا اللہ تعالیٰ اسے نیکی کا کوئی صلہ نہیں دے گے؟ اگر کوئی شخص ذاتی تسکین کے لیے کوئی نیکی کرے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی۔ اگر کوئی شخص اپنے قریب رہنے والے بعض ضرورت مند افراد کی مدد کرنا چاہتا ہے لیکن وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کی یہ نیکی چھپی نہ رہ سکے گی اور وہ منظر عام پر آ جائے گا تو ایسی صورت میں اسے کیا کرنا چاہیے؟ براہ کرم یہ بھی بتائیں کہ کسی کو صدقہ دینے کے لیے صدقہ دینے والے کے پاس کتنی رقم کا ہونا ضروری ہے۔ اس بات کی بھی وضاحت فرمایئے کہ اگر والدین اپنے بیٹے کو کسی کی مدد کرنے سے روکیں اور وہ پھر بھی مستحق افراد کی مدد کرتا رہے تو اس کا یہ فعل کیسا کہلائے گا؟

جواب: مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا ہے اور ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔ اس کی رحمت لامحدود ہے، چنانچہ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم صرف اسی کی عبادت کریں اور ہر کام میں اسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہم اپنی زندگی میں جو بھی اچھا کام کرتے ہیں وہ دراصل اللہ کی عبادت ہے۔ بخاری اور مسلم میں ایک حدیث بیان ہوئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ صدقہ دینا ہم پر واجب ہے۔ یعنی اپنی مرضی سے کوئی اچھا کام کرنا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ صدقہ انسان کے جوڑ جوڑ پر ہر روز واجب ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں صدقے کی مثالیں بھی

دیں، جیسے دولڑنے والوں کے درمیان صلح کروانا، کسی سے کوئی اچھی بات کہہ دینا یا راستے سے کوئی تکلیف دہ چیز ہٹا دینا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ نماز کے لیے مسجد کی جانب اٹھنے والا ہر قدم ایک نیکی (صدقہ) میں شمار کیا جاتا ہے۔

نیک کام عبادت ہے، اللہ تعالیٰ ایسی عبادت کو قبول نہیں کرے گا جو اس کے لیے نہ کی گئی ہو۔ جب ہم دیگر افراد کی خوشنودی حاصل کرنے یا ان کے منہ سے تعریف کے دو بول سننے کے لیے کوئی نیکی کرتے ہیں تو دراصل ہم راہ راست سے بھٹک چکے ہوتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایسے شخص سے تشبیہ دی ہے جو تنخواہ تو کسی سے وصول کرتا ہے لیکن کام کسی اور کا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا مالک اسے جلد ہی ملازمت سے جواب دے دے گا۔ جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ رب العالمین نے ہمیں پیدا کیا ہے اور ہمیں دیکھنے، سننے، اور محسوس کرنے کی قوتیں، جسمانی طاقت، اولاد، مال و دولت غرض بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں، تو ہم کس طرح اللہ کے سوا کسی اور کی خوشنودی کے لیے کوئی نیک کام کر سکتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ ایسی کسی شے کو قبول نہیں کرتا جو خالص اس کے لیے وقف نہ کی گئی ہو۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو شخص نام و نمود اور ذاتی شہرت کی خاطر کوئی کام کرتا ہے اسے اللہ کی طرف سے کوئی انعام نہیں ملے گا بلکہ وہ ایک گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔ چنانچہ ہمیں کوئی بھی نیکی کرتے ہوئے اس بات کا پورا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ صرف اللہ کے لیے ہو اور اس سے ہمارا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہ ہو۔ شیطان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ذاتی شہرت اور تعریف کا عنصر داخل کر کے ہماری نیکیوں کو تباہ و برباد کرے۔ اگر ہم شیطان کو ایسا کرنے کی اجازت دے دیں گے تو اللہ کی طرف سے انعام سے محروم ہو جائیں گے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ عبادت کا اصل جوہر اخلاص ہے۔ یعنی صرف اللہ کے لیے عبادت کرنا۔ اخلاص کے بغیر عبادت ایسی ہے جیسے روح کے بغیر جسم۔

جب ہم ذاتی تسکین کی خاطر کسی نیک کام کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں ذاتی تسکین کے الفاظ کا مطلب سمجھنے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ کوئی کام اس وقت اچھا کیا جا سکتا ہے جب وہ ان شرائط پر پورا اترے جو اسلام نے اچھے کاموں کے لیے مقرر کی ہیں۔ ان میں اولین چیز ایمان ہے۔ یہ ایمان ہے جو ہمیں خالصتاً اللہ کے نزدیک کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ ذاتی تسکین کا جہاں تک تعلق ہے، ایک شخص تعریف یا احترام کے لیے نیک کام کر سکتا ہے۔ ایک شخص کسی کو دھوکا دینے یا نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا لیکن صرف ذاتی غرض سے کوئی کام کرتا ہے جس کا مذہب یا اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ایسی صورت میں وہ شخص اپنے عمل کے بدلے

اللہ سے کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔ اسے کوئی انعام نہیں ملے گا نہ ہی اسے اس کے اس عمل کی کوئی سزا ملے گی۔ انعام اس عمل پر ملے گا جو صرف اللہ کے لیے کیا گیا ہو اور سزا اس عمل پر دی جائے گی جو کسی برے مقصد کے تحت کیا گیا ہو۔

اسلام کے اولین دور میں مدینے کی طرف ہجرت اس بات کی علامت تھی کہ ہجرت کرنے والوں نے اسلام کو قبول کرلیا ہے۔ انہوں نے اپنے ماضی کے رشتوں کو کاٹ ڈالا ہے اور مسلمانوں کے کیمپ سے وابستگی اختیار کرلی ہے، لیکن ایک مقام سے دوسرے مقام ہجرت کسی اور مقصد کے تحت بھی ہوسکتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو دنیاوی مقصد کے تحت یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے ہجرت کرتا ہے اس کی ہجرت اسی مقصد کے لیے ہے۔ اس طرح ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ جو شخص ذاتی تسکین کے لیے کوئی نیک کام کرتا ہے وہ کوئی گناہ نہیں کرتا لیکن وہ خود کو اللہ تعالیٰ کے انعام سے محروم کر دیتا ہے جو اسے اس صورت میں ملتا ہے، جب وہ اس نیک کام کو صرف اللہ کی خوشنودی کی خاطر انجام دیتا۔

جہاں تک مستحق افراد کی مدد کا تعلق ہے، زیادہ بہتر یہ ہے کہ مدد چھپا کر کی جائے۔ چھپا کر مدد کرنے سے یہ بات زیادہ یقینی ہوجاتی ہے کہ یہ عمل صرف اور صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ ویسے کھلے عام کسی کی مدد کرنا بھی اچھا ہے جبکہ نیت لوگوں سے تعریف کے بول سننے کی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے۔

> ”اگر تم صدقات کھلے عام دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر تم انہیں مستحق افراد تک چھپا کر پہنچاؤ تو تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اس طرح تمہاری بعض برائیاں تم سے دور ہوجائیں گی۔ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“
> (سورہ بقرہ ۲۷۱)

بعض صورتوں میں کھلے عام صدقہ دینا اچھا ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی مستحق کی دیگر افراد کے سامنے مدد کرتا ہے، تو دوسروں کو بھی اس سے نیک عمل کی ترغیب ملتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایک مستحق اور خود دار شخص دوسروں کے سامنے اپنی ضرورت بیان کرتے ہوئے شدید جھجک محسوس کرتا ہے۔ جب دوسروں کے سامنے اس کی مدد کی جائے گی تو دوسرے بھی اس کی مشکلات اور تنگ دستی سے آگاہ ہوجائیں گے اور اس کی مدد کو آگے بڑھیں گے۔

جہاں تک صدقہ کی ادائیگی کے لیے صاحب نصاب ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ جان لینا چاہیے کہ صدقہ کے لیے کوئی نصاب نہیں ہے۔ جس طرح زکواۃ کی صورت میں ہوتا ہے کہ ۸۵ گرام سونا یا اس سے زائد رکھنے والے شخص پر زکواۃ فرض ہوجاتی ہے، لیکن صدقہ کے لیے ایسی

کوئی شرط نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص، کسی بھی مستحق کی، کسی بھی پیمانے پر مدد کر سکتا ہے۔ صدقہ دینے پر قرآن پاک نے بہت زور دیا ہے اور تقریباً ہر سورہ میں صدقہ دینے کی تعریف کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلم معاشرہ دراصل ایک خاندان کی مانند ہے جس میں جو لوگ مالی اعتبار سے زیادہ مستحکم ہیں وہ ایسے لوگوں کی زکواۃ اور صدقات سے مدد کرتے ہیں جن کی معاشی صورتحال اطمینان بخش نہیں ہے۔

جو والدین اپنی اولاد کو نادار اور مستحق افراد کی مدد کرنے سے روکتے ہیں ان کی صورت یہ ہے کہ اگر بیٹے نے اپنے والدین اور بیوی بچوں کے حقوق ادا کر دیے ہیں اور ان کی کفالت کا فریضہ بخوبی انجام دے دیا ہے تو اسے اپنی رقم کو جائز اور نیک کاموں میں صرف کرنے کا اختیار ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ترجیح غریب رشتہ دار ہونے چاہئیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کسی ایسے شخص کو صدقہ دینا جو ہمارا رشتہ دار نہیں، ایک نیکی ہے جبکہ وہی صدقہ کسی غریب رشتہ دار کو دینا دو نیکیوں کے برابر ہے، یعنی صدقہ اور صلہ رحمی۔ ویسے یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص اگر کسی غریب کی مدد کرے تو اس سے اپنے والدین کو لازماً مطلع کرے، یہ اس شخص اور اللہ تعالیٰ کے درمیان معاملہ ہے۔

چند پریشان کن سوالات

سوال : میں جب بھی اپنے وطن جاتا ہوں مجھے ہر بار چند پریشان کن سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میرے لیے بعض اوقات ان سوالوں کے تسلی بخش جواب دینا آسان نہیں ہوتا۔ بعض مقامی علماء سے رجوع کیا جائے تو وہاں سے بھی اطمینان بخش جواب نہیں ملتے۔ براہ کرم درج ذیل سوالات کے جوابات تفصیل سے دیجیے:

۱۔ انسانی خون حرام ہے لیکن انسانی جسم میں خون منتقل کرنے کی اجازت ہے، کیوں؟

۲۔ کسی مسلمان کی آنکھ یا دیگر اعضاء وفات کے فوراً بعد تحقیق و تعلیم کے لیے کسی میڈیکل کالج کو دیے جا سکتے ہیں؟

۳۔ کیا ایک شخص زندہ رہتے ہوئے اپنا ایک گردہ کسی ضرورت مند کو عطیہ کر سکتا ہے؟

۴۔ روزے کی حالت میں طبی وجوہ کی بنا پر انجکشن یا ڈرپ لگائی جا سکتی ہے؟

۵۔ روزے کی حالت میں تالاب یا سوئمنگ پول میں نہانے کی اجازت ہے؟

۶۔ شیر خوارگی میں ایک ہی عورت کا دودھ پینے والے بچوں (لڑکی اور لڑکے) کی باہمی شادی کی اجازت کیوں نہیں ہے؟

جوابات:

۱۔خون کی منتقلی صرف طبی وجوہ کی بناء پر عمل میں آتی ہے۔کسی حادثے یا آپریشن کے دوران ایک مریض کا بہت سا خون ضائع ہوسکتا ہے۔ایسے شخص کی صحت یابی کے لیے اسے خون دینا ضروری ہوتا ہے۔اس کی اجازت ہے۔یہ کہنا کہ ایک شخص اپنا خون پی سکتا ہے،قطعی ناممکن ہے۔یہ تصور کرنا ہی نہایت دشوار ہے کہ کوئی صحیح الدماغ شخص اپنے جسم کے کسی حصے کو کاٹ کر اپنا خون پیئے۔ علاوہ ازیں،اسلام میں کسی بھی قسم کا خون پینا حرام ہے۔اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں،عرب کے لوگ اپنے کسی جانور، بالعموم اونٹ کے جسم میں چرکا لگا کر خون جمع کر لیتے تھے تاکہ اسے پی سکیں۔اس قسم کا خون صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔علاوہ ازیں اس عمل سے جانور کو بھی اذیت ہوتی ہے۔اسلام میں اس کی ممانعت ہے۔مائع خون پینا منع ہے تاہم حلال جانور کی تلی استعمال کرنے کی اجازت ہے۔

۲۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے۔لہٰذا زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی انسانی جسم کا احترام لازم ہے۔اسلام نے تو اسلام کے سخت مخالف افراد کے جسم کے اعضاء کاٹنے کی بھی ممانعت کی ہے۔تاہم اگر انسانی برادری کی بہبود کے لیے کسی انسانی عضو پر تحقیق کے لیے کوئی شخص اپنا کوئی عضو عطیہ کرے،تو وفات کے بعد اس کے جسم سے یہ عضو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ایسے عضو کو احترام کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے اور تحقیق کا کام ختم ہونے کے بعد اسے دفن کر دینا چاہیے۔(حنفی مسلک کے علماء کے نزدیک انسانی جسم کے کسی بھی عضو کا عطیہ جائز نہیں ہے)۔

۳۔کسی ہنگامی صورتحال میں اس بات کی اجازت ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے شخص کو (اس کی جان بچانے کے لیے) اپنا ایک گردہ عطیہ کر دے۔(حنفی مسلک کے علماء کے نزدیک گردے کی پیوند کاری جائز نہیں ہے)۔

۴۔روزے کی حالت میں طبی وجوہ کی بنا پر انجکشن لگوانے کی اجازت ہے لیکن اگر ایک شخص بیمار ہے تو اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ بیماری کی حالت میں رمضان کے روزے نہ رکھنے کی رخصت سے فائدہ اٹھائے اور جتنے روزے بیماری کی وجہ سے قضا ہوئے ہیں وہ رمضان کے بعد رکھ لے۔بیماری کی وجہ سے ڈرپ لگوانے کی بھی اجازت ہے

روزے کی حالت میں تمباکو کا استعمال قطعی منع ہے خواہ وہ کھایا جائے، دھوئیں (سگریٹ) کی شکل میں لیا جائے یا سونگھا جائے، (ناس)۔اس بات پر سب متفق ہیں کہ تمباکو میں نشے کے

اجزاء پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں تمبا کو بعض مہلک امراض پیدا کرنے کا سبب بھی ہے جن میں پھیپھڑوں کا سرطان، دل کے امراض اور دیگر بیماریاں شامل ہیں۔ روزے میں خوشبو کا استعمال جائز ہے۔

۵۔ روزے کی حالت میں آپ تالاب، دریا، یا سوئمنگ پول میں نہا سکتے ہیں یا گھر میں باقاعدہ غسل کر سکتے ہیں۔ صرف یہ احتیاط ضروری ہے کہ پانی آپ کے حلق سے نیچے نہ جائے۔

۶۔ جب ایک عورت دو سال سے کم عمر بچے کو کم سے کم پانچ مرتبہ دودھ پلا دیتی ہے تو وہ بچہ اس عورت کے لیے اپنے بیٹے یا بیٹی کی طرح ہو جاتا ہے اور بالغ ہونے پر اس بچے کی اس عورت (رضاعی ماں) یا اس کی بیٹی یا بہن سے شادی نہیں ہو سکتی، شادی کے بارے میں اس بچے کی وہی حیثیت ہوگی جو اس عورت کے اپنے بیٹے کی ہے۔

دودھ پلانے والی عورت سے اور اس کی بیٹی یا بہن سے شادی کی مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ شیرخوارگی کے عالم میں ماں یا رضاعی ماں کا دودھ بچہ کے گوشت اور ہڈیوں اور پورے جسم کی نشو نما میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے اور دودھ پلانے والی عورت اور بچے کے درمیان ماں اور بیٹے کا رشتہ پیدا کر دیتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں کے درمیان شادی کی ممانعت کی ہے۔ آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انسان کے خالق کی حیثیت سے اللہ بہتر جانتے ہیں کہ یہ کس خاص صورتحال میں کس طرح متاثر ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک حکم کے ذریعے واضح طور پر اس کی ممانعت کی ہے۔ یہ ممانعت کسی خام خیال پر نہیں ہے یقیناً اس کے پیچھے کوئی حکمت ہے۔ ہم اپنے ناقص علم کی بناء پر صرف اندازے لگا سکتے ہیں۔ لیکن صحیح صورتحال کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ جو لوگ اس بارے میں سوالات کرتے ہیں آپ انہیں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر کامل یقین رکھتے ہوئے ہمیں یہ ایمان رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کسی بھی ایسی چیز سے منع نہیں کیا جو انسان کے فائدے کے لیے ہو۔ انسان کو صرف ایسی باتوں اور چیزوں سے روکا گیا ہے جو اس کے لیے نقصان کا باعث ہو سکتی ہیں۔

الکحل ملی خوشبو کا استعمال

سوال: اگر خوشبو میں الکحل شامل ہو تو کیا اسے استعمال کرنے کی اجازت ہے؟

جواب: یہ بات سب جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو کو پسند فرماتے تھے۔ آپ (صلی

اللہ علیہ وسلم) نے جمعہ کی نماز کے لیے خوشبو لگا کر مسجد آنے کو پسند فرمایا ہے۔ آج کل بازار میں عام طور پر جو خوشبویات دستیاب ہیں ان میں سے بیشتر الکحل سے بنائی جاتی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر شراب ناپاک ہے تو وہ تمام خوشبویات ناپاک ہیں جن میں الکحل کی آمیزش ہو؟ اس مسئلے کے بارے میں علماء مختلف رائے رکھتے ہیں۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ الکحل اور اس کی بنیاد پر بننے والے تمام منشیات بذات خود ناپاک نہیں ہیں (یعنی شراب حرام ہے، ناپاک نہیں ہے)۔ اس لیے ایسی خوشبو کا استعمال جائز ہے جس میں الکحل کی آمیزش ہو۔ اس موقف کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ الکحل (اسپرٹ) طبی امور میں استعمال کی جاتی ہے کیونکہ یہ جراثیم کو ہلاک کرتی ہے۔ علاوہ ازیں بیشتر ادویات اور مصنوعات میں الکحل بطور کیمیائی جزو شامل ہوتی ہے۔ ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے الکحل ملی خوشبویات کا استعمال جائز ہے (حنفی مسلک کے مطابق الکحل ملی خوشبو کا استعمال پسندیدہ نہیں ہے۔ اس طرح کی خوشبو لگا کر نماز پڑھی جائے تو نماز ادا تو ہو جائے گی لیکن علماء کی رائے ہے کہ اس سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے)۔

عیسائی اہل ایمان نہیں ہیں؟

سوال: اسلامی نقطہ نظر سے عیسائیوں کی کیا حیثیت ہے؟ ایک بزرگ کا کہنا ہے کہ عیسائیوں کو کافروں کے برابر قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ قرآن مجید میں انہیں ''نصاریٰ'' کہا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ اللہ پر تو ایمان رکھتے ہیں لیکن اللہ کے آخری رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے، براہ کرم وضاحت فرمایئے۔

جواب: دنیا کے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک مسلمان اور دوسرے غیر مسلم۔ مسلمان وہ ہے جو اللہ کی وحدانیت پر ایمان لائے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری نبی تسلیم کرے۔ جو شخص ان دو بنیادی باتوں پر ایمان نہیں رکھتا وہ غیر مسلم ہے، اس لیے کافر ہے۔

تاہم اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں عیسائیوں اور یہودیوں کو ''اہل کتاب'' کے نام سے پکارا ہے۔ ''اہل کتاب'' کا مطلب یہ ہے کہ ان قوموں پر آسمانی کتابیں نازل کی گئیں۔ مسلمانوں اور ان دو قوموں کے درمیان چند باتیں مشترک ہیں جن کی بنیاد پر مسلمان مردوں کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کر سکتے ہیں۔ یہ رعایت یہیں تک محدود ہے۔ چونکہ عیسائی اور یہودی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپؐ کے پیغام پر ایمان نہیں رکھتے اس لیے انہیں ''اہل ایمان'' نہیں کہا جا سکتا۔

خودکشی کیوں منع ہے؟

سوال: اسلام میں خودکشی کیوں منع ہے؟ خودکشی کو گناہ کبیرہ کیوں کہا جاتا ہے۔ خودکشی کرنے والا اگر یہ اقدام نہ کرے تو کیا وہ زیادہ عرصے زندہ رہ سکتا ہے؟

جواب: خودکشی کے مسئلے پر گفتگو کرتے وقت سب سے پہلی بات جو پیش نظر رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہیں جو زندگی دینے اور اسے واپس لینے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس امر کو ممکن بنایا ہے کہ بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے بھی موت آ سکتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کو جو حرمت عطا کی ہے اس کی وجہ سے کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ دوسرے کی زندگی یا خود اپنی زندگی کو ختم کر لے۔ جب کوئی شخص کسی دوسرے انسان پر پستول تان کر لبلبی دباتا ہے یا کسی بھی طریقے سے خود کو ہلاک کرتا ہے تو اس کا یہ فعل اللہ کے خلاف جنگ کے مترادف ہے، جس نے انسان کو زندگی عطا کی ہے۔ علاوہ ازیں دوسرے کو یا خود کو ہلاک کرنے والا، اپنے آپ کو (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کے برابر قرار دینے کی کوشش کرتا ہے، کیونکہ زندگی واپس لینے کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے۔ ایسے شخص کے اس اقدام کا مطلب اللہ کو یہ بتانا ہے کہ تو نے زندگی دی تھی لیکن میں نے واپس لے لی۔ خودکشی کرنے والے کے معاملے میں بھی یہی صورت ہے۔ کیونکہ ''زندگی'' خودکشی کرنے والے کی اپنی ملکیت نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی ان بہت سی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو انسان کو بخشی گئی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص خود کو زندگی سے محروم کرتا ہے تو ایک طرف تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو ٹھکرا رہا ہے اور دوسری جانب وہ ایک ایسے اختیار میں اللہ تعالیٰ کا شریک بننے کی کوشش کر رہا ہے، جو صرف اللہ ہی کے لیے خاص ہے۔ یقیناً یہ ایک گناہ کبیرہ ہے۔

ایک حدیث قدسی بیان کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے خودکشی کو اپنی توہین قرار دیا ہے اور خودکشی کرنے والے کا جنت میں داخلہ ممنوع کر دیا ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کا جنت میں داخلہ ممنوع قرار دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ ''خودکشی'' ایسا ہی بڑا گناہ ہے۔

خودکشی کے مسئلے کو ایک اور نقطہ نظر سے دیکھیے۔ کوئی بھی شخص اس وقت تک خود کو ہلاک نہیں کرتا جب تک وہ مایوسی کی انتہا تک نہ پہنچ گیا ہو۔ ایک مسلمان کبھی بھی مایوسی کی اس انتہا تک نہیں پہنچ سکتا، خواہ وہ کتنے ہی مشکل حالات اور مصیبتوں میں مبتلا کیوں نہ ہو۔ وہ صبر کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شخص خود کو کیوں ہلاک کرتا ہے۔ یقیناً وہ ایک طویل عرصے تک بدترین حالات کا شکار رہا ہوگا کہ اسے ایک کے بعد دوسری مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ یہ صورتحال ایک مسلمان کو بھی درپیش ہو سکتی ہے، لیکن مسلمان کے لیے اس کا یہ ایمان تقویت دیتا ہے کہ اس مشکل وقت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوگا اور اس کا اجر بہتر ملے گا۔ اس کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ اس یقین کی وجہ سے اس کی مصیبت کا خاتمہ ہو جائے گا اور اب اسے دنیا کی ساری آسائشیں حاصل ہوں گی۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو جائے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو، لیکن جس بات کا اسے یقین رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ آلام اور مصیبت کے وقت استقامت سے کام لے تو اسے آخرت کی زندگی میں آرام و مسرت حاصل ہوگی۔ ایک مسلمان کے لیے یہ سب سے بڑا انعام ہے۔ مسلمان بخوبی جانتا ہے کہ دنیا کی زندگی عارضی اور چند روزہ ہے اور حقیقی زندگی وہ ہے جو موت کے بعد شروع ہوگی، لہٰذا اگر اسے مصیبت و آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ اسے صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک مسلمان ہمیشہ پرامید ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جلد خوشیوں سے ہمکنار کریں گے، اگر کوئی شخص یہ امید ترک کر دے تو وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا جائے گا اور اس کے نتیجہ میں خود کو اللہ کی رحمت سے بھی محروم کر لے گا۔

اگر کوئی شخص مایوسی کی اس انتہا پر پہنچ چکا ہے کہ خودکشی کا ارتکاب کرنا چاہتا ہے تو اسے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ''موت'' تو بہرحال آنی ہی ہے۔ اگر وہ اپنی باقی زندگی مصیبت میں گزارے تب بھی، موت ہی اس کی زندگی کا خاتمہ کرے گی۔ اگر وہ مصیبت کا مقابلہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے نوازیں گے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس دنیا کی زندگی اپنی تمام دلچسپیوں اور رنگینیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مچھر کے پر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک مصدقہ حدیث میں ارشاد فرمایا کہ ''اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس دنیا کی حیثیت ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کافروں کو پینے کے لیے پانی نہیں دیتا۔''

اس تمام گفتگو کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ دنیا چند روزہ ہے اور اس کی حیثیت حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ''مچھر کے پر'' کے برابر بھی نہیں ہے۔ تو کیا زندگی جیسی اللہ تعالیٰ کی حسین نعمت کو اس ''مچھر کے پر'' سے کم حیثیت شے کے لیے ختم کر دینا چاہیے۔ خودکشی کا ارادہ رکھنے والے کو اس سوال پر ضرور غور کرنا چاہیے۔

اس سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ اگر خودکشی کرنے والا خود کو ہلاک نہ کرتا تو کیا وہ زیادہ عرصہ تک زندہ رہتا؟

میں اکثر فطرت کے ایک قانون کی طرف اشارہ کرتا ہوں، جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ یہ قانون ہے ''اسباب ونتائج'' کا۔ اللہ تعالیٰ نے آگ میں جلانے کی خاصیت رکھی ہے۔ اگر آپ ماچس کی تیلی جلا کر ہاتھ میں لیے رہیں گے تو آگ کا شعلہ جب انگلیوں کے نزدیک پہنچے گا تو آپ کی انگلیوں کو جلائے گا۔ لہٰذا آپ آگ کے اندر اپنا ہاتھ ڈال کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسے اللہ نے جلا دیا۔ آپ کا ہاتھ آپ کے اپنے عمل کے نتیجہ میں جلا ہے۔ آپ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ آپ اپنا ہاتھ آگ میں نہ ڈالتے، آپ کا ہاتھ نہ جلتا۔ اسی طرح اگر قاتل، پستول یا ریوالور کی لبلبی نہ دباتا تو دوسرے شخص کی جان ضائع نہ ہوتی۔ اگر کوئی شخص کسی خاص لمحے میں خودکشی کا ارتکاب نہ کرے، تو اس وقت وہ اپنے عمل کے نتیجے میں ہلاک نہیں ہوگا۔ وہ زیادہ عرصے زندہ رہ سکتا ہے یا کسی اور سبب سے اس کا انتقال ہوسکتا ہے، ہم ہمیشہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی زندگی کا عرصہ متعین کر رکھا ہے، یہ بات بالکل درست ہے لیکن اگر کوئی شخص خودکشی کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ، عزرائیل (موت کا فرشتہ) کو حکم دے سکتا ہے کہ وہ اس لمحہ میں اس شخص کی زندگی ختم کر دے اگر خودکشی نہیں کی جارہی تو زندہ رہنے دے، یہ سب اللہ تعالیٰ کی اپنی مرضی پر مبنی ہے۔

چند کبیرہ گناہ

سوال: براہ کرم چند کبیرہ گناہوں کی نشاندہی کیجیے۔

جواب: سب سے بڑا گناہ شرک ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ کسی بھی شکل میں کوئی دوسرا اللہ کا شریک ہے تو وہ ایک ایسے عظیم گناہ کا ارتکاب کرتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کبھی بھی معاف نہیں کریں گے، سوائے اس کے کہ وہ شخص اپنے اس دعویٰ سے دستبردار ہو، اس گناہ (یعنی شرک) سے خلوص دل سے توبہ کرے اور یہ اعلان کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے۔ اگر وہ صمیم قلب کے ساتھ یہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سابق گناہ معاف کر سکتے ہیں۔

شرک کے علاوہ دوسرے کبیرہ گناہوں میں زنا، جھوٹی قسم کھانا، چوری، مسلم ریاست کے ساتھ جنگ کرنا، شراب پینا اور قمار بازی وغیرہ شامل ہیں۔ ایک اور سنگین گناہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی شان میں گستاخی کرنا ہے۔

والدین کے اعمال کا اولاد پر اثر

سوال: کیا یہ صحیح ہے کے والدین کی نیکیوں کی وجہ سے اولاد پھلتی پھولتی ہے اور اگر والدین کے اعمال ٹھیک نہ ہوں تو ان سے اولاد متاثر ہوتی ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مواقع پر فرمایا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی ایک شخص کے گناہوں کی وجہ سے دوسرا شخص متاثر نہیں ہو گا۔ ہر شخص صرف اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے۔ اس اصول کی روشنی میں یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ والدین کے برے اعمال سے اولاد متاثر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک، جو سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے، ایسے والدین کی اولاد صرف اپنے اعمال کی بنیاد پر قابل جزا یا سزا ہو گی۔

والدین کی نیکیوں کے اولاد پر اثرات کے بارے میں ہمارے سامنے قرآن مجید میں مذکورہ مثال موجود ہے۔ حضرت موسیٰؑ اس کائنات کے نظام کو چلانے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور طریقہ کار کے مطالعے کے بارے میں ایک برگزیدہ شخص کے ہمراہ سفر پر نکلے۔ اس سفر میں اللہ کے اس بندے کے بعض افعال حضرت موسیٰؑ کے نزدیک اس قدر حیرانی کا باعث بنے کہ آپ وعدہ کے باوجود ان کا سبب دریافت کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس قسم کے تیسرے واقعے میں، یہ بزرگ اور حضرت موسیٰؑ جب ایک گاؤں میں داخل ہوئے تو دونوں بھوکے تھے، گاؤں والوں نے انہیں کھانا کھلانے سے انکار کر دیا، اس کے باوجود بزرگ شخص نے گاؤں کی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی مرمت کی۔ حضرت موسیٰؑ کا خیال تھا کہ دیوار کی مرمت کرنے کے عوض انہیں کچھ ملنا چاہیے۔ اس سوال پر یہ بزرگ حضرت موسیٰؑ سے الگ ہو گئے، لیکن روانہ ہونے سے پہلے ان بزرگ نے اپنے کاموں کے اسباب بتا دیے۔ دیوار کی مرمت کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ یہ دیوار دو یتیم بچوں کی ملکیت ہے جن کا باپ ایک نیک آدمی تھا اور اس نے دیوار کے نیچے اپنے بچوں کے لیے خزانہ چھپا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ ہے کہ بڑے ہو کر یہ یتیم بچے اس خزانے سے فائدہ اٹھائیں، اس لیے اللہ نے اپنے بندے (بزرگ) کو حکم دیا کہ دیوار کی مرمت کر دی جائے۔

والدین کے اچھے کاموں سے اولاد کو فائدہ پہنچنے کی یہ ایک واضح مثال ہے۔

بچے کی تربیت اور والدین کی ذمہ داری

سوال: میری والدہ تمام مذہبی فرائض پابندی کے ساتھ ادا کرتی ہیں لیکن اپنے بیٹے کی مذہبی تربیت کے بارے میں ان کا رویہ سنجیدہ نہیں ہے۔ جب میں ان کے بارے میں سوال کرتی ہوں تو وہ کہتی ہیں کہ اگر اللہ اسے ہدایت دے گا تو نیک کام کرے گا اور اگر اللہ اسے ہدایت نہیں دے گا تو بچے کو زبردستی کسی بات پر مجبور کر کے اس کے مستقبل کے رویے کو متاثر کرنا بے کار ہوگا۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا والدہ کا یہ رویہ درست ہے؟ اگر نہیں تو براہ کرم وضاحت فرمایے کہ بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں والدین پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟

جواب: آپ نے سوال میں جس مسئلے کی نشاندہی کی ہے وہ ان لوگوں کا ایک عام رویہ ہے جن کی اسلامی تعلیم میں خاصی کمی رہ گئی ہو۔ ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کی نیت اچھی ہوتی ہو، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ لوگ غلطی پر ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی مثال اس کسان کی سی ہے جسے وراثت میں ایک ایسا قطعہ زمین ملا ہو جسے اس کے باپ نے اپنی موت سے کچھ ہی عرصے پہلے کاشت کے قابل بنایا ہو اور اس میں بیج ڈال دیے ہوں۔ دوسرے الفاظ میں زمین تیار ہے، بیج بو دیا گیا ہے، کسان کو صرف یہ کرنا ہے کہ اس کی مناسب دیکھ بھال کرے، صحیح کھاد ڈالے، وقت پر آبیاری کرے اور ہر موقع پر اچھی نگہداشت رکھے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کی فصل اچھی ہوگی اور اسے منافع ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر کسان اپنی زمین سے غفلت برتے اور یہ کہے کہ "اگر اللہ چاہے گا تو یہ پودے اور درخت اُگ جائیں گے اور فصل اچھی ہوگی اور اگر نہیں چاہے گا تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ اللہ کی مرضی کے خلاف کام کروں۔" اگر وہ کسان فصل کی دیکھ بھال کرنے کے بجائے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا تو ظاہر ہے کہ اس کی فصل اچھی نہیں ہوگی اور اس موقع پر وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ کی مرضی یہی تھی کہ میری فصل اچھی نہ ہو۔

اس کی فصل کے خراب ہونے کی وجہ اس کی اپنی غفلت اور عدم سعی ہوگی، اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کی مرضی یہ ہے کہ ہر کوشش کا صلہ ملتا ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جاری کر رکھا ہے۔ جب بھی اور جو بھی انسان اس قانون کے مطابق کام کرتا ہے اسے اپنی محنت کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ فطرت کے اسی قانون کا اطلاق بچوں کی تعلیم وتربیت کے معاملے پر ہوتا ہے۔

والدین کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کی اچھی نگہداشت کریں اور ان کی پرورش

اس طرح کریں کہ وہ اللہ کی جانب سے ملنے والی رہنمائی پر عمل کریں۔ بچوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان اور کافر میں کیا فرق ہوتا ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کیا باتیں فرض کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں والدین کو بچوں کی صحیح تربیت کرنا چاہیے اور انہیں وقتاً فوقتاً یاد دہانی کراتے رہنا چاہیے تاکہ وہ کوئی ناقابل قبول رویہ اختیار نہ کریں۔ جس طرح والدین اپنی اولاد کی تربیت میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ یہ لوگ بڑے ہوکر ذمہ دار شہری بنیں اور مرد یا عورت کی حیثیت سے اپنی معاشرتی ذمہ داریاں پوری کرنے کے اہل ہوں، اسی طرح انہیں یہ خیال بھی رکھنا چاہیے کہ ان کی اولاد بڑی ہوکر فطری طور پر اس قابل ہو کہ وہ صحیح ہدایت حاصل کرے اور ایمان کا راستہ اختیار کرے۔ اولاد میں یہ خصوصیات صحیح تعلیم سے پیدا ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ تعلیم اسکول یا یونیورسٹی میں حاصل کی جائے، گو کہ یہ تعلیم بھی ضروری ہے اور صحیح اور غلط کے انتخاب میں مدد دیتی ہے، لیکن اس سے بڑھ کر تعلیم وہ ہے کہ جو انسان میں جستجو کا مادہ پیدا کرے اور اسباب و نتائج کے حوالے سے فیصلہ کرنے کی قوت عطا کرے۔ جب ایک نوعمر، ان صلاحیتوں اور اس رویے کے ساتھ جوان ہوگا تو اشیاء اور معاملات کو دیکھنے کی اس کی نظر بالکل مختلف ہوگی اور ایمان کے بارے میں بھی اس کا رویہ مختلف ہوگا۔

اگر والدین نے اولاد کی تربیت کے بارے میں اپنی ذمہ داری پوری کی ہے اور اس کے باوجود کوئی شخص بالغ ہونے پر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ ملحد یا بے دین رہے گا تو یہ اس کا اپنا انتخاب ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر وہ والدین کی تربیت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی حاصل کرتا ہے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو وہ ایک اچھا مسلمان ہوگا۔ لہٰذا یہ والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت اچھی طرح کریں تاکہ وہ اللہ اور بندے کے تعلق کو سمجھنے کے اہل ہوں اور اللہ تعالیٰ سے حاصل ہونے والی ہدایت سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہوں۔ والدین یہ کہہ کر اپنی ذمے داری سے بری الذمہ نہیں ہوسکتے کہ ''ہدایت تو اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے اور اگر اس نے ہدایت نہ دی تو وہ اولاد کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔'' اس طرح کا رویہ اپنی ذمہ داری سے جان بچانے کا ہے اور ایک اچھا مسلمان یہ کبھی نہیں کرتا۔

اجتماعی تدفین

سوال: کیا اس بات کی اجازت ہے کہ بہت سے مردہ افراد کو عارضی طور پر ایک بڑی قبر میں دفن کردیا جائے اور بعد میں انہیں جلا کر ان کی راکھ سمندر میں بہادی جائے؟

جواب: ایک سے زائد میتوں کو ایک ہی قبر میں دفن کرنے کی اجازت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنگ کے بعد حکم دیا تھا کہ دو تین شہداء کو ایک قبر میں دفن کیا جاسکتا ہے۔ آپ کے سوال کے دوسرے حصے کے بارے میں تشویش ہے۔ آپ نے میت کو جلانے کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا یہ ایک فطری طریقہ ہے۔ اصل صورت یہ ہے کہ اسلام مردہ شخص کے احترام کا حکم دیتا ہے۔ وفات کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو، میت کو دفن کردینا چاہیے۔ مردوں کو جلانے کا طریقہ اسلام کے مطابق نہیں ہے۔

میت کو قبر میں کیسے رکھا جائے؟

سوال: برصغیر میں جب کسی عورت کی تدفین کی جاتی ہے تو میت کو پیٹھ کے بل اس طرح لٹایا جاتا ہے کہ چہرہ آسمان کی جانب رہتا ہے، لیکن عرب ممالک میں خواتین کی میت کو سیدھی جانب کروٹ دلا کر رکھا جاتا ہے۔ براہ کرم بتائیے کہ کون سا طریقہ درست ہے؟

جواب: قبر میں میت کو رکھنے کے لیے زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسے سیدھی کروٹ دلا کر اس طرح رکھا جائے کہ چہرہ قبلے کی جانب ہو۔ یہ طریقہ مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے۔ اگر قبلہ رو لٹانے میں کوئی دشواری ہو تو میت کو کسی بھی طرح رکھا جاسکتا ہے۔

قرب قیامت کی نشانیاں

سوال: وہ کیا نشانیاں ہیں جن کی بنیاد پر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اب دنیا کا خاتمہ قریب ہے اور قیامت آنے کو ہے۔ کیا یہ سچ ہے کہ قرب قیامت کی نشانیوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ عرب ممالک دولت مند ہوجائیں گے اور صحرائے عرب کو سبزہ ڈھانپ لے گا۔ کیا ان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ ظہور کے بعد جب ان کا انتقال ہوگا تو انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کیا جائے گا اور اس مقصد کے لیے جگہ مخصوص کی گئی ہے۔

جواب: قرب قیامت کی چند نشانیاں بتائی جاتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نشاندہی کی ہے جن میں دھواں، ظہور مسیح کا جعلی دعویٰ کرنے والا شخص، ایک جانور جو انسان کی زبان میں گفتگو کرے گا، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ ظہور، یاجوج ماجوج، چاند کا تین بار گرہن ایک مشرق میں ایک مغرب میں اور تیسرا عرب میں، اور آخر میں یمن

میں ایک زبردست آگ کا لگنا جو لوگوں کو اس جگہ گھیر کر لے جائے گی، جہاں سے انہیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔

بعض دوسری حدیثوں میں قیامت سے پہلے کی علامتوں میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس وقت دنیا میں ہر چیز کی بہتات ہوگی، یہ صورتحال صرف عرب کے کسی خاص علاقے میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہوگی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ جب ہر چیز کی بہتات ہوگی تو سبزہ بھی کثرت سے ہوگا کیونکہ یہ بھی بہتات کی ایک شکل ہے۔ ہر شخص کے پاس دولت کی فراوانی ہوگی جو اللہ نے انہیں مختلف ذرائع سے فراہم کی ہوگی۔ یہ حقیقت کہ چونکہ اس وقت بعض عرب ممالک کے پاس دولت وافر ہے، قیامت کی علامت نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں جو لوگ اس قسم کی بات کرتے ہیں وہ حسد یا بدنیتی کی وجہ سے ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ ظہور کے بارے میں متعدد احادیث ہیں لیکن کسی میں بھی اس جگہ کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے جہاں ان کا انتقال ہوگا یا انہیں دفن کیا جائے گا۔ اس بات کی کوئی مذہبی اہمیت بھی نہیں ہے۔ یہ بات میں پہلی مرتبہ سن رہا ہوں کہ انہیں مدینے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کیا جائے گا۔ تحقیق سے بھی اس بات کے ثبوت میں کوئی حدیث یا دلیل نہیں ملتی۔ پھر سوال یہ ہے کہ اگر بالفرض ایسا ہوا تو اس کی کیا اہمیت ہوگی۔ تمام انبیاء اور رسل علیہم آپس میں بھائی ہیں، یہ ہمارا عقیدہ ہے۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تدفین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر ہوتی ہے تو اس میں ہمارے لیے حیرانی یا اچنبھے کی کیا بات ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی جگہ دفن کیا گیا جہاں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات ہوئی تھی۔ یہ جگہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کمرہ تھا۔ بعد میں اس جگہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی ان کی وفات کے بعد دفن کیا گیا اور اب صورت یہ ہے کہ اس جگہ کسی اور قبر کی گنجائش نہیں ہے۔

آب زم زم کے استعمالات

سوال: ازراہ کرم بتایئے کہ پینے کے علاوہ زم زم کا پانی اور کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے؟

جواب: جیسا کہ آپ کو علم ہوگا کہ زم زم وہ چشمہ ہے جو حرم مکہ میں واقع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے اس وقت جاری فرمایا تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام، اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ان دونوں کو اس مقام پر چھوڑ کر چلے

گئے۔ اس وقت سے یہ چشمہ حجاج اور زائرین کے لیے فیض کا باعث ہے اور ان کے پینے کے پانی کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ جو لوگ اس فضیلت کو سمجھتے ہیں کہ اس چشمہ فیض سے حجاج و زائرین کی پانی کی ضرورت پوری ہوتی رہے گی، وہ اس کی دیکھ بھال کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہیں۔

علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''زم زم'' کو ''بھوک کی تسکین کی غذا'' قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ نے ایک حدیث روایت کی ہے جو ایک صحابیؓ کے قبول اسلام کے موقع پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا ''آپ کتنے دن سے یہاں ہیں۔''

انہوں نے جواب دیا ''تیس دن سے۔'' رسول اللہ نے سوال کیا کہ ''اتنے دن غذا کہاں سے فراہم کی۔''

صحابی رسول نے جواب دیا ''میرے پاس کھانے پینے کے لیے زم زم کے سوا کچھ نہیں تھا اور میں نے اس دوران خود کو کبھی بھوکا، یا فاقہ زدہ محسوس نہیں کیا۔'' اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''یہ بابرکت پانی ہے اور بھوک کی تسکین کی غذا ہے۔''

اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ زم زم کے پانی کو جس مقصد اور نیت سے پیا جائے وہ مقصد پورا ہوتا ہے لہٰذا اگر آپ زم زم پینے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ آپ کی بیماری کو دور کریں اور شفا عطا فرمائیں یا علم میں اضافہ فرمائیں یا اپنی رحمت سے نوازیں، تو یقیناً اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتے ہیں۔ آب زم زم کو ان تمام کاموں کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے جن کاموں کے لیے عام پانی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً وضو اور غسل وغیرہ کے لیے۔

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں غیر مسلموں کے داخلہ پر پابندی

سوال: براہ کرم یہ بتائیے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں غیر مسلموں کا داخلہ کب ممنوع قرار دیا گیا؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے سورہ توبہ کی ۲۸ویں آیت کے ذریعے مکہ مکرمہ کو غیر مسلموں کے لیے ممنوع علاقہ قرار دیا ہے۔ سورہ توبہ کی اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اے مومنو! مشرک تو ناپاک ہیں تو اس برس کے بعد وہ خانہ کعبہ کے پاس نہ جائیں۔''

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ یہاں ناپاک کا مطلب جسمانی ناپاکی نہیں ہے بلکہ کفار کو ناپاک اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ سچائی کا انکار کرتے ہیں۔ ایمان سے انکار کے عمل نے انہیں ذہنی اور

روحانی طور پر ناپاک بنایا۔ ہجرت کے نویں برس جیسے ہی یہ آیت نازل ہوئی اسی وقت سے حرم مکہ میں غیر مسلموں کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ مدینہ منورہ میں غیر مسلموں کا داخلہ بعد میں ممنوع قرار دیا گیا۔

بعض منکرین کی جانب سے مدینہ منورہ میں تخریب کاری کی کوششوں کے بعد مسلم حکمرانوں نے تمام غیر مسلموں کا داخلہ مدینہ منورہ میں بند کر دیا تھا۔ یہ پابندی آج بھی برقرار ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم ان دونوں محترم شہروں میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی نشاندہی ہو جاتی ہے تو اسے گرفتار کر کے سخت سزا دی جاتی ہے۔ سزا کی نوعیت کا فیصلہ مسلمان قاضی ان حالات کا جائزہ لے کر دیتا ہے جن حالات میں اس پابندی کی خلاف ورزی کی گئی ہو۔

تبلیغی جماعت

سوال نمبر۱: تبلیغی جماعت کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ بھارت اور دیگر ملکوں میں اس کا خاصا اثر ہے۔ اس جماعت کے ارکان کا کہنا ہے کہ جو شخص تبلیغ دین کے سلسلہ میں چالیس روز ان کے ساتھ مصروف رہے اسے عمرے سے زیادہ ثواب ملتا ہے۔

سوال نمبر۲: میرے ایک چچا جو برطانیہ میں رہتے ہیں تبلیغی جماعت کے رکن ہیں۔ بعض اوقات وہ تبلیغی سرگرمیوں کے سلسلے میں بیرون ملک سفر کرتے ہیں۔ ان دوروں کا اہتمام تبلیغی جماعت کرتی ہے۔ قابل تشویش بات یہ ہے کہ میرے چچا اور ان جیسے دیگر حضرت برطانوی حکومت سے بیروزگاری وظیفہ وصول کرتے ہیں جب کہ یہ لوگ کام کرنے کے اہل ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے بعض حضرات کو روزگار کی پیش کش ہوئی لیکن انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ ان کا گزربسر بے روزگاری وظیفے اور اپنی بیوی اور بچوں کی ملازمت کی آمدنی پر ہے۔

جواب: اسلامی سرگرمیوں کو ایک تحریک، تنظیم یا جماعت کی صورت میں منظم کرنے کا تصور جدید تاریخ میں، بعض مسلم ملکوں میں غیر ملکی تسلط اور نوآبادیاتی نظام کا نتیجہ ہے۔ نوآبادیاتی نظام نے نہ صرف ان مسلم ملکوں کے سیاسی ڈھانچے کو بدل کر رکھ دیا بلکہ وہاں کے قانونی اور سماجی نظاموں کو بھی متاثر کیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان مسلم ملکوں کے عوام کی جہالت اور بے خبری کی وجہ سے وہاں نوآبادیاتی نظام کا قیام ممکن ہوا۔ غیر ملکی طاقتوں کے قبضہ اور تسلط کے بعد مقامی آبادی کے ذہنوں میں اسلام کا تصور محض چند عبادات اور چند بگڑے ہوئے توہمات تک محدود ہو کر رہ گیا۔ یہ صورتحال اس بات کا

ثبوت تھی کہ وہاں کے عوام الناس اسلام کے حقیقی معنی سے بالکل ناواقف ہیں۔

غیر ملکی تسلط کے بعد ان علاقوں میں مزاحمت کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ نوآبادیاتی نظام کے خلاف مزاحمت کی تحریکوں کے چلانے والوں میں سے اکثر غیر ملکی حکمرانوں اور نظام کو بیدخل کرکے لامذہبی (سیکولر) حکومت قائم کرنے کے دعویدار تھے جبکہ ہر مسلم ملک میں چند ایسے لوگ بھی تھے جو آزادی کے بعد وہاں اسلامی نظام زندگی بحال کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔

اسلامی نظام کی بحالی کا دعویٰ کرنے والوں نے جلد ہی یہ بات محسوس کرلی کہ انہیں اپنے کام کو آگے بڑھانے کے لیے خود کو ایک تحریک یا جماعت کی صورت میں منظم کرنا ہوگا۔ تحریک کو منظم کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے وہ ہر علاقے میں وہاں کے مخصوص ماحول اور حالات کے مطابق تھے۔ بعض نے تعلیم کے فروغ کو زیادہ اہمیت دی، بہت سوں نے سماج سدھار کو ذریعہ بنایا۔ کچھ جگہوں پر معاشرتی برائیوں کے خلاف متحد ہوجانے کا نعرہ دیا گیا اور بعض نے مذہبی امور و عبادات کو اسی انداز میں جاری کرنے کی کوشش کی جس انداز میں ان کے خیال میں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں جاری تھیں۔ ان میں سے کچھ تنظیمیں یہ سمجھتی تھیں کہ اسلام ایک جامع مذہب ہے جو فرد اور معاشرے کی زندگیوں کو مکمل طور پر اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

تبلیغی جماعت ان تحریکوں میں سے ایک ہے جن کا مقصد احیائے اسلام ہے۔ یہ بات اس کے نام سے بھی ظاہر ہے۔ ''تبلیغ'' کے معنی ہیں دینا یا پہنچانا۔ دینی و روایتی طور پر یہ اللہ کے اس پیغام کو بندوں تک پہنچانے کے مترادف ہے جو اللہ کی طرف سے تمام انبیاء علیہم السلام لے کر آئے۔

تبلیغی جماعت کا موقف یہ ہے کہ اسلام کا آفاقی پیغام دوسروں تک پہنچانا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ اس موقف کو بنیادی مقصد قرار دیتے ہوئے وہ اپنی سرگرمیوں کو منظم کرتی ہے اور اپنے ارکان کے ذریعہ پوری دنیا کو اللہ کے پیغام کی دعوت دیتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس انداز میں یہ اپنے کام کو منظم کرتی ہے اور اپنے ارکان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنا وقت اور صلاحیتیں تبلیغ دین کے لیے صرف کریں، وہ قابل تحسین ہے۔ تبلیغی جماعت اپنے ارکان کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ وہ دن بھر میں ایک گھنٹہ، ہفتہ میں ایک دن اور سال میں ایک ماہ دین کی تبلیغ کے لیے پوری طرح سرگرم رہیں۔ وہ لوگوں کے گھروں، کام کی جگہوں، تفریحی مقامات پر اندرون ملک اور بیرون ملک جاتے ہیں اور اسلام کی دعوت پیش کرتے ہیں کہ اگر وہ اس دین میں مکمل طور پر داخل ہوجائیں تو ان کی زندگیوں میں کیا تبدیلی آسکتی ہے۔

احیائے دین کے لیے کام کرنے والی دیگر جماعتوں اور تبلیغی جماعت میں فرق یہ ہے کہ

بالکل آغاز میں انہوں نے واضح کردیا ہے کہ سیاست سے نہ انہیں کوئی تعلق ہے اور نہ دلچسپی ہے۔ اس طرز عمل سے بیشتر مسلم ممالک میں ان کی کوئی مخالفت نہیں ہے۔ اگر آپ تبلیغی جماعت کے ارکان سے گفتگو کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ سیاست ان کی دلچسپی کا موضوع نہیں ہے۔ جو علماء تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں کی حمایت کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ جب وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں گے تو سیاستدانوں کی دلچسپی اور رجحان خود اسلام کی جانب ہو جائے گا۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حکمرانوں کو اس بات کا یقین دلائیں کہ ان کے (تبلیغی جماعت کے) سیاسی عزائم نہیں ہیں اور نہ انہیں اقتدار سے کوئی دلچسپی ہے۔ وہ یہ بات زیادہ پسند کرتے ہیں کہ حکمراں اپنا اقتدار جاری رکھیں لیکن صرف اپنے طرز حکمرانی کو اسلام کے مطابق تبدیل کرلیں۔ اس نقطہ نظر کی بنیاد مضبوط دلائل ہیں، تاہم احیائے اسلام کے لیے کام کرنے والے بعض لوگوں کو اس سے اختلاف بھی ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ دوسرے بہت سے طریقوں کے ساتھ اس طریقے سے بھی کوشش کرلینا چاہیے ممکن ہے یہ زیادہ سودمند ثابت ہو۔

تبلیغی جماعت کے موقف اور طرز عمل میں جس جگہ کوئی کمی نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے جو ارکان تبلیغی دوروں پر جاتے ہیں اور غیر مسلموں کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کرتے ہیں یا مسلمانوں کو زیادہ بہتر مسلمان بننے کی دعوت دیتے ہیں، وہ اسلام کے بارے میں نہ تو خاص معلومات رکھتے ہیں اور نہ انہوں نے اس کے پیغام کو بہت اچھی طرح سمجھا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ دوسروں کو ایک ایسی بات کی طرف بلارہے ہوتے ہیں جس کو بذات خود انہوں نے صحیح طور پر نہیں سمجھا ہوتا۔ ان کی ذاتی سرگرمیاں، طرز عمل اور رویہ مطلوبہ معیار سے کافی پست ہوتا ہے۔ تاہم یہ بات درست ہے کہ یہ حضرات ایک ایسے شخص کی قیادت میں سفر کرتے ہیں جسے اسلام سے خاصی واقفیت ہوتی ہے، لیکن میری رائے میں یہ بات کافی نہیں ہے۔ آپ دوسرے شخص کو ایسی کوئی چیز نہیں دے سکتے جو خود آپ کے پاس نہ ہو۔ جب ہم دوسروں کو اسلام کی دعوت دیں یا ان سے اسلامی زندگی اختیار کرنے کا مطالبہ کریں تو اس سے قبل خود ہمیں اسلامی طرز زندگی کا نمونہ پیش کرنا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دوسروں کو اسلام کی جانب راغب کرنے کا زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ انہیں یہ دکھایا جائے کہ اسلام مہذب زندگی کے بھرپور معنی میں ایک ایسا دین ہے جو زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے۔ تبلیغ دین سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اسلام کے پیغام کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے کہ یہ لوگوں کی زندگی میں کس طرح انقلاب برپا کرتا ہے۔ میری رائے میں تبلیغی جماعت جب اپنے ارکان کو تبلیغی دوروں پر روانہ کرتی ہے تو اس اہم بات کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔

اس کم علمی کی ایک مثال یہ ہے (جیسا کہ بعض قارئین نے لکھا ہے) جب تبلیغی جماعت کے ارکان سے گفتگو کی جاتی ہے تو وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے عوض کس ثواب کی توقع کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے اگر وہ چالیس دن مصروف رہیں تو اس کام کا ثواب عمرہ کی ادائیگی سے زیادہ ہوگا۔ یہ بات وہ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ کسی انسان کے کسی عمل کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ اسے کتنا اجر ملے گا، یہ اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نیک۔ اعمال کی ترغیب کے لیے بعض اشارے دیے ہیں کہ کسی خاص کام کا اجر کتنا ہوگا، لیکن تمام اعمال وعبادات کے بارے میں ہمیں نہیں بتایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہیں تو کسی کام کا اجر کئی گنا بڑھا کر بھی دے سکتے ہیں، وہ مالک ومختار ہیں، جو چاہیں سو کریں۔ لیکن یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص فلاں کام کرے گا تو اسے اتنا اجر ملے گا۔ ان لوگوں کے اس طرز عمل کے بارے میں کم سے کم کوئی بات کہی جا سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ لوگ گستاخی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اللہ کی مخلوق ہونے کے ناتے ہم اپنے خالق سے یہ مطالبہ نہیں کرسکتے کہ وہ ہم کو کس طرح اور کتنا اجر دے۔ وہ جو بھی عطا کرے ہمیں اسے قبول کرنا ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب چیزوں کا موازنہ کیا جائے تو ایک ہی جیسی چیزوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔

عمرہ ایک ایسی عبادت ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر عائد کی ہے اور اس کے بارے میں قرآن مجید میں حکم موجود ہے۔ جب لوگ دوسروں کو اسلام کا پیغام پہنچانے جاتے ہیں تو ان کا یہ عمل بہت زیادہ ثواب کا حامل ہوسکتا ہے، لیکن یہ ان عبادات کے برابر نہیں ہے جن کی تعریف اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔ اس لیے ان دو چیزوں کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس مضمون کے آغاز میں پوچھے گئے دو سوالوں میں ایک قاری نے اپنے چچا کا جو معاملہ پیش کیا ہے وہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بالکل درست ہوگا کیونکہ میں خود بعض ایسے لوگوں سے مل چکا ہوں جن کا طرز عمل اور طرز فکر ایسا ہی ہے۔ میری رائے میں اس قسم کا طرز عمل اسلام سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کسی شخص کو روزگار کی پیشکش کی جائے اور وہ اسے ٹھکراتے ہوئے بے روزگاری کا وظیفہ لینے کو ترجیح دے تو وہ دھوکہ دہی کا مرتکب ہوگا۔ اسلام اس طرز عمل کی اجازت نہیں دیتا۔ سوال میں جن صاحب کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ روزگار کے قابل ہوتے ہوئے اور روزگار کے مواقع حاصل ہوتے ہوئے برطانوی حکومت سے بے روزگاری کا جو وظیفہ وصول کر رہے ہیں، وہ ان کے لیے حلال نہیں ہے۔ اگر انہیں ملازمت کی پیشکش کی جاتی ہے اور وہ اسے صرف تبلیغی کام کی وجہ سے قبول نہیں کرتے تو بے روزگاری کا وظیفہ ان کے لیے جائز نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کبھی یہ پسند نہیں کرتے کہ ان کے دین پر عمل کرنے والے اپنے طرز عمل سے دنیا کے سامنے بری مثال پیش

کریں۔ وہ کبھی یہ نہیں چاہیں گے کہ تبلیغ دین کے لیے دوسروں کو دھوکہ دیا جائے۔ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنی گزر بسر کے لیے محنت کرے، اپنے کام میں مہارت حاصل کرے اور معاشرے کے لیے سود مند ثابت ہو۔ تبلیغی جماعت کے ارکان کے لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی گزر بسر کے لیے محنت کریں اور اپنے اہل خانہ کی دیکھ بھال کریں کیونکہ یہ بھی ایک اہم ذمہ داری ہے جو تبلیغی سرگرمیوں سے زیادہ اہم اور زیادہ فائدہ مند ہے۔ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے ''جو شخص رات کو گھر میں اس طرح داخل ہوتا ہے کہ دن بھر کی محنت سے تھکا ہوا ہو، اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔'' اس حدیث کے مطابق اسلام کسی شخص کے گناہوں کی معافی کے عمل کو اس محنت و مشقت کے مساوی قرار دیتا ہے، جو کوئی شخص اپنی گزر بسر اور اپنے اہل خانہ کی دیکھ بھال کے لیے کرتا ہے۔ یہ حدیث محنت کی اس اہمیت کو بھی اجاگر کرتی ہے جو اسلام کی تعلیمات کا جزو ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کے لیے یہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ وہ دوسروں کی بھیک اور خیرات پر زندگی گزاریں یا بیوی بچوں کی کمائی پر زندہ رہیں۔

ہر مرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے لیے زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کرے۔ بیوی کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنے خاوند کو کما کر کھلائے۔ جو مرد اپنی یہ ذمہ داری احسن طریقے سے پوری کرتا ہے، وہ اللہ کا محبوب بندہ ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک شخص اپنا بیشتر وقت مسجد میں عبادت کرتے ہوئے گزارتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ اس شخص کا بھائی اس کی کفالت کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص کا بھائی اس سے زیادہ عبادت گزار ہے۔

اس کے ساتھ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ تبلیغی جماعت کے جو ارکان اسلام کو بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنے گھروں میں اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ فرصت کے اوقات میں دوسروں کو دین کی دعوت دیتے ہیں، وہ لائق تحسین ہیں۔

''سید'' ہونے کی افضلیت کا دعویٰ درست ہے؟

سوال: ہمارے علاقے میں ''سید'' یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل سے تعلق رکھنے والوں کا نہایت احترام کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں جب میں اپنے گاؤں گیا تو ایک ''سید'' سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے دعویٰ کیا کہ قرآن مجید میں ان کے (سیدوں کے) لیے ''گلہ بان'' کا کردار مخصوص کیا گیا ہے، جو اپنی بھیڑوں یعنی عام لوگوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اور ''سید'' ہونے کی حیثیت میں وہ کسی بھی شخص کو جنت کا پروانہ دے سکتا ہے کیونکہ گلہ بان کی حیثیت سے وہ اپنی بھیڑوں کے لیے

اللہ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ ''سید'' ۔۔۔ ''مالک'' ہیں اور اگر وہ چاہیں تو اپنے پیروؤں سے کوئی بھی چیز لے سکتے ہیں۔ براہ کرم بتایئے کہ کیا یہ سب کچھ درست ہے؟

میں یہاں یہ بات بھی بتانا چاہتا ہوں کہ جب میں نے ان صاحب کی موجودگی میں مسجد میں بغیر سر ڈھانپے نماز ادا کی، جیسا کہ اکثر لوگ سعودی عرب میں کرتے نظر آتے ہیں تو انہوں نے مجھے توہین و تذلیل کا نشانہ بنایا۔ آپ کے تبصرے کے لیے شکر گزار ہوں گا۔

سوال نمبر۲: ہمارے علاقے میں بعض لوگ ''سید'' ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ الزہرہ رضی اللہ عنہا کے توسط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل سے ہیں۔ کیا یہ بات نہایت متضاد نہیں ہے کہ وہ اپنا تعلق باپ کے حوالے سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کرتے ہیں لیکن اس کے بعد ان دونوں بزرگوں کی والدہ، یعنی حضرت فاطمۃ الزہرہ رضی اللہ عنہا کے تعلق سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسب ملاتے ہیں۔

یہ لوگ خود کو دوسروں سے افضل قرار دیتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا شخص جو ''سید'' نہ ہو، وہ ان کی بیٹی کے لیے رشتہ دے تو یہ قبول نہیں کرتے، جبکہ یہ خود کسی بھی مسلمان خاتون سے شادی کر سکتے ہیں۔ براہ کرم اس مسئلے پر روشنی ڈالیے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں سیدوں کو یہ خصوصی حیثیت کیوں دی گئی ہے؟

جواب: اسلام کی پوری تاریخ میں استحکام کی بنیاد مسلمانوں کے درمیان بھائی چارے (اخوت) اور برابری (مساوات) کے رشتے رہے ہیں۔ یہی دو بنیادی اصول ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کو قوت حاصل رہی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

''مسلمان آپس میں بھائی ہیں'' (سورہ ۴۹، آیت ۱۰)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

''اللہ کے نزدیک تم میں عزت والا وہ ہے جو پرہیزگار ہے۔'' (سورہ ۴۹، آیت ۱۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احکامات کی تشریح اپنے مشہور حج کے خطبہ میں فرمائی جو خطبہ حجۃ الوداع، کے نام سے معروف ہے:

''کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے نہ ہی کسی گورے کو کسی کالے پر برتری حاصل ہے، سوائے اس کے کہ جو متقی ہے۔''

یہ اسلام کے عام اصول ہیں جن کا اطلاق ہر شخص پر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اسلام کی بنیادی

فطرت یہ بات واضح کرتی ہے کہ وہ پوری انسانیت سے یکساں مخاطب ہوتا ہے۔ اسلام دنیا کے ہر شخص کو اللہ پر اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ ان سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اسلام کے فرائض یکساں طور پر ادا کریں۔ اس نے جو چیزیں حرام قرار دی ہیں وہ سب انسانوں کے لیے حرام ہیں اور کسی خاص عمل کے لیے جو جزا مقرر کی ہے وہ سب کے لیے یکساں ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام رنگ، نسل یا نسب کی بناء پر انسانوں کے درمیان تفریق نہیں کرتا۔ اس کا عملی مظاہرہ حج کے موقع پر ہوتا ہے جب تمام حجاج یکساں لباس پہنتے ہیں، تمام ارکان ایک مقررہ وقت پر یکساں طور پر ادا کیے جاتے ہیں، ان ارکان حج کی ادائیگی سب کے لیے ایک خاص مقام پر واجب ہوتی ہے۔ کسی کے بہت زیادہ دولت مند ہونے، یا کسی اونچے مرتبے پر فائز ہونے یا بہت عالم فاضل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بعض لوگوں کی طرف سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں لوگوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی عزت کرنی چاہیے۔ اس دعویٰ کی حقیقت جاننے کے لیے ہم اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہی رجوع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس خاص موضوع پر کیا فرمایا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں نہایت واضح طور پر ہدایت دی ہے۔ اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے مخاطب ہوکر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

> ''فاطمہ! اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں کام کرو۔ کیونکہ جب تم اللہ کے سامنے ہوگی تو میں تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکوں گا۔''

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بات ان ہی الفاظ میں اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب سے فرمائی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن کے بارے میں اپنے چچا اور اپنی بیٹی کو کوئی یقین دہانی نہیں کرا سکتے تو یہ استحقاق کسی دوسرے شخص کو کس طرح حاصل ہوسکتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روز قیامت ایک خصوصی استحقاق حاصل ہوگا اور جب اللہ تعالیٰ اجازت دیں گے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی امت کے لوگوں کی شفاعت فرمائیں گے۔ اس پرشوق التجا میں، رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ ان کی امت کے لوگوں کو معاف کردیا جائے، خواہ وہ کتنے گناہ گار کیوں نہ ہوں کیونکہ انہوں نے (امتیوں نے) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا۔ یہ اللہ تعالیٰ پر منحصر ہے کہ وہ اس شفاعت کو قبول فرمائے۔ اسی موقع پر اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ سنائیں گے جو حتمی ہوگا۔ اللہ کے اس فیصلے کا اطلاق ہر انسان پر انفرادی طور پر ہوگا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا اور اپنی صاحبزادی سے جو کچھ فرمایا، اس میں، اور اس حقیقت میں کہ روز قیامت رسول رحمت (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے امتیوں کی شفاعت فرمائیں گے، کوئی تضاد نہیں ہے۔ نبی کریم، اللہ کے حضور درخواست ضرور کریں گے لیکن قطعی فیصلہ بالآخر اللہ تعالیٰ کا ہوگا۔

درج بالا حدیث سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بالکل واضح کردی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی بھی شخص کو کوئی یقین دہانی نہیں کراسکتے۔ علاوہ ازیں اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ روز قیامت، اللہ تعالیٰ ہر شخص کو دنیا میں اس کے اعمال کی بنیاد پر پرکھیں گے۔ ایمان کی مضبوطی اور عمل صالح، یہی دو باتیں ہیں جن کی بنیاد پر کسی شخص کو اللہ کی رضا حاصل ہوگی اور اسے اجر دیا جائے گا۔

درج بالا باتوں کی روشنی میں کون شخص یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ اپنی بھیڑوں، یعنی دوسرے لوگوں کی دیکھ بھال کا ذمے دار ہے۔ اگر دوسرے لوگ کوئی گناہ کریں گے تو کیا وہ شخص (گلہ بان) ان کی جانب سے سزا بھگتے گا تاکہ لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ایسا شخص اپنے دعویٰ اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے درمیان تضاد کے بارے میں کیا جواب دے گا، جو تین مرتبہ دہرایا گیا ہے کہ ''کوئی بھی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔'' اس سب کے باوجود وہ ''سید'' حضرات یا ان میں سے چند لوگ ایسے دعویٰ کرتے ہیں تو ان سے یہ سوال کرنا مناسب ہوگا، کہ کیوں؟

پہلا سوال کرنے والے قاری کے خط میں اس سوال کے جواب کے بارے میں خاصی معلومات موجود ہیں۔ ان کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو دعوے ہیں، ''جو سید'' حضرات اپنے بارے میں کرتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہر وہ شخص جس سے وہ (سید) خوش ہوں جنت میں داخل ہونے کا یقین کرسکتا ہے اور دوسرا یہ کہ وہ ''مالک'' ہیں اور اپنے پیروؤں سے جو چیز چاہیں حاصل کرسکتے ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ یہ دونوں دعوے ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔

ہم میں سے ہر شخص کے پاس جو بھی چیز ہے، وہ ہمارے لیے کوئی نہ کوئی حیثیت رکھتی ہے اور کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ اسے کسی دوسرے کو دے دے، سوائے اس کے کہ اس کے بدلے میں اسے معقول معاوضہ ادا کیا جائے۔ اگر وہ لوگ صرف دوسرا دعویٰ ہی کرتے اور اپنے علاقے کے لوگوں سے ان کی جائیداد کا کوئی حصہ بغیر معاوضہ ادا کیے طلب کرتے، تو کم ہی لوگ ہوتے جو انہیں ان کی مطلوبہ چیز دیتے۔ لیکن جب وہ لوگ (سید) انہیں یہ یقین دلائیں کہ وہ (عام لوگ) اگر سیدوں سے تعاون کریں اور انہیں اپنی جائیداد کا کچھ حصہ دے دیں تو انہیں جنت میں داخلہ مل

جائے گا، تو ممکن ہے کہ کچھ لوگ جنت حاصل کرنے کے لیے اپنی جائیداد انہیں دینے پر تیار ہو جائیں۔ علاوہ ازیں ان کا خود کو ''گلہ بان'' قرار دینا، عزت کی خواہش کا اظہار کرتا ہے خواہ اس سے انہیں کوئی مادی فائدہ حاصل نہ ہو۔ میں کسی بھی جھجھک کے بغیر یہ کہتا ہوں کہ اس قسم کے تمام دعوے محض لغویات ہیں اور ان میں ذرہ برابر بھی سچائی نہیں ہے۔ قیامت کے دن کوئی بھی شخص کسی دوسرے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔ کوئی بھی شخص اللہ تعالیٰ کے حضور کسی دوسرے شخص کی سفارش نہیں کر سکے گا۔ اللہ کے نزدیک کوئی بھی شخص اس مرتبے کا حامل نہیں ہے۔

ایسے لوگوں سے نبٹنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے، ان کا دوسرا علاج یہ ہے کہ ان کے سامنے اس وقار کا مظاہرہ کیا جائے، جو اسلام نے مسلمانوں کو سکھایا ہے۔ اگر وہ اپنی مبینہ حاکمیت پر اصرار کریں تو بہتر ہے کہ انہیں چیلنج کیا جائے۔ اگر وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بااختیار ہیں تو ان سے کہا جائے کہ وہ قرآن اور سنت سے اپنے اس دعویٰ کا ثبوت مہیا کریں۔ اس سلسلہ میں یہ احتیاط رکھی جائے کہ اگر وہ کسی قرآنی آیت کا حوالہ دیں تو اس آیت کے وہی معنی لیے جائیں جو بظاہر ہیں۔ اس بارے میں کوئی ''پوشیدہ'' معنی قابل قبول نہیں ہوں گے کیونکہ اللہ کے کلام کے معنی بالکل صاف ہیں۔ اگر آپ محسوس کریں کہ آپ بذات خود انہیں چیلنج نہیں کر سکتے تو ان سے کہیں کہ وہ کسی جانے پہچانے عالم کے سامنے اپنے دعویٰ کا ثبوت پیش کریں۔ وہ فوراً مفر اختیار کریں گے۔

سر ڈھانپے بغیر نماز ادا کرنے کے بارے میں آپ نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے، وہ ان لوگوں کے رویے کی ایک مثال ہے جو وہ کسی ایسے شخص کے بارے میں اختیار کرتے ہیں جو اسلام کے بارے میں درست علم رکھتا ہو۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ نماز پڑھتے وقت سر ڈھانپنا بہتر ہے لیکن یہ محض ایک تجویز ہے۔ اگر کوئی اس پر عمل نہ کرے تو اس کی نماز ساقط نہیں ہوتی۔ اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی خاص ہدایت نہیں ہے۔ ان صاحب نے مسجد میں دوسرے لوگوں کے سامنے آپ کو ایک ایسی بات پر لعن طعن کی جس کی خاص اہمیت نہیں ہے۔ یہ رویہ مہذبانہ نہیں ہے۔

دوسرے قاری کے سوال کے جواب میں یہ کہوں گا کہ اگر کوئی شخص اپنا نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاتا ہے تو وہ ایسا صرف حضرت فاطمہ الزہرہ رضی اللہ عنہ کے توسط سے کر سکتا ہے اور یہ قابل قبول ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے حوالے سے فرمایا ''میرا یہ بیٹا ایسا شخص ہے جو دو بڑے گروہوں کے درمیان مصالحت کرائے گا۔''

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ بہت سے لوگ جو اس نسب سے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں

اسے ثابت نہیں کر سکتے لیکن وہ اس استحقاق کو پسند کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ کسی مادی فائدے کی خواہش کے بغیر اس استحقاق کو ایک محدود حلقے میں رکھیں تو یہ قابل قبول ہوگا۔ لیکن اگر یہ اپنے اس تعلق کی بنیاد پر اس قسم کے دعوے کریں جن کا ذکر سوال میں کیا ہے، تو اس صورت میں یہ دھوکے باز قرار پائیں گے۔ ایسے لوگوں کو ان کے صحیح مقام پر رکھنا چاہیے۔

مقامی رسوم و رواج

بچے کی پیدائش پر رسومات

سوال: میری بیوی کے یہاں بچے کی ولادت متوقع ہے۔ ازراہ کرم بتایے کہ بچے کی ولادت سے پہلے اور بعد میں کیا اسلامی رسومات ضروری ہیں۔ میرے ملک میں رواج یہ ہے کہ بچے کی ولادت سے کچھ دیر قبل علماء، دوست احباب اور عزیزوں کو بلایا جاتا ہے اور یہ حضرات قرآن مجید کی آیات تلاوت کرتے ہیں، کیا یہ طریقہ درست ہے؟

جواب: آپ نے اپنے سوال میں، بچے کی ولادت سے قبل اپنے یہاں کے جس رواج کا تذکرہ کیا ہے وہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔ یہ طریقہ کار ایک علاقائی رواج ہے۔ تاہم یہ بات ضرور ہے کہ ایک متوقع ولادت کے عمل سے گزرنے والی خاتون کو روحانی اور مادی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر آپ اپنی بیوی کو قرآن مجید کی آیات کی تلاوت کے ذریعہ روحانی سہارا فراہم کریں، تو یہ نہایت احسن طریقہ ہوگا۔

بچے کی ولادت کے بعد جو چار کام کرنے ہوتے ہیں وہ آپ کو یاد رکھنا چاہئیں۔ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ آپ بچے کو اپنے ہاتھوں میں لیں اور اس کے لیے دعا کریں، بچے کے کان کے نزدیک اذان کے کلمات دہرائیں۔ اذان اونچی آواز میں نہیں دینی چاہیے، کیونکہ اس سے بچہ پریشان ہوگا۔ نوزائیدہ بچے کے کان میں اذان دینے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں آنے کے بعد جو پہلی آواز وہ سنے، وہ اللہ کی کبریائی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی کا کلمہ خیر ہو، جو بچے کو زندگی بھر دن میں پانچ بار سننا ہے اور اس کا جواب دینا ہے۔

دوسرا کام بچے کا نام رکھنا ہے، ایک اچھا نام رکھنا والدین کا فرض ہے۔ یہ ہر نوزائیدہ بچے کا حق ہے کہ اس کا اچھا نام رکھا جائے۔

تیسرا کام یہ ہے کہ بچے کے سر کے بال مونڈے جائیں اور ان بالوں کے ہم وزن سونا یا چاندی خیرات کر دی جائے۔

چوتھا کام بچہ کا عقیقہ کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک یا دو بھیڑوں کی قربانی دی جائے اور پڑوسیوں عزیزوں کی دعوت کی جائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عقیقے کی قربانی کا گوشت غرباء میں تقسیم کر دینا چاہیے لیکن عقیقے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔ عقیقے کا مقصد یہ ہے کہ پڑوسیوں اور عزیز رشتہ داروں کو خاندان کے ایک نئے رکن کی آمد (پیدائش) کی خوشیوں میں شریک ہونے کا موقع فراہم کیا جائے۔

اگر نومولود لڑکا ہے تو ایک اور ضروری کام بچہ کی ختنہ کرانا ہے، یہ کام جتنی جلد کرا لیا جائے، اچھا رہتا ہے۔ بچے کی ولادت کے بعد یہ تمام کام، ولادت کے ساتویں دن انجام دینا احسن ہے، لیکن اگر ان میں تاخیر ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

عرس منانا جائز ہے؟

سوال: برصغیر پاک و ہند میں جب کسی بزرگ کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کے مرید عرس مناتے ہیں۔ قبر کے احاطے میں جانوروں کی قربانی کرتے ہیں اور کھانا پکا کر غریبوں میں بھی تقسیم کرتے ہیں اور خود بھی کھاتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ جانوروں کی قربانی سے یہ بزرگ خوش ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مشاہدہ بھی عام ہے کہ بزرگوں کی قبروں کو خوب سجا کر رکھا جاتا ہے اور مزار کی عمارتیں تعمیر کی جاتی ہیں۔ کیا اسلام میں ان تمام باتوں کی اجازت ہے؟

جواب: اس سوال میں جو باتیں بیان کی ہیں وہ ایک افسوسناک حقیقت ہیں۔ برصغیر پاک و ہند اور بعض دوسرے مسلم ممالک میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اسلام میں ان تمام باتوں سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ کے سوا کسی اور کے لیے جانوروں کی قربانی دینا شرک ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

> ''جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کے لیے جانور قربان کرتا ہے وہ شرک کا مجرم ہے۔''

اس حدیث سے زیادہ سخت ممانعت اور کیا ہو سکتی ہے۔

موت کے بعد رسومات

سوال: ہمارے ملک کے باشندوں کی اکثریت حنفی مسلک پر عمل کرتی ہے۔ جب خاندان میں کسی کی موت واقع ہوتی ہے تو موت کے تیسرے، دسویں اور چالیسویں دن چند رسومات ادا کی جاتی ہیں جن میں قرآن خوانی اور آنے والے مہمانوں کی دعوت بھی شامل ہے۔ براہ کرم یہ بتایئے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ رسومات ادا کیں یا ان کی حوصلہ افزائی فرمائی؟

جواب: آپ کے سوال کا سیدھا جواب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں کسی صحابی یا کسی عزیز کی وفات پر اس قسم کی رسومات ادا نہیں کیں۔ علاوہ ازیں حنفی مسلک یا کسی مسلک میں موت کے بعد کوئی خاص دن متعین نہیں کیا گیا کہ اس طرح سوگ منایا جائے یا رسومات ادا کی جائیں۔ نہ ہی قابل ذکر علماء نے کسی کے انتقال پر خاص طریقے سے اس کی برسی منانے کی ہدایت کی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے موت ایک ایسی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہر انسان کے لیے مقرر کردی گئی ہے اور مسلمان موت کو بھی اللہ کی رضا سمجھتے ہوئے اسی طرح قبول کرتا ہے جس طرح زندگی کے ایسے دوسرے واقعات کو جن پر اس کا قابو نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ اپنے کسی عزیز کی وفات پر ہمیں دکھ اور افسوس ہوتا ہے لیکن کسی عزیز کی موت پر ضرورت سے زیادہ واویلا نہیں کرنا چاہیے۔ ایسے موقع پر مرحوم کی مغفرت اور اس کے گناہوں کی معافی کی دعائیں مانگنی چاہئیں۔ توقع کی جانی چاہیے ان دعاؤں سے مرحوم کو فائدہ پہنچے گا۔ لیکن وفات کے بعد غیر ضروری رسومات سے مرنے والے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ ممکن ہے کہ یہ نقصان کا باعث ہوں کیونکہ موت کے بعد کی رسومات اختراع ہیں جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

پوری مسلم دنیا میں اس قسم کی بیشتر رسومات ادا کی جاتی ہیں جنہیں اسلامی نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ روایتیں ہیں۔ اگر آپ تفصیل سے ان کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہ رسومات یا تو مقامی غیر مسلم آبادی کی تہذیب سے متاثر ہوکر مسلمان معاشروں میں داخل ہوگئی ہیں یا ان علاقوں میں، اسلام کی آمد سے قبل کی رسوم و رواج کے تسلسل کا نتیجہ ہیں۔

مسلمان کی حیثیت سے ہم اپنے تمام اعمال کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ خصوصاً موت کے بارے میں ہمیں یہ یقین کرلینا چاہیے کہ کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جو اللہ کی رضا کے خلاف ہو۔ علاوہ ازیں ان میں سے بیشتر رسومات میں خاصی رقم خرچ ہوتی

ہے لیکن رقم کا یہ اسراف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے بجائے اس کی ناراضگی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

موت کی سزا پانے والے کو شہید کہنا

سوال: سعودی عرب میں جب کسی مجرم کو موت کی سزا دی جاتی ہے اور تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا جاتا ہے تو کیا ایسے شخص کی نعش تدفین کے لیے اس کے ورثاء کو واپس کی جاتی ہے۔ کیا ایسے شخص کو تدفین سے پہلے اسی طرح غسل دیا جاتا ہے جیسے عام مسلمان کو۔ کیا اس شخص کو کفنایا بھی عام طریقے سے جاتا ہے۔ کیا ایسے شخص کو ''شہید'' کہنا درست ہوگا کیونکہ اس کا سر قلم کیا گیا ہے۔ ازراہ کرم ان سوالات کے جوابات عنایت فرمائیں؟

جواب: اگر ایک شخص کو کسی جرم کے ارتکاب میں جرم ثابت ہونے کے بعد سزائے موت دی گئی ہے تو سزا پر عملدرآمد کے بعد اس کی نعش اس کے ورثاء کو واپس کر دی جاتی ہے تاکہ وہ اس کی تدفین کر دیں۔ ایسے شخص کی تدفین بالکل اسی طرح ہوگی جس طرح کسی عام مسلمان کی وفات کے بعد کی جاتی ہے، یعنی غسل دیا جائے گا۔ کفنایا بھی جائے گا اور نماز جنازہ بھی ادا کی جائے گی۔ ہمیں اللہ سے اس شخص کی مغفرت کی دعا بھی کرنی چاہیے جیسے کہ دوسرے مسلمانوں کے لیے کی جاتی ہے۔

جس شخص کا سر قلم کیا گیا ہو، اس کے سر کی جسم سے دوبارہ پیوندکاری کی ضرورت نہیں، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھی اسی طرح زندہ کریں گے جس ط[illegible] زمین میں دفن شدہ، نذر آتش کیے جانے والے یا سمندر میں سپرد آب کیے جانے والے لوگوں کو قیامت کے دن زندہ کیا جائے گا۔ کسی شخص کا سر قلم کیا جانا، روز محشر میں اس کے دوبارہ صحیح سلامت زندہ ہونے میں مزاحم نہیں ہوگا۔

ایسے شخص کو یقینی طور پر شہید نہیں کہا جا سکتا۔ شہداء کے تمام گناہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیتے ہیں اور اسلامی نقطہ نظر کے مطابق شہید اس شخص کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتے ہوئے مارا جائے۔ ایک ایسا شخص جسے کسی جرم کی پاداش میں سزائے موت دی گئی ہو، صرف اس وجہ سے شہید کہلانے کا مستحق نہیں ہے کہ اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ یہ سزا اسے کسی کو قتل کرنے یا اسی نوعیت کے کسی دوسرے جرم کے ارتکاب پر دی گئی ہوگی۔ اس کا قتل ایک سزا ہے اور سزا یافتہ لوگ اعزاز کے مستحق نہیں ہوا کرتے۔

ایصال ثواب کے لیے قرآن کی تلاوت

سوال: میں اپنے مرحوم والدین کو ایصال ثواب کے لیے قرآن شریف پڑھتا ہوں۔ کیا انہیں اس کا ثواب پہنچتا ہوگا؟

جواب: اس مسئلے کے بارے میں علماء کی مختلف آراء ہیں، تاہم عام خیال یہی ہے کہ مرنے والوں کو تلاوت قرآن کا ثواب پہنچتا ہے۔ پڑھنے والے کو بھی ثواب ملتا ہے۔ آپ اس نیک کام کو جاری رکھیے یقیناً اللہ اس کا ثواب آپ کے مرحوم والدین کو بھی پہنچائیں گے اور آپ کو بھی اجر ملے گا۔

قیمتی پتھر اور ان کے اثرات

سوال: کیا یہ بات درست ہے کہ ہیروں اور دوسرے قیمتی پتھروں کو صرف ذاتی استعمال کے لیے اور متعلقہ فرد کی تاریخ پیدائش کو مدنظر رکھ کر خریدنا چاہیے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر اس بات کا خیال نہ رکھا جائے تو پہننے والے پر ان قیمتی پتھروں کے نحس اثرات ہوتے ہیں؟

جواب: کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ اس شخص کے معاملے میں کیا ہوگا جس کو اپنی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہو۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصے پہلے تک دنیا کے بڑے علاقے میں لوگوں کی پیدائش کا ریکارڈ رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ اس صدی کے آغاز سے پہلے بہت سے مسلم ممالک میں قانونی معاملات کے سلسلے میں تاریخ پیدائش کا خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ افریقہ اور ایشیا کے بعض قبائل میں اس طرح کا ریکارڈ رکھنے کا رواج تھا لیکن وہ بھی دن، تاریخ، مہینے اور سال کی بنیاد پر نہیں تھا۔

خواتین ہمیشہ سے قیمتی پتھروں کے زیورات استعمال کرتی آئی ہیں۔ آپ نے جو کچھ کہا ہے اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے تک دنیا کی لاکھوں خواتین بدنصیبی کا شکار ہوتی رہی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے نتیجہ میں نوع انسانی مجموعی طور پر بری طرح متاثر ہو چکی ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے توہمات میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ آپ کے اس سوال کی وجہ سے مجھے یہ بات واضح طور پر کہنے کا موقع ملا ہے کہ تاریخ پیدائش کی انسانی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ بعض حضرات اپنی تاریخ پیدائش کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ علم نجوم کے ماہر حضرات یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر انہیں کسی شخص کی تاریخ پیدائش کا صحیح وقت اور دن، تاریخ کا علم ہو جائے تو وہ اس کی زندگی کا زائچہ بنا کر اس کی شخصیت اور اس کے مستقبل کے بارے میں بہت سی باتیں بتا سکتے ہیں۔ یہ حضرات دعویٰ کرتے ہیں کہ صحیح وقت اور تاریخ کا علم ہونے سے وہ اس شخص کی پیدائش کے وقت ستاروں کے عروج و زوال کا پتا لگا کر یہ بتا سکتے ہیں کہ ستاروں کی اس وقت کی چالوں سے انسان کی زندگی پر کیا اثرات پڑ سکتے ہیں۔ بیشتر ممالک میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل میں ستاروں کی چالوں اور انسانی زندگی پر ان کے

اثرات کے بارے میں کالم ہوتے ہیں جن میں ظاہر کیا جاتا ہے کہ فلاں تاریخ سے فلاں تاریخ کے درمیان پیدا ہونے والے افراد کا آئندہ ہفتہ کیسا رہے گا۔ بیشتر قارئین ایسے کالم محض شوقیہ پڑھتے ہیں لیکن بعض حضرات ایسے کالموں میں خاصے سنجیدہ ہوتے ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر کے مطابق، ان باتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قسمت کا حال بتانے والوں سے مشورہ کرنے پر متنبہ کیا ہے، خواہ وہ مستقبل کا حال بتانے کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کریں۔ علاوہ ازیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قسمت کا حال بتانے والوں کو جھوٹا قرار دیا ہے، خواہ ان کی بتائی ہوئی بات درست ہی ثابت کیوں نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قسمت کا حال بتانے والے نے جو کچھ بتایا تھا، بعد میں ایسا ہی پیش آیا، تب بھی وہ کاذب ہوگا کیونکہ جس وقت وہ پیش گوئی کر رہا تھا، اس وقت اسے یقین نہیں تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، ایسا ہی ہوگا۔ وہ محض قیاس آرائی کر رہا تھا اور قیاس آرائی کرنے والا سچا نہیں ہوتا۔ مستقبل یا قسمت کا حال بتانے والوں سے مشورہ کرنے کے بارے میں، جن میں نجومی بھی شامل ہیں، سختی سے منع کیا گیا ہے۔ اس بات پر یقین رکھنا کہ کوئی شخص مستقبل کا حال جانتا ہے، درحقیقت اللہ پر ایمان نہ لانے کے مترادف ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مستقبل کا حال بتانے والا، ایسی بات جانتا ہے جس کا علم صرف اللہ کو ہے۔

یہ عقیدہ کہ کوئی شے نحس ہے اور انسان کی بدنصیبی کا باعث بن سکتی ہے، اسلام کی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔ درحقیقت اسلام میں ایسی باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔ ہیرے یا دوسرے قیمتی پتھر بذات خود اپنی کوئی قوت ارادی نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ ہمیں نفع پہنچانے یا نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یہ بے جان اشیاء ہیں اس لیے یہ نہ ہمارے لیے خوش بختی لا سکتے ہیں اور نہ بدنصیبی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

غیر مسلم سے دعا کی درخواست کرنا

سوال: کیا ایک مسلمان دوسرے مذہب کے عالم یا مذہبی پیشوا سے یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اس کے لیے اس کے گناہوں کی مغفرت کے لیے اللہ سے دعا کرے؟

جواب: مسلمان کی حیثیت سے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام اللہ کا آخری پیغام ہے اور اللہ نے اپنا دین مکمل کر دیا ہے۔ اسلام کے بعد دوسرے تمام ادیان اور دیگر شریعتیں جو اس سے پہلے بھیجی گئیں، منسوخ کر دی گئیں۔ اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا "ہم نے تمہیں تمام جہانوں کے

لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس دین کی دعوت بنی نوع انسان تک پہنچائیں۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو چاہیے کہ وہ اسلام قبول کریں خاص طور پر ان مذاہب کے ماننے والوں کے لیے یہ بات بہت ضروری ہے جو آسمانی کتابوں اور اللہ کے بھیجے ہوئے دوسرے انبیاء کے ماننے والے ہیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل جتنے بھی انبیاء اور رسول بھیجے گئے انہوں نے اپنے ماننے والوں کو واضح طور پر یہ بتایا کہ "میرے بعد ایک آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آنے والا ہے جو دین کو مکمل کرے گا اور اگر وہ تمہاری زندگی میں آئے تو تمہیں چاہیے کہ اس پر ایمان لاؤ۔" اب اگر دوسرے مذاہب کے ماننے والے اس ہدایت پر عمل نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکامات سے روگردانی کر رہے ہیں۔ اب کسی ایسے آدمی سے دعا کے لیے کہنا جو اللہ کی ہدایات پر عمل نہ کر رہا ہو، ایک لایعنی سی بات ہے۔ دوسری جانب اس بات کا یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ آپ اس شخص کے دین یا مذہب کو جائز تسلیم کر رہے ہیں۔

تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس قسم کی دعا کا جواب اللہ کی طرف سے نہیں دیا جائے گا۔ اللہ تو رب العالمین ہے اور وہ سب کی دعائیں سنتا ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ ۲۷ ویں پارے کی ۶۲ ویں آیت میں ارشاد ہے۔ "ہمیں جو بھی ضرورت کے وقت پکارتا ہے ہم اس کی فریاد سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔" مصیبت کے وقت اپنے بندوں کی فریاد سننا اور ان کی دستگیری کرنا اللہ کی خصوصیت ہے۔

مکڑی کو مارنا گناہ ہے؟

سوال: عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مکڑی کو نہیں مارنا چاہیے کیونکہ مکہ سے مدینہ ہجرت کے وقت، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غار ثور میں قیام کیا تو مکڑی نے فوراً غار کے دہانے پر جالا بن دیا اور قریش کے وہ افراد جو انعام کے لالچ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا تعاقب کر رہے تھے، انہیں نہ پا سکے۔ ابھی حال میں جب میں چھ ہفتوں کی تعطیلات کے بعد واپس آیا تو دیکھا کہ مکڑیوں نے گھر میں جگہ جگہ جالے بن رکھے ہیں۔ باورچی خانے کی الماریوں میں ہزاروں کی تعداد میں مکڑیوں نے بچے دے رکھے ہیں۔ میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ان سے نجات پانے کے لیے جراثیم کش ادویات استعمال کروں۔ اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

جواب: یہ خیال عام ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت مکڑی نے غار کے منہ پر جالا بن دیا تھا، اس کے ساتھ یہ روایت بھی سننے میں آتی ہے کہ اس غار کے منہ پر کبوتر نے گھونسلہ بنالیا اور انڈے بھی دے دیے، لیکن ان واقعات کی تصدیق کسی مصدقہ ذریعے سے نہیں ہوسکی ہے۔ بالفرض یہ واقعات صحیح بھی ہوں، تب بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی کوئی حدیث موجود نہیں ہے جس میں مکڑی اور کبوتر کو دوسرے کیڑے مکوڑوں اور پرندوں سے ممتاز کیا گیا ہو۔ لوگ کبوتر کا شکار کرتے ہیں اور انہیں کھاتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں کبوتر کو ذبح کر کے کھانے سے نہ روکا گیا اور نہ ہی اس فعل کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ اسی طرح مکڑی کو مارنے سے منع کرنے کے بارے میں بھی کوئی ہدایت اور حکم موجود نہیں ہے۔ اس لیے مکڑیوں کو مارنا، خاص طور پر ایسی صورت میں جس کی آپ نے نشاندہی کی ہے، قطعی جائز ہے۔

غسل میت کے لیے آب زم زم کا استعمال

سوال: بعض حجاج، فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد وطن واپس جاتے ہوئے اپنے ساتھ آب زم زم لے جاتے ہیں اور اسے حفاظت سے رکھتے ہیں۔ جب ان کا انتقال ہوتا ہے تو وصیت کے مطابق یہ آب زم زم عام پانی میں شامل کردیا جاتا ہے اور اس پانی سے میت کو غسل دیا جاتا ہے۔ براہ کرم وضاحت فرمایے کہ یہ طریقہ کہاں تک درست ہے؟

جواب: آب زم زم، پینے اور وضو کرنے کے لیے ہے۔ پانی کا یہ چشمہ اس وقت پھوٹ پڑا تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام، اپنی بیوی حضرت ہاجرہ اور اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس مقام پر چھوڑ گئے تھے۔ اس وقت یہ مقام غیر آباد تھا۔ ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ زم زم کو کسی بھی مقصد سے پیا جاسکتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ مقصد پورا ہوتا ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مریض اسے پیے اور اللہ تعالیٰ سے شفایابی کی دعا کرے تو وہ شفا پاسکتا ہے۔ خانہ کعبہ کے گرد طواف مکمل کرنے والوں کو بھی زم زم پینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس پانی میں بذات خود کوئی ایسی خاصیت نہیں ہے جس کی وجہ سے اسے کوئی تقدس حاصل ہو۔ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق تقدس کی حدیں محدود ہیں۔ لہٰذا اگر ایک شخص کو وفات کے بعد تدفین سے پہلے کسی بھی صاف اور پاک پانی سے غسل دیا جائے تو اس غسل میں، اور ایک ایسی میت کے غسل میں کوئی فرق نہیں ہوتا جسے زم زم سے نہلایا گیا ہو۔ آب زم زم سے میت کا غسل، کسی شخص کے گناہوں سے نجات کا ذریعہ نہیں ہے۔

تاہم زم زم ساتھ لے جانے اور اسے محفوظ رکھنے میں، خواہ وہ میت کے غسل کے لیے ہی کیوں نہ ہو، کوئی حرج نہیں ہے لیکن پانی کو اگر زیادہ عرصہ تک رکھا جائے تو وہ باسی ہو جاتا ہے۔ اگر اسے ریفریجریٹر میں رکھا جائے تو جگہ گھیرتا ہے۔ بہرحال یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ زم زم کے پانی سے کسی میت کا غسل نہ تو خیر و برکت اور رحمت کا باعث ہوتا ہے اور نہ گناہوں کی بخشش کا۔

زم زم میں بھیگا ہوا کفن

سوال: لوگ جب حج یا عمرے کے لیے مکہ مکرمہ آتے ہیں تو واپسی میں کپڑے کے کسی ٹکڑے کو زم زم کے پانی میں بھگو کر لے جاتے ہیں تاکہ اسے میت کے کفن کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ کیا اس قسم کے کپڑے سے میت کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے؟

جواب: آب زم زم میں بھیگے ہوئے کپڑے میں میت کو کفنانے سے مرنے والے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کیونکہ زم زم کا پانی مرنے والے کے ان اعمال کو تبدیل نہیں کر سکتا جو اس نے زندگی میں کیے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص سے اس کے ان اعمال کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا جو ہم نے زندگی میں کیے۔ اگر ایک شخص نے برے اعمال کے ساتھ زندگی گزاری ہے تو زم زم کی وجہ سے آخرت میں اس کی سزا کم نہیں ہوگی۔ آخرت میں صرف وہ نیک اعمال ہی ہمیں فائدہ پہنچائیں گے، جو اس زندگی میں ہم دنیا میں انجام دیں گے۔ گناہوں سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی کی امید رکھی جا سکتی ہے بشرطیکہ توبہ کے بعد وہ گناہ دوبارہ نہ کیے جائیں۔

خانہ کعبہ کس نے تعمیر کیا؟

سوال: عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کی تھی لیکن میں نے ایک جگہ پڑھا ہے کہ کعبہ کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام نے رکھی تھی۔ از راہ کرم وضاحت فرمائیں۔ علاوہ ازیں مزدلفہ اور نمرہ و الخیف کی مساجد کی اہمیت بھی بیان فرمائیں۔

جواب: کعبے کی تعمیر کے بارے میں مصدقہ اطلاعات کا ذریعہ قرآن مجید ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق کعبے کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاتھوں انجام پائی۔ سورۃ بقرہ کی آیت ۱۲۷ اور تیسری سورۃ کی آیت ۹۶، ۹۷ میں اس بارے

میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''دنیا میں پہلی مسجد، مسجد الحرام (خانہ کعبہ) ہے اور دوسری بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ ہے۔ ان دونوں کی تعمیر کے درمیان چالیس برس کا وقفہ ہے۔'' اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ مسجد اقصیٰ حضرت یعقوب علیہ السلام نے تعمیر کی تھی۔

منیٰ اور مزدلفہ ''حرم'' میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ ان دو مقامات کے علاوہ ان مقامات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے جن کا آپ نے اپنے سوال میں ذکر کیا ہے، حج کی ادائیگی کے دوران منیٰ میں دو راتیں اور مزدلفہ میں ایک رات قیام کیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طواف اور منیٰ میں جمرہ (شیطان) کو کنکریاں مارنا اللہ کی عظمت کا اقرار کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ان مقامات کی اہمیت کے بارے میں مزید کوئی بات نہیں ملتی۔ اسلامی عقیدے اور تعلیمات کے مطابق حج وہ عبادت ہے جس میں بندہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے خود کو خلوص قلب کے ساتھ اس کے حضور پیش کر دیتا ہے جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے، ہمیں بلا چوں و چرا بجا لانا چاہئیں۔ خواہ اس سلسلے میں کتنی ہی دشواری اور تکالیف کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ حج کے دوران جن مقامات پر حاضری دی جاتی ہے ان کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، اس لیے ہمیں وہاں جانا ہے اور مطلوبہ فرائض ادا کرنے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں چند خاص مقامات پر حاضر ہوکر وہاں مخصوص ارکان ادا کرنے کی ہدایت کی ہے تو ہمیں وہ ادا کرنے ہیں۔ یہاں یہ بات نہیں سوچنا چاہیے کہ وہ مقام کسی خاص اہمیت کا حامل ہے یا نہیں۔

اسلام سے قبل خانہ کعبہ کی حیثیت

سوال: خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی تاکہ لوگ دنیا بھر سے یہاں آئیں اور اللہ کی عبادت کریں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے پہلے تک کعبے کی وہ اہمیت نہیں تھی جو اسلام کے دور میں رہی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل مبعوث ہونے والے پیغمبروں نے کعبہ کو ایک مرکزی عبادت گاہ کے طور پر استعمال نہیں کیا، ازراہ کرم اس کی وضاحت فرمایئے۔

جواب: جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان کے مطابق اللہ کے ہر پیغمبر نے اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایک مرتبہ خانہ کعبہ کی زیارت کی ہے۔ تاہم یہ روایات اس قدر مصدقہ نہیں ہیں کہ اس بات کو بالکل

درست سمجھا جائے۔ اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ اللہ کے ہر پیغمبر نے خانہ کعبہ آ کر عبادت کی یا نہیں، کوئی بھی مقام بذات خود مقدس یا متبرک نہیں ہوتا۔ کوئی بھی مقام اگر مقدس و قابل احترام ہے تو اس لیے کہ اسے اللہ نے متبرک قرار دیا ہے۔ کعبہ مشرف کا تقدس اس لیے ہے کہ اس کی تعمیر اللہ کے حکم کے مطابق، اللہ کے دو پیغمبروں کے ہاتھوں ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے کعبے تک سفر اور یہاں پہنچ کر عبادت کرنے کو بندوں کی طرف سے اپنی اطاعت کی ایک علامت اور اپنی خوشنودی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور انتخاب ہے کہ اس نے ایک مقام کو خاص اہمیت اور تقدس عطا کر دیا، خود اس جگہ میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے۔

جب ہم خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں، اس کے گرد والہانہ ذوق وشوق سے چکر لگاتے ہیں تو درحقیقت ہم اللہ کی حمد وثناء کرتے ہیں اور اپنی دعاؤں کے ذریعہ اس کی عنایت اور اس کے رحم و کرم کے طالب ہوتے ہیں۔ ہمارے اس عمل کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ جن پتھروں سے کعبہ کی تعمیر ہوئی ہے ہم انہیں خصوصی احترام دے رہے ہیں بلکہ ہم سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسے ہی کیا تھا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ خلیفہ دوم، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک بار طواف کعبہ کے دوران حجر اسود کو بوسہ دینے سے قبل اس سے مخاطب ہو کر کہا تھا ''میں جانتا ہوں کہ تو محض ایک پتھر ہے جو نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، اگر میں نے اپنی آنکھوں سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو میں کبھی تجھے نہ چومتا۔''

لہٰذا ہمارے لیے یہ بات اہم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے امتیوں کی تربیت کے لیے جو ہدایات دیں وہی ہمارے لیے باعث تقلید و اطاعت ہیں۔ اللہ تو مالک و مختار ہے، وہ ایک مخصوص مدت کے لیے کسی خاص جگہ کو اہمیت دینے کے لیے منتخب کر سکتا ہے۔ پھر وہ اپنے پیغمبر کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ اس کے امتی اس مقام پر عبادت کا مخصوص طریقہ اختیار کریں اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اللہ کی رضا اس وجہ سے حاصل کرتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے احکام کی اطاعت کی۔

ان حقائق کی روشنی میں ہمیں اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں، نبوت کا سلسلہ بنی اسرائیل کی قوم میں چلا تو اس زمانے میں بیت المقدس کو خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں صاحبزادے، حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل بھی پیغمبر تھے۔ ان کے بعد حضرت اسحاق کے صاحبزادے حضرت یعقوب پیغمبر ہوئے۔ پھر ان کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کو پیغمبری دی گئی ان کے بعد پیغمبری کا سلسلہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت داوٗد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام کے ذریعہ جاری رہا اور حضرت عیسٰی علیہ السلام تک پہنچا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ نسل کی دوسری شاخ میں، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا۔

کسی مقام کی بذات خود کوئی اہمیت نہیں ہے، اور اس بات کی صداقت اس نقطہ نظر سے بھی جانچی جاسکتی ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ نزول وحی کے ۱۴ سال بعد حکم ہوا کہ نماز ادا کرتے وقت اپنے رخ کعبے کی طرف پھیرلو۔ اس وقت سے قیامت تک کے لیے کعبہ مشرف، مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا۔ لیکن قبلے کی اس تبدیلی کے باوجود مسلمان بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کا احترام کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں مقامات صدیوں تک اللہ پر ایمان رکھنے والوں کی عبادت کا مرکز رہے ہیں۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ خانہ کعبہ اپنی اولین تعمیر کے وقت سے عربوں کے لیے مقدس ومحترم رہا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی عرب خانہ کعبہ میں آکر عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ بات علیحدہ ہے کہ انہوں نے ان عبادات میں عجیب وغریب رسومات شامل کردی تھیں جو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ اور ناقابل قبول تھیں۔ طواف کعبہ ایسی روایت اور عبادت ہے جو کہ کعبہ کی تعمیر کے وقت سے جاری ہے۔ معتبر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ بندگان خدا کو کعبہ آکر عبادت کا حکم دیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دریافت کیا کہ ''میری آواز کہاں تک پہنچے گی۔'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا ''آپ صرف اعلان کریں اور اسے لوگوں تک پہنچانے کا کام میرے لیے چھوڑ دیں۔'' صدیوں پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ریگزار عرب میں وہ صدا بلند کی تھی۔ اس صدا کی پکار پر آج بھی ہزاروں لاکھوں پروانے اس ازلی ابدی روشنی سے اکتساب نور کے لیے ہر سال جمع ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

اشاریہ

○ سوالات کی فہرست

سوالات کا اشاریہ

عقائد

ایمان اور عقیدہ

قرآن مجید اور احادیث نبویؐ

عبادات

نماز

زکواۃ اور زکواۃ الفطر

حج اور عمرہ

معاملات

طہارت و پاکیزگی

فقہی اختلافات

معاشرتی آداب وتعلقات

اقتصادی مسائل

وراثت

ازدواجی تعلقات

خواتین کے معاملات

غیر مسلم معاشروں میں رہنے والے مسلمانوں کے مسائل

جدید دور کے مسائل

متفرق سوالات